رجسٹرڈ نمبر ۱۵۱ علیگڑھ

اردوئے معلیٰ

(63)

جلد ... نمبر ...
بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۰۶ء

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی - بی - اے

(فہرست مضامین)

بمقام اشاعت دفتر اردوئے معلیٰ علی گڑھ

احسن المطابع علی گڑھ میں طبع ہوا

بمسالانہ
(عہ مع محصول)

بسم اللہ

قلق

نام و تخلص | خواجہ ارشد علیخاں معروف بہ خواجہ اسد اللہ مخاطب بہ آفتاب الدولہ قلق تخلص زمانہ شاہی کے دور آخر میں لکھنؤ کے دوم درجے کے شاعروں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے اور اپنے ماموں خواجہ وزیر کے اچھے شاگردوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اپنے ایک قصیدے میں اُنہوں نے واجد علیشاہ مرحوم کی بھی شاگردی کا اظہار فخریہ انداز میں یوں کیا ہے ؎

ترا یہ مُنہ تھا کہ سلطان عالم و عادل — بنائیں دست مبارک سے خود ترے اشعار
خوشا نصیب خوشا قسمت و خوشا طالع — کہ ہو حضور کے شاگردوں میں ترا بھی شمار

لیکن ہمارے خیال میں امرائے دربار کا شاگردی بادشاہ میں داخل ہونا علی قصیدہ گوئی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا بادشاہ کو رستم سے زیادہ قوی قرار دینا خیالی تعریف ہے لیکن اسیر مرحوم کا واجد علیشاہ کی غزل پر مصرع لگانا یا قلق کا اپنے تئیں شاگرد اختر بتانا علی قصیدہ گوئی ہے جس سے بڑھکر کوئی اور صورت خوشامد کی نہیں ہو سکتی۔ افسوس کہ اس قسم کی صریح خوشامد کی مثالیں اس زمانے میں بھی موجود ہیں۔ خیر۔

قلق کی شاعری۔ | قلق کی مشاقی اور استادی میں کوئی شبہ نہیں لیکن دیگر اساتذہ لکھنؤ کے مانند انکے کلام سے بھی بجز اسکے کہ بوقت ضرورت بطور سند استعمال کیا جاے دل یا روح کو اور کسی قسم کا سرور حاصل نہیں ہو سکتا عام طور پر انکی غزلوں میں یا تو رعایت لفظی کا جنجال ہوتا ہے جو مبتدیوں اور ظاہر بینوں کو بصورت حسن نظر آتا ہے یا مصنوعی عاشقی کا غیر مہذب چوچلا جسکو عیاشوں کے سوا کوئی دوسرا شاعر یا غیر شاعر دل سے پسند نہیں کر سکتا ملاحظہ ہو۔

ازل سے ہوں میں کشتہ آپکے حسن و ملاحت کا — نمک چھڑکا ہے میں نے زخم دل پر شور الفت کا
صدائے آہ ہے مضراب غم کی چھیڑ سے پیدا — دل نالاں نیا پردہ ہے قانونِ محبت کا
جو وقت قتل اسکے لعل شیریں کا بڑا ہے تو — پلایا آب تیغ یار نے شربت شہادت کا

حسن جاتا رہا موقوف ہے ملنا اُن کا — خط رخسار ہوا ایسے مچلکا اُن کا
نام پر دیکھیں گے اغیار جو ہمکو تم کو — دیکھ لینا کہ بدل جائے گا کوٹھا اُنکا
گل جو ہم کہا چکے تو چمن کو اک داغ دیا — دیکھا خوب نشانی ہمیں چھلا اُن کا

ان خرابیوں کا الزام قلق سے زیادہ انکے عہد کے مذاق پر ہے جبکہ لوگوں نے عیش و عشرت میں پڑکر حقیقی محبت کے مفہوم فراموش کر دیا تھا اور بوالہوسی کو عشق کا قائم مقام سمجھکر قلق و رند کی بیہودہ شاعری کو نہ صرف گوارا بلکہ پسند بھی کرتے تھے۔ رند و قلق چونکہ مصنوعی محبت کی تصویر کھینچتے ہیں اسلئے ان کی غزلوں میں عموماً اُس اثر اور درد کا نام بھی نہیں ہے جو انکے ہمعصر و ہمپایہ لکھنویوں مثلاً نسیم و شیفتہ کی شاعری میں بمنزلہ جان پایا جاتا ہے۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو صرف اُن موقعوں پر جہاں انکے قلم سے جو کچھ نکلا ہے اُسے اُنکے دل نے بھی محسوس کیا ہو۔ مثلاً واجد علیشاہ مرحوم کی سرگذشت سفر ٹمس یا قیصر باغ کے قافیے کی مندرجہ ذیل غزل میں۔

لُٹ رہی ہے دولت دیدار قیصر باغ میں	شل گل سب ہوگئے زردار قیصر باغ میں
گاتے ہیں مرغان گلشن پینگ دیتی ہے صبا	جبکہ جھولا جھولتا ہے یار قیصر باغ میں
بیخودی چھائی ہوئی ہے یہ شراب عیش کی	مست دو با ہر پڑے ہیں چار قیصر باغ میں
آمد آمد ہے سلامی کو ہمارے شاہ کی	ہیں جوانان چمن طیار قیصر باغ میں
محتسب کے ہاتھ سے تنگ اسقدر ہیں اے قلق	آئے ہیں نالش کو سب میخوار قیصر باغ میں

غزلیات قلق کی بے اثری کے باب میں ہمنے "عموماً" کی قید اسلئے لگائی ہے کہ جسطرح کبھی کبھی لکھنویوں کے ہاں رعایت لفظی کی بھی مثالیں نظر آجاتی ہیں اسیطرح لکھنویوں کے کلام میں کہیں کہیں بے تکلفی اور درد کی آمیزش بھی پائی جاتی ہے مثلاً قلق کی مشہور غزل (اداسی دیکھ لو جاتا ہے گلہ دلکا + بس ایک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دلکا) اپنی خاص رنگ کے لحاظ سے انکے تمام دیوان میں فرد ہے اور یہی وجہ ہے کہ آجتک زبان زد خاص و عام ہے اسی رنگ کی اور بھی چند شعر ملاحظہ طلب ہیں۔

صلح ٹھری فیصلہ باہم اگر ہونے لگا	عذر ادہر ہونے لگا شکوہ اُدہر ہونے لگا
چپ رہ اے مرغ قفس نالۂ فریاد نکر	موسم گل میں اسیری کے مزے یاد نکر
کچھ گلا اسکا نہیں ہے مے اگر ملتی نہیں	آنکھ بھی اے ساقی رشک قمر ملتی نہیں
یہ دعا دیکے در یار سے ہم رات چلے	خانہ آباد کہ مشتاق ملاقات چلے
کیا کیا نہ امتحاں میں ہم سرخرو رہے	تیغ نگاہ یار تری آبرو رہے
دنیا ہو اور گلشن کوئے حبیب ہو	جنت کی گر ہوس ہو تو دوزخ نصیب ہو

خاتمہ | دوم درجے کی مثنویوں میں قلق کی مثنوی طلسم الفت مشہور پسندیدہ اور مقبول ہے۔ واجد علیشاہ کی مدح میں انکے قصائد بھی بُرے نہیں اور بحیثیت مجموعی متاخرین اساتذہ لکھنؤ میں انکا بھی شمار بیجا نہیں ہے۔ فقط

سفر آشوب

متضمن کیفیت سفر سلطان عالم محمد واجد علی شاہ از قلق لکہنوی

دہوم ہی شہر میں وارفتہ اختر آیا
شاد آیا ہے چلو دیکہیں کہ مضطر آیا
کچہ کریں فکر علاجِ غم و درد و محن آج

خوش جمالوں میں یہ چرچا ہے کہ کیونکر آیا
اور کوئی مژدہ جاں بخش ہی لیکر آیا
پوچہیں حالِ سفر شاہ غریب الوطن آج

صبح سے شام تلک لوگ سب چلے آتے ہیں
بہیڑ سی بہیڑ ہے انسان پسے جاتے ہیں
کثرتِ اہلِ تمنا ہے بڑا ریلا ہے

خلق اومنڈی ہوئی ہے بار نہیں پاتے ہیں
ایسی مشتاق کب انبوہ سی گہبراتے ہیں
میرے غمخانہ کی دروازہ پہ اک میلا ہے

پوچہتے ہیں ایدہر آنا ہوا تیرا کیونکر
رنج جاں کاہ جگر سے تیری اُٹہا کیونکر
چہیڑ کچہ ای فلک آوارہ کہانی اپنی

چین تیرے دلِ بیتاب نے پایا کیونکر
دردِ فرقت یہ ہوا تجکو گوارا کیونکر
نقل کر اس سفرِ غم کی زبانی اپنی

عذر کرتا ہوں کہ اتنا نہ تم اصرار کرو
مجہ ستمکش سے نہ حجت کوئی زنہار کرو
کیا مصیبت ہو بیاں غم کی گرفتار ونکی

ہر گہڑی مجہسے نہ اس امر کی تکرار کرو
پرسشِ حالِ دلِ زار نہ ہر بار کرو
حیرت آگین ہی کہانی وطن آوارونکی

میں ہی اُس شمع کا تنہا نہیں پروانہ ہوں
میں ہی اُن گیسوؤں کا کچہ نہیں دیوانہ ہوں
اور بہی شاہ کی دمساز غلام آئے ہیں

میں ہی کیا اوس نگہہ مست کا مستانہ ہوں
میں ہی اُلفت میں نہیں اپنوں سی بیگانہ ہوں
اور بہی عاشق جانباز غلام آئے ہیں

سب وہ اس حال سے آگاہ ہیں پوچہو اونسے
حال صدمہ جانکاہ ہیں پوچہو اونسے
چین دردِ دل بیتاب ذرا لوں تو کہوں

وہ بہی اس غم میں اسیر آہ ہیں پوچہو اونسے
خاص وہ بندہ درگاہ ہیں پوچہو اونسے
نفس سرد بہی دم لینے مجہے دی تو کہوں

کیا کروں حال میں اظہار نہ چہیڑو مجہکو
ہوں مصیبت کا گرفتار نہ چہیڑو مجہکو
میرا افسانہ ہو اظہار کے قابل تو کہوں

دردِ فرقت کا ہوں بیمار نہ چہیڑو مجہکو
پکا پہوڑا ہی دلِ زار نہ چہیڑو مجہکو
میری قابو میں اگر ہو وے میرا دل تو کہوں

آہ و زاری سے سحر [illegible] کرتا ہے
بحر خون دیدۂ گریاں سے بہا کرتا ہے
رنج بیحد دل غمدیدہ سہا کرتا ہے
داستاں اپنی مصیبت کی کہا کرتا ہے
یاس اندوہ ہی اور عالم تنہائی ہے
ہم ہیں اور یاس ہمارا دل سودائی ہے

جسکی دم بھر بھی جدائی ہو گوارا مجھکو
جو سوا جان سے بھی اپنی ہو پیارا مجھکو
دم سے جس مہ کی ہو جینے کا سہارا مجھکو
اس سے بیداد سے سپہر ستم آرا مجھکو
قہر بیداد ستم تفرقہ پردازی کی
نئی صورت کی جفا تازہ وراندازی کی

ایسے ملتے ہیں غلاموں کو کہیں یار آقا
ایسے دنیا میں کہاں مونس غمخوار آقا
ایسے کم ہوتے ہیں عالم میں طرحدار آقا
اس مروت کے تو دیکھے نہیں زنہار آقا
شرق سے غرب تلک ڈھونڈنے گر جاؤنگا
ایسا آقای خوش اخلاق نہیں پاؤنگا

اب جو بیٹھا ہوں تو حال غم غربت سنیئے
ماجرای سفر دشت مصیبت سنیئے
الم بیکسی و رنج مشقت سنیئے
صدمۂ آفت و ایذای ہلاکت سنیئے
خانہ ویران وطن آوارہ و برباد ہوئے
مبتلای الم و مورد بیداد ہوئے

شہر سے جبکہ مقدر نے نکالا ہمکو
سخت آفت عجب اندوہ میں ڈالا ہمکو
کر دیا مبتلی زمانہ تہ و بالا ہمکو
یہی کہتا تھا ہر اک دیکھنے والا ہمکو
بلبل ہند اب آوارہ وطن ہوتا ہے
حیف صد حیف کہ ویران یہ چمن ہوتا ہے

تا لب گنگ جو وہ خسرو یکتا جائے
تو تو ہمراہ رکاب ایک زمانا جائے
سفر وادی اندوہ جو پیش آجائے
ایک بگھی پہ دہی یکہ و تنہا جائے
گھر سے باہر بھی جو اپنے نہ کبھی نکلا ہو
وہ گل حسن ہو اور منزلوں کا صحرا ہو

رات کو کوچ کیا کرتے تھے تو دنکو مقام
ایک منزل پہ بنایا کہیں دم بھر آرام
نہ سرانجام سفر کچھ نہ کسی جا پہ قیام
بسکہ تھا طبع کی ناسازی کا وہ ہی ہنگام
شب وہی میں ہی جو تکلیف سوا پائی تھی
سب کا منہ دیکھکے کس یاس سے [illegible] تھی

چند دن بعد جو کلکتے سے ہوئے شبکو سوار
ہو گیا کاٹنا رستے کا سحر تک دشوار
[illegible] ہوئے جو ترہینی پہ آکر یکبار
دھوپ کی گرمی سے کملا ہوئی تو رخسار

فرط ایذا سے نہ تھلنے کا یارا اُسوقت
تھام کر لایا تو نکو بھی [illegible]

اوترے اوس کوٹھی میں آ کر مع ساز و سامان
لے کے گئی تھی جو [illegible]

حال کچھ اوسکی خرابی کا بھی کرتا ہوں بیاں
[illegible]

ڈھیر خاشاک کے تھے چار و نطرف جالے تھے لہ
دھوپ چھنتی تھی وہ ٹوٹے چھپر [illegible]

دیکھے کچھ اپنا تصدق اُٹھ سوار ہوئے
[illegible]

پھنسگئی ریتے میں بگھی تو یہ ناچار ہوئے
[illegible] لوگ [illegible]

ریت میں برہنہ پا خود بھی اوتر کر کھینچا
الغرض [illegible]

شاہ کرتے تھے جہاں شکوۂ ایذائے سفر
[illegible]

یہ نہ معلوم تھا کہ کونسا ان میں افسر
انتظام [illegible]

کار پردازوں نے دیا ان آشنائی اصلا نہ کیا
کھینچنے والا [illegible]

پہونچے شب بھر کی مشقت میں جو تا گولی گنج
صبح ہوا [illegible]

قدم شہ سے منور ہوا کیسا گولی گنج
[illegible]

رات کو جاگنے سے تھی جو حرارت طاری
نیند کب آتی تھی دن بھر بھی غفلت طاری تھی

چند دن بعد بنارس میں تو پائی راحت
[illegible]

اپنے مالک کی ہر اک طرح ادا کی خدمت
شاہ کے آنے کی تھی دلمیں جو اوسکو حسرت

شادی و فرحت سے پھولے نہ سماتا تھا وہ
اپنے جامے میں سے [illegible] تا تھا وہ

تھالی بھر کر تو روپے آتے ہی صدقہ بھیجا
پیشکش اور نذر نقد بھی [illegible] کا بھیجا

کیا بیاں کیجیے ایک ایک کو کیا کیا بھیجا
جتنا سامان تھا راحت کا وہ سارا بھیجا

جیسے کرتے ہیں غلام ایسی وفا کی اسنے
سب نمکخواری سرکار ادا کی اسنے

آرزو مند زیارت جو ہوا بلوایا
بعد مجرے کے وہ اشک آنکھوں میں بھر لایا

نذر دیکر قدم شاہ پہ سر ٹھہرایا
شہ نے الطاف کیا بیٹھنے کو فرمایا

بیٹھتے ہی کرم شہ کی ثنا کی اوسنے
پھر افزایش اقبال دعا دی اوسنے

جب قدم دیکھکے مالک سے ہوا وہ رخصت
شرم سے کہنے لگا وہ شہ عالی ہمت

لہ اس موقع پر شاہ نے نہایت سخت الفاظ میں انگریز منتظم سفر اور مالک ہوٹل کی شکایت کی ہے جسنے بوقت رخصت
[illegible]

ہاتھی اور پالکی سے ہم تمہیں دیتے خلعت
اُسکی قیمت کے موافق زر نقد انکو دو
پیشکش بھی میری جانب سے ابھی انکا انہیں دو
جب کہ دکھلائیگا وہ دن مرا آقا در مجکو
عرض کی میں بھی اُسی روز یہ خلعت لونگا

واہ ری یاس جو کہتا تہا کوئی اوسکا یار
تو وہ کہتا تہا کہ ہوں عیش سے ہم تو سرشار
شاد کیا خاک ہوں کس سے کہیں کہ غم ہے پیش
آرزو تھی کہ مری گہر مرا آقا آئے
یا فلک دفعتہً اس قہر کی آفت ڈہائے
ہائے کیا روؤں میں اس پھوٹی ہوئی قسمت کو

جب چلے وہاں سے تو دریا کا سفر ٹھہرایا
جس سے کشتیٔ فلک کھنگی میں ہم پایا
جب ہوا زور کی چلتی تھی تو گہبراتے تھے
خوش فزا ایک نظر آیا مگر سمندر بن
حسن میں گلشن شداد یہ ہی چشمک زن
ہمیں آب چپ و راست وہ پیاری اشجار

تیسرے روز ہوا قطع وہ صحرا جسدم
صدمۂ آب روانکا نرہا اب کچھ غم
نظر اتنے میں سمندر کا ٹہانا آیا
ہو گیا موج کے صدمونمیں گرفتار جہاز
سوجھتا تہا ہو گا یہ کسطرح سے اب پار جہاز
مارے دہشت کے نہ تہا دیدکا یارا اُسدم

پر کریں کیا کہ نہیں آج وہ باقی حشمت
جسقدر ہے انکے ہی لایق زر نقد انکو دو
کہدو مقبول ہوا دلمیں کچھ آزردہ نہو
میں یہ لے لونگا امانت ہے میری رکھہ چھوڑ دو
اور جو کچھ کہ میرے دلمیں ہے حسرت لونگا

نکلیا ایک برس آپنے کوئی تہوار
اور اسطرح سے لٹجائے ہماری سرکار
اپنی سرکار کے سنچا ئنکی ماتم میں ہیں
تا نکلو ار بھی ہیچ شو ئمیں عزت پائے
کہ وہ آئے بھی تو تشریف یہاں یوں لائے
دیکھیں آوارہ وطن اپنی ولی نعمت کو

اک جہاز ایسا پرانا سا دکھائی پایا
باد و باران نے بھی وسد نے کرم فرمایا
کثرت بارش ہر روزہ سے ہول آتی تھی
فی الحقیقت کہ وہ صحرا ہی برنگ گلشن
وہ ہوا اوسکی معطر صفت دشت ختن
دست قدرت کے تراشے ہوئے ساری اشجار

سمجھے اب منزل مقصد کے قریب آئے ہم
دل میں اپنے ہوا ہر ایک مسافر خرم
اوس تلاطم میں تو بس مُنہ کو کلیجا آیا
دفعتہً چلنے لگا مست کی رفتار جہاز
بچگیا ڈوبنے سے اوسمیں کئی بار جہاز
نظر آتا تہا کسیجا نہ کنارا اُسدم

دیکھتا کوئی میری شاہ کا عالم اُسوقت
گو کہ بہلاتے تہی پر ڈرتے تہی خود ہم اُسوقت
ناخدا لاکہ ہر اک شخص کو سمجہاتا تہا
ستہ پہر تک تو رہا ایک تلاطم برپا
اس مصیبت سے سنبہلنے بہی نہ پائی تہی ذرا
چین غربت میں بہی لینے نہ دیا قسمت نے
دفعتًہ مادرِ فرزند و برادر چہوٹے
جی نہ انسان کا کسطرح یہ سُنکر چہوٹے
اُسپہ بہی چین نہ لی چرخ یہ آفت ڈالی
کچہ عجب چرخ ستمگار بہی ہے بد خصلت
نازپروردوں پر اندوہ کی اتنی کثرت
ایک کی نورِ نظر نورِ نظر ایک اپنا
ماں بہی وہ ماں کہ جو پروانۂ شمعِ رخسار
دم بہر آنکہوں سے گر اوجہل ہوں تو آئی نہ قرار
فرطِ اُلفت سے جو وسواس بہت آتے تہی
دیکہنا نام سے دریا کی جسے خوف آئے
ملکۂ شہر اودہ کی جو سدا کہلائے
یوں جدا بیٹے سے پردیس میں ہائے کوئی
منصفی کیجیے جو ماں ہو نثارِ فرزند
ملک بنگالہ میں وہ خاک کا ہووے پیوند
رنج ناکامیِ مطلب سے جگر پارہ ہو
بہلی وہ بہائی کو ہرگز نہ برادر سمجہا
بہائی نے بہی اُسے فرزند سے بہتر سمجہا

اُس تلاطم میں نہ تہا چین کوئی دم اُسوقت
حال ایک ایک کا تہا وہم و بہم اُسوقت
مگر ایک ایک کا مُنہ زرد ہوا جاتا تہا
شام کو قافلہ سب داخلِ کلکتہ ہوا
کہ چلی گوشۂ غربت میں کس آفت کی ہوا
سخت اندہیر غضب قہر کیا قسمت نے
زیست کا جن سے مزا تہا وہی یکسر چہوٹے
سلطنت ساری چہٹی شہر چہٹے گہر چہوٹے
ایسی غربت میں مصیبت پہ مصیبت ڈالی
طرفہ ڈالی ہے غریب الوطنی میں آفت
آکے پردیس میں کن کن سے ہوئی ہے فرقت
زورِ بازو و دل و روح و جگر ایک اپنا
نام فرزند پہ جسکی ہو سدا جان نثار
روز منگوایا کریں دینیں خبر سو سو بار
صدقے ہر روز ہزاروں ہی دیے جاتے تہے
سوئے لندن وہی رستے سے تری کی جائے
آسماں اُسپہ ضعیفی میں یہ آفت ڈہائے
ایسا غربت میں تہ خاک نہاں ہو کوئی
دیکہنے پائی نہ پہر آکے جمالِ دلبند
حسرتیں دل کی رہیں دل ہی میں اور آنکہ ہو بند
خانہ ویران و تباہ و وطن آوارہ ہو
ہر طرح والدِ ماجد کی برابر سمجہا
یہ محبت تہی کہ معشوق سے بڑہ کر سمجہا

ایسے ملتے ہیں کہیں تابع فرماں بہائی ایسے دیکھے ہیں کہیں بہائی پہ قرباں بہائی
پھر دیکھو وہی پردیس میں بازو ٹوٹے نقد جاں رہزن مرگ اسکا سفر میں لوٹے
آس ملنے کی ہی جسکی سنو ایسا چھوٹے کیوں نہ اس رنج میں ہر اک سر و سینہ کوٹے
پھر کے غربت سے نہ وہ یوسف ثانی آئے نوجواں بہائی کی افسوس سنائی آئے

اور بیٹا بھی وہ بیٹا کہ سعید ازلی خوردسالی میں فراست ہی بزرگوں کی سی
دیکھکر طبع مبارک کی بہت ناسازی پیار سے عرض حضور پدر آکر خود کی
آپ تشریف نہ لیجائیں ہمارے ہوتے کہیں تکلیف نہ فرمائیں ہمارے ہوتے

ہم ہیں کسدن کے لئے ہمکو روانا کیجے آپ تشویش نہ کچھ دل میں خدارا کیجے
گو کہ کم عمر ہیں پر دہیان نہ اسکا کیجے مورد طعن زمانہ ہوں نہ ایسا کیجے
سعی زیبا ہی ہمیں اپنی ریاست کے لئے آدمی کیا نہیں کرتا ہے حکومت کے لئے

للہ الحمد کہ خالق نے یہ دن دکھلایا ایک لندن کا مسافر تو سلامت آیا
حق تعالی نے بڑا اپنا کرم فرمایا یوسف ہند کو یعقوب زماں نے پایا
حق ولیعہد بہادر کو سلامت رکھے سایۂ شاہ میں تا دور قیامت رکھے

ذی لیاقت بہت افضال الہی سی ہے بامروت بہت افضال الہی سی ہے
اہل ہمت بہت افضال الہی سی ہے اور غیرت بہت افضال الہی سی ہے
کتنا خوش وضع ہی بانکا مرا مرشدزادہ فہم و جرات میں ہی یکتا مرا مرشدزادہ

اور اس چرخ ستمگار کے سنئے نیرنگ شاہ غربت زدہ پر دیکھیے بیداد کے ڈھنگ
ایسا پروردۂ ناز و نعم اور قید فرنگ بوی گل سی ہی جو ہو جان نزاکت سی تنگ
مثل بلبل وہ گرفتار قفس میں ہو جای خود جو حاکم ہو وہ یوں غیر کے بس میں ہو جای

ہر برس سینکڑوں خنگ لیے ہوں جسکی طیار ایک ٹٹی کا وہ حکام سے ہو شکر گذار
برف کا جسکے غلاموں کے ہو گہر انبار آٹھ سیر اوسکو کرے برف عنایات سرکار
کیا کہوں حال میں اسوقت کہ ہی کیا میرا شق ہوا جاتا ہی اس غم سی کلیجا میرا
کیا کروں نقل میں اس ماہ کی بربادی کو یوں اجڑتے نہیں دیکھا کسی آبادی کو

دیکھنا ساری نگوڑاروں کی ناشادی کو ۔۔۔ قید کرتا ہی کوئی بھی کہیں فریادی کو
گھر لٹا مال لٹا شہر لٹا وای نصیب ۔۔۔ ماں چھٹی بہائی چھٹا دیس چھٹا وائی نصیب
ہائے اللہ سوا تیرے کہوں اب کس سے ۔۔۔ غم جانکاہ سوا تیرے کہوں اب کس سے
درد دل آہ سوا تیری کہوں اب کس سے ۔۔۔ تو ہے آگاہ سوا تیرے کہوں اب کس سے
وقت بد میں کوئی بے تیری مددگار نہیں ۔۔۔ تجھسا ہم بیکسونکا کوئی طرفدار نہیں
مجکو آنکھوں سے دکھائی یہ مقدر ساماں ۔۔۔ میرا یوسف مرے آگے ہوا اسیر زنداں
اور میں اُسپہ تصدق نکروں دولت جاں ۔۔۔ صدمۂ درد جدائی سے رہوں سینہ زناں
سخت جاں مجھسا زمانہ میں نہوگا کوئی ۔۔۔ زن رہتا نہیں ان صدموں میں اچھا کوئی
لیچلے میرے مسافر کو جو ہیں کرکے اسیر ۔۔۔ خود ہی پوچھا کہ کوئی جرم مرا کچھ تقصیر
یہی فریادی کی ہوتی ہی جہانمیں توقیر ۔۔۔ واقعی میری اطاعت کی یہی تہی تعزیر
ایک نئے رحم غریب الوطنی پر نکلیا ۔۔۔ دہیان کچھ اپنی بھی بیباکی پہ نکلیا
پہر تو اوسوقت زن و مرد میں تہا اک کہرام ۔۔۔ صورت ماہی بے آب تڑپتے تہے غلام
ہوشمیں اپنے نہ تہی خاص سے لیکر تا عام ۔۔۔ زندہ در گور تہی ارباب محلات تمام
غل تہا پردیسمیں ہم آکے لٹے صد افسوس ۔۔۔ قدم شاہ سے غربت میں چھٹے صد افسوس
غرض اُسدنسے یہی رہتی تہی باہم تقریر ۔۔۔ اپنے مالک کے رہائی کی کرو کچھ تدبیر
نکلے آخر کو اس امید میں ہم بے تاخیر ۔۔۔ ہو گئے راہ ہی میں خوبی قسمت سے اسیر
بیٹھا سات مہینے تو گرفتار رہے ۔۔۔ اپنی خالق سے رہائی کے طلبگار رہے
فضل سے اوسکے جو ہیں ہمنے رہائی پائی ۔۔۔ اُسی غمخانے میں تقدیر ہمیں پہر لائی
جبکہ خالی نظر آرامگہ شاہ آئی ۔۔۔ نہ رہا آپ میں پہر اپنا دل سودائی
اُسی وحشت میں دم اُلٹا جو کئی بار اپنا ۔۔۔ لیچلا گھر کیطرف کو یہ دل زار اپنا
جب وطن میں ہمیں غربت سے مقدر لایا ۔۔۔ دل یہاں آکے وہانسے بھی سوا گھبرایا
شدت درد جدائی نے تو جہر اک ڈہایا ۔۔۔ شہر کا ہمنے عجب رنگ کچھ آکر پایا
چوک ویران گلی کوچہ میں سناٹا ہے ۔۔۔ شہر سارا دل بیکس کیطرح سونا ہے

نہ وہ چہلیں نہ وہ دہومیں وہ چرچے باہم
شہر کے لٹنے کا کرتا ہے زمانہ ماتم
بند دروازے کئے بیٹھے ہیں ارباب نشاط

تین حصے سے ہوا شہر کھدا پایا تمام
مہروش سیکڑوں رہتی تہی جہاں گرم خرام
اجنبی ہوگئے ایسی یہ بہٹک جاتے ہیں

ہو نہ اسطرح کوئی شہر الٰہی تاراج
جنمیں شاہی کوئی کرتا تہا ہمیشہ کوئی راج
بستیاں ایسی اُجڑتی نہیں دیکہیں ہمنے

برسا کرتا ہو شب و روز جہاں پر کنچن
کوٹھیاں یوں ہوں سجی جیسے کہ اک شب کی دلہن
جو نہ دیکہا تہا ان آنکہوں نے دکہایا ہمکو

جس جگہہ کل تک ان آنکہوں سے یہ ساماں دیکہا
جسکو دیکہا صفت گل اُسے خنداں دیکہا
سبق دفتر آرام نہ زنہار پڑہو

کثرتِ لالہ و گل سے جو ہو مملو گلزار
زر گل روز لٹاتی ہو جہاں بادِ بہار
جای گل خار ہوں باغ عوض گلچیں ہوں

لکہنو ایسی تباہی کے سزاوار نہ تہا
یوں کبہی جان سے اپنی کوئی بیزار نہ تہا
ان بلاؤں سے تو واقف بہی غم دیدہ نہ تہے

یہی سرکار وہ پارس تہی جو چہو جاتا تہا
خوبیٔ بخت سے توقیر بہی یہ پاتا تہا
روز ساماں نئے سبکو نظر آتے تہے

ایک جا بیٹھے ہوئے دو کو نہ دیکہا خرّم
وائے لئے ملک کی عزت کا ہے ایک ایک کو غم
خستہ و برہم و درہم ہیں سب اسباب نشاط

جسطرف دیکہو نظر آتا ہے ایک ہو مقام
ٹہوکریں کہا کے بشر چلتے ہیں اُسجا ہر گام
ساکن شہر تلک راہ نہیں پاتے ہیں

لکہنو والے ہوئے جیسے تباہ و محتاج
اُن مکانوں کے نشاں ڈہونڈو تو ملتے نہیں آج
قسمتیں ایسی بگڑتی نہیں دیکہیں ہمنے

اُن محلات میں ہوں زاغ و زغن کی مسکن
خس و خاشاک کی ہوں ڈہیر وہاں سیکڑوں من
نہ سُنا تہا سو وہ کانوں نے سُنایا ہمکو

جا پڑی آنکھ جدہر ایک پرستاں دیکہا
آج اجڑا ہوا ہمنے وہ گلستاں دیکہا
آیۂ فعتبروا یا اولی الابصار پڑہو

عندلیبوں کو قدم رکہنا ہو جن شاخوں پہ بار
ہر چمن میں ہوں وہاں برگ خزاں کے انبار
بلبلِ سرخی کی لہو سے کروں رنگیں ہوں

اور عشرت کدہ ایسا کوئی زنہار نہ تہا
اسطرح موت کا ہر ایک طلبگار نہ تہا
ایسی آفت زدہ ایک یہ ستم دیدہ نہ تہے

چار ہی دن میں اُسے مال یہ ہاتہ آتا تہا
کبر سے ایک کو خاطر میں نہ وہ لاتا تہا
دم میں بنتے تہے کئی کتنے بگڑ جاتے تہے

اور اقلیموں کے لوگوں کی طبیعت یہ کہاں
پاسداری و وفاداری و ہمت یہ کہاں
کہیں یہ وضع ہے اور طرز لباس ایسا ہے

کہیں جانباز و نمودار جوان ہیں ایسے
کس جگہ اہل زباں سحر بیاں ہیں ایسے
اہل ثروت کا تجمل یہ کہیں اور بھی ہے

یہ لگاوٹ یہ بناوٹ یہ زباں پیاری ہے
آشنا پروری و دوستی و یاری ہے
مارے غیرت کے تو خود فاقہ کیا کرتے ہیں

یہی وہ گھر تھا غلام اسکا جو کہلاتا تھا
اک جہاں اسکی زیارت کے لیے آتا تھا
ہائی کیا قہر یہ ڈھایا ہے سپہر دوں نے

ایسے ہر فن کی کہیں اہل کمال اور بھی ہیں
سارے دنیا میں ملاقات کی یہ طور بھی ہیں
ایسی ہر بات میں ایجاد کہیں ہوتے ہیں

ایک اس گھر کے بگڑنے سے زمانہ بگڑا
جانعالم کی بچھڑنے سے زمانہ بگڑا
جو جو عشرتکدہ تھا آج وہ غمخانہ ہے

جسگھڑی ہوتا ہے اس تازہ خرابی پہ گذر
نہیں مڑتا ہے یہ سڑکوں پہ غبار آٹھ پہر
دل پہ صدمے جو گذرتے ہیں وہ سب سہتے ہیں

چھٹ گیا ہے جو شہ داد گر قیصر باغ
نہر کو کہتے ہیں سب چشم تر قیصر باغ

آدمیت یہ مروت یہ حمیت یہ کہاں
جرات و غیرت و اخلاق و محبت یہ کہاں
کہیں انسان کا کوئی قدرشناس ایسا ہے

ٹھاٹھ امیروں کے سواری کے کہاں ہیں ایسے
نہ مکیں ایسے کہیں ہیں نہ مکاں ہیں ایسے
اہل ہمت کا تو غل یہ کہیں اور بھی ہے

یہ تراش اور یہ خراش اور یہ طرحداری ہے
یہ یہی شہر ہے جسمیں کہ یہ غمخواری ہے
آشناؤں کے کھلانے پہ بگڑ مرتے ہیں

جس جگہ جاتا تھا توقیر بڑی پاتا تھا
جانکر فخر ہر اک آنکھوں پہ بٹھلاتا تھا
ہائی کیا شہر مٹایا ہے سپہر دوں نے

امرا کی کہیں یہ ٹھاٹھ ہیں یہ دور بھی ہیں
یہ حسینوں کی یہ طرز ستم و جور بھی ہیں
ایسے ہر علم کی استاد کہیں ہوتے ہیں

لکھنؤ شہر اجڑنے سے زمانہ بگڑا
بد معاشوں کے بھی لڑنے سے زمانہ بگڑا
کنج لٹتے تھے جہاں اب وہیں ویرانہ ہے

یہ گماں کرتا ہے ہر ایک ستمدیدہ بشر
فرقت شہ میں زمیں شہر کی ہے خاک بسر
باغ شاہی میں سڑک دیکھکے یہ کہتے ہیں

شق ہوا ہے یہ الم سے جگر قیصر باغ
چشم حیراں کیطرح وا ہے در قیصر باغ

جا ہی گل خار مغیلاں ہیں عجب ساماں ہے
باغباں آفت تازہ ہی خزاں بان ہے

خاص بازار کی صورت نہ خدا اب کہلائے
یا تو اک خلق زیارت کے لیے جسکے آئے

حسن میں مصر کا بازار ہی جس سے شرمائے
راہ چلتے ہوئے یاد انکو وہاں ہیبت چھائے

جلسہ ہر روز جہاں ناچنے والوں کا ہو
اس جگہ رات کو ہنگامہ شغالوں کا ہو

زرد کوٹھی کے وہ آگے کی گجر دم صحبت
کہ نہ تھی بزم سلیماں سے وہ کچھ کم صحبت

لوزن کے لوگ وہ جو شاہ کے تھے ہم صحبت
چرخ بے مہر نے یوں کر دی وہ برہم صحبت

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روی گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

رہس منزل کو وہ جلسے وہ مزے آٹھ پہر
جسکی آراستگی قصر جناں سے بہتر

نشۂ حسن میں سرشار ہر اک رشک قمر
ناچ گانے کے تماشے ہی میں ہوتی تھی بسر

کر دیا تھا ہے عشرت نے یہ مدہوش ہمیں
فکر کونین کی رہتی تھی فراموش ہمیں

وہ ہوادار پہ سلطان ملائک منظر
مثل خورشید درخشندہ جمال انور

جگمگے ساتھ وہ خوباں جہاں نکلے اکثر
جیسے گل بلبلوں میں اور ستاروں میں قمر

داخل اس طرح سے ہوتے تھے پریخانوں میں
ہائے اب ذکر ہیں ان جلسوں کے افسانوں میں

دو گھڑی دن سے وہ بگھی پہ حسینان جہاں
صورت تخت سلیماں چمنستاں میں رواں

ہائی اللہ یکایک یہ ہوا کیا سامان
نہ وہ گل ہے نہ وہ بلبل نہ چمن نے وہ سماں

یہ گلستاں تو نہ تھا جور خزاں کے قابل
نغمہ سنج اسکی نہ تھی شور و فغاں کے قابل

شہر کو میرے نظر کھا گئی کس کی یارو
ہائی ہونا تھا یہ کس اہل حسد نے اسکو

دام کو اسکا نشاں رہ گیا باقی اب تو
وصف اس معدن اوصاف کی کیا پوچھتے ہو

ہفت اقلیم میں تو شہر نہیں ایسا تھا
واقعی سچ ہے طلسمات کا یہ خطا تھا

دلخراش ایسی الٰہی کوئی روداد نہ ہو
اس طرح گھر کسی دشمن کا بھی برباد نہ ہو

مدعی ایسا سیہ ستم ایجاد نہ ہو
کسی بے جرم پہ دنیا میں یہ بیداد نہ ہو

ایسی سرکار کسیکی نہ لٹے دنیا میں
یوں وطن سے کوئی اپنے نہ چھٹے دنیا میں

اے شہ کشور الطاف و عطا میں صدقے
اے مہ برج عنایات و سخا میں صدقے

ای نہالِ چمن صدق وصفا میں صدقے
مجھکو پھر آنکھوں سے دکھلای خدا اوج وہی
لکھنو آپ کا اب بیکس و بیوالی ہے
اور دولت پہ نہ نوبت ہی نہ گھڑیالی ہے
جس جگہ آگئے پریزادوں کا مجمع دیکھا
شہر میں گاتا ہے جب کوئی پہیلی بالم
روتے روتے کہیں ہوجاتا ہے کوئی بیدم
دم اب آنکھوں میں ہے دیدار دکھاؤ آکر
منتیں مانیں گئی ہیں یہ ہوا خواہوں میں
اثر اللہ عنایت کرے ان آہوں میں
جس گلی کوچے میں گذرو یہی چرچا سن لو
ایک عالم ہے خریدار مرے یوسف کا
لکھنو بھر ہے طلبگار مرے یوسف کا
میں ہی مرتا نہیں کچھ اس بت لاثانی پر
جوگنیں آپ کی اک جوگ لیے بیٹھی ہیں
سر بصحرا ہوں یہی عزم کیے بیٹھی ہیں
دو کسی روز کسی جا جو بہم ہوتے ہیں
منہ لپیٹے ہوے دن رات پڑے رہتی ہیں
ضبط غم کرتے ہیں کچھ منہ سے نہیں کہتی ہیں
واقعی درد جدائی بھی بلائی بد ہے
ٹھیر ای دیدۂ گریاں کہ شگون بد ہے
کیا کریں چاک گریباں کہ شگون بد ہے
وہ دم اللہ زمانے میں سلامت رکھے

ای میری جرم نہ بجرم و خطا میں صدقے
سلطنت کا وہی سامان ہو پھر فوج وہی
جس سے رخ نے آ مصیبت یہ نئی ڈالی ہے
قصر و گلزار کی بربادی و پامالی ہے
کچھ عجب رنگ کا آکر وہ مرقع دیکھا
ساری عالم کا عجب ہوتا ہے اس دم عالم
کوئی کہتا ہے نثار ای میرے جان عالم
اپنا اجڑا ہوا پھر شہر بساؤ آکر
چلے باندھے ہیں پریزادوں نے درگاہوں میں
ڈھونڈھتے پھرتے ہیں جلجا کی تمہیں راہوں میں
جسکا دکھ پوچھو یہی اوسکی تمنا سنلو
رات دن گرم ہے بازار مرے یوسف کا
ہے ہر اک طالب دیدار مرے یوسف کا
جان عالم کی نکلتی ہے مری جانی پر
سر پہ کھیلے ہوئے ہیں جان دیے بیٹھی ہیں
چاک دل سوزن مژگاں سی سیے بیٹھی ہیں
کیسا آپس میں گلے ملتے ہیں اور روتی ہیں
شدتیں درد جدائی کی بہت سہتی ہیں
دونوں آنکھیں صفت بحر رواں بہتی ہیں
اسمیں ایذائی غم و رنج و الم بیحد ہے
دیکھ چپ رہ دل نالاں کہ شگون بد ہے
بال کیونکر ہوں پریشاں کہ شگون بد ہے
قائم اس نام کو تا روز قیامت رکھے

جلد اللہ بدیسی کو ہمارے لائے
پھر ہمیں چاند سی صورت وہ کہیں دکہلائے

چین اُسوقت کچھ اپنا دلِ نالاں پائے
یہ مصیبت غمِ فرقت کی کہیں کٹ جائے

زیب پہلو جو ہمارے وہ گلِ رعنا ہو
گرم آغوشِ تمنا ہو جگر ٹھنڈا ہو

یاد آتا ہے وہ اے یار اکڑ کر چلنا
بانکپن سے وہ دمِ رفتار اکڑ کر چلنا

شیر کی طرح وہ ہر بار اکڑ کر چلنا
لیکے وہ ہاتھ میں تلوار اکڑ کر چلنا

بانکی ٹوپی کی ادا یاد جب آجاتی ہے
ایک برچھی سی کلیجے پہ لگا جاتی ہے

اتنے میں پڑ گئی اک دہوم مبارک ہووے
شاد ہوں جو کہ ہیں مغموم مبارک ہووے

یاوری پر ہوئی مقسوم مبارک ہووے
وصل اونھیں جو کہ ہیں محروم مبارک ہووے

یوسفِ مصرِ اودہ قیدِ محن سے نکلا
آفتابِ فلکِ ہند گہن سے نکلا

منتیں لوگ بڑہائیں کہ مراد آج آئی
حق نے عشاق کی تاثیرِ دعا دکہلائی

تازگی کشتِ تمنائی جہاں نے پائی
غمزدونکو یہ عجب خوشخبری سنوائی

سوئے درگاہ خدا سجدۂ شکرانہ کیا
کس مسرت سے ادا سجدۂ شکرانہ کیا

کہیں صحنک کہیں کونڈی ہوئی مشتاقونمیں
گلگلے جاکے بہرے مسجدونکے طاقوں میں

عید صلت ہوئی غمخوار یک مشتاقوں میں
مجلسیں سیکڑوں محتاجوں نے کیں فاقونمیں

دودنے دینی کی ہوئی رسم ہوا خواہونمیں
سیکڑوں حاضریاں چڑہ گئیں درگاہونمیں

کوئی یہ مژدۂ جاں بخش جو ہم تک لایا
اوسنے اعجاز مسیحا کیطرح دکہلایا

دم اوسیدم تن مردہ میں ہمارے آیا
دلِ بیتاب نے ہمکو یہ قلق سمجھایا

رخ تم اب اپنا سوئے قبلۂ حاجات کرو
یہ دعا دل سے پئے خسروِ خوشذات کرو

کر الٰہی پئے توقیر امام معصوم
بہر پئے آلِ شہِ شہدائے مظلوم

اور از بہر جگر سوزئ طفلِ معصوم
از پئے عصمت و اعزاز جنابِ کلثوم

تو مرے شاہ کو سلطانِ اودہ پھر کردے
دُرِ مقصود سے دامانِ تمنا بھر دے

فقط

نیشنل کانگرس کا اکیسواں اجلاس

بمقام بنارس ۲۷-۲۸-۲۹-۳۰ کو بخوبی تمام منعقد ہوا یعنی اس سال کثرت کار کی وجہ سے ۳۰ دسمبر کا نصف دن اور کانگرس کے [illegible]

کانگرس کی کامیابی بمبئی کانگرس کی غیر معمولی کامیابی کے بعد اسکے مقابلے میں لوگوں کو بنارس کانگرس کے کم شاندار نظر آنے کا اندیشہ تھا اور بیجا نہ تھا اسلئے کہ اول تو اہل بنارس کے لئے اتنے بڑے جلسے کے سرانجام انتظام کا یہ پہلا ہی موقع تھا دوسرے یوں کہ پولٹیکل معاملات میں اس صوبے کے باشندوں کی کم توجہی سے مالی امداد کے ناکافی ہونیکا بھی خیال تھا لیکن ان سب دقتوں اور خطروں کے باوجود کانگرس کی کامیابی نے ثابت کر دیا کہ تائید ایزدی اس پاک و اہم تحریک کے شامل حال ہے۔

کانگرس کا انتظام آنریبل منشی مادھولال اور استقبالیہ کمیٹی کے بنارسی ممبروں نے ڈیلیگیٹوں کے خورونوش و قیام کا اچھا بندوبست کیا تھا۔ اور تمام اشیاء ضروری کا ذخیرہ کافی سے زیادہ موجود تھا۔ اور ایک حد تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی بڑی برات کا انتظام کیا گیا ہے چنانچہ ابتدا میں برات کے دستور کے مطابق بعض لوگوں کو والنٹیروں کی ناتجربہ کاری سے باوجود ہونیکے کچھ چیزیں نہیں بھی ملیں لیکن یہ شکایت بہت جلد رفع ہو گئی۔ البتہ ایک شکایت باقی رہی وہ یہ کہ مختلف صوبوں کے ڈیلیگیٹوں میں ملاقات باہم کی کوئی سبیل نہ نکالی گئی اور کانگرس کے اجلاسوں کی شرکت یا نمائش کی سرسری سیر کے سوا لوگوں کو پرائیوٹ ملاقات ذاتی واقفیت اور تبادلہ خیالات کا بہت کم موقع ملا۔ امید ہے کہ آیندہ اس امر کا ضرور لحاظ رکھا جائیگا۔

بنارس کانگرس کے فیصلہ جات [illegible] لوگوں کی تقریروں اور چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ لارڈ کرزن کی گذشتہ جابری حکومت نے اہل ہند کے دلوں پر قومی اثر ڈالا ہے اور ہر شخص کے دل کو بلند ہمتی اور استقلال سے لبریز کر دینے کے علاوہ پوشیدہ طور پر میدان عمل میں درآنے کی ہمت بھی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ انڈسٹریل کانفرنس کا انعقاد اور نمائش کانگرس میں تقریباً کل سلسلہ پیشی شاہانہ موجودگی اس خیال کی بزبان حال بڑے زور سے تائید کرتی نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں کہ کتنے پیر لوگ اس نظارہ روح افزا سے متاثر ہوکر پست خیال سے بلند خیال ہو گئے ہونگے اور کتنے افسردہ دل جوش اور امید کے جذبوں سے مالامال ہو کر آزادی و خدمت ملک کو اپنا ایمان سمجھنے لگے ہونگے۔

حب وطن اور ولولہ محبت کا ایک عجیب عالم کانگرس پنڈال میں نمایاں ہوتا ہے اور اس عالم سرور کی آب و ہوا میں قلوب احرار کو جو لذت منٹوں میں حاصل ہوتی ہے وہ دوسرے طور پر برسوں بلکہ عمروں میں بھی نہیں فراہم ہو سکتی۔

عہد یک عمر فراغت سے بھی بہتر گذرا ۔۔۔ وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گذرا

دوسری قابل مسرت اور لائق لحاظ خصوصیت مسلمانوں اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی معمول سے زیادہ شرکت تھی جس میں انشاء اللہ تعالیٰ روز افزوں ترقی ہوتی رہیگی کیونکہ ایک بار کانگرس میں شریک ہو کر سبجکٹس کمیٹی کی دلچسپ [illegible] تقریروں کو سنکر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر کیونکر کوئی شخص کانگرس سے علیحدہ رہنا گوارا کر سکتا ہے۔

کانگرس کی اسپیچیں مسٹر گوکھلے کا اڈریس تمام ضروری معاملات پر حاوی اور اپنی جامعیت پختگی اور سادگی کے لحاظ سے لاجواب تھا۔ دوسری اسپیچوں میں مسٹر کھاپردے کی ظرافت مسٹر بنرجی کی فصاحت لالہ لاجپت رائے کی آزاد خیالی و بیباکی۔ مسٹر پرانجپا آئر کی معلومات۔ مسٹر دت کی متانت۔ مسٹر تلک کی صاف گوئی و صداقت مسٹر غزنوی کا جوش۔ مسٹر کرشنا سوامی آئر کی ذہانت، پنڈت مدن موہن مالوی کی روانی بیان اور ملا عبدالقیوم صاحب کے زور تقریر و بلاغت کو حاضرین نے خاص طور پر پسند کیا۔

کانگرس کا آخری سین نہایت پر اثر اور درد انگیز تھا جبکہ مسٹر گوکھلے کی آخری اسپیچ اور کانگرس کے ختم ہونے کے افسوس کی موجودگی میں مسٹر گھوشال کی صاحبزادی یعنی مسز دت چودھری نے "بندے ماترم"

کا بنگالی ترانہ ہارمونیم پر السیی پر اثر آواز میں گا کر سنایا کہ کانگرس کے حاضرین میں سے اکثر آبدیدہ نظر آنے لگے اور کلکتے میں دوبارہ ملنے کی امید پر با دیدہ پرنم کانگرس سے رخصت ہوئے۔

کانگرس کی بے اصول مخالفت افسوس ہے ان بعض مسلمانوں پر جو کانگرس کی بے اصول مخالفت کرتے ہیں۔ بے اصول اسلئے کہ محض افواہی یا اپنی ایجاد کردہ واقعات پر اعتراض کرکے اپنی فرومائگی اور ناواقفیت کے سوا اور کچھ نہیں ثابت کرسکتے۔ ایک متعصب اخبار نے سودیشی تحریک کا رزولیوشن پاس کرنیکے لئے کانگرس کو گالیاں دیں اور ایک اس سے بھی زیادہ ناواقف اخبار نے سرحدی صوبہ پنجاب کی علحدگی پر افسوس کے رزولیوشن پر مضحکہ اڑایا حالانکہ اُنہیں سے ایک بھی تجویز بنارس کانگرس میں پیش نہیں ہوئی تھی۔ نیز اول الذکر اخبار نے مسلمان شرکار کانگرس کو محض تماشائی قرار دیا اسکا جواب ہم اسوقت کچھ نہ دینگے۔ خدا نے چاہا تو بہت جلد ان اخبار نویسوں کو اپنی غلط بیانی پر شرمندہ ہونا پڑیگا۔ خیر حامیان کانگرس کو اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے اور ان بہی معترضوں شامدیوں کی آوارہ بیانی کی پروا نکرکے انہیں تعصب کی آگ میں جلنے دینا چاہئے۔ ان ناقابل اخبار نویسوں سے گذر کر افسوس ہو کہ ہمکو ان چند فہمیدہ اور متین معترضین کانگرس کی منطق بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی جنکا دعویٰ اس کمزور دلیل پر قائم ہے کہ چونکہ بعض معاملات میں ہنود اور اہل اسلام میں اختلاف ہے اسلئے ان دونوں گروہ نکو ہر معاملے میں اختلاف رکھنا چاہئے۔ ہم ان سادہ دل لوگوں سے دریافت کرتے ہیں کہ جب از روئے تجربہ دو شخصوں میں اتحاد خیالات و اغراض بدرجہ اتم نہیں ہوتا تو دو قوموں میں کیونکر ممکن ہے۔ اور جب یہ حال ہو تو کیا اصول یا پالیٹکس کا اقتضا یہ نہیں ہے کہ جن معاملات میں دونوں گروہوں کے اغراض متحد ہوں کم از کم انکے متعلق دونوں متفق ہو کر ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اور کیا یہ غایت درجے کا اخلاقی اور ملکی جرم نہیں ہے کہ چند اختلافی مسائل کو بہانہ نفاق قرار دیکر ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانے کی اہم اور ضروری تجویز میں رخنہ اندازی کرکے ہندوستانکے دشمنوں کو قوت پہونچائیں درانحالیکہ اس طاقت سے انہیں من حیث القوم کسی خاص فائدے کی خود بھی امید نہو۔

رفع اختلاف کی ضرورت ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جزوی اختلاف کی بنا پر کلی اختلاف کی صلاح کسیطرح دانشمندانہ نہیں کہی جاسکتی تاہم حتی الامکان غیر ضروری جزوی اختلافات کے مٹانے کی بھی کوشش ضرور کرنا چاہئے۔ یعنی اسطور پر کہ مثلاً لالہ لاجپت رائے صاحب اپنے مذہب آریا اخباروں کو مذہبی جنگ سے روکیں اور نرمی کا سبق دیں اور خلیفہ منشی محبوب عالم صاحب مسلمان اخبار نویسوں کو سمجھائیں کہ محض ہنود سے اختلاف کرنیکی غرض سے وہ سودیشی تحریک کی سی مفید اور چلتی ہوئی تحریک میں بعذر ہائے لنگ و نامعقول رکاوٹ پیدا کرنے سے باز آئیں۔ اگر ہندو اخبار کم از کم "ہندوستانی" اخبار کی پالیسی اختیار کریں اور مسلمان اخبار "پیسہ اخبار" کو نمونہ قرار دے لیں تو وہ اپنی قومی حقوق کی حمایت پر قائم رہکر بھی دوسری قوموں کی دلآزاری سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہو کہ چند روشن خیال مسلمان جو اب تک کانگرس میں شریک نہیں ہیں مثلاً حاجی موسیٰ خانصاحب رئیس تاولی اور شیخ عبداللہ صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی مستند پیشوایان کانگرس مثلاً سر فیروز شاہ مہتا مسٹر گوکھلے اور مسٹر تلک سے پرائیوٹ طور پر ملیں تو ہم کو قطعی یقین ہو کہ انکے دلوں سے کانگرس کی جانب سے تمام شکوک ان فرشتہ خصال بزرگوں کی صاف دلی اور بے تعصبی کے اثر سے خود بخود محو ہوجائیں اور مسلمان بلا خطر کانگرس میں شریک ہو نگیں۔

ایک اور تجویز امتحانی اگر معترضین کانگرس صادق القول اور راست بیان ہیں تو انکے لئے یہ طریق مناسب ہے کہ اختیار موجودہ اختلافی مسائل نیز معاملات مخصوص بہ اسلام کیلئے محمدن پولیٹکل کانفرنس قائم کریں اور متفق علیہ مسائل میں کانگرس کا ساتھ دیں۔ لیکن اگر یہ بات بھی منظور نہیں تو ہم بلاخوف تردید کہتے ہیں کہ مخالفین کانگرس اسکو نقصان پہونچانیکے علاوہ اپنے نادان ہمقوموں کے فوائد کو بھی بطور صریح پامال کر رہے ہیں۔ خدا انہیں راہ راست پر لائے۔ آمین۔

خاتمہ سالگذشتہ کیطرح بنارس کانگرس کی مفصل رپورٹ بھی آئیندہ نذر ناظرین اردوئے معلّٰی ہوگی اسموقع پر ہم تمام رزولیوشنوں کا صحیح اور بامحاورہ ترجمہ مع اسمائے مقررین درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

رزولیوشن ۱ — حضور ولیعہد بہادر کا خیر مقدم

یہ کانگرس بہ حیثیت قائمقام تمام اقوام گروہ اور فرقہ ہای رعایای ہند کے ہز رائل ہائنس شاہزادہ اور شاہزادی آف ویلز کے ورود ہندپر اپنا نیاز مندانہ اور خیر خواہانہ خیر مقدم عرض کرتی ہے۔ ہز رائل ہائنس نے باشندگان ہند کی نسبت جس لطف آمیز خوش خیالی کا اظہار فرمایا ہے۔ کانگرس نے اسکا گہرا اثر قبول کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ جو ذاتی معلومات اس سفر میں حاصل ہوئی ہیں انسے اس مربیانہ توجہ میں جو باشندگان ہند کیطرف مبذول ہے اور ترقی ہوگی کانگرس بہت جوش کیساتھ یہ امید رکھتی ہے کہ ہز رائل ہائنس از راہ مرحمت اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہند کے جناب میں اس کانگرس کی دلی التجا پیش کرینگے کہ جو اصول حکمرانی ملکہ مرحومہ کے اعلان میں قائم کئے گئے ہیں وہ اس ملک کی گورنمنٹ میں داخل کئے جائیں۔

صاحب پریسیڈنٹ اس رزولیوشن کو بذریعہ تار ہز رائل ہائنس کے حضور میں ارسال کریں۔

رزولیوشن ۲ — لیجسلیٹو کونسل....

اس کانگرس کی رای میں وہ وقت آگیا ہے کہ سپریم اور پراونشل کونسلوں میں اصلاح کیجائے تاکہ وہ ملک کا بہتر انتظام ہو سکے اور غیر سرکاری ممبروں کو معاملات ملکی میں واقعی اور حقیقی مداخلت حاصل ہو۔ کانگرس سفارش کرتی ہے کہ غیر سرکاری اور منتخب ممبروں کی تعداد بڑہا دی جاوے اور انہیں اختیار دیا جاوے کہ ان مسائل پر جو انکے روبرو پیش ہوں کونسل کو اظہار رای پر مجبور کر سکیں حاکم اعلیٰ مجاز ہو کہ کونسل کے فیصلہ کو مسترد کر دے۔ مجوزہ آنریبل مسٹر جے چودہری (کلکتہ) موید۔ مسٹر گوبند رگہوا آیر (مدراس) مسٹر آر۔ پی۔ کرندیکار (ستارہ)

رزولیوشن ۳ — آبکاری کی پالیسی..

(الف) یہ کانگرس گورنمنٹ ہند کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اُسنے مختلف صوبوں کے انتظام آبکاری کی تحقیقات کیلئے ایک کمیٹی مقرر کی ہے۔ مگر ساتھ ہی کانگرس کو افسوس ہے۔ کہ اس کمیٹی کے کل ارکین سرکاری ہیں، اسلئے عوام کا پورا اعتبار اسپر نہیں ہوسکتا۔

(ب) یہ کانگرس سابق کانگرس سے متفق الرای ہو کر اپنا پختہ یقین ظاہر کرتی ہے کہ آبکاری کی انتظام قابل اطمینان اصلاح کے مقدم شرائط یہ ہیں کہ مقامی انتظام لوکل ہو اور شراب کی موجودہ دکانوں میں بہت کمی کیجاوے

(ج) یہ کانگرس گورنمنٹ ہند سے باادب درخواست کرتی ہے کہ سال گذشتہ جو یادداشت سر فریڈرک للی نے انتظام آبکاری کے متعلق پیش کی تہی اُسکے خاص تجاویز پر فوری کارروائی کرنا بہت پسندیدہ ہوگا۔

(د) یہ کانگرس اس امر پر اعتراض کرتی ہے کہ گورنمنٹ ہند نے اپنی عاملانہ اختیارات سے بنگال کونسل کے مسودہ

قانون آبکاری کو جو شراب خواری کو کم کرنیکے لئے مفید اور ترقی پذیر قانون تھا معطل کر دیا۔ اور اسطرح اسنے اس کانسٹیٹیوشنل طریق عمل کو توڑ دیا جو پراونشل کونسل میں پڑتا جاتا ہے۔

مجوز۔ سر بھالچندر کرشن (بمبئی) موید۔ مسٹر جی۔ ای نٹیسن (مدراس) مسٹر ایس۔ ایس۔ بھاٹیا (پنجاب)

رزولیوشن ۴ ہاوس آف کامنس اور کونسلوں میں ہندوستانی

اس کانگرس کی رای میں وقت آگیا ہے کہ باشندگان ہند کو ملک کے انتظام اور نگرانی میں زیادہ حصہ دیا جائے۔ اور یہ غرض اسطرح حاصل ہوسکتی ہے کہ

الف ۔ ہندوستان کے ہر صوبے کو اختیار دیا جاے کہ برٹش ہاوس آف کامنس میں کم از کم دو ممبر بھیجیں۔

(ب) کم از کم دو ہندوستانی جنکی لیاقت اور تجربہ مسلم ہو سکرٹری آف اسٹیٹ کی کونسل میں ممبر مقرر کئے جائیں

(ج) گورنر جنرل کی اکزیکیٹو کونسل میں دو ہندوستانی ممبر مقرر ہوں اور اسیطرح گورنران مدراس اور بمبئی کی کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی مقرر ہو۔ مجوز۔ مسٹر جی۔ سبرمنیا ایر (مدراس) موید۔ مسٹر جہانگیر پیٹیٹ (بمبئی) مسٹر ایس۔ آر۔ داس (کلکتہ) مسٹر فضل الحسن (علیگڈہ)

رزولیوشن ۵ پبلک سروس میں ہندستانی

(الف) اس کانگرس کی رای میں گورنمنٹ کے رزولیوشن مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۴ء میں، جو اصول ہندوستانیونکو ملازمت گورنمنٹ میں اعلی عہدے دئے جانیکی پالیسی کی نسبت قائم کئے گئے ہیں وہ قانون پارلیمنٹ ۱۸۳۳ء اور اعلان ملکہ مرحومہ ۱۸۵۸ء کے خلاف ہیں یہ کانگرس مؤدب مگر بزور اعتراض اس کوشش پر کرتی ہے جو بادشاہ اور پارلیمنٹ کے وعدونکے زائل کر دینے کے متعلق کی گئی ہے۔ اور جس سے اس انتظام کے مخالفت ہوتی ہے جو پبلک سروس کمیشن کے غور و فکر کے بعد گورنمنٹ نے قائم کیا تھا۔

(ب) اس کانگرس کی رای میں ملک کا موجودہ مالی اور انتظامی خرابیونکا صحیح علاج یہ ہے کہ ملک کے اعلی خدمات پر ہندوستانی مقرر کئے جائیں۔ یہ کانگرس پہلی کانگرسونسے اتفاق کرتی ہے کہ ہاوس آف کامنس کے رزولیوشن جون ۱۸۹۳ء پر عملدرآمد شروع کیا جاے جسکے رو سے سول سروس کا امتحان انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں ہونا قرار پایا ہے۔ مگر اس کانگرس کو پختہ یقین ہے کہ اس مسئلے کا قابل اطمینان حل صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ انڈین سول سروس از سر نو مرتب کیجاے۔ اور اس اثناء میں جوڈیشل اختیارات ان لوگوں کو دئے جائیں جنہوں

نے قانونی تعلیم حاصل کی ہو۔

(ج) یہ کانگرس گزشتہ کانگرس کی راے سے اتفاق کرتی اور افسوس کرتی ہے کہ پراونشل سروس کے لیے امتحان مقابلہ توڑ دیا گیا۔ گزشتہ تجربات نے بتا دیا ہے کہ نامزدگی کا طریقہ ملک کی خاص حالات کے اعتبار سے سرکاری سرپرستی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ناقابل لوگوں کی ملازمت میں داخل ہو جانیکے سبب سے انتظام کی خوبی غارت ہو جاتی ہے اور اسطرح ہندوستانیوں کی قابلیت عہدہائے جلیلہ پر الزام لگایا جاتا ہے۔ اسلئے کانگرس باادب گورنمنٹ ہند سے درخواست کرتی ہے کہ پراونشل سروس کے لئے امتحان مقابلہ پھر جاری کیا جائے۔ مجوز۔ مسٹر این۔ ایم۔ سمرتھ (بمبی) موید۔ پنڈت بشن نراین ور (لکھنؤ) مسٹر جے۔ سمین (الہ آباد)

رزولیوشن ۶ — مالیہ ہند

یہ کانگرس گورنمنٹ ہند کی اس کارروائی کی قدر کرتی ہے کہ اس نے گزشتہ مارچ میں بجٹ کا ایک حصہ ان امور پر صرف کیا جن کی کانگرس نے سفارش کی تھی۔ مگر ساتھ ہی کانگرس کی یہ راے ہے کہ جو مالی سبکدوشی اداکنندگان ٹیکس کو دیگئی ہے وہ بہت ہی ناکافی ہے اور کانگرس کو افسوس ہے کہ گزشتہ بجٹ سے فائدہ اٹھا کر فوجی اخراجات بہت بڑھا دئے گئے ہیں بعض محکموں میں یورپین افسروں کی تنخواہوں میں ترقی کی گئی ہے اور بہت سے نئے عہدے انکے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ کانگرس باصرار یہ درخواست کرتی ہے کہ آیندہ جو بجٹ ہو اول وہ ٹیکسوں کے کم کرنے میں صرف کیا جائے اور بعد ازاں ایسے کاموں میں صرف ہو جس سے بلاواسطہ باشندگان ہند کو فائدہ پہونچے مثلاً سائنٹفک صنعتی اور زرعی تعلیمگاہوں کا قائم کیا جانا طبی امداد میں آسانی پیدا کرنا۔ منوسپل اور لوکل بورڈوں کو مدد دینا کہ اشد ضروری انتظامات حفظان صحت کی اصلاح اور ترقی وسائل آمد و رفت وغیرہ میں صرف کرسکیں۔ مجوز۔ مسٹر جی سبرامنیا آیر (مدراس) موید۔ راؤ بہادر آر۔ ان۔ مدہولکر (امراوتی) بابو تہراداس (سندہ)

رزولیوشن ۷ — ہندوستانکے فوجی اخراجات

(الف) یہ کانگرس بہت وثوق سے اپنے اعتراض کا اعادہ کرتی ہے کہ فوجی اخراجات کی مسلسل ترقی، غیر ضروری، غیر منصفانہ اور باشندگان ہند کی حد برداشت سے باہر ہے۔

(ب) یہ کانگرس صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ اس ملک کی فوجی اخراجات صرف اسی ملک کے

فوجی ضروریات اور اغراض پر لحاظ کرکے قرار نہیں دئیے جاتے بلکہ مشرق میں برٹش تفوق اور برٹش پالیسی کی خیالات ہی مد نظر ہوتے ہیں اسلئے انصاف یہ ہے کہ ایک مناسب حصہ اس خرچ کا خزانہ انگلستان اور کل سلطنت کو برداشت کرنا چاہیئے نہ یہ کہ سارا خرچ سلطنت کے ایک ہی حصے پر ڈالدیا جائے جو سب سے زیادہ غریب ہے اور سب سے زیادہ اس بوجہ کی برداشت کرنیکے ناقابل ہے۔

(ج) کانگرس یہ ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے کہ بوجہ صلحنامہ جاپان و روس اور عہدنامہ انگلستان و جاپان حالات مشرق کی صورت بدلجانیکے باعث پندرہ لاکھ پونڈ کا زائد خرچ جو فوجی تجدید کیلئے منظور کیا گیا ہے وہ اس غرض میں نہ خرچ کیا جائے۔ کیونکہ شعبہائے تعلیم کی وسعت اور رعایا سے بار ٹیکس کے کم کرنیکی اشد ضرورت ہے۔ مجوز۔ مسٹر ایچ ای۔ واڈیا (بمبئی) موید۔ مسٹر وی۔ رپرونمبیر (مدراس) مسٹر ایل۔ این راناڈے (بمبئی) بابو کرشن بلدیو لعل

رزولیوشن ۵
ہندوستانی انگریزی نوآبادیوں میں

(الف) یہ کانگرس اس مسودہ قانون پر اپنا اطمینان ظاہر کرتی ہے جو بغرض ترمیم قانون تارکان وطن و دافع شکایات باشندگان ہندآسٹریلیا کی ہاوس آف کامنس میں پیش ہوا ہے۔ مگر ساتھ ہی کانگرس مکرر افسوس ظاہر کرتی ہے کہ ہز مجسٹی کی نوآبادیوں میں ہندوستانیوں کو رعایائے انگریزی کے معمولی حقوق بھی نہیں ملتے اور ذلت و تکلیف کی حالت قائم ہے۔ یہ کانگرس خاص کر ٹرانسوال اور آرنج ریور کالونی کے ان قواعد پر جو بوئیروں کے وقت میں بھی نہ تھے اور اب ہندوستانیوں پر عاید کئے گئے ہیں، اعتراض کرتی ہے۔ باوجودیکہ ہز مجسٹی کے وزراء نے گزشتہ جنگ کے اسباب میں سے ایک سبب یہی بیان کیا تھا کہ ہندوستانیوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا جاتا ہے۔

(ب) یہ ظاہر ہے کہ نوآبادیوں کی ترقی میں ہندوستانیوں نے کسقدر حصہ لیا ہے۔ انکے ہاتھوں سے ہندوستان اور کالونی دونوں کو کسقدر فائدہ پہنچے ہیں، انکی وفاداری اور امن و مشقت پسند عادات کسقدر مسلم ہیں، گزشتہ جنگ میں انہوں نے کیسی کارآمد اور جانباز خدمات انجام دئے اور سب سے بڑھکر حکومت کے اس اصول کے لحاظ سے کہ برٹش سلطنت کے ہر مقام پر تمام رعایائے ملک معظم کے ساتھ یکساں برتاؤ ہوگا، یہ کانگرس باادب اور پرزور طور پر گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ انگلستان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ نوآبادیوں کی گورنمنٹ سے ہندوستانیوں کو حقوق دئیے جانے پر اصرار کریں اور اگر ضرورت ہو تو وہاں مزدوروں کا بھیجنا بند کردیں اور نیز دوسرے طریقے بدلہ لینے کی اختیار کریں۔ مجوز۔ مسٹر وی۔ مدنجیت (اجمیر) موید۔ آنریبل مسٹر بی۔ این۔ سرما (مدراس) ڈاکٹر بی۔ ایس۔ مونجی (ناگپور)

رزولیوشن ۹ — عدالتہائی انصاف کا انتظام

الف - یہ کانگرس اپنی رای کا اعادہ کرتی ہے کہ [illegible] اختیارات کو جوڈیشل اختیارات سے پوری طور پر جدا کئے کی فوری ضرورت ہے۔

(ب) یہ کانگرس گذشتہ کانگرس سے متفق ہو کر یہ درخواست کرتی ہے کہ تمام ہندوستانیوں [illegible] جوڈیشل عہدوں کے لئے قانون پیشہ لوگ منتخب کئے جائیں کیونکہ موجودہ طریقہ یعنی سویلین کو بلا خاص قانونی تعلیم کے اعلی جوڈیشل عہدوں پر مقرر کرنا مقدمات میں غیر قابل اطمینان ثابت ہوتا ہے۔ مجوز - مسٹر آر - سی [illegible]

مؤید - آنریبل مسٹر چمن لال سیتلواڈ (بمبئی) ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی (الہ آباد) بابو [illegible]

رزولیوشن ۱۰ — اصلاح پولیس

یہ کانگرس اطمینان کے ساتھ دیکھتی ہے کہ بعض مفید اصلاحوں کی سفارش پولیس کمیشن نے کی ہے مگر پولیس سروس کی لیاقت اور دیانتداری کو حقیقتاً ترقی دینے کے لئے مناسب کارروائی نہیں کی گئی ہے - یہ کانگرس یقین رکھتی ہے کہ

(۱) پولیس سروس کے اعلی عہدوں کے امتحانات مقابلہ تمام برٹش رعایا کے لئے یکساں کھولدئے جائیں اور صرف انگریزوں کے لئے محفوظ نہ رکھے جائیں - نیز یہ کہ امتحانات ہندوستان اور انگلستان دونوں ملکوں میں [illegible]

(۲) پولیس کی حسن کارگزاری بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی بکثرت اعلی عہدوں پر مقرر کئے جائیں - (۳) پراونشل سروس کا داخلہ بذریعہ امتحان مقابلہ کے ہو -

(۴) حاکم ضلع جو پولیس کا حاکم اعلی ہوتا ہے اُس سے جوڈیشل کام نکال لیا جاوے اور ضلع کی مجسٹریٹی پر اسکا اختیار [illegible]

مجوز - مسٹر ایس - سنہا - (الہ آباد) مؤید - مسٹر ونکٹاراو (مدراس) بابو ایشور سرن (گورکھپور) مسٹر [illegible] نیدو - (مدراس)

رزولیوشن ۱۱ — تقسیم بنگال

یہ کانگرس اس امر پر اعتراض کرتی ہے کہ تمام صوبہ کے ایسی سخت مخالفت کے باوجود تقسیم بنگالہ عمل میں لائی گئی - بدیں خیال کہ تمام بنگالی قوم میں انکے صوبے کے ٹکڑے کئے جانیکے سبب سے سخت ناراضی پھیلی ہوئی ہے اور وہ اس تقسیم کو کبھی ماننے سے گریز کررہے ہیں - یہ کانگرس گورنمنٹ ہند اور سکرٹری آف اسٹیٹ سے اپیل کرتی ہے کہ وہ موجودہ انتظام کو بدل دیں یا اسمیں کچھ ایسی ترمیم کریں کہ عام رای کو طمانیت حاصل ہو اور جو اضطراب اور بے چینی ہوئی ہے وہ کم ہو -

یہ کانگرس سفارش کرتی ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جاوے کہ جس سے انتظامی خوبی بھی قائم رہے اور تمام بنگالی قوم ایک ہی حکومت کے تحت میں رہے -

مجوز - بابو سریندر وناتھ بنرجی (کلکتہ) موید - مسٹر ای - چودہری - رای بہادر سی - وی واڈیا (بمبئی) مسٹر - ایس سنہا (الہ آباد) منشی ہدایت بخش (ڈہاکہ) مسٹر ابو القاسم (بردوان) راؤ بہادر - آر - ان مدہولکر (امراوتی)

رزولیوشن ۱۲ - بنگال میں جابرانہ کارروائی

یہ کانگرس اپنا سچا اور پرزور اعتراض حکام کی ان جابرانہ کارروائیوں پر پیش کرتی ہی جو انہوں نے بنگال میں اختیار کی ہی - باشندگان بنگال کی پاس جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو انہوں نے غیر ملکی مال کے خلاف ہڑتال کی کیونکہ یہی ایک باضابطہ اور با اثر ذریعہ انکے پاس باقی رہگیا تہا جس سے وہ برٹش پبلک کے خیالات گورنمنٹ کی تقسیم بنگالہ کی مسمم ارادہ کیطرف رجوع کر سکتی تہی جو اسنے باشندوں کی عالمگیر استدعا کے خلاف اختیار کیا تہا -"

مجوز - آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی (الہ آباد) موید - مسٹر واڈیا - آنریبل مسٹر واچی اپاجی کہرے (بمبئی) مسٹر کرشنا سوامی آیر (مدراس) مسٹر ایم - ایچ - غزنوی (میمن سنگہ) - مسٹر جی - اس - کہاپرڈے -

رزولیوشن ۱۳ - قرنطینہ

اس کانگرس کی رای ہے کہ جو پانچ روز کا قرنطینہ حاجیوں پر بمبئی میں لگایا جاتا ہی وہ بلا وجہ کی زحمت ہی اور علاوہ وقت کے بے اطمینانی پیدا کرنیکا باعث ہی قانون بین الاقوام کی روسے دس روز کا قرنطینہ کامران میں ہوتا ہی - اسلئے اس کانگرس کی رای ہی کہ جو قرنطینہ بمبئی میں ہوتا ہی وہ بالکل موقوف کیا جاے - مجوز - آنریبل مسٹر کاہن داس گوکل داس پارخ (بمبئی) موید - مسٹر علی محمد بہیم جی - (بمبئی) ملا عبد القیوم (حیدر آباد دکن) مسٹر اس - کہرے (ناسک)

رزولیوشن ۱۴ - بعض صوبوں کی بابت

یہ کانگرس گزشتہ کانگرس سے متفق الرای ہو کر درخواست کرتی ہی کہ (۱) پنجاب اپنی صوبہ بنایا جاوی - (۲) ہندوستانی کونسلوں کے ایکٹ سنہ ۱۸۹۲ع کے رو - پنجاب کے قانونی کونسل کی توسیع اور اصلاح کیجای - (۳) پنجاب میں ہائیکورٹ قائم ہو - (۴) برہما کے قوانین گورنمنٹ ہند کے قانونی کونسل سے پاس ہوا کریں - (۵) صوبجات وسطی کے باشندوں کو اختیار دیا جای کہ اپنا قائمقام کونسل ہند کے لئے منتخب کریں نہ یہ کہ اسے گورنمنٹ یا گورنر نامزد مقرر کرے - (۶) گورنمنٹ ہند کی محکمہ خارجہ کا رزولیوشن مورخہ ۲۵ جون سنہ ۱۸۹۱ع منسوخ کیا جائے جسکے روسے ان مقامات اخباروں کی بلفیں

ہند کی گئی ہیں جو دیسی ریاستوں میں گورنمنٹ انگریزی کے زیر انتظام ہیں۔ از جانب صدر انجمن۔

رزولیوشن ۱۵ — ہندوستان اور جنرل الکشن

یہ کانگرس مسٹر دادا بھائی نوروجی کی نارتھ لمبتھ کیجانب سے امیدوار دی پارلیمینٹ کی بر تائید کرتی ہے۔ مجوز مسٹر کے۔ وینکٹا راؤ (بلاری) موید۔ جے۔ ان رای (کلکتہ)

رزولیوشن ۱۶ — ہندوستانی وکلای انگلستان کا شکریہ

یہ کانگرس آنریبل مسٹر جی کے گوکھلے سی۔ آئی۔ ای۔ اور لالہ لاجپت رای کی اس گرانقدر خدمت کی قدر کرتی ہے کہ انہوں نے وکالت ہند کے مشکل کام کو ایسی خوش اسلوبی کیساتھ انگلستان میں انجام دیا۔ مجوز۔ آنریبل مسٹر واچی اباجی کھرے (بمبی) موید۔ مسٹر کے نرائن راؤ (مدراس)

رزولیوشن ۱۷ — مسٹر گوکھلے کا تقرر بحیثیت ڈیلیگیٹ

چونکہ ضرورت ہے کہ کانگرس کی اہم مسائل کیطرف موجودہ وقت میں انگلستان کی ذمہ دار عہدہ داروں کی توجہ منعطف کرائی جای۔ اسلئے یہ کانگرس اپنی پریسیڈنٹ مسٹر گوپال کرشن گوکھلے سی آئی۔ ای کو مقرر کرتی ہے کہ ہندوستانی وکالت کا کام انجام دیں۔ مجوز۔ مسٹر آر۔ سی دت۔

رزولیوشن ۱۸ — کانگرس کی اسٹینڈنگ کمیٹی

کانگرس کی اغراض کو ترقی دینے اور اسکے رزولیوشنوں کو عملی صورتوں میں لانیکے لئے ضروری ہے کہ ایک اسٹینڈنگ کمیٹی کانگرس کی بنائی جاوے مفصلہ ذیل اصحاب ۱۹۰۶ء کیلئے اس کمیٹی کے ممبر مقرر کیے جاتے ہیں

(۱) آنریبل سر فیروز شاہ مہتا۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ای (بمبی) (۲) آنریبل مسٹر واچی اباجی کھرے (بمبی) (۳) پی سبرمنیا آیر اسکوائر (مدراس) (۴) آنریبل نواب سید محمد (مدراس) (۵) سریندرو ناتھ بنرجی اسکوائر (کلکتہ) (۶) اے چودھری اسکوائر (کلکتہ) (۷) مولوی ابوالقاسم (بردوان) (۸) لالہ لاجپت رای (لاہور) (۹) لالہ ہرکشن لال (لاہور) (۱۰) راؤ بہادر آر۔ ان۔ مدھولکر (امراوتی) (۱۱) بابو گنگا پرشاد ورما (لکھنو) (۱۲) آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی (الہ آباد) (۱۳) مسٹر ایس سنہا (الہ آباد) (۱۴) ڈی۔ ای واچا اسکوائر (۱۵) آنریبل مسٹر جی کے گوکھلے سی آئی۔ ای سکرٹری

رزولیوشن ۱۹ — سکرٹری کا تقرر

یہ کانگرس مسٹر ایلن ہیوم اسکوائر سی۔ بی کو جنرل سکرٹری اور مسٹر ڈی۔ ای واچا اسکوائر اور آنریبل مسٹر گوکھلے سی۔ آئی۔ ای کو جائنٹ سکرٹری سال آئندہ کے لئے مقرر کرتی ہے۔

رزولیوشن ۲۰ — برٹش کمیٹی کا شکریہ

یہ کانگرس سر ولیم ڈربرن اور دوسرے ممبران برٹش کمیٹی کا ان بیشبہا خدمات کیلئے جو وہ ہندوستان کے پولیٹکل ترقی کے لئے انجام دے رہی ہیں دلی شکریہ ادا کرتی ہے۔

رزولیوشن ۲۱ — آئندہ کانگرس

بائیسواں اجلاس انڈین نیشنل کانگرس کا بسن ۱۹۰۶ء کے کلکتہ میں ہوگا تعیین تاریخ بعد کو ہوگا۔ مجوز۔ رای جوتندرناتھ چودھری (کلکتہ)

رزولیوشن ۲۲ — شکریہ پریسیڈنٹ

مجوز۔ آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی (الہ آباد)

بیاض حسرت

لسانی شیرازی

امروز پریشاں ترازانم کہ تواں گفت — وردرد جدائی بچنانم کہ تواں گفت

مصحفی

آنکھوں میں اسکی ہمنے جو تصویر کھینچ لی — سرمے نے اسکی چشم کی شمشیر کھینچ لی
اس جذب کا بھی ہوں میں دوانا کہ یار نے — نظروں میں میرے اشک کی تاثیر کھینچ لی
ہندوستاں میں دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی — کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

نواب مصطفیٰ خاں حسرتی (شیفتہ در ریختہ)

باالباس گل لباس خویش راہمرنگ ساز — بارہ دیگر قبہائے ناز خود راتنگ ساز
من اگر بدنام عشقم غیر بدنام ہوس — گر بسودائی نیازی بنام و ننگ ساز
حسرتی راشیوہ صحو و نظیری اہل سکر — روستہا عاقل و دیوانہ رایکرنگ ساز

مصحفی

دیکھ اسکو اک آہ ہمنے کرلی — حسرت سے نگاہ ہمنے کرلی
جب اسنے چلائی تیغ ہمپر — ہاتھوں کی پناہ ہمنے کرلی
ضبط میں جبکہ مصحفی جان — شرم اسکی گواہ ہمنے کرلی

مرزا مہدی بیان

جلوہ بیجا زراں روشبنمی خوابیدہ است — درمیان غنچہ دگل شبنمے خوابیدہ است

شکر اللہ خاں خاکسار

تلافی ہمہ بیرحمی ہائے شما — بیک نگاہ اداشد زہے ادائے شما

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ

برائے دلولہ کرول بہانہ اہند — معاشراں سخن عاشقانہ میخواہند
مرید پیر مغانم کہ بادشاہ و ا — مرادو خویشں ازیں آستانہ میخواہند
بصلح حسرتی و یار ہردو رامیلست — زشرم واسطہ درمیانہ میخواہند

فقط

مُلّا سیج کی رامائن

یہ مضمون جولائی یا اگست کے نمبر کے لئے لکہا تہا مگر وقت پر تیار نہ ہو سکا۔ اسوقت جاڑے میں یہ بے موسم کا ملار سمجہا جائے گا۔ مگر جو محنت کرلی تہی اُسے ضایع کرنے یا اگلے سال تک مضمون کو پڑا رکہنے کی بات اچہی معلوم ہوئی۔ اگر ہوسکا تو اگلی برسات میں ملک محمد کی برساتی نظم اور دوسری ہندی اور اُردو کے شعرا کی موسمی نظموں کا لطف دکہایا جائے گا۔ "ما لمکند گیت"

بالی کے مارے جانیکے بعد سدرون کا راجہ سگریو پمپاپور کا مالک ہوا ہے وہ رام چندر جی سے یہ وعدہ کرکے کہ برسات ختم ہونیکے بعد سیتا کی تلاش کروں گا اپنے دار الخلافت میں چلا گیا ہے۔ ادہر رام چندر جی اور لچہمن جی پہاڑ پر ایک کوہ کے اندر موسم برسات بسر کر رہے ہیں۔ اُسی حالت میں رامچندر جی لچہمن جی کو برسات کی بہار دکہاتے ہیں۔ بالمیک جی نے اپنی سنسکرت کی رامائن میں یہ سماں ۶۶ شلوکوں میں دکہایا ہے۔ میں اُنمیں سے ۳۶ شلوکوں کا ترجمہ نیچے دیتا ہوں

دُہول دب گئی۔ ٹہنڈی ہوا چلنے لگی گرمی کی شدت دور ہوگئی۔ راجاؤں نے فوجکشی بند کی اور پردیسی اپنے گہروں کو لوٹنے لگے۔

ہنس مانسرور میں چلے گئے۔ چکوے اپنی پیاریوں سے جا ملے ... رات بارش ہونے سے راستے خراب ہوگئے سواریوں کا چلنا مشکل ہو گیا

کہیں روشنی ہے کہیں اندہیرا۔ آسمان پر بادل جمع ہیں کہیں ...وں سے گہرا ہوا آسمان ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا پہاڑوں سے گہرا ہوا سمند... سال اور کدم کے پہولوں سے بہرا ہوا پہاڑی دہا... ...ے رنگا ہوا نیا پانی پہاڑی ندیوں میں زور سے بہہ رہا ہے۔ ندیوں کے کنار... مور بول رہے ہیں بہونرے کے مانند کالی اور رسیلی جامن... لوگ مزے سے ... کہا رہے ہیں کئی ... ...یاں ...

طرح کے پکے ہوئے آم ہوا کے جھونکوں سے زمین پر ٹپک رہے ہیں۔
بجلی کی جھنڈیاں اڑاتے بگلوں کی قطاروں سے چھائے ہوئے پہاڑ کی چوٹیوں
کے مانند اونچے اور کالے بادل جنگ کے متوالے ہاتھیوں کی طرح گرج رہے ہیں۔
بارش کے سبب جنہیں سبزہ لہلہا اٹھا ہے، مور ناچ رہے ہیں۔ مینہ پڑ چکا ہے
ایسے بن شام کے وقت بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔
پانی کی وجہ سے اور بگلوں کی قطاروں سے چھائے ہوئے بادل پہاڑوں کی اونچی
اونچی چوٹیوں پر گویا دم لے لے کر چلتے ہیں۔
بادلوں کی مجت میں اڑتے ہوئے بگلوں کی قطاریں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ گویا
بادلوں کے لئے ہوا نے ایک سفید کنول کے پھولوں کا مالا پھیلا دیا ہے۔
چھوٹی چھوٹی بیر بہوٹیوں سے بھری ہوئی سبز نئی گھاس سے زمین ایسی خوبصورت
معلوم ہوتی ہے گویا کوئی نوعروس لال بوٹے کی سبز ریشمی ساڑی پہنے بیٹھی ہے۔
نیند آہستہ آہستہ بشنو کے پاس جاتی ہے۔ ندیاں دوڑ کر سمندر کے پاس جا رہی
ہیں۔ بگلوں کی قطاریں خوشی سے بادلوں کے پاس جا رہی ہیں۔
خوبصورت عورتیں بڑی امنگ سے اپنے خاوندوں کے پاس جا رہی ہیں۔ بنوں میں
نا ناچنے لگے۔ کدم کی ڈالیاں پھولوں سے بھر گئیں۔ بیل اپنی مستی دور کرنے کو
گائے کے پاس چلے گئے۔ زمین نئی گھاس سے سہاونی بن گئی۔ ندیاں بہتی ہیں بادل
برستے ہیں۔ متوالے ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ بن خوبصورت بن گئے ہیں۔ فرقت زدہ
لوگ اپنے ... کا خیال کر رہے ہیں۔ مور ناچتے ہیں اور بندر چپ ہیں۔
کیتکی ... وں کی خوشبو سے مست ہاتھی بن کے جھرنوں اور موروں کی آواز
کے ساتھ خوش ہو چنگھاڑ رہے ہیں۔
پانی ... گھائل ہو کر کدم کے پھولوں سے لٹکے ہوئے بھونرے پھولوں کی
خوشبو سے ... ہوئی آہستہ آہستہ چھوڑ رہے ہیں۔
کوئلو ... طرح کالی ... بے شمار پھولوں سے لدی ہوئی جامنوں کی ڈالیاں

ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ گویا وہ بھونروں کے جھنڈ سے چھائی ہوئی ہیں۔

بجلی کی جھنڈیاں اوڑانیوالے بڑے زور سے گرجنے والے بادل میدان جنگ میں لڑنے والے بندروں کے مانند معلوم ہوتے ہیں۔

پہاڑی بنوں میں پھرتا ہوا متوالا ہاتھی بادل کی گرج سنکر اُسے متوالا ہاتھی سمجھ کر لڑنے کو دوڑا مگر پھر بادل کا گرجنا سمجھکر واپس چلا گیا۔

کہیں بھونرے گونجتے ہیں کہیں مور ناچتے ہیں کہیں متوالے ہاتھی پھر رہے ہیں اسطرح بن کی خوبصورتی خوب بڑھ رہی ہے۔

کدم سال۔ ارجن اور کیلوں کے پیڑوں سے اور بہت قسم کے پھولوں کی خوشبوسے بسی ہوئی بن کی زمین متوالے موروں کے بولنے اور ناچنے سے میخانہ کے مانند معلوم ہوتی ہے۔

آسمان سے گرا ہوا موتی سا صاف پانی پتوں پر ٹھہر گیا ہے۔ اسے بھیگے پروں والے پیاسے پرند خوش ہو کر پی رہے ہیں۔ بھونرے میٹھی سی بول رہے ہیں۔ مینڈک مردنگ کا لطف دکھا رہے ہیں بندر گا رہے ہیں۔ بن محفل رقص و سرود بن گیا ہے۔

لمبی لمبی دُموں والے مور ناچتے ہیں گاتے ہیں اور پیڑوں پر بیٹھتے ہیں۔ انکے سبب سے بن سرود منزل بنگیا ہے۔

بادلوں کی گرج سے گہری نیند میں سوتے ہوئے بندر جاگ کر بادلوں کے مانند بھیگ کر طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔

جنکے کناروں پر چکوے چکوی پھرتے ہیں ایسی ندیاں پرانے کناروں کو توڑ کر نئے کناروں سے ہم آغوش ہو کر بڑے غرور کے ساتھ عزت کے لایق [illegible] سمندر کے پاس چلی جا رہی ہیں۔

پانی سے بھرے ہوئے نیلے بادل آپسمیں ایک دوسرے سے ملتے ہیں یہ معلوم ہوتے ہیں جیسے بن کی آگ سے جلے ہوئے [illegible] دوسرے [illegible] سے ملتے ہوں۔

جمع ہو جاتے ہیں۔ ندیوں کا پانی سمندر میں جا کر ویسا ہی لاجنب ہو جاتا ہے جیسا بندہ خدا کو پا کر۔

زمین پر چاروں طرف سبزہ چھا جانے سے راستہ نہیں نظر آتا ہے۔ جس طرح کج بحثوں کی بحث سے صحیح کتابیں گم ہو جاتی ہیں۔ مینڈک ایسے بولتے ہیں جیسے لڑکے وید پڑھتے ہیں۔ آک اور جواسے کے پتے گر گئے۔ جسطرح اچھی عملداری ہو جانے سے بدچلن لوگوں کا دفعیہ ہو جاتا ہے۔ خاک تلاش کرنے سے بھی کہیں نہیں ملتی ہے جسطرح غصہ سے نیکیوں کا پتہ نہیں لگتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں جگنو کیا چمکتے ہیں گویا گھمنڈی لوگ مجلس کرتے ہیں۔ بارش کی زیادتی سے کیاری پھوٹ چلی ہے جیسے آزاد ہو کر عورت خراب ہو جاتی ہے۔ ہوشیار کسان کھیتی کا نلاو کرتے ہیں جسطرح لایق لوگ گھمنڈ غرور اور فضول عزت کے خیال کو دور کرتے ہیں۔ چکوے نہیں دکھائی دیتے جیسے کلجگ کے آنے سے دھرم غائب ہو گیا۔ اور سر زمین میں سبزہ اُسطرح نہیں اُگتا ہے جیسے خدا کے بندوں کے جی میں شہوانی خیال بہت طرح کے جاندار زمین پر بڑھ گئے ہیں جسطرح عمدہ حکومت میں رعیت بڑھ جاتی ہے مسافر جہانکو تہاں رہگئے جیسے علم ہونے سے خواہشات نفسانی جہاں کی تہاں رک جاتی ہیں۔

کبھی تیز ہوا بادلوں کو اُڑا دیتی ہے جیسے ناخلف لڑکا خاندان کی عزت کو۔ دنمیں کبھی گھٹا اندھیرا ہو جاتا ہے اور کبھی سورج نکل آتا ہے۔ جیسے خراب صحبت سے خوبیاں ہو جاتی ہیں اور اچھی صحبت سے پیدا ہو جاتی ہیں"

تلسی داس جی فقیر تھے اس سے برسات کا نظارہ دکھاتے ہوئے بھی اپنی فقیرانہ نصیحت [illegible] لے ہیں۔ وہ برسات کی ایک ایک فطرتی بات کو سامنے لاتے جاتے [illegible] کی [illegible] ی کے لئے اُن میں سے ایک ایک پند ظاہر کرتے جاتے ہیں [illegible] بھی کا [illegible] یب کا ہے۔ وہ اکبر اعظم کے وقت میں تھے۔ اس سے [illegible] دہ بن پہاڑ وس وہ اُس زمانہ کی برسات کی کیفیت نہیں کہہ سکتے

تھی جیسی بالمیک جی تھے ۔ بن پہاڑ وغیرہ تلسی داس جی نے بھی دیکھے ۔ مگر ہاتھیونکے
بن اُن کے زمانہ میں نہ تھے ۔ اس سے اُن کی نظم میں ہاتھیوں کا ذکر نہیں ہے ۔ وہ بن سے
آبادی کی طرف آکر کھیتی اور کسانوں کی بات کہنے لگے ہیں ۔ مگر کہا وہی جو آنکھوں سے دیکھا ۔
مُلا مسیح جہانگیر کے زمانہ میں تھے ۔ اس سے تعجب نہیں کہ اُنھوں نے تلسی اُس کو
دیکھا یا سُنا ہو ۔ کیونکہ جہانگیر کے زمانہ میں تلسی داس جی زندہ تھے ۔ جہانگیر کی وفات
سے کوئی پانچ چھ سال پہلے اُن کا انتقال ہوا تھا ۔ اپنی رامائن میں برسات کی بہار
مُلا صاحب نے بھی لکھی ہے ۔ کیونکہ برسات ہندوستان کی مشہور ہے ۔ قدرت نے
یہ نعمت اسی ملک کو عطا کی ہے ۔ بہر اصل رامائن میں جس موقعہ پر برسات کا ذکر کیا
گیا ہے ۔ وہ بہت ضروری ہے اس سے دوسری زبانوں میں رامائن لکھنے والوں
کو بھی اُس کی تقلید کرنا پڑی ہے ۔ مُلا مسیح فرماتے ہیں ؎

ہوائے عشق آمد فصل برسات	کہ فردوس بریں را میکند مات
زبس آب و ہوایش جاں نوا ایست	بخوبی بادشاہ ہر ہوا ایست
بہار عاشقاں برسات ہند است	ز دلہا خونفشاں برسات ہند ایست

ان تین شعروں سے معلوم ہونے لگتا ہے کہ جناب مُلا صاحب ہند کی برسات
کا کچھ اصلی بیان کرنے کی تکلیف گوارا کرنا چاہتے ہیں ۔ مگر چونکہ تھے ہی شعر سے گریز
کرتے ہیں اور اپنے عجمی طرز بیان کو قبول کر لیتے ہیں ۔

ز رنگ و بوے پر کاریست در وے	سراپا نالہ و زاریست در وے
ہوایش بید لا نراسینہ کاود	کہ از ہر ذرہ عشق نو ت[illegible]
بوصفش مخزن گوہر کشایم	چو چشم ابر دُر ریز[illegible] موقع بر[illegible]

رونا دھونا فارس کے شاعروں کو بہت پسند ہے کسی [illegible]
دلیل یہی ہے کہ فارس کا عاشق اُسے دیکھ کر رو دے ۔ [illegible] سے حال پر
بارش کی نئی خوشی کی شے ہیں بھی اپنا رونے کا دستور [illegible] سے

چو پیوستہ پس از سالے بہ میعاد	سلیمان [illegible] بر [illegible] انگیز
	نمایاں

ازاں باد آتش اوگشت پُر تیز	بخار آب دریا یافت انگیز
بگریہ ابر را نوشد اجازہ	کہ سازد سنت عشاق تازہ
فلک عاشق زمیں معشوق زاست	کہ آنرا گریہ ویں را خندہ کارست
بخندہ ابر چوں زنگی مست	ببازی کردہ تیغ برق در دست

مُلا صاحب نے اپنا مضمون بہت زور سے اُٹھایا تھا۔ فلک کا سلیمان لہر کے بعد ہوا کی مسند پر جلوہ فرما ہوا تھا۔ اُس ہوا سے اُسکی آگ تیز ہو گئی اُس سمندر کے بخارات اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہاں تک تو بڑا زور تھا۔ مگر آگے چلکر ابر کو رونے کا نیا حکم حاصل ہوا کہ وہ رو رو کر عاشقوں کی سُنت کو تازہ کرے۔ آسمان عاشق ہے زمین معشوقہ ہے۔ اُسکا کام رونا اسکا کام ہنسنا ہے۔ کہاں وہ مسند پر بیٹھ کر شاہانہ حکم دینا اور کہاں یہ رونا دھونا۔ نیچر کا خیال تو کُجا مُلا صاحب نے اپنی بات تک کا خیال نہ رکھا۔ ایک شعر میں جہانگیر کی تعریف نکالی ہے۔

مقلد پیشہ گشتہ ابر آزار	کند تقلید دست شاہ دربار

آگے پھر کچھ مردمی کے ہتھیار باندھے ہیں

بروی آسماں ابر غریواں	سپہ انگیختہ از تیرہ دیواں
نہ دیوست او کہ نادل شد فرشتہ	برحمت باری از رحمت سرشتہ
بہ سقائی چو شخصے بے بدیل ست	کہ آب زندگیش آب سبیل ست

اُسکے نیچے کئی ایک اشعار خوب ہوئے ہیں

[illegible] شیرہ خوارہ عالم پیر	کہ ابر از شیرۂ جاں مید ہد شیر
[illegible] سبزی ابر دُرفشاں	کشادہ رنگ زیر چرخ دوکاں
[illegible] شیرۂ اطفال رنگیں	کہ ہر یک ابر دارد رنگ چندیں
[illegible] ت نشو نما را	نمودہ گلشن رنگیں ہوا را
[illegible] شگسار آرد گل تر	ہم از موزہ وصدف کافور گوہر
[illegible] دست زدہ [illegible] طرب را	زمیں دو سبزہ کردہ پشت لب را

سبزہ کے بیان میں فرماتے ہیں۔

ز سبزہ شخص گیتی پرنیاں پوش	فگندہ طیلسان خضر بر دوش
ز سبزہ خاک را میناست دُربار	گرفتہ آسماں زو دام زنگار
بہ سرسبزی جہاں چوں بخت شاہان	بشادابی زمیں چوں روئے ماہان

اوپر کے کئی ایک اشعار میں فطرتی رنگ بھی ہے۔ نیچے لکھے چند اشعار اس رنگ میں اور بھی زیادہ سرابور ہیں۔

خروش انگیز ہر سو تازہ سیلے	چو دیوانہ بہ صحرا کردہ میلے
دلِ مُرغاں ز بند دام آزاد	کہ دانہ سبز شد در دام صیاد
ز اقسام ریاحیں بس گل ہند	شگفتہ و کوکلا شد بلبل ہند
ز عشق قطرہ چاتک با دم سرد	رقابت با صدف چوں مور میکرد
دلِ طاؤس را از مستی جوش	شدہ معزولی جنت فراموش
بیک آئینہ نازیدے سکندر	ہزار آئینہ دارد ایں بہ ہر پر

اگر یہ چند شعر بھی مُلّا صاحب کی برسات میں نہ ہوتے تو اُن کی برسات کو ذرا بھی ہند سے تعلق نہ رہتا بالکل ایرانی برسات ہو جاتی۔ وہ بھی ہوا بادل سے بنی ہوئی برسات نہیں بلکہ تشبیہ اور استعارات سے بنی ہوئی خیالی۔

سنہ ۱۲۶[illegible] ہجری میں ایک رامائن اُردو میں منشی جگناتھ صاحب خوشتر نے نظم کی تھی۔ خوشتر ہندو تھے مگر اپنے گھر کی تعلیم اُنہوں نے کچھ نہیں پائی تھی۔

وہ فارسی اُردو کے تعلیم یافتہ تھے۔ اُنہوں نے بھی اپنی رامائن میں اُسی موقع پر برسات کی بہار لکھی ہے۔ کچھ اشعار اُسکے نیچے لکھے جاتے ہیں۔

عجائب موسم باراں ہے خوشتر	سماں کیا ہے گھٹا کا آسماں پر
عجب کیا فصل باران کے کرم سے	گل و لالہ کھلیں شاخ قلم سے
جب آیا موسم ابر گُہر ریز	ہوا رعد آسماں پہ شور انگیز
گھٹا میں کوندتی تھی برق تاباں	بہار آب میں آتش نمایاں

ہوئی ہر سو رواں بادِ بہار نَے	شمامِ سبزہ میں کی مُشکباری
ملے باہم جو برق و بادو باراں	ہوئے مے ریز مثل بادہ خواراں
ہوا فیض ہوا سے دشت گلزار	زمرد گوں ہوا داماں کہسار
ہوئے سنعم تپیدستاں گلشن	ہوا ہر غنچے کا پُر زر سے دامن
گیا ابر سیہ سے چرخ پر شور	ہوئے رقصاں ہیں ہر طرف مور
لگا سبزہ ہر اک سو لہلہانے	لگی ہر گل پہ بلبل چہچہانے
ہوا گرم اژدحام گل سو کہسار	گیا شہر ہین کا سر و بازار
ہجوم گل ہوا وہ ہر چمن میں	ہوا چلنے لگی رُک رُک کر بن میں
جھکی ہر گل پہ ہر جا شاخ سُنبل	رُخ رنگین پہ ہو جسطرح کاکل
زمیں پر خشک تھے جو چشمہ آب	ہوئے سب فیض ابر تر سے سیراب
ہوا آب رواں سو دشت دریا	ہوا دریا ہجوم گل سے صحرا

یہ بھی ایرانی ڈھنگ کی نظم ہے۔ مگر فطرت کو ایکدم سے اسمیں خیرباد نہیں کہدیا ہے شاعر کو خبر نہیں ہے کہ وہ برسات کی بہار لکھتا ہے یا ایران کے موسم گل کی۔ تاہم چند اشعار برساتی ضرور ہیں۔ اگر خوشتر صاحب ہندوں کا لٹریچر جانتے تو اُن کی نظم کچھ اور ہی ڈھنگ کی ہوتی۔ ملک محمد جائسی نے اپنی پدماوت میں ایک بارہ ماسہ لکھا ہے افسوس ہیں برسات کا بیان کرتے ہوئے کمال کیا ہے۔ ہندوستان کی برسات کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے۔ وجہ یہ کہ فقیر تھے۔ سب جگہ پھرتے تھے۔ کتنی ہی برساتیں دیکھی تھیں۔ جو آنکھوں سے دیکھا وہی قلم سے لکھدیا۔ پھر وہ عمدہ کیوں نہ ہو۔ مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے بھی برساتی نظم بہت اعلیٰ درجے کی لکھی ہے۔

فقط بالمکند گپت

تنقید

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا انیسواں اجلاس۔ اس سال علی گڑھ میں ۲۸-۲۹-۳۰-۳۱ دسمبر کو بصدارت آنریبل خلیفہ محمد حسن خاں بہادر نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا یعنی اسلئے کہ

لوگوں کو اس اجلاس کی خاص طور پر کامیاب ہونیکی امید تھی۔ ممبروں، وزیٹروں، اور طالب علمان کالج کی مجموعی تعداد . . . کے قریب تھی۔ ممبروں کی تعداد امید سے کم تھی اور شاہیر کانفرنس مثلاً مولانا شبلی۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مولانا ذکاء اللہ وغیرہم کی عدم موجودگی نیز بعض دیگر ناگفتہ بہ واقعات کی بنا پر اکثر لوگ منغص و مکدر واپس گئے۔ بنظر بر جملہ حالات کہا جاتا ہے کہ علی گڈہ کانفرنس پھیکی رہی۔

مہمانوں کی دعوت کا خرچ نواب فیاض علیخان صاحب بہادر نے اپنے ذمے لیا [illegible] طالب علموں کے سپرد تھا۔ خان بہادر حاجی مزمل اللہ خانصاحب نے مہمانوں [illegible] میں مدعو کیا تھا۔ ان دونوں صاحبوں کے لئے شکرئے [illegible] پاس کئے گئے۔

مہمانوں کے کمروں اور مقام اجلاس میں برقی روشنی کا [illegible] غلام محمد احمد صاحب [illegible] حاجی محمد خانصاحب رئیس خورجہ کی جانب سے ہوا تھا۔ پہلے روز مولوی حبیب الرحمن خانصاحب پریسیڈنٹ ریسپشن کمیٹی نے اپنا ایڈریس پڑھا اسکے بعد صدر انجمن کا انتخاب ہوا آپکے افتتاحی ایڈریس میں منجملہ دیگر معمولی باتوں کے یہ خیالات قابل غور رہیں کہ "سر سید کے منصوبے اسوقت تک پورے نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں نہ ہو یعنی کالج یونیورسٹی نہ ہو۔ اور کماحقہ ترقی نہیں ہو سکتی جبتک ہم عربی پڑھکر مسلمان اور سائنس پڑھکر محقق نہ بنیں۔ افلاس صنعت و حرفت کی تعلیم سے دور ہو سکتا ہے۔ طلبہ جاپان اور امریکہ وغیرہ بھیجے جائیں یا کم از کم ہندوستان ہی میں انہیں اسکی تعلیم دلائی جائے۔ تعلیم نسواں محفوظ اور محصور مدارس میں ہو"

ایڈریس پڑھکر خلیفہ صاحب نے بعذر علالت اپنی جگہ مسٹر علی امام بیرسٹر پٹنہ کو اپنا جانشین بنا دیا۔ چنانچہ کانفرنس کے باقی اجلاسوں میں بھی زیادہ تر آپ ہی صدر انجمن رہے اور حق یہ ہے آپنے فرائض صدارت کو عمدگی کے ساتھ ادا کیا۔ ازاں بعد مسٹر براؤن اسسٹنٹ جائنٹ سکریٹری نے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی نے اپنی کمیٹی کی کارگزاریاں بیان کرکے موجودہ دو کلرکوں کے علاوہ اور بھی چند کلرکوں کا ضرورت ظاہر

ذیل میں کانفرنس کے اجلاسوں کا پروگرام مع رزولیوشنوں کی فہرست کے درج کیا جاتا ہے

۱۔ رزولیوشن نمبر۱ :۔ "اس کانفرنس کی رائے میں نہایت مناسب بلکہ ضروری ہے کہ ہز ہائنس حضور عالی نظام مدظلہ العالی کی چہل سالہ جوبلی کی یادگار میں ایک طلائی تمغہ ہر سال ایک ایسے مسلمان طالب علم کو دیا جائے جو ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں بی۔ ایس۔ سی کے امتحان میں اعلیٰ درجہ کی ڈگری حاصل کرے اور اس امر کا فیصلہ کہ کس خاص سال میں کس یونیورسٹی کے گریجویٹ کو تمغہ دیا جائے سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کانفرنس کی رائے پر چھوڑا جائے"۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اسکوائر بیرسٹر ایٹ لا نے پیش کیا اور نواب محسن الملک بہادر نے تائید کی۔

۲۔ مولوی حکیم مظفر حسین صاحب سکرٹری نے رپورٹ انجمن اسلامیہ مظفر نگر پیش کی۔

۳۔ رزولیوشن نمبر۲ :۔ "اس کانفرنس کو نہایت افسوس ہے کہ فی زمانہ مسلمانوں میں تعلیمی کوششوں کو مقامی خصوصیتوں پر محدود کرنیکا خیال دن بدن قوت پکڑتا جاتا ہے اور یہ کانفرنس اس امر کو قومی ترقی کے لئے بہت ضروری سمجھتی ہے کہ تعلیمی قوتوں کا علیگڈھ میں اسطرح اجتماع اور انضباط کیا جائے کہ مقامی ضرورتوں کا بھی کافی لحاظ رہے"۔ مسٹر محمد علی نے پیش کیا اور مسٹر علی امام و نواب محسن الملک اور منشی محبوب عالم صاحب اڈیٹر پیسہ اخبار نے تائید کی۔

۴۔ رزولیوشن نمبر۳ متعلق اوقاف۔

۵۔ بوقت شب (۸ بجے) ۲۸ دسمبر۔ یونین کلب کی اپنی ورسری (سالانہ جلسہ) تھی جسمیں کالج کے طالب علموں نے ہیملٹ کا ایکٹ کیا۔

۶۔ لکچر مسٹر آرچبولڈ پرنسپل مدرستہ العلوم علیگڈھ۔ ابتدائی تعلیم انگلستان پر۔

۷۔ رزولیوشن نمبر۴ :۔ اس کانفرنس کی رائے ہے کہ مقاصد کانفرنس کی عملی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے کہ تعلیمی مردم شماری کے کام کو ازسرنو جاری کیا جائے۔
محرک۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب۔ موید۔ مسٹر بدرالدین احمد بی۔ اے۔ مترجم

الہ آباد ہائی کورٹ۔

۸۔ رزولیوشن ۵ :۔ اس کانفرنس کی رائے میں یہ نہایت مناسب ہے کہ بغرض حصول تعلیم صنعت و حرفت ہر سال کم از کم ایک مسلمان طالب علم ممالک غیر کو کانفرنس کے اہتمام سے بھیجا جائے۔ اور جبتک روپیہ ادا نہو وہ ۵ فیصدی اپنی آمدنی سے دے محرک۔ مولوی الف دین صاحب پلیڈر راولپنڈی۔ موید مسٹر غلام محمد منشی ہیڈ اسٹرائیٹ جلو

۹۔ رزولیوشن ۶ :۔ اس کانفرنس کی رائے میں علی گڈہ کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہنچانے کی تجویز کو کامیاب کرنیکے لئے لازمی ہے کہ اسکے فنڈ اور کل ضروریات کا صحیح اندازہ قرار دینا چاہئے۔ محرک مسٹر قادری۔ موید۔ اڈیٹر صاحب پیسہ اخبار لاہور۔

بوقت شب۔ ۸ بجے۔ ۲۹ دسمبر۔ (ریک منزل) سکشن میٹنگ تعلیم نسواں۔

بصدارت شیخ عبد اللہ صاحب بی۔ اے ایل ایل۔ بی سکرٹری سکشن نے اپنی رپورٹ پیش کی

۱۰۔ رزولیوشن ۷ :۔ یہ کانفرنس حضور مسٹر جیمس ڈگس لاٹوش بہادر لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودہ کا نہایت تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے کہ انکی گورنمنٹ نے مسلمانوں کی تعلیم کو محمڈن کالج علی گڈہ میں ترقی دینے کے لئے اعلیٰ درجہ کی فیاضی کا اظہار فرمایا محرک۔ نواب محسن الملک بہادر۔ موید۔ خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب

۱۱۔ نظم حکیم مظفر حسین رئیس مظفر نگر مع نقشہ شجر اسلام جسکی شاخیں تمام عالم میں پھیلی ہیں اگر تری صوت حزین

۱۲۔ رزولیوشن ۸ :۔ اس کانفرنس کی رائے میں کانفرنس کے مقاصد کو پبلک کے سامنے مسلسل طور پر رکھنے کے لئے اور ان میں عملی کامیابی حاصل کرنیکے لئے ضرور ہے کہ مستقل تنخواہ دار ایجنٹ مقرر کئے جائیں۔ محرک۔ مسٹر رزاق بخش قادری موید۔ مسٹر گارڈنر براون۔

۱۳۔ رزولیوشن ۹ :۔ اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی اصلاح کے لئے قرآن شریف کے ترجمہ کا بڑہانا ضروری ہے۔ محرک مولوی عبد الحکیم صاحب سیشن افسر پٹیالہ۔

۱۴۔ نظم۔ مرزا اشتیاق حسین صاحب اڈیٹر رسالہ محسن الملک۔ دہلی۔

۱۵- رزولیوشن ۱۰: ـ اس کانفرنس کی رای میں اعلی التعلیم کو مکمل کرنیکے لئے ہندوستان کے کالجوں میں فیلو سسٹم کا جاری کرنا اور وظائف فنڈ قائم کرنا بہت ضروری ہی محرک۔ علی امام صاحب

۱۶- رزولیوشن ۱۱: ـ اس کانفرنس کی راے میں مختلف مقامات میں جو مسلمانوں کے اوقاف ہیں اُن میں جو اوقات تعلیمی مقاصد کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اُن سے تعلیمی مقاصد میں مدد لینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ محرک محبوب عالم صاحب۔

۱۷- لکچر خواجہ غلام الثقلین صاحب متعلق اصلاح تمدن۔ یہ لکچر عام طور پر پسند کیا گیا۔

اجلاس شب وقت ۸ بجے

(۳۰ دسمبر ۱۹۰۵ء): ـ (۱) کنورسیشن لٹریری سکشن۔ (۲) میٹنگ متعلق اصلاحِ تمدن بمقام بیگ منزل جسمیں خواجہ غلام الثقلین صاحب سکرٹری صیغہ نے اپنی رپورٹ پیش کی جس سے معلوم ہوا کہ اس صیغے کا خرچ آمدنی سے زائد ہے۔

۱۹- سید الرحمن صاحب نے صنعت وحرفت کے متعلق اپنا مضمون پڑھا اسکے بعد نواب محسن الملک بہادر نے ایک پُر لطف لکچر دیا جسمیں اسلامی تعلیم قرآن کو باترجمہ پڑھنے پر زور دیا تھا۔

۲۰- مسٹر ظفر عمر نے ون روپے فنڈ کی رپورٹ پیش کرکے بتایا کہ ابتک صرف ۲۹ ہزار روپیہ جمع ہوا ہے اسی اثنا میں مختلف لوگوں کو تمغے دیے گئے۔

۲۱- رزولیوشن ۱۲: ـ شکریہ نواب فیاض علیخاں بہادر متعلق فیاضی ومہمانداری کل ممبران و وزیٹران کانفرنس۔ محرک۔ نواب محسن الملک۔ موید۔ صاحبزادہ آفتاب احمدخاں صاحب۔

۲۲- رزولیوشن شکریہ ۱۳: ـ خان بہادر محمد مزمل اللہ خاں صاحب بابت گارڈن پارٹی محرک۔ مسٹر گارڈنر برون۔ موئید۔ مسٹر رزاق بخش قادری۔

۲۳- رزولیوشن شکریہ ۱۴: ـ محمد احمد صاحب حاجی محمد خاں صاحب وسلے خورجہ بابت اہتمام روشنی برقی۔ محرک۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں خاں صاحب۔ موید شیخ عبد اللہ صاحب۔

۲۴- رزولیوشن شکریہ ۱۵: ـ مسٹر پوپ ٹریفک سپرنڈنٹ اودھ رُہیلکنڈ ریلوی درباب تخفیف کرایہ ریل۔ محرک۔ مسٹر رزاق بخش قادری۔ موید۔ مولوی بشیر الدین صاحب۔

۲۵- مولوی شبلی صاحب کے مستعفی ہونے پر مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو منتخب کئے گئے ہم آپ کو توجہ دلاتے ہیں کہ انجمن کو (۱) ایک مکمل اُردو کتبخانہ فراہم کرنا چاہئے (۲) مستند قواعد اردو مرتب کرنا چاہئے۔ گذشتہ دو سال میں انجمن نے کچھ کام نہیں کیا۔ اسکی تلافی ضروری ہے۔

۲۶ - گذشتہ کانفرنس کا حساب مسٹر قادری نے پیش کیا - مولانا اشہری نے ایک پر زور نظم پڑھی اور آخر میں حضور ملک معظم کے لئے نعرہ ہائے خوشی بلند کئے گئے -

ان رزولیوشنوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہماری تعلیمی کانفرنس میں سب سے زیادہ ضروری امر غالباً مصلحتاً نظر انداز کردیا گیا - یعنی گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کے متعلق اظہار رائے کی کسی نے ہمت نکی حالانکہ اُس پالیسی سے سب سے زیادہ مسلمانوں ہی کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے - پانچویں اور چھٹے رزولیوشن کے سوا باقی اکثر تجویزیں قت کو پورا کرنیکے لئے پیش کی گئی ہیں اور بس - افسوس کہ ان دو تجویزوں کے متعلق بھی کانفرنس کو پوری کامیابی نہیں ہوئی - تعلیم صنعت و حرفت کی غرض سے طالب علموں کو امریکہ و جاپان بھیجنے کی تجویز مسٹر نسیم بی - اے وکیل لکھنؤ کے اس اظہار ارادہ تک محدود رہگئی کہ آپ ہر سال کم از کم ایک طالب علم اودھ سے بھیجدینے کا بندوبست کر سکینگے محمڈن یونیورسٹی کے لئے بھی ۱۴ ہزار روپیہ کا وعدہ ہوا جسمیں سو صرف دو ہزار وصول ہوئے - خدا کرے کہ ہمارا یہ خیال صحیح ثابت ہو کہ مسلمانوں نے اظہار فیاضی کو شہزادۂ انگلستان کے ورود مسعود پر اُٹھا رکھا ہے -

سب سے زیادہ کامیابی صیغہ تعلیم نسواں اور اسکی شاخ یعنی زنانہ صنعت و حرفت کی نمائش کو ہوئی جو اسکے سکرٹری شیخ عبداللہ صاحب کی ذاتی اور عملی کوششوں کا نتیجہ ہے ہم شیخ صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں - آپ کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ بھوپال - بہاولپور مالیرکوٹلہ - جنجیرہ اور پٹیالہ کی ریاستوں سے تعلیم نسواں کیلئے پوری امداد کا وعدہ کیا گیا ہی یہانتک کہ بیگم صاحبہ بھوپال نے معتد بہ رقم دی بھی ہی ہز ہائنس آغا خان صاحب نے بھی ایک معقول رقم کا وعدہ کیا ہے - مگر اس شرط پر کہ اتنی ہی مسلمان خود جمع کرلیں گورنمنٹ نے اسکول کا نصف خرچ دینا منظور کیا ہی - اسوقت اس صیغے کے فنڈ میں ۶ ہزار ۵ سو ۵ ۸ روپیے ہیں شیخ صاحب نے آخر میں یہ بھی امید ظاہر کی کہ ایک سال کے اندر نارمل اسکول قائم ہو جائیگا - خدا ایسا ہی کرے - آخر میں نمائش کے متعلق بھی بیان کیا کہ ہندوستان کے ہر حصے سے چیزیں آئیں - رسالہ خاتون کے متعلق جسکی اشاعت اچھی رہی ہے، امید ظاہر کی گئی کہ اس سے تعلیم نسواں میں بہت مدد ملیگی - افسوس کہ بعض بانفہم جاہلوں اور مذہب نما

غیر مہذب لوگوں نے زنانہ نارمل اسکول اور نمایش صنعت وحرفت کی بہی مخالفت کی
اور تہذیب وتعلیم جدید کے نام کو بدنام کیا - فاعتبروا یا اولی الابصار -

انڈسٹریل کانفرنس کا پہلا اجلاس معمولی کامیابی کے ساتہہ بمقام بنارس ۳۰ دسمبر ۱۹۰۵ء
کو کانگرس پنڈال میں منعقد ہوا - مسٹر رومیش چندر دت سی - آئی - ای صدر نشین تھے جنہوں نے
ایک موزوں تقریر کے ساتہہ کارروائی شروع کی اور چاہا کہ لوگ مختلف مضامین پر اپنے خیالات
ظاہر کریں - پہلا مضمون مسٹر ہوپ ٹمسن - رجسٹرار کریڈٹ سوسائٹیز کا تہا جنہوں نے
کمی وقت کی وجہ سے خلاصہ مضمون زبانی بیان کیا کہ کیونکر زراعتی بنک ان صوبجات میں
چل رہے ہیں مسٹر ہالینڈ ڈائرکٹر معدنیات نے ایک دلچسپ مضمون مختلف معدنیات اور پیداوار
ہندوستان کے متعلق پڑہکر سنایا - اور بہی چند مضامین کے بعد کئی مفید رزولیوشن پاس
ہوئے - اور آخر میں ایک کمیٹی کانفرنس کے کام چلانے کو قائم ہوئی جسکے سکرٹری مسٹر
مدہولکر مقرر ہوئے اور قریب پانچہزار روپیہ چندہ سال آیندہ کے اخراجات کیلئے جمع ہوگیا
مسٹر مدہولکر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ایک تنخواہ دار سکرٹری تجویز کرلیں - ہمارے نزدیک
اس غرض کے لئے مسٹر چنتامنی سابق ایڈیٹر اخبار انڈین پیپل الہ آباد سے بہتر کوئی شخص
نہیں ہے - انڈسٹریل کانفرنس کا خیال سب سے پہلے آپ ہی کو ہوا اور اسکے پہلے
اجلاس کی کامیابی کو بہی زیادہ تر آپ ہی کی ذاتی کوشش کا نتیجہ سمجہنا چاہئے -

ہمکو اس کانفرنس کی مفید ملک ثابت ہونیکی بہت کچہہ امید ہے اور غالباً وہ زمانہ دور
نہیں ہے جبکہ اسکی کوشش سے ہندوستان میں تعلیم وصنعت حرفت کے معقول انتظام کے
علاوہ ہندوستانی طلبا کو امریکہ وجاپان بہیجنے کا بہی قابل اطمینان انتظام ہوجائیگا -

سوشل کانفرنس کا بہی اجلاس ۳۱ دسمبر کو کانگرس پنڈال میں بصدارت پنڈت
جوالا پرشاد کلکٹر ایٹہ ہوا - اس کانفرنس کی تجاویز میں سے رسم پردہ کی سختی کو دور کرنے کے
سوا اور بہت کم تجویزیں ایسی تہیں جنکو ہندو اور مسلمان دونوں سے تعلق ہو - یہی وجہ ہے کہ
اسمیں جو خال خال مسلمان نظر آتے تھے وہ بطور تماشائی کے شریک تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات
نہیں ہے - ہمارا بہی ذاتی خیال یہ ہے کہ پولیٹکل معاملات میں البتہ ہندو مسلمان دونوں کے درمیان

اتحاد ممکن اور ضروری ہی۔ سوشل معاملات میں ان دونوں کا خیال ہونا مشکل ہے اور شاید کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔

اس کانفرنس میں ایک خاص بات قابل غور یہ تھی کہ اسٹیج پر بیش تیس تعلیم یافتہ خاتونوں کی بھی ایک جماعت موجود تھی جسمیں سے بعض نے انگریزی اور ہندی میں تقریریں بھی کیں اسکے مقابلے میں جب ہم مسلمانوں کی حالت پر نظر کرتے ہیں تو اُنکی پست خیالی اور قدامت پرستی پر افسوس آتا ہی کہ تعلیم یافتہ عورتوں کا بے پردہ مہذب جلسوں میں شریک ہونا تو درکنار محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی کارروائی کو بقید پردہ دیکھنے کی بھی سخت مخالفت کی گئی حتی کہ بعض لوگوں نے تو نمایش کی بقید پردہ سیر سے بھی خواتین کو محروم کرنا چاہا اور مہذب عورتوں کی باہم ملاقات کو بھی ناجائز سمجھکر شیخ عبداللہ صاحب کی مجوزہ لیڈیز کانفرنس کے انتظام میں بھی در پردہ رخنہ اندازی کرنا چاہی۔ لاریب اس قسم کی تاریک خیالیاں مسلمانوں کی ادبار اور ذلت کی نشانیاں ہیں۔

اسپیچ تائیدی مُلا عبدالقیوم صاحب حیدرآبادی

(متعلق بہ رزولیوشن کانگرس بابت قرنطینہ حجاج)

اسوقت جو رزولیوشن کہ آپ حضرات کے سامنے آنریبل گوکل داس پارک نے پیش فرمایا ہی اور جسکی تائید علی محمد بھیجی صاحب نے کی ہی اُسکی مزید تائید کے لیے میں کھڑا ہوں اور اس امر سے میں مطمئن و مسرور ہوں کہ آپ حضرات اکیس سال سے برابر اپنے اوطان عزیز کو چھوڑ کر محض اسوجہ سے زحمت سفر گوارا کرتے اور مختلف اقطاع ہند میں اپنے جلسے قرار دیتے رہتے ہیں کہ رعایا کی تکالیف و مصائب کو دور کریں اور اون کی شکایات کو بطور نمایان قومی سرکار تک پہنچائیں اور اسوقت تک آپ حضرات نے اس بھاری ذمہ داری قومی و ملکی کو نہایت متانت و خلوص و صداقت و استقلال و لیاقت کے ساتھ انجام دیا ہی جسکی وجہ سے ملک کا ہر ایک فرقہ بلا امتیاز مذہب و ملت آپکے مساعی جمیلہ و احسانات

جزیلہ کا دلی شکر گزار ہے۔

ہم تمام ممبران نیشنل کانگریس بلا تفرقہ مذہب وملت اپنی برادران وطنی کے ساتھ برادرانہ سلوک رکھتے ہیں اور ہمارے دل ودماغ تعصبات مذہبی سے تیرہ وتار نہیں ہیں بلکہ بالکل اُس سے منزہ ومبرا ہیں ہمارا مذہب حب وطن وہمدردی ملکی وقومی ہے۔

ومن مذہبی حب الدیار لاہلہا		وللناس فیما یعشقون مذاھب
لقد صار قلبی قابلاً کل صورۃ		فمرعی الغزلان ودیر الرھبان
ادین بدین الحب انی توجہت		رکائبہ ارسلت دینی وایمانی

اسکا ثبوت ابھی آپ حضرات کے سامنے پیش ہو چکا ہے کہ حاجیوں کے قرنطینہ کی رنج تکالیف کی تحریک ہمارے آنریبل ہندو بھائی مسٹر پارک نے کی ہے جو تمام ہندوستانکے دیگر مجالس مدعیان حب وطنی وہمدردی قومی میں سے کسی نے بھی آجتک نہیں کی تھی بلکہ بزعم خود بعض قومی مجلسوں نے سرسیے حج ہی کو فضول وغیر ضروری ظاہر کیا ہے ہمارے دل ودماغ انسانی مواانست سے ایسی منور وروشن ہیں اور ایسے وسیع وبلند وارجمند ہیں کہ ہماری عظیم الشان واجب التنظیم مجلس کے ہر ایک فرد کا یہ خیال ومقال ہے جو بالکل مطابق واقع ومطابق حال ہے کہ ۔

مقصود من از کعبہ وبتخانہ تو ئی		ورنہ من ازیں ہر دو مقام آزادم
چراغ بتکدہ وشمع خانقاہ یکیست		اگرچہ دیدہ دو آمد ولے نگاہ یکیست
عاشقم ملامرا باکفر وبا ایمان چہ کار		رونق ہنگامہ گبر ومسلمانم چو شمع

صاحبو! انسانی طبایع کا مقتضا یہ ہے کہ ہر ایک عاجز ودرماندہ شخص وگروہ سے ہمدردی کرے جو اوسکے مشارک جنسی، نوعی، قومی ووطنی ہیں اور جب یہ مشارکین معزز ومقدس بھی ہوں تو اونکی برگزیدگی واعزاز کیوجہ سے خلوص وارادت دلی اور بڑھجاتی ہے۔ پس جس درماندہ مقدس گروہ کی ہمدردی کی تائید کرنیکے لئے میں آپکے سامنے کھڑا ہوں وہ حاجیوں کا گروہ ہے جو بمقتضای اپنے پاک خیالات مذہبی کے اپنی اہل وعیال سے مہاجرت کرکے دور دراز مقامات کا اور اوسکے شدائد ومصائب جھیلنے

اور ایسی تکالیف برداشت کرنے پر جبکا چارہ کار نہیں آمادہ وطیار رہتے ہیں مگر یہ مقدس گروہ قرنطینہ بمبئی کیوجہ سے نہایت تکالیف میں ہرسال مبتلا رہتا ہے اور کوئی ان کی ہمدردی بجز آپکے سے پاکدل پاک نفس محبان قوم و وطن کے نہیں کرتا اور نہیں کرسکتا اور نہ کسیکو ان کی حالت زار و نزار پر کبہی کچہ رحم آتا ہی بجز ہمارے آنریبل مسٹر بارک ہند و کریم النفس رحیم دل ممبر کے جبکی تحریک آج انہوں نے آپکے سامنے پیش فرمائی ہے اور جبکی تائید میں بصد ترقب و امید و التجا و ارتجا کر رہا ہوں۔ حضرات تمام مسافرین جو بصرہ، کویت، بغداد، مصر، شام و بنادر خلیج فارس بلکہ تمام عالم میں سفر کرتے ہیں کسی کے لئے قرنطینہ مقرر نہیں ہے بجز حاجیونکے اور سوائے ایام حج کے اگر دوسرے وقتوں میں جدہ و مکہ کا سفر کیا جاے تو انکے لئے بہی قرنطینہ نہیں ہوتا مگر ہوتا ہی تو صرف موسم حج میں اور خاص حاجیوں ہی کے لئے اور وہ بہی اس بے تمیزی کے ساتہ کہ مطلقاً انکے آسایش و آرام و حفاظت سرما و گرما کا خیال کچہ نہیں کیا جاتا نہ اون کے لئے کہانے پانی اور اشیا رخور و نوش کا فراہم کیا جانا کچہ ضروری سمہا جاتا ہی بلکہ وہ نہایت بیرحمی کے ساتھ لیٹرے دلالوں اور ظالم کوتوالی کے جوانوں کے حوالے ہوتے ہیں اور اون کی عورات اور بچے بہی اون سے علیحدہ و مجبور کر دئے جاتے ہیں اور اسطرح ہرسال اُن کی نہایت ذلت و خواری و بیحرمتی ہوا کرتی ہے جس سے مسلمانوں کو نہایت صدمہ اور رنج پہنچ رہا ہی۔ آغاز و ابتدائی حصول اجازت سفر سے لیکر معاودت اوطان تک حاجی کشمکش میں پہنس جاتے ہیں اور انکو اقسام اقسام کے تکالیف جسمی و روحی اور نقصانات عرضی و مالی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

ایحضرات ہر ایک انتظام کی غرض و غایت آسائش و آرام رعایا و بہبودی و بہروزی ملک و دولت و اظہار تہذیب و تکمیل حالت تمدنی و انتظامی ہوا کرتی ہی جو موجب ترقی و زیب و زینت دولت و ملک ہے اور جس انتظام کی یہ حالت ہو کہ انہیں سے کوئی ایک غرض بہی اوس سے حاصل نہو بلکہ اونکے برخلاف موجب تکالیف و باعث نقصانات و سبب بدنامی و نارضامندی عمومی ہو تو اسکا فوراً انسداد کرنا ضروری ہی تا رعایای

مسلم کو دولت برطانیہ کی طرف سے جو عموماً یہ بدگمانی ہو رہی ہے کہ وہ خلاف اپنی مسلمہ اصُول حکمرانی و آئین جہانبانی کے مداخلت و مزاحمت تبقدیم فرائض مذہبی کر رہی ہے وہ بالکل مرتفع و مندفع ہو جائے اور رعایا شکر گزار اور اپنی مذہبی مراسم کے انجام دہی میں آزاد رہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ ان مقاصد سے کسیکو انکار یا اس پر ہرگز کسیکو اصرار نہیں ہو سکتا بجز لارڈ کرزن کے سچا بر حاکم کے جنہوں نے رعایای بمبئی کی عرضداشت پر کچھ بھی توجہ و التفات نہیں کی بلکہ ایک نیم سرکاری اخبار کی ذریعے سے مسلمانوں کو یہ دہمکی دیگئی کہ اگر بمبئی کا بندر بھی بند کر دیا جائے تو اُسوقت کیا ہوگا اور مسلمان کیا کرینگے۔ ظاہر ہے کہ بجز بدنامی و رسوائی دین و دنیا کے اور نفرین عقبیٰ کے کیا ہوگا۔ افسوس ہے کہ ہم لارڈ کرزن کے کس کس کام کو روئیں اور کس کس دہبے کو اپنے آنسوؤں سے دہوئیں ؎

او نگار جہانے شدہ از جور تو شکل	مشکل کہ رود نقش ستمہای تو از دل

حصہ نظم

غزل جناب طاہر فرخ آبادی

عاشقوں کا کوئی پرسان عہد خوبان میں نہ تھا	پھول بلبل کے ہوئے ماتم گلستاں میں نہ تھا
نقص تھا سب میں رُخ پر نور جاناں میں نہ تھا	کون کہتا ہے کہ دہبا ماہ تاباں میں نہ تھا
اے صنم کیوں حضرت زاہد بنے میرے رقیب	کیا سلیقہ دلبری کا حور و غلماں میں نہ تھا
محو مژگاں کسطرح دل کے پہپولے پھوڑتے	ہاہ ملکر رہگئے نشتر رگ جاں میں نہ تھا
عمر بہر فریاد کی مینے تو کیا بیجا کیا	کوچہ جاناں میں تھا شہر خموشاں میں نہ تھا
رزق خالق نے دیا بے منت اہل دول	شکر ہے حصہ ہمارا خوان احساں میں نہ تھا
میرے دل سے پوچھنا تھا سنگساری کا مزہ	تھا وہ دیوانہ جو بازیگاہ طفلاں میں نہ تھا
بیخودی میں حال دل کیا عرض کرتا آئینہ	اور ہی عالم میں تھا بزم حسیناں میں نہ تھا
سکہ داغ جنوں سے میں بدلتا کس لئے	واہ سید ہا نام تک سلیماں میں نہ تھا

ہمکو سب کچھ ملگیا بچھڑا ہوا دل ملگیا
اس سی مطلب کیا ہی تہا یا کوئے جاناں میں تہا

کیوں کیا بدنام ظاہر جوشِ وحشت نی مجھے
آنسوؤں کا تار بھی میرے گریباں میں تہا

غزل جناب رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

دام سے طولِ امل اس سی رہا ہو جائے
رفتہ رفتہ یک دلِ بے مدعا ہو جائے

کارواں دردکا ہی کوی جاناں سے گزر
نالۂ پیہم سے آوازِ درا ہو جائے

نبضِ خس میں کیجئے پیدا حرارت شعلہ کی
یعنی اُس بیگانہ خو سے آشنا ہو جائے

جلوۂ سرگرم نمائش ہے کھچا جاتا ہی دل
ہو اگر توفیق تو تجھپر فدا ہو جائے

دردمندانِ وفا کو بس ہی تیرا التفات
تیرے قربان ای نگاہِ آشنا ہو جائے

ہم خدا خواہی و ہم دنیای دوں وحشت کیا
جستجو میں اُسکی برق ماسوا ہو جائے

غزل جناب شفق عمادپوری

تماشا ہی رہا دل میں مگر دل سے جدا ہوکر
ہوا نا آشنا وہ مجھسے عالم آشنا ہوکر

ملینگے خاک میں محو خرامِ فتنہ زا ہوکر
تری رفتار پر مٹ جائینگے ہم نقشِ پا ہوکر

بڑا ہونا توانی کا جو کوسوں ہمسے پیچھے تھے
وہ آگے قافلے سے بڑھگئے بانگِ درا ہوکر

کوئی بچکر کہاں جائے کہاں جا کر اماں پائے
بنی ہی جان کی گاہک ادا اُسکی قضا ہوکر

تلاشِ منزلِ مقصود میں خود آجتک گم ہیں
کسیکو خضر کیا رستہ بتائیں رہنما ہوکر

لہو پیتا ہوا دل سی جگر کی راہ نکلا ہے
کہاں پہونچا ہی اُسکا تیر ترکش سے جدا ہوکر

بکھیڑے ہی بسر تو نکلے ہیں نہ جھگڑے آرزو کے
تعلق سی بری ہیں ہم دلِ بے مدعا ہوکر

پہلا پہولا ہی پامالِ خرامِ ناز ہو جانا
مقدر رنگ لایا ہی شفق برگِ حنا ہوکر

ولہٗ

پہونچیگا خاک کوچۂ دامانِ یار تک
اٹھتا نہیں زمیں سے ہمارا غبار تک

مدت سی ہمصفیر اسیرِ قفس ہیں ہم
کیسی خزاں گزر گئی فصلِ بہار تک

کیا دن تھے وہ کہ مستِ مئے بیخودی تھے ہم
کیسا سرور اب نہیں باقی خمار تک

اے غضب کیا ہی جامۂ ہستی کا اعتبار — زینت تری ہی پیرہن مستعار تک

زاہد سے بوجہ حسن عمل کا نہ اٹھ سکا — ہلکے بیاں ہیں سر پہ گناہوں کے بار تک

اب کسکی جستجو میں اڑاتی ہی سر پہ خاک — اے بیکسی وہ پہر گئے آکر مزار تک

اتنے گناہ ہیں کہ جو گننے لگوں شفق
فرصت نہ ہو شمار سے روز شمار تک

غزل جناب عبدالکریم نشتر چیروی سلیم پوری - وارد کلکتہ

ہونٹوں پہ تبسم ہو تو آنکھوں میں حیا ہو — بس جائے ادا آپ وہ مستانہ ادا ہو

مستی ہو کچھ آنکھوں میں تو کچھ لغزش پا ہو — یوں بزم حریفاں میں وہ آئے تو مزا ہو

اپنے دل سوزاں کا تو میں ہوں خس و خاشاک — تم کسکے گلستان تمنا کی فضا ہو

ہشیار رہا چاہئے گلبانگ نفس سے — دیکھو کہیں یہ شور نہ آواز درا ہو

ہی نور بصر اشک - نہ آنکھوں سے الگ ہو — ہی مونس دل آہ - نہ سینے سے جدا ہو

اے دست جنوں! جیب گریباں کی خبر لے — اے شعلۂ غم! خاطر محزوں کی دوا ہو

اے دیدۂ تر! قاعدۂ ضبط سے لے کام — اے نالۂ دل! ذوق خموشی پہ فدا ہو

اے تیر نظر! تیرا قدم مجھکو مبارک — اے زخم جگر حق مدارات ادا ہو

میں معتقد شیوہ ارباب وفا ہوں — تم مجتہد رسم و رہ اہل جفا ہو

دلگیر سا کیوں آج نظر آتا ہی نشتر — تیر نگہ ناز کا گھائل نہ ہوا ہو

جناب حسرت [illegible]

وہ کس کس شرم سی عذر جفا تقریر کرتے ہیں — مگر پاس وفا ہی عاشق دلگیر کرتے ہیں

بحسرت دیکھتے ہیں غیر پر لطف و کرم انکے — بناکامی سپاس آہ بے تاثیر کرتے ہیں

گرفتاران غم کو کیا ضرورت قید ظاہر کی — ترے سودائیوں کو لوگ کیوں زنجیر کرتے ہیں

بھلا دیتی ہی مضموں - یاد اس محو تغافل کی — بڑی مشکل سے مکتوب وفا تحریر کرتے ہیں

نہیں یارا ہی خاموشی کہانتک ضبط غم حسرت
فراق یار میں ہم نالۂ شبگیر کرتے ہیں

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خاں بہادر مدظلہ

(۵۴)

کچھ کہے جاتا تھا غرق اپنی ہی غمناکی میں تھا
مرتے مرتے ہوش باقی تیرے دیوانے میں تھا

دون کی بیٹھا ہوا لیتا ہے زاہد کیا کہوں
متقی ساقی سے بڑھکر کون میخانے میں تھا

ہائے پروانے کا وہ جلنا۔ وہ رونا شمع کا
میں نے روکا ورنہ کیا آنسو نکل آنے میں تھا

دیکھتا تھا جسطرف اپنا ہی جلوہ تھا عیاں
میں نہ تھا دنیا میں۔ وحشی آئینہ خانے میں تھا

دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا
چہرہ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا

ہو رہا تھا۔ کچھ شیشے میں تھی۔ یا ٹوٹے سبو
اور کیا اسکے سوا مستوں کے غم خانے میں تھا

ہنستے ہنستے رو دیا کرتے تھے اکثر قصہ خواں
اک نئی ترکیب کا درد اپنے افسانے میں تھا

خود غرض دنیا کی حالت قابل نفرت تھی شاد
لطف ملنے کا نہ اپنے میں۔ نہ بیگانے میں تھا

(۵۵)

نقاب اکدن الٹ دیتا تھا اس روئے دل آرا کو
ہم اپنا سا بنا لیتے کبھی تو اہل دنیا کو

کرم پیر مغاں کا مجھ پہ ہے سب سے سوا لیکن
کف اغیار میں دیکھا ہے ان آنکھوں نے مینا کو

نگاہ شوق مجنوں فرش سے تا عرش جاتی ہے
کہاں تک پردہ محمل چھپائے روئے لیلا کو

لباس اہل تقویٰ پر نہیں کچھ منحصر واعظ
کہیں کیا ہمنے کس کس بھیس میں دیکھا ہے دنیا کو

بہک جاتے ہیں اکثر سالکان راہ الفت بھی
خدا نے کیا غضب تاثیر دی ہے روئے زیبا کو

زمانہ چاہتا ہے وزن ہر شے کا برابر ہو
گھٹا دیتا ہے اعلیٰ کو بڑھا دیتا ہے ادنا کو

گہر کانوں کے جھک آئے ہیں اسکے روئے روشن پر
کہاں ہے آسماں صدقہ کرے عقد ثریا کو

جئیں یا حسرت دیدار میں ہم خاک ہو جائیں
قیامت تک خدا رکھے سلامت ناز بیجا کو

جو اُن کو بے حجاب اے شاد دیکھا چاہتے ہو تم
جلا دو اور بھی آئینہ قلب مصفا کو

ہے عطا تری ہے کرم ترا وہ ستم کہ جسمیں دوام ہو
اگر اسمیں کوئی کلام ہو تو بہشت مجھ پہ حرام ہو

جو ہوئے مسافر دشت غم ہوئی آسماں کو بھی انسے ضد
کئی رات خاک پہ رہے اگر ایک رات قیام ہو

کبھی دشت غم میں پھرا کئے کبھی انکے در پہ پڑے رہے
رہیں مثل اپنے بنا فلک۔ کہ نہ کوچ ہو نہ قیام ہو

وہ پیام بر ہو کہ خود وہی کوئی شرح کیا کرے جسکو گھڑی / نہ مفصل اوسکا بیان ہو نہ مفصل انکا کلام ہو

یہ دو رنگیاں تو خلاف ہیں نہ بنی کی شاد سے ساقیا / جو خمار ہو تو ہمیشہ ہو۔ جو شراب ہو تو مدام ہو

جب میں کہتا ہوں گوارا مری ذلت نہ کرو / مطلع / سر جھکا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں "محبت نہ کرو"

غزل

دیا جو عشق مجھے تو نے سرفراز کیا / ہر اک صفت سے مرے دل کو بے نیاز کیا

ازل میں عشق نے طینت کا امتیاز کیا / نیاز مند مجھے۔ تجھ کو بے نیاز کیا

نہ خوش ہو کیوں مری مستانہ چال پر ساقی / میکدہ سے چلا رخ سوئے حجاز کیا

کٹی تھی عمر صعوبت میں مرنیوالوں کی / لحد میں پاؤں غریبوں نے اب دراز کیا

کچھ اس طرح سے چھپائی ہے اپنی مستی شاد / کہ میکدہ میں کسی نے نہ امتیاز کیا

غزل

نہ ہوا تجھسے بھی چارہ کوئی بے چاروں کا / ہے غضب ڈہل گیا سکہ ترے بیماروں کا

ذکر تک لب پہ نہیں بچھڑے ہوئے یاروں کا / صبر کیوں لیتا ہے صیاد گرفتاروں کا

بیکسی ساتھ دیئے جاتی ہے بے چاروں کا / ترے بیماروں کا

جوش الفت ہی جو ہو فصل بہاری میں شریک / پردہ کھلجائے ابھی باغ کی دیواروں کا

حسن بے پردہ کو بازار میں لے آیا ہے شوق / چارسو بھیڑ ہے مجمع ہے خریداروں کا

رخنہ انداز نگاہ ہونے نہیں دیتے ہیں کام / پردہ رکھ لیتے ہیں اس کوچہ کی دیواروں کا

مطمئن ہو کے کہاں کہاتے ہیں روٹی دو دن / شاد کچھ پوچھ نہ احوال زمینداروں کا

زباں پہ مرتے ہوئے انکا نام آ ہی گیا / وہ اک خلوص جو تھا دلمیں کام آ ہی گیا

کہا تھا میں نے کہ واعظ تو انکا ذکر نہ چھیڑ / خدا کے باب میں آخر کلام آ ہی گیا

تمہارا راز مری درد دل نے کھول دیا / ہزار ضبط کیا لب پہ نام آ ہی گیا

غل آپڑا تھا جو رندوں میں زاہد نا فہم / سنا کہ ذکر حلال و حرام آ ہی گیا

وصال شاد مبارک ہو کھولئے روزہ / کٹا پہاڑ سا دن وقت شام آ ہی گیا

فقط

رعایت نصف قیمت عایت

گنج شایگاں - معروف بہ ٹکسال قدیم شاہان ایرانسے لیکر آجتک کے دنیا بھر کے بادشاہتوں ریاستوں وغیرہ کے سونے چاندی تانبے کے سکونکے دونوں رخونکی اصلی تصویر - سال - سنہ جلوس ماہیت عجیب چھپے ہیں - ایک مبسوط فہرست تمام سلاطین ہندوستان اور جلال الدین اکبر کے سکونکی دیکھنی ہے - (عہ)

تاج ونشان - معروف بہ تاج الملوک قدیم شاہان ایران سے لیکر تمام سلطنتوں ریاستوں وغیرہ کے تاج ونشان - فوجی مارک و بیریہ ہو وغیرہ کی اصلی تصویر ہیئت اونکی رنگتونکے دکھائی گئی ہے (۸ر)

دستار وکلاہ - تمام دنیا کی مختلف قسم کی پگڑی - ٹوپی - کنٹوپ - خود - انگریزی عہدیداروں - فوجی تماشہ والوں انگریزی لڑکوں لڑکیوں - لیڈیوں کی مختلف اوقات کی ٹوپیاں - مختلف قوموں کی پگڑی و ٹوپیاں - ان سب کے حالات و تصویریں درج ہیں (۸ر)

جنگ روس وجاپان - ہر حصہ میں فرہنگ جنگ سے لیکر ہر ایک واقعہ کا تفصیلی بیان ہر ایک موقع کا نقشہ دونوں جانب کے تمام افسروں کی تصاویر [illegible] کل ۲۶ تصاویر و نقشے ہیں اور ۵۶ مفصل بیانوں اور ماہ میں اس مشہور جنگ کے حالات لکھے ہیں ۸ ہر فی حصہ

احسن الاذکار فی مناقب غوث الابرار - غوث پاک کے مفصل سوانح - کرامات اور حالات مناقب بھی وخوارق عادات مریدوں اصحاب وغیرہ کا تذکرہ ۲ر المشتہر خیر شاہ
مہتمم علم بک ڈپو مراد آباد (روہیلکھنڈ)

دیوان شیفتہ

مع دیباچہ مفید و ضمیمہ مشتمل بر غزلیات فارسی شیفتہ

از تصنیفات نواب مصطفیٰ خان دہلوی شاگرد رشید مومن

شیفتہ کا دیوان کیاب ہو گیا تھا باتفاق کے ہم نے پھر چھاپا گیا ہے مجلد [illegible]

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنی

ملفوظات و حالات حضرت حضرت شیخ العالم مخدوم [illegible] ردولوی قدس اللہ سرہ جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲)

دیوان مجروح | میر مہدی حسین مرحوم شاگرد غالب - قیمت عہ

دی رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ شہر بھاگلپور کے چند زمیندار و رؤسا نے بہ صد بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہرگز یہ نیت نہیں کہ وہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہو بلکہ تجارتی دنیا کیلئے نفع بخش ثابت ہو کر ہے منشا اس کمپنی کا خاص یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے - پائدار نفیس دیسی قسم کا کپڑے از قسم لنگی چادر دہوتی و صافہ و رومال کشتی و بستی و بنگالہ ساڑھیاں ہر قسم ہر رنگ کی دستار ہر قسم ہر رنگ کا دھوپ چھاؤں سادہ و چکن دار وغیرہ لائق تیاری فیصلہ کن اور دیا جارہا ہے انگریزی اندرون و بیرون ہندوستان ہر جگہ باسانی بھیجی جائیں - نفاست و پائداری میں یہ خاص بھاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔

فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر کے جاسکتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص طرح کی رکھی گئی ہے نمونے [illegible]

رجسٹرڈ نمبر ۲۰۱

اردوئے معلّیٰ

جلد (۲) | بابت ماہ فروری ۱۹۰۹ء | نمبر (۲)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلیٰ علیگڈھ

احسن المطابع واقع علی گڈھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ (عہ مع محصول)

شاعری

شاعری رضائے الٰہی کی اصلی نقل صحیح ہے جو الفاظ با معنی کے ذریعے ظہور میں آتی ہو رضائے الٰہی سے مراد فطرت اللہ ہے اور فطرت اللہ سے مراد وہ قوانین فطرت ہیں جنہوں نے حسب مرضی الٰہی نفاذ پایا ہے اور جنکے مطابق عالم درونی و بیرونی نشو و نما پاتے گئے ہیں یعنی جاننا چاہیے کہ اسی عالم درونی و بیرونی کی نقل صحیح جو الفاظ با معنی کے ذریعے عمل میں آتی ہو شاعری ہے۔

واضح ہو کہ عالم دو قسم پر منقسم ہے ایک عالم خارجی ہو اور دوسرا عالم باطن جسے ذہنی کہتے ہیں پس جب عالم دو قسم پر منقسم ہو یعنی مادی اور غیر مادی تو مضامین بھی جو اُنسے متعلق ہوں ضرور ہے کہ دو رنگ ہوں چنانچہ حقیقت حال بھی یہی ہو کہ جو مضامین اشیائے فی الخارج سے تعلق رکھتے ہیں اون کا رنگ جدا ہے۔ اور جو امور ذہنیہ سے متعلق ہیں اُن کی کیفیت کچھ علیحدہ ہے اسی فرق رنگ کے اعتبار سے شاعری دو قسم پر تقسیم پاتی ہے یعنی شاعری متعلق بعالم خارج جسے بزبان انگریزی آبجکٹو (Objective) اور شاعری متعلق بعالم ذہن جسے بزبان انگریزی سبجکٹو (Subjective) کہتے ہیں۔ اول قسم کی شاعری جسکا نام راقم خارجی رکھتا ہے ایسے بیانات پر مشتمل ہوتی ہے جنسے عالم فی الخارج کے معاملات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں اکثر بیانات رزم بزم جلوس فوج تحرک احتشام بیابان باغ قصور چمن گلزار سبزہ زار لالہ زار جبال بحور صحرا دشت بیابان ریگستان خارستان جنگل آبستان چشمے ہوا ابر برق باران سیل برف شفق مہر شام روز شب قمر سیارے ثوابت قطب بروج و دیگر خارجی اشیا کے متعلق ہوتے ہیں بعض شعرا میں اس قسم کی شاعری کی صلاحیت ایسی دیکھی جاتی ہے کہ اُن کے بیان سے معاملات خارجیہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے اور جو لطف اعلیٰ درجے کے مصور کی قلمکاریوں سے اٹھتا ہے وہی لطف اونکے بیان سے پیدا ہوتا ہے یورپ میں اس رنگ کے شاعر کی مثال (انگریزی شاعروں میں) سر والٹر اسکاٹ

اور اُردو شاعروں میں کسیقدر نظیر اکبر آبادی ہیں۔ یورپ اور ایشیا دونوں میں اس رنگ کے کچھ ایسے شعرا گذرے ہیں کہ اگر انہوں نے کسی معاملہ رزم کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ رزم آنکھوں کے سامنے ظہور میں آ رہا ہے اسیطرح اگر انہوں نے جبال و بحور و صحرا وغیرہ کے حالات موزوں کیے ہیں تو یہ سب موجودات فی الخارج پیش نظر معلوم ہوتی ہیں اس طرح کی واقعہ نگاری پر قادر ہونا آسان امر نہیں ہے جبتک کہ شاعر کو معاملات خارجیہ پر غور اور فطرت اللہ کی تبعیت کی صلاحیت بدرجہ اتم حاصل ہو گی اپنے بیانات میں تصویر کا عالم نہیں پیدا کر سکیگا دوسری قسم کی شاعری جسکو راقم داخلی سوسوم کرتا ہے تمامتر ایسے مضامین سے متعلق ہوتی ہے کہ جنکو سراسر امور ذہنیہ سے سروکار رہتا ہے یہ شاعری انسان کے قوائے داخلیہ اور واردات قلبیہ کیفیتوں کی مصوری ہے اس رنگ کے بھی ممتاز شعرا یورپ اور ایشیا میں گذرے ہیں منجملہ اُن کے انگریزی شعرا میں لارڈ بیرن (Lord Byron) ہے اور اُردو شاعروں میں میر تقی اس رنگ کے شاعروں نے اگر عشق کو بیان کیا ہے تو عشق کی تصویر سامنے لاکر کھڑی کر دی ہے اسی طرح اگر انہوں نے غم غصہ رنج ملال افسوس حسد بغض رشک محبت عداوت رغبت نفرت وغیرہ وغیرہ کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسے ایسے امور ذہنیہ کے بیان میں مصور کی قلمکاری کا لطف دکھایا ہے۔ بہر حال ان دونوں رنگوں کے شعرا کی کلام مختلف زبانوں میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسیکو معاملات خارجیہ کے بیان پر قدرت حاصل تھی اور کسیکو امور ذہنیہ کے اظہار کوائف کی صلاحیت مودعہ تھی۔ علاوہ اسکے کچھ ایسے شعرا بھی اقوام مختلفہ میں دیکھے جاتے ہیں کہ دونوں رنگ کی شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور اسی دوہری قابلیت کیوجہ سے اُن کی شہرت آجتک برقرار ہے بلکہ ترقی علوم و فنون کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے اس جامعیت کی مثال ہومر ورجل فردوسی شیکسپیر ملٹن گرے ٹینی سن والمیکی بیاس اور کالیداس ہیں۔

جاننا چاہیے کہ شاعری کے مذاق صحیح و غیر صحیح کا مدار انہیں معاملات خارجیہ

اور امور ذہنیہ کی واقفیت پر ہے جن شعرا نے عالم درونی و بیرونی کے مضمون کو ملحوظ
رکھکر مضمون بندی کی ہے اُن کی شاعری مذاق صحیح سے خالی نہیں ہو سکتی۔ عالم خارج
و داخل کے تقاضوں پر لحاظ رکھکر کاربند ہونا تبعیت فطرت ہی پس جب کوئی شاعر
تبعیت فطرت کی پابندی کے ساتھ مضمون بندی کریگا تو عام اس سے کہ اوسکی شاعری
کا انداز خارجی ہو یا داخلی اوسکی شاعری ضرور فطرتی ہوگی اسی فطرتی شاعری کو
مذاق صحیح کا مصداق سمجھنا چاہیے برخلاف اسکے اگر کوئی شاعر معاملات خارجیہ و ذہنیہ
کے تقاضوں سے انحراف کرے یعنی تبعیت فطرت نہ کرے تو اوسکی شاعری مذاق
غیر صحیح کا نقشہ پیدا کریگی۔

اسی اصول پر سخن فہموں کے مذاق کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور حق یہ ہے کہ سخن
فہم کو معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی واقفیت اور اونکے تقاضوں کی اطلاع
خود شاعر کے برابر یا شاعر سے بھی زیادہ درکار ہے اگر زیادہ نہو تو شاعر کے برابر
تو ہو کسواسطے کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ فطرتی مضامین شاعر کو تبعیت فطرت کے قصد کے بغیر
بسبیل الہام تفویض ہوتے ہیں اور خود شاعر اپنے کلام کی خوبیوں سے شعر گوئی کے
وقت آگاہ نہیں رہتا ہے بلکہ بہت ایسے مضامین اوسکے قلم سے الہامی طور پر نکل آتے
ہیں کہ سخن فہموں کو اوسکی خوبیاں بعد فکر و غور کے درک میں آتی اور شاعر اونکی
اطلاع سے ممکن ہو کہ تا دم آخر محروم رہجای پس ایسی صورت میں ضرور ہے کہ سخن فہم
معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی نہایت وسیع اطلاع رکھے ورنہ شعر فہمی میں عاجز رہیگا
اسلیے ذی فہموں نے کہا ہے کہ شعر گوئی سے شعر فہمی مشکل ہے۔ یہ قول اگر تمامتر صحیح نہ
بھی مانا جاوے تاہم اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ شعر فہمی ایک دشوار امر ہے کسواسطے
کہ اسکے واسطے بڑے مذاق صحیح کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شعر فہمی کا مذاق
صحیح کسیکو نہیں حاصل ہو سکتا ہے جبتک کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی واقفیت
اور اونکے تقاضوں سے آگہی بدرجہ اتم حاصل نہو جب تک انسان بحد امکان اسکی
واقفیت پیدا کر لے زنہار دعوی سخن فہمی نکرے کیا تعجب کی بات ہے کہ بعض اشخاص

اور اُردو شاعروں میں کسیقدر نظیر اکبرآبادی ہی - یورپ اور ایشیا دونوں میں اس رنگ کے کچھ ایسے شعرا گزرے گئے ہیں کہ اگر انہوں نے کسی معاملہ رزم کو حوالہ قلم کیا ہی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاملہ رزم آنکھوں کے سامنے ظہور میں آرہا ہی اسیطرح اگر انھوں نے جبال و بحور و صحرا وغیرہ کے حالات موزوں کئے ہیں تو یہ سب موجودات فی الخارج پیش نظر معلوم ہوتی ہیں اس طرح کی واقعہ نگاری پر قادر ہونا آسان امر نہیں ہے جبتک کہ شاعر کو معاملات خارجیہ پر غور اور فطرت اللہ کی تبعیت کی صلاحیت بدرجہ اتم حاصل ہوگی اپنے بیانات میں تصویر کا عالم نہیں پیدا کر سکیگا دوسری قسم کی شاعری جسکو راقم داخلی موسوم کرتا ہے تمامتر ایسے مضامین سے متعلق ہوتی ہے کہ جنکو سراسر امور ذہنیہ سے سروکار رہتا ہے یہ شاعری انسان کے قوائے داخلیہ اور واردات قلبیہ کی کیفیتوں کی مصوری ہے اس رنگ کے بہی ممتاز شعرا یورپ اور ایشیا میں گزرے ہیں منجملہ اُن کے انگریزی شعرا میں لارڈ بیرن (Lord Byron) ہی اور اُردو شاعروں میں میر تقی اس رنگ کے شاعروں نے اگر عشق کو بیان کیا ہے تو عشق کی تصویر سامنے لاکر کھڑی کر دی ہے اسی طرح اگر انہوں نے غم غصہ رنج ملال افسوس حسد بغض رشک محبت عداوت رغبت نفرت وغیرہ وغیرہ کو حوالہ قلم کیا ہے تو ایسے ایسے امور ذہنیہ کے بیان میں مصور کی قلمکاری کا لطف دکھایا ہے - بہرحال ان دونوں رنگوں کے شعرا کی کلام مختلف زبانوں میں موجود ہیں جن کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسیکو معاملات خارجیہ کے بیان پر قدرت حاصل تہی اور کسیکو امور ذہنیہ کے اظہار کی الیف کی صلاحیت مودعہ تہی - علاوہ انکے کچھ ایسے شعرا بہی اقوام مختلفہ میں دیکھے جاتے ہیں کہ دونوں رنگ کی شاعری پر یکساں قدرت رکھتے تہے اور اسی دوہری قابلیت کی وجہ سے اُن کی شہرت آجتک برقرار ہے بلکہ ترقی علوم و فنون کے ساتہ ترقی کرتی جاتی ہے اس جامعیت کی مثال ہومر ورجل فردوسی شکسپیر ملٹن گرٹی میر انیس والمیکی بیاس اور کالیداس ہیں -

جاننا چاہیے کہ شاعری کے مذاق صحیح و غیر صحیح کا مدار انہیں معاملات خارجیہ

اور امور ذہنیہ کی واقفیت پر ہے جن شعرا نے عالم درونی و بیرونی کے تقاضوں کو لحاظ رکھکر مضمون بندی کی ہے اُن کی شاعری مذاق صحیح سے خالی نہیں ہو سکتی۔ عالم خارج و داخل کے تقاضوں پر لحاظ رکھکر کاربند ہونا تبعیت فطرت ہے پس جب کوئی شاعر تبعیت فطرت کی پابندی کے ساتھ مضمون بندی کریگا تو عام اس سے کہ اوسکی شاعری کا انداز خارجی ہو یا داخلی اوسکی شاعری ضرور فطرتی ہوگی اسی فطرتی شاعری کو مذاق صحیح کا مصداق سمجھنا چاہئے برخلاف اسکے اگر کوئی شاعر معاملات خارجیہ و ذہنیہ کے تقاضوں سے انحراف کرے یعنی تبعیت فطرت نہ کرے تو اوسکی شاعری مذاق غیر صحیح کا نقشہ پیدا کریگی۔

اسی اصول پر سخن فہموں کے مذاق کو بھی قیاس کرنا چاہئے اور حق یہ ہے کہ سخن فہم کو معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی واقفیت اور اونکے تقاضوں کی اطلاع خود شاعر کے برابر یا شاعر سے بھی زیادہ درکار ہے اگر زیادہ نہو تو شاعر کے برابر تو ہو کسواسطے کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ فطرتی مضامین شاعر کو تبعیت فطرت کے قصد کے بغیر بسبیل الہام تفویض ہوتے ہیں اور خود شاعر اپنے کلام کی خوبیوں سے شعرگوئی کے وقت آگاہ نہیں رہتا ہے بلکہ بہت ایسے مضامین اوسکے قلم سے الہامی طور پر نکل آتے ہیں کہ سخن فہموں کو اوسکی خوبیاں بعد فکر و غور کے درک میں آتی اور شاعر اونکی اطلاع سے ممکن ہے کہ تا دم آخر محروم رہجائے پس ایسی صورت میں ضرور ہے کہ سخن فہم معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی نہایت صحیح اطلاع رکھے ورنہ شعر فہمی میں عاجز رہیگا اسلیئے ذی فہموں نے کہا ہے کہ شعرگوئی سے شعر فہمی مشکل ہے۔ یہ قول اگر تمام تر صحیح نہ بھی مانا جائے تاہم اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ شعر فہمی ایک دشوار امر ہے کسواسطے کہ اسکے واسطے بڑے مذاق صحیح کی ضرورت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ شعر فہمی کا مذاق صحیح کسیکو نہیں حاصل ہو سکتا ہے جبتک کہ معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ کی واقفیت اور اونکے تقاضوں سے آگہی بدرجہ اتم حاصل نہو جب تک انسان بحد امکان اسکی واقفیت پیدا کرلے زنہار دعوی سخن فہمی نکرے کیا تعجب کی بات ہے کہ بعض اشخاص

جو عالم مادی اور عالم ذہنی کا فرق تک نہیں سمجھتے ہیں شعرا کی نسبت رائے زنی کیلئے مستعدی ہو جاتے ہیں اور بے محابا جو کچھ منہ میں آتا ہے فرما جاتے ہیں ایسے حضرات سے جب چاہیے سن لیجیے کہ فلاں شاعر نے خوب غزلیں لکھی ہیں فلاں شاعر نے خوب قصیدے لکھے ہیں فلاں شاعر نے خوب مثنویاں کہی ہیں حالانکہ یہ بھی ان حضرات کو نہیں معلوم کہ غزل کو کس قسم کے مضامین سے تعلق ہے اور قصیدے اور مثنویوں کے لئے کن اقسام کے مضامین درکار ہیں یعنی انہیں اسکی کوئی خبر نہیں کہ غزل قصیدہ و مثنوی کے لئے معاملات خارجیہ یا امور ذہنیہ کے متعلق مضامین درکار ہیں یا دونوں کے مضامین کی آمیزش کی حاجت ہے۔ پس جب کسی شخص کو ان باتوں کی تمیز نہ ہوگی تو وہ فطرتی اور غیر فطرتی شاعری کے پہلو کیا سمجھے گا پھر ایسے شخص سے سخن فہمی اور شاعروں کی قدر دانی کی کیا امید کیجا سکتی ہے سخن فہم کو فطرت اللہ سے وفور اطلاع کی بڑی حاجت ہے ایسے شخص کی اطلاع کو بہت وسیع ہونا چاہیے۔ ضرور ہے کہ ایسا شخص معاملات خارجیہ اور امور ذہنیہ سے پوری واقفیت رکھے اور واقفیت اسکی محصلانہ طور کی ہو محصلانہ سے مراد حکیمانہ ہے یعنی یہ نہیں کہ عدم ترتیب کے ساتھ ہزاروں امور سے واقفیت رکھتا ہو مگر اس بے ترتیبی کے سبب سے اپنی دانست سے کوئی کام نہ لے سکے۔ مرد محصل کے خیالات سلسلہ وار اور منتظم ہوتے ہیں اور فطرت اللہ کے سمجھنے کے لئے اس ترتیب و انتظام کی بڑی ضرورت ہے۔ المختصر شعر فہمی حکیم کا کام ہے اور شعرا کی نسبت رائے زنی آسان امر نہیں ہے پس مناسب نہیں ہے کہ غیر محصل اشخاص رائے زنی کی تکلیف کو اپنے اوپر گوارا کریں۔

جیسا کہ سابق میں عرض ہوا کہ سخن فہم کو فطرت اللہ سے محصلانہ اطلاع درکار ہے اس عدم اطلاع سے حضرات ناواقف عجیب عجیب طرح کے مغالطے میں پڑتے ہیں بعض اشخاص معاملات فطرت سے ناواقف رہنے کے باعث مجرد شوکت لفظی کو شاعری سمجھنے لگتے ہیں اور اسی غلط خیالی میں ہمیشہ مبتلا رہا کرتے ہیں ظاہر ہے کہ مجرد شوکت لفظی کوئی شے نہیں ہے شاعری زنہار شوکت لفظی نہیں۔ شاعری کا مدار خوش

خیالی پر ہے و شوکت لفظی پر۔ شاعری کی جان خوش خیالی ہے شوکت لفظی شاعری کا کوئی جزو بدن نہیں ہے البتہ شوکت لفظی خلعت فاخرہ کا حکم رکھتی ہو اور تب ہی خوشنما معلوم ہوتی ہی کہ قطع برید سے درست ہو اور جس مضمون کو پہنائیں وہ جامہ زیب بھی ہو ورنہ شعر سعدی صادق آئیگا ؎

گر بود بر عروس نازیبا	بد نماید بیقی و دیبا

اسمیں شک نہیں کہ اگر موقع کی شوکت لفظی ہوتی ہے تو اس سے شاعری میں ایک دبدبہ پیدا ہوتا ہے لیکن اگر شوکت لفظی بد قرینگی کے ساتھ ہے یعنی فطرت اللہ کی تبعیت کے ساتھ نہیں ہو تو ایسی شوکت لفظی شخص محصل کی آنکھ میں بدنما معلوم ہوگی گو اُس سے غیر محصل اور ناقص التعلیم کو چکا چوندہ لگ جای۔ اکثر شوکت لفظی اس قسم کی ہوتی ہی کہ حکیم اوس سے نافر اور جاہل اوسکی طرف راغب ہوتا ہی۔ کمتر شوکت لفظی ایسی دیکھی جاتی ہی کہ تبعیت فطرت کے ساتھ اُس سے کسی مضمون عالی کی بندش ظہور میں آئی ہو۔ جاننا چاہیے کہ مسائل محققہ اور امور فطرتی کبھی محتاج شوکت لفظی کے نہیں ہیں وہی شعرا اس سے کام لیتے ہیں جو اپنے غیر فطرتی اقوال کو پُر از شان و شکوہ دکھایا چاہتے ہیں۔ فطرت کا تقاضا سادگی ہے اور جب کلام تبعیت فطرت کے ساتھ ہوگا ضرور ہوا اسمیں سادگی ہوگی

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی	قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہی

المختصر جاننا چاہیے کہ بےموقع کی شوکت لفظی نہایت نامطبوع امر ہے اور اسلئے قابل حذر ہے جب بےموقع اس کا استعمال ہوگا تو کبھی تقاضای فطرت کے مطابق نہ ہوگا اور جب تبعیت فطرت کی باقی نہیں رہی تو حکیمانہ دماغ کو ایسے پُرشکوہ غیر فطرتی کلام سے حظ ہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ شوکت لفظی کی مثال مصوری کی پیرائی میں یہ ہے کہ مثلاً کسی مصور سے کہا جائے کہ ایک عربی گھوڑے کی تصویر کھینچ لاؤ اگر مصور صاحب مذاق صحیح ہی یعنی مرد محصل ہے تو اپنی اطلاع کے مطابق جیسا کہ عربی گھوڑا ہوتا ہے ویسے ہی اوسکی تصویر کھینچ لائیگا لیکن اگر بدمذاق ہے یا جان بوجھکر

فطرت انشو عداوت رکہتا ہی تو ترقی بطلان رنگوں کی طرف سے تصویر کشی میں [illegible]
انشو اگر [illegible] ممکن ہی اسراف کریگا مثلاً گہوڑے کے بدن کو دہانی رنگ دیگا سم لعل
کے کان یاقوت کی آنکہیں نیلم کی منہ فیروزہ کا پیشانی پکہراج کی دُم منقش کی بنا دیگا
بلکہ اسپر بہی قناعت نہ کرکے اوپر بہی جواہر نگار لگا دیگا۔ گہوڑے کی ایسی تصویر
عالم فطرت کو جیسی مکروہ معلوم ہوگی محتاج بیان نہیں ہے مگر غیر محصل شخص تو ایسے بو
قلمونی الوان و مرصع کاری کو دیکہکر جان و دل سے محو سہو ہو جائیگا یہی حال نا تعلیم
یافتہ آدمی کے ہر قسم کے مذاق کا ہی شخص غیر محصل لباس وہی اختیار کرتا ہی جو زنگارنگ
اور زر آلود ہو گہوڑے ہاتی لڑکے بالے نوکر چاکر سبکی آراستگی اوسی نامطبوع ترکیب
سی پسند کرتا ہی مکان اسی مذاق کے ساتہ تعمیر کرتا ہے مختصر یہ ہے کہ جو کچہ کرتا ہے
جاہلانہ شان و شکوہ کے ساتہ کرتا ہی خیر راقم نے جو مصوری کے پیرایہ میں مثال بالا
عرض کی اوسمیں چنداں مبالغہ کو دخل نہیں ہے غیر محصل اشخاص کا مذاق ایسا ہی ناپسندیدہ
انداز کا ہوتا ہی بہرکیف یہ مثال تو مصوری کے پیرایہ میں تہی اگر شعرای ایشیا کے کلاموں
میں ایسی مثالیں ڈہونڈہیے تو بیشمار ملتی ہیں واقعی شعراے ایشیائی نے ملوک
امرا کو عجب تماشے کا گہوڑا بنا رکہا ہی اگر گہوڑے کو بلند دکہایا ہی تو اوسکی بلندی
کو آسمان سی بہی زیادہ رفیع دکہلایا ہی چنانچہ ظہیر فاریابی نے اپنی ممدوح کے گہوڑے کو اسقدر
بلند دکہلایا ہی کہ عرش اللہ تعالیٰ بہی اوس سی کچہ نیچا ہی نظر آتا ہی فرماتے ہیں شعر

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا	تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

اس شعر کا بے تکاپن محتاج بیان نہیں ہی مگر سعدی کہ شاعری کا مذاق صحیح رکہتے
ہیں نہایت تبعیت فطرت کے ساتہ فرماتے ہیں۔ شعر

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان	نہی زیر پاے قزل [illegible]

شوکت لفظی کے علاوہ عوام رعایت لفظی کو بہی جان شاعری قیاس کرتے ہیں
حالانکہ رعایت لفظی بجای خود کوئی شئی نہیں ہی اور شاعری سے اسکو کوئی تعلق ضروری
نہیں ہی اگر بے تکلف کسی شعر میں رعایت لفظی کی صورت پیدا ہو جای تو ایسی رعایت

لفظی فی الحال از لطف شعور نہیں ہی مگر بہ تکلف رعایت لفظی کا التزام صرف ناپسندیدہ ہی
نہیں ہے بلکہ یہ بھی شاعری کے بہت منافی ہے بعض شعرا کو رعایت لفظی کا مرض ہوتا ہی
اور غیر محصل اشخاص اونکے کلام کو بوجہ رعایت لفظی کے خیال ہو پسند کرتے ہیں رعایت
لفظی تبھی لطف دیتی ہی کہ باخود الفاظ میں معنوی تعلق موجود ہو ایسی صورت میں رعایت
لفظی انتخاب الفاظ مناسب مربوط کے اصول پر مبنی ہوتی ہی۔

منجملہ بدمذاقیوں کے غیر فطرتی مبالغہ پردازی بھی ایک نہایت ناپسندیدہ امر ہے
اسکے مرتکب ایشیائی شعرا بہت دیکھے جاتے ہیں ان شعرا کی اس بدمذاقی کا سبب
بیشتر بادشاہ اور امرا ہوتے گئے ہیں۔ تقرب سلطانی نے اکثر عالی دماغ اور عالی خیال
شعرا کو بھی برباد کر ڈالا ہی عوام مبالغہ پردازی کو عین شاعری سمجھتے ہیں حالانکہ فطرتی
شاعری میں مبالغہ پردازی کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

سوای ان لغویات کے غیر محصل اشخاص بہت سے صنایع بدیع کو ضروریات شاعری
سے شمار کرتے ہیں لیکن اہل مذاق سے پوشیدہ نہیں ہی کہ ایسے ایسے ڈھکوسلوں
کو شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس مقام پر ایک اور بھی بدمذاقی کا اعادہ ضرور معلوم ہوتا ہی اور وہ یہ ہے
کہ شعرا کبھی پست خیالی کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں شاعر کے لئے پست خیالی سخت
عیب ہے حقیقت حال یہ ہی کہ بعض شاعر فطرت کے رو سے پست خیال ہوتے ہیں اور
اون کی طبیعت ہمیشہ پستی کیطرف میلان رکھتی ہے۔ راقم ایسے حضرات کو شاعر کے
معزز خطاب کے قابل نہ سمجھکر اور شاعر سے فرق کرنے کی نظر سے شعر گو کے لقب سے
ملقب کرتا ہے۔ ایسے حضرات بلا تامل زنان بازاری کے مناقب لکھنے کے لئے ستلے
رہتے ہیں اور غزل سرائی میں انہیں فواحش کو معشوق قرار دیتے ہیں اور کلام کی
ترکیب ایسی بُری رکھتے ہیں کہ جس سے معشوق بازاری کے سوا معشوق حقیقی مراد لیا جا
ہی نہ سکے۔ اسی طرح جوش جدائی وغیرہ کا بیان اس بدمذاقی کے ساتھ کرتے ہیں کہ جس سے
دلی تنفر پیدا ہوتا ہی بیشک عہد جدائی بہت جوش انگیز ہوتا ہی اور تقاضاے بشریت سے ناجائز

امور کی طرف طبیعت کو میلان ہی [illegible] ایسے معاملات [illegible]
اس قابل نہیں ہیں کہ شاعر اون کو [illegible] ورغبت کے ساتھ شعروں میں باندھے
اور وہ شعر زانو پہ ساتھ مار مار کر پڑھے [illegible]

مکروہ مضامین سے حتی الامکان اجتناب واجبات سے ہے مجرد نیچرل ہونے سے
کوئی مضمون شاعر کے اختیار کرنے کے قابل نہیں ہوتا ہے ہزاروں مضمون ایسے
ہیں کہ جو نیچرل یعنی فطرتی ہیں مگر اس سے ضرور نہیں کہ شاعر یا ناولسٹ انکو حوالہ
قلم کر ڈالے پستی خیالات سے احتراز پہلا کام شاعر اور ناولسٹ کا ہے۔

سابق میں جو بد مذاقیاں حوالۂ قلم ہوئیں بیشتر اونمیں قدیم سے چلی آتی ہیں اور
امراض قدیمہ سے شمار کیجا سکتی ہیں مگر اس زمانے میں ایک نئی بیماری پیدا ہوئی ہے
اور وہ یہ ہے کہ اکثر اوہورے انگریزی خوانوں کے دماغ میں اس خیال فاسد نے
جگہ کر لی ہے کہ ساری خوبیاں یورپ پر ختم ہو گئی ہیں ایشیا کو خوبی کا کوئی حصہ ملا ہی
نہیں ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ اس زمانے میں یورپ نے مادیات میں بڑی ترقی کی
ہے یہاں تک کہ اکابر علمای یورپ خدا سے بھی استغنی نظر آتے ہیں یہ کوئی تعجب
کی بات نہیں ہے علوم مادیات کا یہی تقاضا ہے کہ انسان تدہر اختیار کرے چنانچہ
یہ امر محقق ہے کہ انسان جسقدر مادیات میں ترقی کرتا جاتا ہے روحانیات سے دور پڑتا
جاتا ہے حتی کہ آخرکار خدا اور تمام روحانیات سے منکر ہو بیٹھتا ہے۔ خیر جو کچھ یورپ
تدہر کی حالت میں مبتلا ہو رہا ہے اوسکی مادی ترقیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا
مگر اس سے یہ بات نہیں ثابت ہوتی ہے کہ اگر یورپ ساری خوبیوں سے معمور ہے تو
ایشیا تمام خوبیوں سے محروم ہے قصور معاف اکثر ہمارے نئی روشنی والے حضرات
کا تو ایسا ہی خیال معلوم ہوتا ہے وہ ایشیائی خیالات اوضاع و معاملات کو بالکل
قابل نفرت سمجھتے ہیں یورپ کے ہر امر پر عام اس سے کہ معقول ہو یا غیر معقول جان
دئے لیتے ہیں اور اپنے اقوال و افعال سے عجب طرح کی نادیدگی ظاہر کرتے ہیں
جا و بیجا ہر قدم پر اہل یورپ کے تتبع پر مستعد رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے

مکروہ مضامین

مغربی خوبیاں

خل ما صنا و [illegible] [illegible] مبارک تک کبھی پہونچا ہی نہیں
ان حضرات کی دلدادگیاں خیالات [illegible] اسقدر بڑھ کر پہونچ گئی ہیں
کہ ایشیائی شاعری ہی اُن کی نظر میں ذلیل و حقیر معلوم ہوتی ہے حالانکہ خود
اہل یورپ اسکے معترف ہیں کہ ابھی تک انہیں ایشیائی خیالات شاعرانہ سے آشنائی
پیدا نہیں ہوئی ہے اور بہت کچھ اونکو معلوم کرنا ہے چنانچہ اسوقت تک جو کچھ اونکو
ایشیائی شاعری سے اطلاع کی شکل پیدا ہوئی ہے وہ پایۂ اعتبار نہیں رکھتی ہے
اسپر بھی جسقدر وہ مطلع ہو چکے ہیں اُس حساب سے ایشیائی شاعری کی وقعت اُنکے
دلوں میں پیدا ہو چکی ہے۔ حضرات ناظرین راقم کی اس تحریر سے یہ نہ سمجھیں کہ ایشیائی
شاعری تمام معایب سے پاک ہے اسپر بھی قابل نفرت نہیں ہے مگر نئی روشنی والے
حضرات نے اسکو تسلیم کر لیا ہے کہ جو معایب ہیں ایشیائی شاعری میں ہیں اور یورپین
شاعری تمام معایب سے مبرا ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ فارسی اور اردو کی شاعریاں معایب رکھتی ہیں مگر ان معایب سے
ایشیائی شاعریاں ایسی ذلیل نہیں ہیں کہ کسی حکیم یا مرد عقل کے قابل توجہ نہوں
راقم جب ان نئی روشنی والوں کو یورپ کی شاعری کا ذکر کرتے سنتا ہے تو ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ اونکے خیال میں یوروپین شاعری تمام معایب سے پاک منصوص ہے
اور ایشیائی شاعری اسکے برخلاف سراسر عیب ہی عیب ہے۔ بدانست راقم اس تنگ
چشمی کا سبب نادیدگی ہے یا یہ کہ یوروپین شاعری بسبب ایک امر جدید ہونیکے
پرلذت معلوم ہوتی ہے اسمیں شک نہیں کہ یوروپین شاعری کی آگاہی سے ہم
ایشیائیوں کی شاعری کو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے نئے نئے مضمون دستیاب
ہو سکتے ہیں مگر یہ فائدہ یوروپین شاعری کو بھی ہماری ایشیائی شاعری سے
پہونچ سکتا ہے۔ اسواسطے کہ بہت سی نازک خیالیاں ایشیائی شاعری میں ایسی
ہیں جنسے شعراے یورپ کے دماغ کو ابھی آشنائی پیدا نہیں ہوئی ہے اس امر کا
اعتراف خود اہل یورپ اور اہل امریکہ کو ہے بہرحال اہل یورپ کو ایشیائی

خیالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ضرور ہوگا یا پوری طرح از روفارسی عربی یا ان زبانوں کے شعرا کی تصانیف کو نہایت [illegible] ساتھ ترجمہ کر ڈالیں اسیلئے ہم لوگوں کو ترقی فن شاعری کیلئے دو امر درکار ہیں ایک یہ کہ جو معایب ایشیائی شاعری کے ہیں اُن سے متنبہ ہوکر انکے ازالے کی فکر کریں دوم یہ کہ جو جو خوبیاں یوروپین شاعری میں ہیں انکو حسب ضرورت اپنی شاعری میں داخل کرنے کی صورتیں نکالیں۔

یہاں ایک بات یوروپین شاعری کی خوبی کی نسبت عرض کر دینا مناسب ہے یہ ایسی بات ہے کہ جس سے ہمارے ایشیائی شعرا محروم ہوتے ہیں یعنی شعرای یورپ اپنی تصانیف میں ہزاروں امور کو جو متعلق جغرافیہ اور تاریخ کے ہیں داخل کرتے ہیں برخلاف اسکے ایشیائی شاعر، اِن امور سے خاصکر امور جغرافیہ سے نہایت نابلد معلوم ہوتے ہیں چند معمولی شہروں دریا و کوہ کا ذکر بھی جو کرتے ہیں تو آگاہی علم جغرافیہ سے اونکے ذکر کو تعلق نہیں معلوم ہوتا ہے بلاشبہ جب ہمارے ملک کے طبیعت داروں کو اہل یورپ کا یہ مذاق صحیح معلوم ہو جائیگا تو حسب مراد تاریخ و جغرافیہ کی اطلاع کی صورت پیدا کرینگے اور اس ذریعے سو بہت سو نئے نئے مضامین ایشیائی شاعری میں داخل ہو جائینگے۔

واضح ہو کہ شاعری ایک امر طبعی ہے اور جز و فطرت ہونیکے باعث کسی حال میں انسان سو منفک نہیں ہوسکتی۔ جیسے کہ تاریخی وسائل سے انسان کے حالات کا پتا لگتا ہے ہر ملک و ہر قوم و ہر وقت میں شاعری نثر یا نظم کے پیرائے میں جلوہ گر رہی ہے۔ وحشی قوم پر لحاظ کیجیے تو کچھ نہ کچھ شاعری اوس قوم میں پائی جائیگی گو اُس قوم کی شاعری ہومیروس ورجل، فردوسی ملٹن بالمکی میر انیس کے درجہ کی شائستگی اور بلند خیالی کے اعتبار سے نہ ہو کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں ہے کہ جسمیں کچھ نہ کچھ گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ یہی گیت قومی شاعری سے خبر دیتے ہیں اگر انہیں وحشی اقوام کو تعلیم یافتگی نصیب ہو تو اونکے شعرا میں بھی ہومیروس وغیرہ کی عالی خیالی پیدا ہوسکتی ہے مختصر یہ ہے کہ چونکہ شاعری داخل فطرت انسانی ہے جہاں انسان کا وجود پایا جاتا ہے وہاں

شاعری بھی موجود رہتی ہے گو وہ شاعری کسی درجہ ابتذال کی ہو اس سے شاعری
کا ایک امر فطرتی ہونا ثابت ہوتا ہے اگر شاعری کے ذہنی تعلق پر غور کیجیے تو شاعری
سے ایک قلبی کیفیت درک ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری تب ہی انسان
سے منفک ہو سکتی ہے جبکہ خود قلب معدوم و مفقود ہو جائے البتہ مختلف انسانوں
کو مختلف درجے کی صلاحیت قلبی بخشی گئی ہے اور گو بعض انسان بظاہر
شاعری سے بے لگاؤ معلوم ہوتے ہیں مگر کبھی ایسا نہیں ہے کہ بعض انسان کو
دیا گیا ہو اور قلب واردات قلب سے خالی ہو۔ جاننا چاہیے کہ یہی واردات قلبیہ
شاعری کے تخم ہیں عام اس سے کہ اون سے شاعری کا درخت اوگے یا نہ اوگے فقیر
کی دانست میں ہر صاحب واردات قلبیہ کچھ نہ کچھ شاعر ہے گو اوسنے کبھی ایک مصرعہ
بھی نہ کہا ہو ایسا شخص اپنے لئے تو ضرور شاعر ہے گو اپنی شاعری کا اثر دوسروں
تک بسبب موانع کے نہیں پہونچا سکتا ہے فقیر شاعر نہیں ہے مگر اپنے واردات
قلبیہ پر جو لحاظ کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واردات قلبیہ ایک ایسا عالم رکھتی
ہیں جسکے گرد کو بھی عالم مادی نہیں پہونچ سکتا ہے درحقیقت واردات قلبیہ کا ایک
ایسا عالم معلوم ہوتا ہے کہ تمام عالموں سے مستغنی ہے اور اگر اوس عالم میں ترقیاں
پیدا ہوں تو قلب پورا عالم اکبر کا عالم دکھلا سکتا ہے یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ قلب
سے مراد وہ صنوبری شکل مضغہ گوشت نہیں ہے جو انسان کے سینے کے اندر جانب
چپ میں واقع ہے۔ قلب سے مراد وہ لطیفہ ربانیہ ہے کہ جسکو خدا نے اپنی جلوہ گاہ
بنایا ہے اور جس سے تعلق روحانیات کو کر دیا ہے پس جاننا چاہیے کہ شاعری
اسی لطیفہ ربانیہ کا جوش ہے عام اس سے کہ اوسکا اظہار نطق یا قلم سے ہو یا واردات
قلبیہ کی طرح دل ہی دل میں رہجائے جب شاعری کو اتنا بڑا تعلق قلب کے ساتھ ہے
تو شاعری کے فطرتی ہونے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

جب شاعری ایک امر فطرتی ہے تو اس سے اغراض انسانی کا کم و بیش طور پر تعلق
رکھنا بھی خالی از فطرت نہیں ہے چنانچہ عند التفحص یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شاعر

اگلے زمانوں میں اپنا جلوہ دکھاتی رہی ہے اور آج بھی اسکی وہی رونق باقی ہے اور
تا بقائے نوع انسان اسکی رونق سابق کی طرح رہیگی قدیم اہل مصر و اہل یونان و
اہل روم و اہل ہند اور بعثت آنحضرت صلعم سے پہلے کے اہل عرب کے درمیان
میں شاعری ایک قومی آلۂ تمدن و مذہب سمجھی جاتی تھی بعد بعثت کے بھی اسکا زور و شور
قایم رہا گو انداز شاعری میں بہت فرق آگیا اور اسکے اغراض کے پہلو بدلتے گئے کتب
تواریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی بادشاہوں نے شاعری کو بہت
عزیز رکھا ہو گو ان کی توجہ سے نفس شاعری کو فروغ بھی بہت پہونچا گیا ہے۔

شاعری صرف شاہان اسلام میں ممتاز صورت نہیں رہی ہے بلکہ عیسائی شاہان
یورپ بھی اسکے قدردان رہے ہیں۔ یورپ اور ایشیا دونوں بر اعظموں میں اسکی یکساں
توقیر رہا کی ہے اور جو اسکی قوت سابق میں تھی آج تک باقی ہے۔ فرق اسیقدر ہے
کہ اب شاعری کے عنوان بدل گئے ہیں ورنہ نفس شاعری اپنے حال پر ہے اور اسسے
برنگ سابق تمدنی اخلاقی اور مذہبی کام لئے جا رہے ہیں۔ عامیانہ خیال کا آدمی پوچھ
سکتا ہے کہ اس انیسویں صدی میں تو نہ یورپ نہ ایشیا میں شاعری کو کسی قسم کا فروغ
نظر آتا ہے پھر شاعری کی سابق قوت سے اعتراف کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہراً شخص ناواقف
کا اعتراض بہت بجا معلوم ہوتا ہے واقعی اسوقت میں ہومیر کس۔ ورجل شیکسپیر ملٹن
گرلی فردوسی سعدی حافظ کالیداس بالمیکی وغیرہ کے مماثل لوگ کہاں ہیں جنسے
شاعری کے فروغ کی صورت قیاس کیجا سکتی۔ اس عہد میں بظاہر شاعری کی رونق تو کہیں
بھی دیکھی نہیں جاتی۔ مگر جب نفس شاعری کے فروغ و غیر فروغ پر لحاظ کیجئے تو صاف معلوم
ہوتا ہے کہ شاعری انسان کے داخل فطرت ہونیکے باعث اسیقدر فروغ پر ہے جسقدر
سابق ایام کیوقت میں تھی البتہ شاعری نے لباس بدل دیا ہے ورنہ شاعری معزول
نہیں ہو گئی ہے انسان کا جو کام شاعری پہلے کرتی تھی اس صدی میں بھی کرتی ہے
اور زمانہ آیندہ میں بھی کرتی رہیگی گو اسکے پیرایہ انقلاب پذیر ہوتے چلے جائیں گے۔

بہر رنگیکہ خواہی جامہ می پوش	من آن انداز قدرا می شناسم

اس عہد میں البتہ متمدن اقوام دنیا بلباس نثر شاعری سے کم کام لیتے ہیں مگر شاعری کو
اپنے رنگوں میں برتتے ہیں کہ اثر میں اوسکے فرق نہیں ہوتا ہے شاعری فی زماننا زبان قلم
کے مختلف پیرایوں میں برق جولاں ہے اور مختلف فنون کے لباس میں درآ کر اپنی
قوت دکھلاتی ہے مختلف پیرایوں کی مثال یہ ہے کہ عہد جدید کے فصحا و بلغا کی اسپیچیں
عام اس سے کہ تمدنی یا اخلاقی یا مذہبی عنوان رکھتی ہوں وہ کام کرتی ہیں کہ قوی
ترین شعرائے عہد سابق بھی نہیں کرسکے - برک ([illegible]) [illegible] اور
([illegible]) - اونکے عہد سے آج تک کے فصحا و بلغائے یورپ نے نطق کے
وہ تماشے دکھلائے ہیں کہ مجرد جنکے خیال سے عقل دنگ نظر آتی ہے ان فصحا کے
نطق نے سلطنتیں قایم کی ہیں اور سلطنتیں معدوم کی ہیں ملکوں کو خونریزی سے
بچایا ہے اور ملکوں کو خونریزی میں مبتلا کیا ہے ظلم کی بنیادیں ڈالی ہیں اور ظلم کی
بنیادیں کھود دی ہیں بادشاہوں کو تخت سے اٹھایا ہے اور تخت پر بٹھایا ہے مختصر یہ ہے
کہ قوموں کو جس راہ پر چلایا ہے قومیں وہ راہ چلی ہیں کیا ان فصحا بلغا کے نطق لطافت
شاعری سے خالی تھے در حقیقت انکے نطق عین شاعری تھے جو ان سے ایسے ایسے حیرت
خیز اثر قوموں پر پیدا ہوتے گئے ہیں اسیطرح نطق کے ذریعہ سے فرقۂ اہل قانون
عجیب وغریب تماشے دکھلاتا ہے واقعی اس عہد کے بیرسٹران نامی یک رنگ کے
شعرا ہیں اونکے کمال نطق کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سامعین پر عالم حیرت طاری ہوتا ہے
بہت بار ایسا ہوا ہے کہ سامعین کو اشکباری کی نوبت پہونچی ہے اور بہت بار
ہنسی کا روکنا دشوار ہوگیا ہے غرض یہ ہے کہ جادوئے نطق سے ہنسانا رولانا
اونکے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی بیگناہ شخص ماخوذ و مجرم ہوکر
عدالت کے سامنے لایا گیا ہے اوسکو اپنی بیگناہی کا پورا یقین ہے مگر جب اوسکے خلاف
میں بارسٹر نے بحث شروع کی اور اوسکی مجرمیت کو دکھلانا شروع کیا تو بیچارہ ماخوذ
باوجود بیجرم ہونیکے اپنے مخالف کی اسپیچ کے اثر سے اپنے کو مجرم سمجھنے لگا ہے
چنانچہ وارن ہیسٹنگس (Warren Hastings) کہتے ہیں کہ جس وقت

(۱) اُردوی معلا چغتائیوں کے لشکر کو کہتے تھے جس میں بہت بڑے بڑے عالیشان خیمے نصب ہوتے اور عالیشان بارگاہیں لگائی جاتیں۔ اس لشکر کی عظمت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ چالیس ہزار خیموں پر مشتمل تھا۔ اور قاآن اعظم کے خیمے و بارگاہ کا تو کچھ کہنا ہی نہیں اور چونکہ دلی کے اکثر بادشاہ سلسلہ چغتائیہ کی شاخ تھے اسلئے انہوں نے اپنے لشکر کو بھی اُردوی معلا کے نام سے موسوم کیا اور اُس لشکر کی زبان بھی اُردوی مُعلا کہلائی

(۲) اُردوی معلا جوجی خان کی اولاد کے لشکر کا خطاب ہو گیا تھا کیونکہ اوس میں سیکڑوں کلس سونیکے شاہی خیموں اور بارگاہوں پر نصب ہوتے تھے اور ہزاروں چھوٹے چھوٹے کلس امیروں اور سرداروں کے خیموں کو عزت دیتے تھے۔

مغرب کے مشہور سیاح مارکو پولو نے بھی چنگیز کے پوتے قبلائی خان کے جاہ و احتشام کا ذکر اسطور پر کیا ہے کہ اوسکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوسکو عالم حیرت میں محو ہو کر بطور ایک طلسمی فسانہ کے خیال کرتا ہے۔

پس جو تحفہ اُردوی معلا کا دلی میں نصب ہوا سلاطین چغتائیہ کے اُردوی معلے سے آیا ہوا تحفہ ہے جو بجائے خود اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اُردوی معلا اور اُردوی معلا کا نام اوسوقت کے نہ کہتے ہوئے ہیں جبکہ بغداد اور جنوب بلاد فارس فتح ہوئے۔ اور وہاں کے علما و ادبا اور شعرا نے فاتحین کے لشکروں کو ان ناموں سے یاد کیا۔ یا یہ کہ خود فاتحین نے اُسوقت کے عالیشان مناظر کو دیکھکر اپنے لشکروں کے لئے یہ شاندار الفاظ استعمال کئے اب میں گمنام اُردوی معلا کے نام کو زندہ کرنا چاہتا ہوں جو شاید اردو کے کسی رسالہ اور اخبار میں اب تک میری نگاہ سے نہیں گزرا اور آج پہلی پہل آپ اوسکا حال (اُردوی معلی علی گڈہ) میں ملاحظہ فرمائیں

اُردوی معلا کی شاخ میں چنگیز کے بیٹے جوجی کے بعد جوجی کا بڑا لڑکا (اردوا) اسکا جانشین ہوا جسکے معنی ایک بڑے اُردو کے مالک کے ہیں۔

جوجی کے دوسرے لڑکے باتو نے یورپ پر حملہ کر کے اپنی حکومت وسیع کی اور دشت قبچاق کے ترکی قبایل کا امیر ہوا جوجی کے تیسرے لڑکے تقا تیمور کو بلگیریا اور انکا

جغرافیہ اور اہل عرب

صرف لفظ جغرافیہ کا اس بات پر دلالت کرنیکے لئے کافی ہے کہ یہ علم اہل عرب کا نہیں ہے۔ لیکن چونکہ عربی علم تاریخ کی تمام اقوام عالم کی نگاہوں میں بہت زیادہ وقعت ہے اور علم تاریخ کو جغرافیہ کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہے ہمکو اسبات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم یہ بھی دکھائیں کہ اس فن میں اہل عرب نے کس قدر کوششیں کی اور کہانتک دسترس حاصل کی۔

کوئی علم یا کوئی فن انسان سے اسوقت تک نہیں پیدا کیا جب تک کہ اوسکے داعی اور اسباب نہیں پیدا ہوے۔ کیونکہ انسان کو ہمیشہ اپنی ضروریات کے لئے مختلف باتونکی حاجت پڑا کرتی ہے۔ اسلئے یہ مقولہ مشہور ہے کہ "ایجاد کی ماں ضرورت ہے" چنانچہ فتح ممالک اور تجارت کی ضرورتیں جب پیش آئیں۔ اور بلاد وامصار کے راستے اور فاصلے دریافت کرنے کی حاجت پڑی تو تاجروں۔ فاتحوں۔ اور سیاحونکی معلومات جمع کی گئیں۔ اور رفتہ رفتہ بڑھتے بڑھتے یہ ایک وسیع علم ہوگیا جسکی ترتیب مختلف ابواب اور حصونپر قرار پائی۔

سب سے پہلے جس قوم نے اس کی بنیاد رکھی وہ اہل فنشیا ہیں۔ کیونکہ اوسی قوم نے دنیا میں سب سے پہلے تجارت شروع کی۔ اور انہیں سے سیاحی کی ابتدا ہوئی وہ بحر ابیض کے سواحل تک گئے اور وہاں جاکر آبادی قائم کی۔ شہر صور اوس زمانہ میں تجارتی دنیا کا مرکز تھا۔ وہاں تمام عالم سے تجارتی اور مصنوعی چیزیں آتی تھیں۔ اور تمام اقوام سے یہانتک کہ اہل ہند سے بھی اون کی تجارت تھی۔ ہندو یہانسے ہاتھی دانت اور خوشبو وغیرہ لیجاتے تھے اور وہاں سے مسالے (مصالح)

اور دوسری چیزیں خرید کر لاتے تھے۔ اہل فنشیا نے اپنی غیر معمولی تجارت کی وجہ سے دنیا کے ممالک کے متعلق بہت معلومات حاصل کیں۔ اور اکثر ملکوں کے باشندوں اور اونکے باہمی فاصلوں سے خبردار ہو گئے۔

جب اسکندر نے اپنا بھاری لشکر لیکر حملہ کیا۔ اور ایشیا کی سرزمین کو پامال کرتا ہوا بلاد ہند تک پہونچا۔ تو اوسکے ہمراہی ایشیا کے حالات سے بہت زیادہ واقف ہو گئے پھر جب وہ واپس گیا تو ان حالات کو عجیب و غریب ہونیکی وجہ سے قلم بند کرالیا۔ بطالسہ (خاندان بطلیموسی جو مصر کے حاکم) اسنے سواحل بحر احمر کے حالات لکھوا دیے۔ اہل روما نے بھی اپنی معلومات کا اسپر بعد میں اضافہ کیا۔ یہ علم اسیطرح پراگندہ حالت میں چلا آتا تھا یہاں تک کہ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسکو ترتیب دیں۔ پہلے پہل جس شخص نے یہ کام کیا وہ اراٹیشین یونانی ہے جسکی وفات سنہ ۱۹۶ میں قبل ولادت مسیح ہوئی۔ اس شخص نے بطالسہ کے عہد میں ایک کتاب لکھی جسمیں اہل فنشیا۔ اہل روما اور اسکندر کے ساتھیوں کی تمام معلومات جمع کیں۔ اسکے بعد اسٹربن سیاح نے بھی اسمیں ایک کتاب لکھی۔ پھر بلینیاس جغرافی ہوا۔ یہ بطلیموس کے زمانہ میں سنہ ۵۰ء میں تھا۔ اسنے ایک بہت بڑی کتاب جغرافیہ میں لکھی۔ جسمیں فلکی حساب کے مطابق مقامات اور راستے مقرر کئے۔ اوسنے اوس کتاب میں اوس زمانہ کے ۵۴۳۰ شہروں کے نام لکھے ہیں۔ مدینہ کو مدینہ ہی لکھا ہے۔ پہاڑوں کی تعداد دو سو بیان کی ہے۔ معادن۔ اور مختلف ملکوں کے باشندے اور وہاں کی پیداوار کی حالتیں بھی تھوڑی تھوڑی لکھی ہیں جس زمانہ میں اسلامی سلطنت قائم ہوئی اسوقت تک بھی اسی کتاب پر جغرافیہ کا دارمدار تھا اہل عرب نے عصر عباسی میں جہاں اور تمام علوم و فنون کے ترجمے کیے تھے اس کتاب کا ترجمہ کر لیا۔ اور اسکا نام الجغرافیہ رکھا۔ بلینیاس کی دوسری کتاب کا بھی ترجمہ کر لیا جو فلکیات میں تھی۔ اور اب وہ مجسطی کے نام سے مشہور ہے اور انہیں دونوں کتابوں پر اوکی جغرافیہ دانی

مضمون

مگر اس کتاب کے ترجمے کے قبل سے ہی اہل عرب علم جغرافیہ کی ابتدا کر چکے تھے جسکے تین سبب تھے۔ پہلے وہ سبب ہی تھا جن کی وجہ سے اہل یونان اور اہل روما نے اس فن کی بنیاد رکھی تھی یعنی فتح ممالک و تجارت۔ کیونکہ اہل اسلام لڑائی اور فتوح ممالک میں تمام اقوام عالم پر سبقت لیگئے اور دنیا کے ہر چہار سمت پھیل گئے۔ اور نیز وہ لوگ اور خاص اہل حجاز زمانہ جاہلیت سے تجارت پیشہ تھے اسلام کے بعد اُن کی تجارت فتح اور سلطنت کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتی چلی گئی۔ لیکن تیسرا زبردست سبب جس میں اہل عرب بہ نسبت دوسری قوموں کے ممتاز ہیں یہ تھا کہ وہ مختلف بلاد اور ممالک سے فریضہ حج ادا کرنیکے لئے کعبہ آتے تھے۔ یہانتک کہ ہند اور چین کے مسلمانوں کے لئے بھی یہ لازمی بات تھی۔ اور اسکے لئے راستے اور مقامات جاننے کی خاص طور پر ضرورت تھی۔ ورنہ وہ کیونکر کعبہ پہنچ سکتے۔ اسکے علاوہ طلب علم میں بھی وہ سفر کرتے تھے۔ اور تمام اسلامی دیار میں علم اور علما کی تلاش میں پھرتے تھے اسکے لئے بھی مقامات جاننے اور منازل و طرق پہچاننے کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ پہلے پہل عربوں نے جغرافیہ میں جو کتاب لکھی وہ راستوں اور منازل کے حالات میں تھی۔ سب سے پہلے اس قسم کی تصنیف ادیبوں نے مثلاً اصمعی اور سکونی نے کی۔ اسکے بعد پھر پورے ملک کے حالات لکھے گئے۔ جیسا کہ ابو الاشعث اور ہمدانی نے جزیرہ عرب اور تہامہ کے پہاڑ اور صحاری وغیرہ کے حالات میں کتابیں لکھیں۔ مزید براں فتح ممالک کے بعد اُن کو خراج اور لگان مقرر کرنیکے لئے ممالک کے حالات اور صحابہ کے زمانہ میں جو ملک فتح ہوئے تو اُن کی کیفیت جاننے کی ضرورت پڑی اور علم جغرافیہ گویا ایک حیثیت سے اونکے مذہب کا حصہ ہو گیا۔

جب جغرافیہ کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تو اہل عرب نے اسی طرز پر تالیف شروع کی اور اپنی معلومات کو اسپر قابل قدر اضافہ کیا۔ چونکہ اُنکو تحقیق کا شوق تھا اسلئے اُنہوں نے صرف

روایت اور بیان پر بس نہیں کیا بلکہ خود بری اور بحری سفر کرنا شروع کیا۔ اور دنیا کے حالات دیکھکر اونکو کتابوں میں مدوّن کرنے لگے۔ اُن لوگوں نے بلیناس کے جغرافیہ میں بہت سی غلطیوں کی تصحیح کی۔

مسلمانوں میں علم جغرافیہ کی تکمیل چوتھی صدی ہجری میں ہوئی۔ اوس زمانہ میں لوگوں نے اس فن میں بھی اسیطرح تصنیف وتالیف شروع کی جسطرح تواریخ وغیرہ میں۔ سب سے پہلے اہل اسلام میں سے جس شخص نے اس فن میں کتاب لکھی وہ ابوزید بلخی تھا۔ اسنے چوتھی صدی میں اپنی کتاب "صور الاقالیم" یونانیوں کے طرز پر لکھی تھی۔ اوسکے بیس حصے کئے تھے۔ اور پھر ہر ایک حصہ کی الگ الگ تشریح کی تھی۔ لیکن اُسمیں بہت سے بڑے بڑے شہروں کے نام چھوٹ گئے ہیں۔ اسی کا معاصر ابواسحاق فارسی تھا جو کرخی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بہت بڑا سیاح تھا۔ خود سفر کرکے نہایت تحقیق کے ساتھ کتاب مسالک الممالک لکھی بلخی نے بھی تمام ممالک اسلام کا سفر کیا۔ اور تمام شہروں پہاڑوں۔ شہروں وغیرہ کا مفصل حال لکھا اسنے اپنے سفر کی ابتدا مدینے سے ۳۳۱ھ میں کی تھی۔ اسکے بعد ابن فقیہ ہمدانی۔ مقدسی اور مسعودی نے کتابیں لکھیں۔ مسعودی نے کئی سفر کئے۔ یہانتک کہ وہ انتہائی ہندوستان تک گیا تھا۔ اوسنے تمام چشم دید حالات لکھے ہیں۔ البیرونی نے بھی اپنی کتاب میں جو ہندوستان کے متعلق لکھی ہے یہاں کے شہروں۔ دریاؤں۔ پہاڑوں کے حالات اونکے نام اور فاصلے مفصل طور پر لکھے ہیں۔ لیکن اب اونمیں سے سوائے چند مشہور شہروں کے ایک بھی نہیں۔ یا اگر ہے تو نام میں تبدیلی واقع ہوگئی۔ یہ سب کتابیں چھپ گئی ہیں۔

کچھ زمانہ کے بعد جب علم تاریخ کی طرف زیادہ توجہ کی گئی تو لوگوں نے جغرافیہ کی باقاعدہ ترتیب شروع کی۔ اور شہروں اور مقامات کے نام حروف تہجی کی ترتیب پر لکھے جانے لگے اس قسم کی سب سے مشہور تصنیف یاقوت حموی کی ہے جنکی وفات ۶۲۶ھ ہجری میں ہوئی

ہے معجم البلدان لکھی جس میں شہروں پہاڑوں۔ وادیوں۔ سمندروں۔ نہروں۔ بتوں وغیرہ وغیرہ کے مفصل حالات لکھے۔ اور ضمناً بہت سے لوگوں کے تذکرے جو ان شہروں میں پیدا ہوئے بیان کئے۔ یہ کتاب جغرافیہ کی قاموس خیال کی جاتی ہے۔ ابوالفدا نے بھی ایک کتاب تقویم البلدان لکھی ہے۔ انکے علاوہ اہل عرب نے بہت سے سفرنامے لکھے جنکے ذریعے ملک۔ قوم۔ تاریخ اور جغرافیہ کی خدمت کی۔

اسلم جیراجپوری مدرسۃ العلوم علی گڈھ

ایک مغنیہ سے التجا

گائے جا، سنائے جا، اللہ کے واسطے گائے جا، ہیپرشت، رباب کے ساتھ، ستار کے ساتھ میرے دل کے ساتھ گائے جا۔ یہ میری التجا وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے۔ اپنے ستار کو چھیڑ میرے دلکو چھیڑ آہ میں التجا کرتا ہوں گائے جا۔

تیری آواز۔۔۔ وہ باریک، وہ بلورین، وہ تیرے دل کی طرح صاف اور شفاف وہ تیرے ننھے دل کی طرح تیری ننھی آواز، مجھے آغوش میں لیلے، مجھے بہلائے۔ وہ آواز جو تیرے رقیق قلب کے گوشوں سے نکلتی ہے، اور جامۂ ماسوا کو اُتار کر عریاں اور گریاں اوپر کی طرف جاتی ہے، اور پھر ایک پُرناز لرزش کے ساتھ واپس آکر تیرے ہونٹوں میں چھپ جاتی ہے، وہ آواز جو خود ایک شعر ہے، اُس منظوم آواز کے ساتھ آہ گائے جا۔ میری روح کی سی نحیف وضعیف، میرے دل کی سی کانپنے والی، نازک باریک آواز سے گائے جا ستار کے ساتھ چنگ ورباب کے ساتھ، میرے دل کے ساتھ گائے جا۔ یہ وہ التجا ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے۔ آہ میں خواہش کرتا ہوں گائے جا تاکہ زندگی کیا ہے؟ سُنا کہ روح کیا ہے؟ محبت کیا ہے؟ تاکہ میں سمجھوں، پئی اُس نازنین روح کے ساتھ گا جو پھولوں کی خوشبو کی طرح عطر پاش ہے۔

اپنی دلگداز آواز کے ساتھ گا۔ جو لطافت سادی کی طرح دل پر اثر کرتی ہے۔ دنیا سے میرا علاقہ قطع کردے۔ میری خواہشیں، میری حسرتیں جو نہیں جانتیں کہ ختم ہونا کیا چیز ہے انہیں اس طرح۔ بس اس طرح ختم کرنا چاہتا ہوں کہ اس آواز کے نرم آغوش میں، اس آہنگِ دل کی رقت میں، اس نوائے غنغنت کی لطیف موج میں غرق ہو کر مرجاؤں تمہاری باریک، اور شیریں آواز کی تنیں میرا کفن ہوں۔ انہیں لپٹ لپٹا کر مرجاؤں اُسے چوم چوم کے جان دیدوں۔ اُس ہوا سے زیادہ ہلکی، آسمان سے زیادہ صاف آواز میں لپٹ کر اونچا اڑجاؤں، اور میری آنکھیں اور کان حشر تک اس باریک کانپنے والی آواز کو، اس صدا کو جو ایک ننی چڑیا کے ننھے بازوں کی طرح پھڑپھڑاتی ہے۔ بلبلوں کی منقاروں میں، بادلوں کی رنگ آمیزیوں میں، خاموش رات کو موجوں کی نشانش میں، حزن قمر، خندۂ صبح میں ڈھونڈتی پھرا کریں۔۔۔

آہ! مت ٹھیر گائے جا، اللہ کے واسطے گائے جا ستار کے ساتھ۔ میرے دل کے ساتھ گائے جا۔ یہ عرض وہ ہے جو میری روح تیری روح سے کرتی ہے۔ آہ! میں التجا کرتا ہوں گائے جا۔۔۔ (ایلیا رمس)

انتخاب بیاض

جناب منشی سید انور علی صاحب انور متوسل بھوپال

رباعی عمر خیام نیشاپوری

پیش از من و تو لیل و نہاری بوداست	گردندہ فلک برائے کارے بوداست
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی	کان مردمک چشم نگارے بوداست

"از جملہ رباعیات عمر خیام ایں رباعی انتخاب کردم" "انور"

ملک الشعرا کلیم ہمدانی

نہ ہمی می رمد آں تو گل خنداں از من | می کشد خار دریں بادیہ داماں از من

میرزا نعمت خان عالی شیرازی

ہر کہ یکبار بجانانہ رساند خود را | این محال است کہ تا خانہ رساند خود را

نواب الٰہی بخش خان معروف دہلوی

کہاں تک راز عشق افشا نہ کرتا | مثل یہ ہے کہ مرتا کیا نہ کرتا

شاہ نصیر دہلوی

دل کا کیا مول بلا زلف چلیپا ٹھہرے | کچھ تری گانٹھ گرہ میں ہو تو سودا ٹھہرے

آذری طوسی

قیمت دولت وصل تو اگر جاں بودے | کار بر عاشق دل سوختہ آساں بودے

ملک الشعرا کلیم ہمدانی

زاں چشم ندیدم کہ نگاہے بمن افتد | بیمار عجب نیست اگر کم سخن افتد

گلشن دہلوی

بدقت میتواں فہمید معنی ہائے ناز او | کہ شرح حلت العین ست مژگان دراز او

فغانی شیرازی

بہ بستر افتم و مردن کنم بہانۂ خویش | بدیں بہانہ مگر آرمت بخانۂ خویش

مصحفی لکھنوی

جتنا کہ ہمیں خوار یہ کرتا ہے شب و روز | اتنے تو کہیں گا زمانے کے نہیں ہم

ناصر علی سرہندی

کہ بر شیخ و برہمن دارد احسانے کہ من دارم | چراغ کعبہ و دیر است ایمانے کہ من دارم

نواب عمدۃ الملک امیر خان انجام

مارا ہوای گلشن و باغی نماندہ است | اسے بوئے گل ہر کو دماغی نماندہ است

میرزا محمد امین بیرنگ نیشاپوری

رفتم از خویش سوی یار سلامی گفتم | قاصد گریہ رواں بود پیامے گفتم

سکندر جہاں بیگم ضیا گلشن آبادی

گم کردہ رہ غریب ہوں منزل سے دور ہوں | طوفان زدہ سفینہ ہوں ساحل سے دور ہوں

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی

تسلیم روے یار کو حسرت کی آنکھ سے | اچھا نہیں ہے شوق میں ہر بار دیکھنا

انور

قتل کر کے مجھے یہ کہگئے جاتے جاتے | دیکھ مشکل تری آسان کئے جاتے ہیں

انوری خاوری

تا کے بغم رخ تو خون خورید دل | آزار جفائے تو بجان جو ید دل
بخشای کز آسمان نمی بارد جان | رحم آر کہ از زمیں نمی روید دل

شاعرہ آقا لی

ز ہشیاران عالم ہر کرا دیدم غمی دارد | دلا دیوانہ شو دیوانگی ہم عالمی دارد

شکوہ فقر ملک بے نیازی کرد تسلیم | بیدل | با قبا لیکہ دل برخاست از دنیا بہ تعظیم

حسن دہلوی

من بودم و کنجے و حریفے و سرودی | غم راکہ نشان داد بلا را کہ خبر کرد

موسوی خان جرات

نہ ہر آں کہ منزل دور یا لنگ است و نالم | دلم را چوں جرس جائے تپش تنگ است نالم

مومن دہلوی

دمبدم روتا ہیں چاروں طرف تکتا ہیں | یا کہیں عاشق ہوے یا ہو گیا سودا ہیں

دار السلطنت فرانس کی سیر (۲) تابع ماقبل

میرے خیال میں فرنچ پولیس کو ہجوم میں عمدہ انتظام قائم رکھنے کا بالکل سلیقہ نہیں اور لندن پولیس سے جب ان کا مقابلہ کرتا ہوں تو میری نظر میں اُن کی کوئی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ انگلستان کے عظیم الشان دار السلطنت میں جہاں پیرس سے کہیں زیادہ ہجوم اور لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ایک لمبا زبردست پولیس کا جوان جو اکیطرف سیاہ ہلمٹ لگائے کھڑا رہتا ہے تمام گاڑیوں اور آمنے بسوں کے ہجوم کے ہجوم کو صرف اپنے ہاتھ کے ایک اشارے سے آن واحد میں روک دینا بخوبی جانتا ہے اور پیدل چلنے والے ان امن و امان کے محافظوں سے بے انتہا درجے کے خلق کا برتاؤ معلوم کرتے ہوئے بآسانی ادھر سے اُدھر ہوجاتے ہیں۔ یہاں کی حالت اسکے مقابلے میں بالکل ہی لچر ہے علاوہ اسکے پولیس کے جوان بھی مجھے کچھ کمزور اور پریشان سے نظر آئے۔ پردیسیوں کے ساتھ انکا اخلاق بھی اچھا نہیں ہوتا اور بعض اوقات تو نہایت ہی خشک اور بدتہذیب سے معلوم ہوتے ہیں۔

اس برتاؤ کو میرے دوست مسٹر منگا حق بجانب کہتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ پردیسی فرانسیس تہذیب کے ساتھ اونسے سوال نہیں کرتے اور اسلئے ویسا جواب بھی نہیں پا سکتے ہیں۔ مثلاً فرانسیس اگر پولس کے جوان سے جس سے جان پہچان نہ ہو کوئی بات پوچھیگا تو پہلے (وہاں کی تہذیب کے موافق) ٹوپی اتاریگا اور نہایت ادب سے کہیگا "پارڈن موسیو" اور پھر سوال کرنے گا بخلاف اسکے انگریز اور امریکن جنکی طبیعتیں فرانسیسیوں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں ان باتوں کی پروا نہیں کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ اخیر میں صرف "تھینک یو" کہدینا بس کافی ہے۔ فرانسیسیوں میں ظاہری تکلفات اور شایستگی تہذیب کی سخت ضرورت ہے اور ان لوگوں کو اسکا احساس بھی نہیں۔ اس خاص قسم کے روکھے اور غیر شایستہ برتاؤ میں انگریز تمام یورپ میں مشہور ہیں اور اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ جزیرہ کے رہنے والے تمام دنیا میں چکر لگا آئیں

لیکن بمشکل دوسرے لوگوں میں خلط ملط کرینگے اور بالکل ہی اون کی صحبت سے متاثر ہونگے
یہ لوگ ہر شے کو کاروباری نظر سے دیکھتے ہیں اور جس چیز کو ہاتھ میں لیتے ہیں کاروبار
کی طرح پر لیتے ہیں۔ اور جب کسی چیز سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو اوسمیں کچھ جوش
ظاہر ہی نہیں کر سکتے اور اُن کی نظر جو ہر شے کو کاروبار کی حیثیت سے دیکھتی ہے اوس
لطف کو معمولات روزانہ کی طرح سمجھنے لگتی ہے اور عیش کی لذت کو زائل کر دیتی ہو
یہی عدم جوش و ہمدردی اونکے ہر طریقہ عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ علی ہذا دوسرے
ملک والوں سے میل جول رکھنے میں بھی انہیں یہی انداز طبیعت غالب ہو جسکا اثر یہ ہوا
کہ یورپ والے انہیں مغرور سمجھتے ہیں اور باہمی میل جول کا فائدہ جو تہذیب اخلاق
تمدن و طرز معاشرت کی ترقی کی صورت میں نتیج ہوتا ہے۔ اوس سے یہ محروم ہوتے
ہیں۔ مگر مجھے امید ہے کہ میرا یہ خیال قاعدۂ کلیہ نہ تصور کیا جائیگا اور اقرار کرتا ہوں
کہ اسکے مستثنیات بھی ہونگے مگر وہ انگریز جنکا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے انکی عمر کا زیادہ
زمانہ یورپ کے اسی حصے میں گذرتا ہے اور کثرت ربط و ضبط سے ان لوگوں کے سے
اخلاق ہو جاتے ہیں۔ قوم انگلو سیکسن کی طبیعت کی یہ خصوصیت ایسی ہے جسکے نتیجے
اکثر اچھے نہیں ہوتے۔ ترقی زمانہ کی دوڑ میں بھی یہ لوگ پیچھے رہجاتے ہیں اور
اپنی علیحدگی کے سبب سے بہت سی چیزیں نہیں حاصل کر سکتے۔

ٹریموے گاڑیوں کا جو طریقہ لندن میں ہے یہ اوسکی عمدہ مثال ہے اور نیز
اونکی طبیعت کی قدامت پسندی کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ یورپ میں مدت ہوئی
جیسے تیز ٹریموے گاڑیاں اور بجلی کی ٹرامیں جاری ہیں مگر لندن میں ابھی تک لوگ
اونکے مخالف ہیں (گو کہ اب کسیقدر موٹر آمنی بس گاڑیاں جاری ہو چلی ہیں) اور انہی
پرانی ہی آمنی بسوں (omnibus) (جو نہایت سست ہوتی ہیں) کو ترجیح دیتے
ہیں۔ فرنچ پولیس کے اس برتاؤ کی ایک اور وجہ ہو سکتی ہے جو کسیقدر معقول معلوم
ہوتی ہے یعنی اون کے ملک کی طرز حکومت بہت کچھ اسکا باعث ہے۔ میرے خیال
میں سلطنت جمہوری صرف ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کیلئے زیادہ مناسب

ہوتی ہے جیسے سوئٹزر لینڈ ہے لیکن ایسے بڑے بڑے ملکوں کے لئے جیسے کہ
فرانس اور امریکہ ہیں یہ طرز حکومت کسیطرح مناسب نہیں اسمیں فوائد ضرور ہیں
مگر میرے خیال میں نقصانات زیادہ ہیں معمولی سے معمولی جاہل آدمی کو بھی جب
مساوات کا خبط دامنگیر ہوتا ہے تو بجائے اسکے کہ اوسکے اخلاق اچھے ہوں
اور خراب ہوجاتے ہیں اور بڑے بڑے امور ملکی میں اپنی ٹانگ اڑانا جائز کیا
بلکہ ضروری سمجھنے لگتا ہے۔ اسیطرح سے اوسے بہت سے موقعے عامہ خلائق کو برانگیختہ
کرنیکے ملتے ہیں۔ وہ کتناہی نالائق کیوں نہ ہو مگر اپنی آپ کو بہت کچھ دقیع سمجھکر عظیم
الشان بننے کی کوشش کرتا ہے اور خواص کے دوش بدوش رہنے کی خواہش
کرتا ہے اوسکی راے کے خلاف اگر علیدہ آمد ہوتا ہے تو علم مخالفت بلند کرتا ہے
اسطرح سے ایک متحد جماعت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں اور عمدہ حکومت
محال ہوجاتی ہے انگلستان میں بھی دو پولیٹکل فرقے ہیں مگر اُن کی لڑائی صرف پولیٹکل
دائرے کے اندر محدود رہتی ہے اور خانگی معاملات پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ بخلاف
اسکے فرانس میں ایک پولیٹکل فرقہ پرائیویٹ معاملات میں بھی دوسرے پولیٹکل فرقے
کا مخالف ہوجاتا ہے اور یہ مخالفت اسقدر بڑھ جاتی ہے۔ کہ اگر ممکن ہو تو ایک
دوسرے کی گردن کاٹ ڈالے فتنہ کمیونس (Communes) کا واقعہ اب
بھی ہر شخص کی یاد میں تازہ ہوگا جبکہ سیکڑوں بیچارے غریب مزدور سلطنت جمہوری
سے بغاوت کرنیکے جرم میں کتوں کی طرح گولی سے مار ڈالے گئے۔ بہت ممکن ہے کہ
اب بھی کسیوقت فرانس میں اسطرح کا کوئی نہ کوئی فتنہ پھر اُٹھ کھڑا ہو جسمیں اس طرز
حکومت کی بھینٹ ہزاروں کو چڑھنا پڑے۔

فرانسیسی درحقیقت بمقابلہ انگریزوں کے زیادہ ذکی الحس و پر از جذبات ہوتے
ہیں اسی لحاظ سے اون کی طبیعت بہت زیادہ ہم لوگوں سے ملتی جلتی ہے۔

اثنائے قیام میں ایک مرتبہ شام کے وقت مجھے مدمازل لے ہمان سے
ملنے جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ لڑکی مسٹر فنگ کے دوست ہے اور گو کہ کسی اونچے خاندان

سے اسکا تعلق نہیں تاہم بہت مہذب اور شائستہ ہی اور فرنچ مڈل کلاس کے اچھے لوگوں میں سے ہی کسیقدر پڑہی لکھی بہی ہے اور میرے دوست کے ساتھ بہت کچھ اتحاد رکھتی ہے۔ نگا صاحب جب پہلے پہل یہاں آئے تو اس لڑکی نے بہت کچھ اُن کی مدد کی اور بہت سی دقتیں جو ایک نووارد اجنبی کے سدراہ ہوا کرتی ہیں اسکی وجہ سے آسان ہوگئیں۔ اوسکا گھر دیکھکر میرا جی بہت خوش ہوا اور ہم سب نے ملکر شانتلی (   ) چلنے کا ارادہ کیا کہ کچھ وقت وہاں تفریح میں گذارا جائے۔

* دوسرے دن صبح کو ہماری پارٹی جسمیں وہ لڑکی اور اوسکی ماں بہی شامل تہی گیر ڈیلیاں (Gare de Lyon) سے سوار ہوکر شانتلی (Chantilly) روانہ ہوے۔ یہ مقام پیرس کے نواح میں صرف ایک گہنٹے کے فاصلہ پر واقع ہے اور بہت سی ایسی دلچسپ چیزوں کیلئے مشہور ہے جو دوسری جگہ کم نظر آتی ہیں۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ نواح پیرس کے کسی قصبہ یا گاؤں میں جانا بمقابلہ لندن کے بہت کچھ غیر دلچسپ اور گراں معلوم ہوتا ہے۔ شاید اسلئے کہ یہاں لوگوں کی آمدورفت اتنی نہیں یہاں کے مناظر قدرت میرے خیال میں لندن سے کسی طرح کم دلفریب نہیں مگر جسطرح لندن کے قصبات میں بہیڑ لگی رہتی ہے یہاں کبہی دیکھنے میں نہیں آئی لندن میں اتوار یا بنک ہالیڈیز کے دن ضلع ہمسٹڈ ہیتھ (Hampstead Heath) رچمانڈ (Richmond) وغیرہ تمام قرب وجوار کے خوبصورت و دلچسپ قصبات میں لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے مگر پیرس میں گوکہ ورسائی (Versailles) بہت دلچسپ مقام ہے مگر یہاں آنے والوں کا کبہی زیادہ مجمع نہیں ہوتا۔ اسکی وجہ بالکل ظاہر ہے کیونکہ نہ تو پیرس اتنا بڑا ہے جتنا کہ لندن اور نہ اتنا غیر دلچسپ اور میلا ہے کہ لوگ مجبوراً گرد و نواح کے قصبات میں چہٹیاں گذارنے جایا کریں۔

یہ دن کسیقدر گرم تہا اور ہم خوب شانتلی (Chantilly) کے سڑکوں پر آہستہ آہستہ ٹہلا کئے۔ کچھ دیر بعد درختوں کے جھنڈ کے نیچے کہانا منگایا۔ دیہات کی ایک جوان اور خوبصورت لڑکی نے ہمارے سامنے کہانا چنا اور طرح طرح کے دیہاتی اشیاء

سے میز کو سجا دیا۔ ہمارے پاس کی ایک فرانسیسی جماعت کے خوش مزاج نوجوان لڑکے چٹیاں منا رہے تھے اور خوب دلگیاں کرتے ہنستے جاتے اچھل کود رہے تھے۔ مجھے یہ فرق بیوے ہوئے سوبے ساجے خاموش انگریزوں کے سامنے ایسا بین معلوم ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔

تین گھنٹے تک ہم یہاں کے مشہور شاہی محل اور اصطبل کو دیکھتے رہے جسکا جواب یورپ بھر میں نہ ہوگا۔ اس محل میں ایک زمانے میں کئی ایک فرانسیسی بادشاہ رہ چکے ہیں اور اب انہیں قدیم نادر اشیاء اور تصاویر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے یہاں میں نے بہت سے خوبصورت اور عالیشان کمرے دیکھے جنہیں بادشاہ رات کو سویا کرتے اور دربار کیا کرتے تھے۔

اس محل کی ساخت بالکل قدیم فرانسیسی قلعوں کی سی ہے چاروں طرف خندق کھدی ہے اور باہر کی جانب ایک بے انتہا دلچسپ جنگل احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس جنگل کو اور اسکی دلفریب مناظر کو دیکھکر بکیچیو (Buccaccio) کے قصہ کے سین میری نظر کے سامنے پھر گئے۔ کیونکہ حقیقت میں فرانسیسی بادشاہوں کی تاریخ محض اُن کی عیش و طرب کے افسانے ہیں اور اسی مقام شانتلی (Chantilly) کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان سبزے کے واجد علی شاہوں کی عیش و عیاشی کا مرکز کہلایا جائے۔

اس مقام کی نظر خیال میں اسطرح تصویر کھینچنا چاہئے کہ (Beeches) کی لاتعداد دورویہ صفیں استادہ ہیں۔ ہر طرف موج آسا میدان کے نشیب فراز سبزے سے ڈھکے ہیں۔ بہت سے عجیب و غریب باغ ہیں جنہیں درختوں کی کثرت نے اندھیرا سا کر دیا ہے وہاں کہیں تنگ و تاریک کنج ہیں اور کہیں موڑ پر چنار کے درختوں کے سایہ نے ماندی راہگیروں یا عاشقوں اور معشوقوں سب کے لئے مقامات تنہائی بنا دئے ہیں۔ ایک طرف پانی کے جھلملاتے چشمے بل کھاتے ہوئے بہہ رہے ہیں اور اُن پر خوبصورت خوبصورت نازک پل بندھے ہیں اور ان چشموں کے کنارے سبز سبز جھاڑیوں کی قطار کی قطار چلی گئی ہے۔ دوسری طرف چھوٹی چھوٹی خوبصورت سبز ٹیلے ڈھکے ہوئے

ٹیلے جنہیں نیچر اور انسان دونوں نے ملکر سجانے میں گویا ایک دوسرے کا مقابلہ کیا
ہے۔ دلہن کے مانند آراستہ نظر آتے ہیں۔

اس مقام پر فرانس کے کسی عیش پسند بادشاہ کا بنوایا ہوا ایک (Pavillion)
ہے جسکی خوبی و دلفریبی نے بہت دیر تک مجھے محو حیرت رکھا۔ اسکا نام پلے سی لامو
(Plessis l'amour) یا عیش و محبت کا مسکن ہے اور درحقیقت اس مقام کی خوبصورتی
اور نزاکت و دلفریبی کے مقابلے میں دیکھا جائے تو یہ نام بالکل صحیح معلوم ہوگا میں نے
دیکھا کہ ایک طرف ایک خوش و خرم فرانسیسی جماعت کے نوجوان بادہ سرور میں مست
(Allee) کے عظیم الشان دو رویہ صفوں کے بیچ میں۔ سڑک پر گویا متوالوں کی
طرح بہکتے اور آہستہ آہستہ ٹہلتے جارہے ہیں کہ انہیں سے ایک نے نہایت ہی دلفریب
سروں میں نغمہ لامو (محبت) کی ایک ایسی تان نکالی کہ ہوا گونج اٹھی۔ دوسری طرف
ایک بڑھیا عورت کے ہمراہ حسین لڑکیوں کی ایک جماعت ہے جو نہایت ہی دلفریب
نیچے سروں میں آہستہ آہستہ گاتی جاتی اور ٹہلتی جاتی ہیں۔ کہیں ایک دوسرے سے
ہنسی اور چہل کرنے میں کسی کی لے کی آواز سنائی دیتی ہے اور کہیں چتنار کے درختوں کے
نیچے کھیل کود کا طوفان بپا ہے۔ غرضکہ سب کے سب اس مقام کی دلفریبیوں کے سرور میں
ایسے مست ہیں کہ گویا لامو (محبت و عیش) کی دیبی ان کے سروں پہ منڈلا رہی ہے
اور اپنے جادو سے اوسنے ہر ایک کو بیخود و بے ہوش کر دیا ہے۔

ہم ٹہلتے رہے یہاں تک کہ تھک کر سبزے کی فرش پر لیٹ گئے جسکے اوپر سبز سبز
پتیوں کا شامیانہ لگا تھا۔ آہ! یہاں پر اس آدھ گھنٹے کی نیند مجھے ہمیشہ یاد رہیگی
میں بالکل بیخود اور نشہ سرور میں غافل ہو کر سویا کہ مجھے اپنے وطن کی نیندیں یاد آگئیں۔

آفتاب قریب غروب تھا اور ہم بھی سیر و تفریح سے فارغ ہو چکے تھے اسٹیشن پر
گاڑی تیار رہی تھی اسلئے فوراً بیٹھکر گیری ڈی لایں (Gare de Lyon) سے
اس عالم فریب مقام کو خیرباد کہتے ہوئے روانہ ہوئے ہمارے خوبصورت
میزبان نے درحقیقت اس سیر کو زیادہ دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت

کیا اور (Whiteman) شاگی سے ہم انکا شکریہ ادا کر کے خوش خوش نہایت محظوظ واپس ہوئے
پیرس کے اس دلچسپ نواح کی سیر کے بعد ہمنے ورسائی (Versailles) کے دیکھنے
کا قصد کیا۔ یہ مقام بادشاہان فرانس کا ایک زمانہ تک وندسر کیسل (Windsor) تھا
یہ پیرس سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر واقع ہے اور بے شک پیرس کی نواح میں سب مقاموں
سے زیادہ دلچسپ ہے اتوار کے روز چھٹی منانیوالوں کا یہاں بڑا مجمع ہوتا ہے۔

محلات شاہی میں سے ورسائی ( ) میں ایک محل ہے جسمیں لوئی
چہاردہم (Louis XIV) اور نپولین اول کے رہنے کے کمرے ہیں۔ گو کہ اسکے علاوہ
اور بھی محلات بکثرت ہیں مگر یہ محل سب میں ممتاز ہے۔ اس محل اعظم میں ایک تصویرخانہ
ہے۔ جہاں اس کثرت سے عجیب غریب تصویریں جمع ہیں کہ سوائے لاور (Louvre)
کے میں نے کہیں نہیں دیکھیں۔ یہ تصویریں بالکل تاریخی تصویریں ہیں جسمیں مصورنے
زیادہ تر اپنے ملک کے کارنامے دکھائے ہیں نپولین کے قریب قریب تمام لڑائیاں
اور اوسکی زندگی کے مختلف واقعات اور نیز فرانس اور الجیریا کے محاربات کے
بہت سے موقعے دکھائے گئے ہیں۔ یہ تصویریں اسمیں شک نہیں بے انتہا قابلیت
اور صفائی کے ساتھ بنائی گئیں اور جسامت کے لحاظ سے اسقدر بڑی ہیں کہ میں
سخت متحیر ہوا۔ میرے خیال میں مختصر طور پر اس مقام کی چند تصویروں کا ذکر دلچسپی سے
خالی نہ ہوگا۔

محل کے دوسرے چھت پر جسمیں ۹ کمرے ہیں فرانس کے تمام اور نیز انگلستان کی چند
بادشاہوں کی تصویریں ہیں۔ فرانس کے بادشاہوں کی تصویروں میں میری انٹونائٹ
(Marie Antoinette) ملکہ لوئی شانزدہم کی تصویریں جو کیلے (Callet)
کے بنائی ہوئی ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس تصویر میں بہت کچھ کام باقی ہے
اور پوری طور سے مکمل نہیں۔

ایک کمرے میں ۱۷۸۹ء کے فتنہ عظیم کے چند واقعات کی تصویریں ہیں جس میں
اوتھ۔ آف۔ دی ٹینس کورٹ (Oath of the Tennis Court) کی تصویریں زیادہ

ممتاز ہیں۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ اس محل میں ایک ٹینس کورٹ تہا جہاں لوگوں نے فتنہ عظیم کے زمانہ میں جمع ہوکر قسم کہائی تہی کہ جب تک حکومت میں کوئی مفید تبدیلی نہوگی اوسوقت تک برابر مخالفت کیلئے جمع ہونا اور بغاوت کرنا چاہئے۔ یہ تصویریں انہیں مجموں اور اونکے سرغناؤں کی تصویریں ہیں۔

محل ورسائی کے جنوبی پہلو کے فرش پر گیلیری آف دی امپائر یعنی تصویر خانہ سلطنت ہی جسمیں ۱۳ کمروں میں جنگ ۱۸۱۰-۱۷۹۶ع کی تصویریں بہری ہوئی ہیں۔ انہیں روگی (Rouquet) کی کہینچی ہوئی ایک تصویر ہی جسمیں دکہایا ہے کہ نپولین اعظم کی شادی آسٹریا کی شہزادی میری لوئیسی کے ساتہ ہورہی ہے۔ یہ تصویر بہت زیادہ صاف نہیں اور کسیقدر اندہی معلوم ہوتی ہے مگر اسی شہزادی کی تصویریں دو جگہ اور ہیں جو بے انتہا صاف اور خوبصورت ہیں۔ ایک میں میری لوئیسی تنہا کہڑی ہے اور دوسری میں اپنے لڑکے کو جو نپولین سے پیدا ہوا تہا دیکہ رہی ہے۔ یہ دوسری تصویر فرانس کے شہور مصنف فرانک (Franque) کی بنائی ہوئی ہے۔

ایک تصویر ہے جنمیں لیو پولڈ اول شاہ بلجیم اور شہزادی لوئیسی دختر لوی فلپ کے شادی کے شاہانہ جلسے کو دکہایا ہے کہ شادی کا دربار ہے اور پادری کہڑا نکاح پڑہا رہا ہے یہ تصویر ایسی دلچسپ اور خوبصورت ہے کہ اپنے رنگ میں نظیر نہیں رکہتی۔

محل کے شمالی بازو کی پہلی چہت پر اور کمرے ۱۰ کے صدر دیوار پر جیروم (Gerome) کی کہنچی ہوئی ایک نہایت عظیم الشان تصویر ہے جسمیں لوئی نپولین اور ملکہ دربار فائینٹی بلو (Fontainebleau) میں سفرای سیام سے مل رہے ہیں۔

ایک تصویر ہے۔ انتہا درجہ کی دردناک جو انقلاب عظیم فرانس کے خوفناک واقعات میں سے ایک واقعہ کا ایسا دردناک نقشہ ہے کہ موت کا سین آنکہوں کے سامنے پہرجاتا ہی موت کا بازار ۱۷۹۳ع میں گرم ہوا۔ ۱۷۹۴ع میں انتہائی کمال پر پہونچا اور خونخواری اور وحشیانہ مظالم کی کوئی انتہا باقی نہ رہی۔ اوسی زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ کنسرجری (Conciergerie) کے قیدخانہ میں بے گناہ بڈہے۔ بچے۔ نوجوان لڑکیاں

مائیں شیر خوار بچوں کو چھاتی سے لگائے بند ہیں اور تمام فرانس میں خون کا سمندر امنڈ رہا ہے۔ باغیوں کی ایک عدالت ہے جو بلا توقف قتل کے احکام جاری کر رہی ہے۔ بے گناہوں کے چھکڑے بھرے ہوئے قید خانے کے پاس کھڑے ہیں کہ انہیں خالی کر کے قید خانے میں ٹھونسیں اور وہاں سے جنہیں قتل کا حکم ہوا ہے بھر کر پلیس ڈی لاریوولیوشن (Place de la revolution) سولی پر چڑھانے لیجائیں۔ اُف۔ اس سے بھی زیادہ مظالم کہیں سنے نہ گئے ہونگے۔ ان مظلوموں میں سے ایک مظلوم کا سین اس تصویر میں دکھایا گیا ہے جس میں شاعر اندری شینیر (André Chenier) سر پر ہاتھ دھرے موت کے حکم کا انتظار کر رہا ہے۔ اس سے زیادہ دردناک سین میری نظر سے کہیں نہیں گذرا

ایک تصویر ہے۔ ایچ۔ ورنے (H. Vernet) کی بنائی ہوئی۔ اسمیں اس مشہور لڑائی کی سین کھینچنے والے مصور نے سان جوان دی یولوا (San Juan de Ulloa) کی گولہ باری کی تصویر بنائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوی فلپ (Louis Philippe) کے زمانہ میں جہازات کیسے ہوتے تھے اور بحری لڑائی کا کیا انداز تھا۔

اس محل کے شمالی بازو کے پہلی چھت کے کمرے میں یواں (Yvon) کی کھینچی ہوئی حملہ ملاکوف (۸ ستمبر ۱۸۵۵ء) کی تصویر ہے۔ اس سے بڑھکر عمدہ لڑائی کی تصویر شاید ہی دنیا میں کہیں ہوگی صاف معلوم ہوتا ہے کہ خون بہ رہا ہے۔ گولیاں برس رہی ہیں۔ تپنچے۔ بندوقیں۔ کرچیں۔ تلواریں چل رہی ہیں۔ کوئی گر رہا ہے۔ کوئی کراہ رہا ہے غرض ایک آفت کا عالم ہے۔ جنگ کریمیا میں اس سے بڑھکر سخت کوئی لڑائی نہیں ہوئی جسمیں انگلستان فرانس۔ سارڈینیا اور ٹرکی کی افواج متحدہ کو فتح حاصل ہوئی تھی۔

فرانس کے مشہور مصور بلیس (Bellangé) کی بنائی ہوئی جنگ آلما (۲۰ ستمبر ۱۸۵۴ء) کی ایک سین کی تصویر ہے جو ایسی صاف ہے کہ کپڑے پر ہر چیز گویا جاندار معلوم ہوتی ہے خوبی میں حملہ ملاکوف کی تصویر سے یہ کم نہیں اور مصور کی منتہائی کمال کو ظاہر کرتی ہے۔ فرانس اور الجیریا کی لڑائی کی جو تصویریں ہیں وہ بھی عجیب وغریب فرانسیسی۔

مشہور مصور بے لانجیر (Bellangé) کی بنائی ہوئی قبضہ درہ موضعہ کی تصویر اور ہوریس ورنے (Horace Vernet) کی بھی بنائی ہوئی قبضہ درہ موضعہ وسالا کی تصویریں قابل دید ہیں۔ کہیں یہ ہے کہ فرانسیسی امام عبدالقادر کے خیمہ و خرگاہ پر قبضہ کر رہے ہیں۔ کہیں یہ دکھایا گیا ہے کہ امام کی عورتیں بے پردہ کی گئی ہیں خاصکر ایک تصویر تو اسقدر بڑی تھی کہ میں چونک پڑا۔ ....۔ اسمیں یہ دکھایا گیا ہے کہ فرانسیسی فوج نے عبدالقادر کی فوج پر قبضہ کیا ہے۔ ضخامت میں یہ تصویر ۱۱۰ فیٹ لمبی اور ۱۷ فیٹ چوڑی ہے اور ۲۰۰ کے قریب آدمی ہیں۔ بے پردہ[1] مسلمان عورتیں اور بچے سپاہیوں سے پناہ طلب کر رہے ہیں۔ ایک خاص عورت جو شاید امام عبدالقادر کی بیوی ہیں افسر فوج ڈیوک ڈاملی۔ (Duc d'Aumale) سے رحم طلب کر رہی ہیں۔ ایسا ہیبت ناک سین ہو کہ میں بیان نہیں کر سکتا جیسا برتاؤ فرانسیسیوں نے عبدالقادر کیساتھ کیا شاید ہی اس سے زیادہ وحشیانہ برتاؤ کسی نے ہزیمت خوردہ غنیم کے ساتھ کیا ہوگا۔ وحشیوں میں بھی کچھ ترس ہوتا ہے اور اونکے بھی ظلم و ستم کی انتہا ہوتی ہے مگر ان مہذب نما وحشی یورپ کی قوموں کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

---

[1] سر سید نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس تصویر کا ذکر کیا ہے اور فرانسیسیوں کی اس تہذیب کا گو کہ بہت نرم الفاظ میں ذکر کیا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلیجہ میں خون جوش مار رہا ہے اور آنکھوں سے فوارے نکل رہے ہیں فرماتے ہیں۔

"اس تمام تصویر خانہ میں صرف ایک ہی بات تھی جو فرنچ کی شجاعت اور سویلیزیشن کو بٹہ لگاتی تھی اور مجھکو اُسے دیکھکر نہایت تعجب ہوا کہ ایسی بہادر اور شجاع اور سپاہی قوم نے جو سویلیزیشن کے زیور سے بھی نہایت آراستہ ہے ایسی عجیب بات جو اُن سب خوبیوں کے برخلاف ہے کیونکر کی ہے۔ الجزائر کے محاربات کی تصویروں کی کمرہ میں امام عبدالقادر کی عورتوں کو گرفتار کرنیکے تصویر بنائی ہے اُس کی عورتیں اونٹ پر کجاوہ میں تھیں فرنچ سپاہیوں نے اونٹ کو بٹھا کر کجاوہ گرا دیا ہے اور عورتیں اسمیں سے نکل پڑتی ہیں اور اُن کے بدن سے کپڑا ہٹ گیا ہے۔ اور فرنچ سپاہی سنگین اُٹھائے ہوئی اور اُن کی لڑکیں عورتوں کی طرف کئے ہوئی گویا اب مارینگے گرد کھڑے ہوئے ہیں۔ کیا فرنچ کو یہ زیبا تھا کہ عورتوں کی گرفتاری کی تصویر اپنی محل میں لگاتے کیا عورت پر سنگین سیدھی کرنی اور اوسکو کجاوہ میں سے گرا دینا فرنچ سپاہیوں کی بہادری کی یادگاری تھا۔ کیا ایک عورت کا تصویر میں کپڑا بدن پر سے ہٹا ہوا بنا دینا (بالفرض اگر ایسا ہی ہوا بھی ہو) فرنچ کی سویلیزیشن کی شایاں تھا۔"

(دیکھو مسافران لندن۔) از سر سید احمد خاں۔

اس تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ وحشیانہ مظالم میں یہ فرانسیسی کیسے خوش ہیں اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو ہاتھ جوڑتے منتیں کرتے اور پناہ مانگتے دیکھکر فخریہ اکڑے جاتے ہیں کسی قوم کی عظمت وشان کی یہ تصویر ہرگز نہیں بلکہ موجودہ تہذیب وتمدن کے لئے جسکا راہبر اور اگوا تمام دنیا میں فرانسیسی صرف اپنے تئیں سمجھتے ہیں ایک شرم کی تصویر ہے۔ نیرو (Nero) نادر اور ہلاکو کے مظالم کے قصے بیان کئے جاتے ہیں لیکن اگر ان فرانسیسیوں کی اس موجودہ زمانہ کے مظالم سے مقابلہ کیا جاوے تو اونکی کوئی حقیقت باقی نہ رہیگی۔ فرانس کے انقلاب عظیم کے زمانہ کو یاد کرو (Commune) کمیونس کے اوس بغاوت کے واقعات بھی ذرا یاد کرو جنہیں ابھی ستر برس بھی نہ ہوئے ہونگے اور اوس ظلم وستم کو یاد کرو جس سے فرانسیسیوں نے اس غدر کو فرو کرنے میں کام لیا ان سب واقعات سے معلوم ہوگا کہ شاید ہی دنیا میں کوئی قوم انسے زیادہ فطرتًہ ظالم اور وحشی پیدا ہوئی ہو۔ نیرو (Nero) بھی جسنے اپنے باغ کو عیسائیوں کی جسموں میں آگ لگاکر روشن کیا تھا اگر ان وحشیانہ مظالم کو دیکھتا تو شرم سے مانہ چھپاتا۔ یوروپین مہذب اقوام ذرا روس کے آجکل کے مظالم اور خاصکر قتل عام سینٹ پیٹرسبرگ کے واقعہ کو دیکھیں اور شرمائیں۔ ذرا کوہ قاف کے مسلمانوں اور تاتاریوں کے قتل کو یاد کریں اور سلطان المعظم پر اسطرح نرغہ کرنیکی وجہ تو بتائیں۔ کیا ہمارے اُن احسانات کا جو از منہ وسطی میں ہمنے ان یوروپینوں کے ساتھ کئے تھے یہی بدلہ ہے جو آجکل ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس موجودہ تہذیب کے زمانہ میں جو درحقیقت اخلاق کے لحاظ سے تباہ اور نہایت ہی ذلیل زمانہ ہے کیا ہمارے ساتھ یہی برتاؤ ہوتا رہیگا اور ہم بہے جائینگے۔ اوہ! صلاح الدین کی روح تو ہی آج ہمارے سامنے آتا کہ تجھے دیکھکر ہمارے دلوں میں عبرت۔ اتفاق وحمیت کے خیال پیدا ہوں۔ آہ! اوس عظیم الشان بہادر بادشاہ کا جسد کہیں شام کے میدانوں میں زیر زمیں آرام کرتا ہوگا۔ اُسے کیا خبر کہ جو مقامات اوسکے تزک واحتشام کی مرکز تھے، آج ویران پڑے ہیں جن لوگوں کی تلوار سے اوسنے عیسائی دنیا کے دانت کھٹے کردئے تھے آج اُن کی اولاد ذلیل وخوار ہے۔ اوسکی روح بیشک اُن کھنڈروں کو دیکھکر روتی ہوگی۔ مگر کیا ہمسے نہیں ہوسکتا

کہ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے یاد کر کے اسیطرح دنیا میں بہتر نام پیدا کریں جسطرح اُنہوں نے کئے تھے مسلمانوں کی اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو طوفان حوادث کے تھپیڑوں سے نجات دیں اور اُن عیسائیوں کے ہاتھوں سے اپنے تئیں محفوظ رکھ سکیں جو اپنے آپکو رحم و کرم کے امام اور بڑے کے مانند حلیم کہتے ہیں اور اسلام کو مذہب شمشیر بتاتے ہیں اس سے بڑھ کر دہوکے بازی اور منافقت دنیا میں کہیں اور بھی ہے ہخدا کی قسم میرا دل بے انتہا جوش سے بھر جاتا ہے اور ناامیدی اوس پاک خدا کے مکان یعنی کعبہ کی تصویر سامنے کھڑی کر دیتی ہے - اور میرے نظر میں اس مرکز وحدانیت کی گرد ہزاروں زائر اطراف و اکناف عالم کی جمع طواف کرتے اور اوس پاک ذات کی وحدانیت والوہیت کا اقرار کرتے معلوم ہوتے ہیں - اسی ناامیدی و بیکسی کی حالت میں مدد کے لئے میری زبان سے یہ آواز بیساختہ نکل جاتی ہے کہ "اُو خدای واحد کی مقدس مقام اور اوسکی وحدانیت کے آشکارا کرنے والے اپنے ان زیارت کرنے والوں میں اُن کی اسلاف کی سی روح پہونک دے - تیرے سامنے میں اُن اقطاب و ابدال و بزرگان دین کی ارواح کو پکارتا ہوں جنہوں نے تیرے دامنوں کو زمانہ سلف میں بوسہ دیا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں حمیت و اتفاق اور اصلی اسلامی جوش پیدا ہو جائے - تمام اسلامی دنیا سے یہ لوگ تیرے گرد آکر جمع ہوئے ہیں - انہیں سچائی - انصاف - اتفاق - مذہب وطن کی محبت کے خیالات پیدا کر دے کہ گھر جا کر ان خیالات کو پھیلائیں اور اپنے ممالک کو ان عیسائی بروں کی چراگاہ بننے نہ دیں"

فرانسیسیوں کی اس ظلم و ستم کی تصویر نے مجھے کہاں سے کہاں پہونچا دیا - دریائی کی دلچسپیاں ابھی بہت باقی ہیں اور یہاں کے حالات مجھے کچھ اور بیان کرنے ہیں -

یہ مقام اپنے فواروں کے لحاظ سے بہت مشہور ہے جنپر خوبصورت اور عجیب عجیب تصویریں پریوں کی شکل کی بکثرت کندہ ہیں ان فواروں نے باغ کو رشک باغ عدن بنا دیا ہے اور ان کا چھوٹنا اور ہوا میں طرح طرح سے چکر کھا کر گرنا ایسا دلفریب ہے کہ یہ باغ ان کی وجہ سے دنیا کے بہترین باغوں میں شمار کیا جاتا ہے - یہاں ایک خوبصورت جھیل ہے

جسپر اکثر کشتیوں میں بیٹھکر تفریح کے لئے لوگ نکلتے ہیں۔ گو کہ یہاں شاتلی (Wollensondi) کی مانند درختوں کے دورویہ صفیں کثرت کے ساتھ نہیں تاہم چیناری درختوں کے دلفریب کنج بہت ہیں اور بمقابلہ شاتلی (Wollensondi) کی چل پہل بھی یہاں زیادہ ہی۔ ہر طرف سیر و تفریح کرنیوالوں کی جماعتوں کی جماعتیں نظر آتی ہیں جو صرف ایک دن کے لئے چھٹی منانے آسکتے ہیں۔

مین ورسائی (ـــــــ) دریاے سین (ـــــــ) کے راستہ کشتی پر گیا تھا تاکہ وہاں کے دلفریب مناظر قدرت کے دیکھنے کا موقعہ زیادہ ملے مگر لوٹتے وقت نہایت تیز رفتار کی برقی ٹرین پر جسمیں آسایش کا تمام سامان مہیا تھا واپس آیا۔ فقط

"مانی"

مکتوبات امیر مینائی

استاذ امیر مینائی علیہ الرحمۃ جسطرح نظم اردو کی استاد مسلم الثبوت ہیں اسی طرح جناب مرحوم کی نثر بھی ایک ممتاز مرتبہ رکھتی ہے۔ وہ نہایت متین اور معنی خیز نثر تحریر فرماتے تھے اور میری آرزو ہے کہ کسیطرح استاذ مرحوم کے مکتوبات اور نثر کا مجموعہ مدون ہوجائے چنانچہ رسائل اور اخبارات میں اعلان بھی کیا۔ تلامذہ اور احباب کو خطوط بھی لکھے۔ منشی محمد احمد صاحب خلف اکبر استاذ مرحوم سے زبانی بھی عرض کیا مگر زمانہ ایک حجاب غفلت ہے کہ عالم دانش و فن پر پڑا ہوا ہے اور کسیکو اس خواب خوش آیند سے بیدار ہونے کی رخصت نہیں دیتا۔ خیر یہ چند خطوط اردوی معلےٰ میں شائع کرتا ہوں تاکہ اہل فن کو استاذ مغفور کی نثر کا پایہ معلوم ہوجائے اور وہ انکو پڑھکر محظوظ ہوں۔ تلامذہ اور احباب جناب امیر مرحوم سے درخواست ہے کہ جلد متوجہ ہوں اور نقل خطوط حضرت ممدوح خاکسار کو مرحمت فرمائیں تاکہ استاذ کا مجموعہ نثر مکمل ہوجائے۔

خاکسار۔
محمد احسن اللہ خاں ثاقب دفتر قند پارسی علی گڈھ

(۱) حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی کے نام

(رام پور - ۸ر مارچ ۱۸۹۹ء)

مجبی حکیم صاحب۔ سلام مسنون و دعا مشحون - مہربانی نامے نے پہنچکر شکر گزار یاد آوری کیا ؎

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

اب تک آپکا فائز مرام نہ ہونا سخت افسوس کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حسب دلخواہ کامیاب فرمائے۔ یہ داعی خیر دعا سے کسیوقت غافل نہیں ہے۔

بجا نا "پسند آنے" کے معنی میں اگلی زبان ہے اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے۔ "مہین"۔ "میں ہی" کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں ابتک نظر سے نہیں گزرا۔ حکم اسکو استعمال کا نہیں دیا جاسکتا حضرت اسیر مرحوم کی نظر سے آپکے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہگیا اور میں نے بھی اسے دیکھا ہے تو سوا اپنی سہو نظر کے اور کیا کہا جائے انکھڑیاں چشم معشوق کیلئے مخصوص ہے اور یہ لفظ مجھے بہت پسند ہے۔ بیدا کا لفظ صحیح بدنما ہے اور [illegible] کرنیکے معنی میں مستعمل ہے

[illegible]سکا ہے وہ ہی عشق جنوں زا دل میں	صبا	بدہ گیا ہے نمکین حسن کا سودا دل میں

ایجاد مذکر ہے۔ سند کے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آج کل اس لفظ کے تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں اور جا بجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خانصاحب داغ کا قول ہے کہ دکی میں مونث ہے مگر کلام میں کہیں سے مونث کا پتا نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مونث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں ہے۔ نسیم دہلوی ؎

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارکباد مرگ		یہ نیا ایجاد ہے میرے ستم ایجاد کا

یہ تازہ لگا ہوئے ایجاد گلستاں میں میر سالوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

اگرچہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے وہ سند کیلئے [illegible] سے کافی نہیں ہوسکتا مگر دیوان میں اسیطرح چھپا ہے اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے سنا ہے

غافل لکھنوی ؎

اتنی بینائی کہاں کھینچ سیر جزو و کل		عالم ایجاد میں تو سیکڑوں ایجاد ہیں

دشنام زیادہ مونث ہی مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر کہا ہے فلہذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہی

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی	ناسخ	تو گویا پیمبر کو دشنام دی
بارہا میں گیا ہوں نزد امام	ولہ	کبھی مجھکو ندے کوئی دشنام
ہمکو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے	ظفر	خط یہ خط روز ہیں بے نام کسو کے آتے
ہوس بوسہ اگر کیجے نہ لالی ہمکو		کاہیکو سننے کو دشنام کسو کے آتے

سب بنسکے زادے اور جلیل حسن بالتخصیص تسلیم گزار و سپاسگزار ہیں امیر فقیر

(۲) مولوی نور الحسن صاحب خلف اکبر استاذ مولوی محمد محسن صاحب محسن کاکوروی ؒ کے نام

دفتر امیر اللغات - ریاست رام پور ۸ راگست ۱۸۹۹ء

سراپا رشد و سعادت - مجسم علم و لیاقت عزیز از جان مولوی محمد نور الحسن کو امیر فقیر کے جی سے بے اختیار نکلی ہوئی دعائیں -

آج آزاد آیا - آشوب چشم کے سبب میں دیکھ تو نہ سکا مگر تمہارا ریویو امیر اللغات پر پڑھوا کر سنا - اس حیثیت سے کہ تمنے اپنی رائے ظاہر کی تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں - اور اس نظر سے کہ تمنے بہت ہی نازک خیالی کے ساتھ ریویو کیا آفریں و مرحبا کہتا ہوں - چشم بدور تمنے تو امیر اللغات کے بعض بعض وہ حسن ملک کو دکہا دیے جن کی نسبت میرا خیال یہ تھا کہ جو اس کام میں مصروف ہیں صرف انہیں کی نگاہ میں ہیں - خدا تمہیں بہت بڑی عمر دے - تمہاری علم و لیاقت کا ملک میں ڈنکا بجے اور بہت بڑا صاحب اقبال کرے - آمین -

تمہارے سوالوں کا جواب حسب ذیل ہے -

آرسی میرے نزدیک ہندی ہے اسلئے کہ مادری نسخ وتنگ و عاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا - ہندی میں تو عین سے لکہنا خلاف اصول ہے

ہندی میں عین کہاں۔

سالا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصالح کا ہندی ہے جو عربی میں مصلح کی جمع ہے۔ اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہی محل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے جیسے عمارت کے لئے چونا سرخی وغیرہ۔ تالیف کے لئے وہ کتابیں وغیرہ جنسے اس تالیف میں مدد ملے۔ کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لئے گوٹا پٹھا بنت کناری۔ کھانے کے لئے لونگ۔ الائچی۔ دھنیا مرچ۔ بال دھونے کا سالا۔ محرم کا سالا سالے کا تیل۔ دلی والے اصل کی طرف جاتے ہیں مگر چونکہ زبانوں پر مصالح نہیں ہے یعنی کوئی یہ نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا۔ گرم مصالح ہوگیا۔ کری میں مصالح کم پڑا۔ انکی محرم کا مصالح ہمکو نہیں دیا اسلئے میری رائے ہے کہ اُردو میں جو بولیں وہی لکھیں۔ جسطرح سالا بولتے ہیں اسیطرح لکھا بھی جائے اور یہی مغرب متوسطین متاخرین شعرائے لکھنو کا ہے۔ جیسا رشک نے اپنی لغت میں لکھا ہے۔

سالا۔ بیم مفتوح سین مہملہ و لام بالف کشیدہ۔ ضروریات ہر چیز باشد کہ بداں ضروریات رونق و لذت آں چیز شود۔ ظاہرا ایں لغت از مصالح باشد۔ اور اسکی تقلید جلال نے بھی اپنی لغت گلشن فیض میں کی ہے۔ منیر مرحوم نے بھی یہی طرز اختیار کیا ہے

نک چڑکنے کو مانگے جراحت دل پر	؎	جو دیکھے آپکے موباف کا سالا سانپ

کالا سانپ اور بالا سانپ زمین ہے۔ ولہ ؎

کسی کے سینہ سوزاں سے کیا نشہ میں لپٹی ہے		کباب دل کی کچھ کچھ بو ہے کری کے سالے میں

لالے میں پیالے میں زمین ہے۔ اور جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ محلات لکھنو میں بھی یہی بول چال تھی ؎

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بیچ کر		انگیا کا میرے سارا سالا مسل گیا

"امیر فقیر"

ایک پُر لطف تحقیق

دہلی اور لکھنؤ کے طفیل میں گو قریب قریب ہندوستان کے تمام شہروں میں کم و بیش فصاحت کا خوشنما جلوہ نظر آنے لگا ہے پھر بھی بہت کسر باقی ہے اور بعض محاورے بالکل ہی بیجا گوش زد ہوا کرتے ہیں عرصہ ہوا کہ میں بانسہ شریف میں حاضر تھا وہاں ایک میرے مکرم شاعر فصیح اللسان جنکا وطن شاہجہانپور ہے اور حضرت داغ دہلوی مرحوم کے تلامذہ میں سے ہیں تشریف رکھتے تھے - اُنہوں نے ایک آم کے بڑے درخت کو فرمایا کہ کیا ہی اچھا آم کا بوٹا ہے خاکسار نے عرض کیا کہ اتنے بڑے درخت کو بوٹا کہنا یہ کہاں کا محاورہ ہے اُنہوں نے فرمایا کہ ہر درخت کو خواہ کتنا ہی بڑا ہو اور چاہے جسکا ہو بوٹا کہ سکتے ہیں اور فصحا برابر اسکو استعمال کرتے ہیں - کوئی مثال کسی اہل زبان کی نہیں دی - میں نے اسکے صحیح ہونے سے بالکل انکار کیا اور بوٹا جن معنوں میں مستعمل ہے وہ ظاہر کئے لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہے - آخر یہ صلاح ٹھری کہ فصحائے اہل زبان سے اسکی نسبت استفسار کیا جائے اور جو وہ لکھدیں صحیح مان لیا جائے - چنانچہ میں نے یہ مسئلہ پہلے افصح الفصحا استاذی حضرت محمد لکھنوی مدظلہم العالی کی خدمت میں پیش کرکے اونسے جواب لکھوایا - بعدہ حضرت جلال لکھنوی سے لکھوا کر حضرت داغ کی خدمت میں حیدرآباد بھیجا - اُنہوں نے بھی اوسکا جواب عنایت فرمایا - الحمد للہ کہ خاکسار کا خیال صحیح نکلا - اسکی بعد دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ بیشک شاہجہانپور میں عام طور سے ہر درخت کو بوٹا کہتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو -

اب وہ دلچسپ سوال و جواب لفظ بلفظ درج ذیل کرکے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں یقین کہ ناظرین اس مفید تحقیق کے ملاحظے سے بہت محظوظ ہونگے - فقط -

سوال

شعرائے محقق اور فصحائے زبان اردو کی خدمت میں التماس ہے کہ اس بارے میں

اپنی رائے ظاہر کرکے مرہون منت فرمائیں۔ کہ لفظ **بوٹا** بواؤ معروف کے کیا معنی ہیں اور عام اشجار پر اس لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ مثلاً ۔ آم کا بوٹا ۔ املی کا بوٹا ۔ تاڑ کا بوٹا وغیرہ اور دہلی و لکھنؤ میں اسکے معنی میں کوئی فرق ہے یا نہیں فقط

جواب

(بوٹا) اصل میں یہ فارسی زبان کا لفظ بوتہ واؤ معروف اور تائے قرشت کے ساتھ ہے جسکے معنی چھوٹا درخت جو بہت بلند نہو۔ اُسی کی تے کو تائے ہندی اور آخر کی ہائے مختفیہ کو الف سے تبدیل کرکے بوٹا لفظ ہندی بنا لیا ہے ۔ معنوں میں کوئی فرق نہیں ۔ اردو میں بھی چھوٹے ہی درخت کو بوٹا کہتے ہیں ۔ جیسا کہ جناب بحر مرحوم کے اس شعر میں توضیح کے ساتھ موجود ہے ؎

راستی چاہیے خردی و بزرگی کیسی	بڑھ گیا سرو سے قد یار کا بوٹا ہو کر

اسی وجہ سے اکثر پھول کے درخت پر اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے جیسا کہ امانت مرحوم نے کہا ہے ؎

چمن ڈ کوئی گل کا بوٹا ہے تو	ستارہ و یا نیک لوٹا ہے تو

اور تصغیر ہی کے لحاظ سے چھوٹے خوشنما قد کو بوٹا سا قد کہتے ہیں جیسے ناسخ مغفور ؎

گڑ گئے گلبن ترے بوٹا سے قد کو دیکھکر	تھا لفٹ گل میں جو زر گویا دفینا ہو گیا

اور نیز بلحاظ خردی پودے کو بھی کہ سکتے ہیں جیسا کہ بحر مرحوم کے اس شعر سے تشریح ہوتی ہے ؎

سیر کے قابل ہے اب باغ جوانی یار کا	بیل زلفوں کی چلی قامت کا بوٹا بڑھ گیا

اور گل و برگ کی تصویر کو بھی بوٹا کہتے ہیں جو کسی چیز پر بنی یا چھپی ہو جیسے بحر مرحوم کے اس شعر میں ؎

اپنی بہار خاک دکھائیں غریب لوگ	بوٹی نہ چھینٹ کی ہے نہ بوٹا ہے شال کا

انہیں معنوں میں برعایت معنی مذکورۂ بالا یعنی گلبن اس شعر میں فرماتے ہیں ؎

عجب بہار ہے بیلوں کی اور بوٹوں کی	پری دوپٹا ترا غیرت چمن کیا خوب

سحر مرحوم چھوٹے خوشنما قد کو تشبیہا دوشالے کا بوٹا یوں فرماتے ہیں ؎

گھٹا ہو گئی ہے بڈھے چھوٹے ہوئے	قدم دو شالوں کے بوٹے ہوئے

آتش مرحوم کہتے ہیں ؎

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی ۔۔۔ قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

راقم السطور عرض کرتا ہے ؎

رنگین کفن بھی ہو کہ میں رنگین مزاج تھا ۔۔۔ نیچے کفن کے بوٹے ہوں اوپر کفن کے پھول

اب رہا یہ سوال کہ درخت کو چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہو بوٹا کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔ مثلاً آم کا بوٹا۔ تاڑ کا بوٹا اور املی کا بوٹا وغیرہ ایسا نہ تو اصل لفظ فارسی بوتہ کے معنوں سے مفہوم ہوتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور نہ محاورہ اردو میں فصحاے لکھنؤ کی زبان سے سنا نہ اونکے کلام میں نظر سے گذرا دہلی کے قدماے محقق کے کلام میں بھی جہانتک دیکھنے کا اتفاق ہوا سوا معنی مذکورہ کے ان معنوں میں ہونیکا خیال نہیں۔ میرے نزدیک تو کسی بہت بڑے درخت کو بوٹا نہ کہنا چاہیے

فقط واللہ اعلم

خادم الشعرا (محمد محمود وحید) لکھنوی

بوٹا کا اطلاق محض درخت گل یعنے گلبن پر کیا جاتا ہے اور کسی درخت کو نہیں کہہ سکتے۔ جلال لکھنوی۔

بوٹا چھوٹے خوبصورت درخت جو خلقت میں چھوٹا ہو یعنی پودے کو کہتے ہیں اور گلبن کو بھی کہتے ہیں اور پھول پتی کو بھی کہتے ہیں۔ آم کا بوٹا تاڑ کا بوٹا املی کا بوٹا میں نہیں جانتا۔ متوسط دنوں اور خوبصورت قد کو بوٹا سا قد کہتے ہیں۔ فصیح الملک داغ دہلوی۔

الراقم خاکسار وحید مل بلگرامی عاملہ اللہ تعالی بلطفہ السامی از تلامذۂ حضرت وحید لکھنوی۔

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

وہاں سے میرے اقارب کو کیا مری خبر آئے ۔۔۔ تری گلی سے مری لاش بیوفا مگر آئے

ہو چکے ہیں کہیں تو صنم کدہ ہو کہ کعبہ ۔۔۔ اب اسکو جانتے بھی وہ فرطِ شوق میں جدھر آئے

تجھے کو عشق و ہوس میں کچھ امتیاز نہیں ہے ۔۔۔ نگاہِ حسرت اہل وفا میں کیا نظر آئے

ہمیں مجال کہاں ہے کہ جائیں ہم ترے در تک ۔۔۔ تجھے خیال کہاں ہے کہ تو ہماری گھر آئے

ابھی ذرا سے قاتل کے کوچے سے نہ اٹھائیں ۔۔۔ بہارِ زخم تو جب ہے کہ خوں تا کمر آئے

دکھائیں ہم بھی تجھے ایک دن بہار تبسم ۔۔۔ لب جراحت دل میں جو خونِ ناب بھر آئے

پہونچ سکے نہ لب تک نہ شیشۂ مے گلگوں
تجھے خیال دل عاشقاں کبھی اگر آئے

ہے اب تو طعن اقارب کا ڈر ہی ہم عدو ہی
گئی وہ بات کہ بد عہد تو ہمارے گھر آئے

بطور تحفہ اُسے بھیجئے بخدمت کو کب
زبان خامہ یہ وحشت جو کوئی شعر تر آئے

غزل جناب محمد محمود صاحب حمد لکھنوی ارشد تلامذہ حضرت سحر مرحوم لکھنوی وحضرت قدر مرحوم بلگرامی

یہ بے موقع تمہاری ہر گھڑی کی دل لگی کیسی
طبیعت آدمی کی ہے کبھی کیسی کبھی کیسی

نہیں دل لیکے دیتے یہ تمہاری دھاندلی کیسی
مری ہی چیز کو کہتے ہو - میری ہے - تری کیسی

دکھا دوں ایکدن اونکو تو پھر ہو دل لگی کیسی
جو کہتے ہیں کہ دیکھیں - ہوتی ہے دلگی لگی کیسی

نہیں اک رنگ پر رہتی طبیعت ہی تری کیسی
کبھی ایسی - کبھی ویسی - کبھی کیسی - کبھی کیسی

تری محفل میں کسکی موئے نے شوخی تیغ کی کیسی
کھنچی کھنچکر چلی کیسی چلی چلکر رکی کیسی

جہاں آیا وہاں کھویا گیا ہمسے الگ چھوٹا
سزا اپنے کئے کی دلکو آخر ملگئی کیسی

بیان سوز دل رو رو کے کرتا ہوں تو کہتے ہیں
لگی ہے آگ جب دلمیں تو آنکھوں میں تری کیسی

ستم کرنے سے اونکو کام اور اونکی بلا جانے
یہ تو ہمسے کوئی پوچھے پڑی کیسی سہی کیسی

ہزاروں لخت دل ساتھ آہ کے نکلے ہیں رونے میں
چلا ہے میرا نالہ لیکے پھولوں کی چھڑی کیسی

یہ قدرت قاف والوں کی کریں جو حسن کا دعویٰ
مقابل اونکے پہلے حور تو ہولے - پری کیسی

مقابل ہوتے ہی مرغ نظر سے مرغ دل ہارا
یہ بازی چھوٹتے ہی جوڑ گھٹ بڑھ ہوگئی کیسی

وہ سُن سُن کر مرے ہر شعر کو اے حمد کہتے ہیں
طبیعت میں ہے اس کمبخت کی شوخی بھری کیسی

غزل جناب طاہر فرخ آبادی بطرز لکھنؤ

تاؤ کھا کر رہگیا آہوں سے جل کر رہگیا
رنگ جنبر کیطرح کہدوں بدل کر رہگیا

وصف شمع عارض پر نور کا کیا پوچھنا
نور کا مضمون تھا سانچے میں ڈھل کر رہگیا

سخت جاں پایا مجھے غصے کے جوہر کھل گئے
نیچہ جلاد کا تیور ہی بدل کر رہگیا

دل نے جیتے جی نہ چھوڑا دامن عشق مژہ / واہ رے نادان کانٹوں میں مچلکر رہگیا
تیری چوٹی ایڑیوں تک آئی حسرت بڑھگئی / پاؤں اسنے چھولئے ہیں ہاتھ مل کر رہگیا
کچھ نہ ٹھہرا دل ہمارا سوز غم کے سامنے / سنگ خارا تھا مگر کمبخت جلکر رہگیا
آتے آتے میرے گھر رخصت ہوا وہ مہروش / وصل کا دن صبح ہوتے ہوتے ڈھلکر رہگیا
بزم میں مجھکو فدا ہوتے جو دیکھا یار پر / شمع کو حسرت ہوئی پروانہ جلکر رہگیا

جب حنائی ہاتھ اٹھائے اسنے بہر فاتحہ
قبر میں طاہر کف افسوس ملکر رہگیا

غزل جناب سجّاد عظیم آبادی

زباں سے کیا گلہ کاوش عدو سے نکلے / جو دوست۔ دشمن ایمان وآبرو نکلے
تمہاری یاد میں تن سے جدا ہوئی یوں روح / کہ جیسے پھول سے بو۔ دلسے آرزو نکلے
نہ چھوڑنا کبھی دست ہوس سے دامن عشق / جو سو جگہ سے گریبان آبرو سے نکلے
میں دم بخود ہوں کہ جب ذبح کرکے اٹھ جائیں / تو جان جسم سے اور زخم سے لہو نکلے
زبان تیغ سے بیجا نہیں ہے پرسش حال / وہ راہ کرتے ہیں دلمیں کہ آرزو نکلے
میں جانتا ہوں کہ آداب میکدہ کیا ہیں / خدا گواہ ہے ساقی جو ہائے وہو نکلے
شروع راہ حقیقت ہے انتہائے مجاز / صنم کدے سے جو نکلے تو قبلہ رو نکلے
ٹھہر ادب سے ذرا قتل کر مجھے قاتل / غضب ہو۔ گر وہ قریب رگ گلو نکلے
یہ آہ سرد ہے غماز راز عشق بتاں / نہ ہو صبا۔ نہ چمن سے گلگوں کی بو نکلے
مریض غم کی اجل آچکے تو وہ آئیں / بدن سے جان نکل لے۔ تو آرزو نکلے

نوید امن ہی سجاد دشمنی اُن کی
وہ جسکے دوست ہوئے اُسکے عدو نکلے

غزل جناب حاجی شاہ سید نور الرحمن صاحب نذر عظیم آبادی

ہزار شکر اسی کا یہ دل نشانہ نہ ہوا / خراب جسکے اشارے سے اک زمانہ ہوا
دکھائیں خوب سی نیرنگیاں دو عالم کی / نگاہ یار کا ممنوں اک زمانہ نہ ہوا

ترے ہی ذکر پہ صد شکر خاتمہ بھی ہوا
رہیں تو باعثِ آرام یہ فسانہ ہوا

نہ بھول جینے پہ اپنے۔جہاں اجل آئی
تمام درہم و برہم یہ کارخانہ ہوا

خوشا نصیب کہ تم آج میرے گھر آئے
شرف میں عرش کا ہمسر فقیر خانہ ہوا

بھلا مجھے ہو کوئی آرزو تو کیونکر ہو
کہ دل کو روئے ہوئے مجھکو اک زمانہ ہوا

وہ مست ہوں کہ اُدھر میں کبھی جو جا نکلا
تو قدسیوں میں بھی اک جشنِ خسروانہ ہوا

نگاہِ یار کا مجھسے نہ پوچھئے عالم
کہ اسکے سامنے جو آگیا نشانہ ہوا

اب اور کیا کہوں صیاد مختصر یہ ہے
سبب قفس میں پہونچنے کا آب و دانہ ہوا

قیام راست نہ تھا مجھکو ای جہاں والو
تمہیں یہ ملک مبارک ہو۔میں روانہ ہوا

ہمارے حال سے ہو لی ہے تیری شان عیاں
ہمارا ذکر بھی گویا ترا فسانہ ہوا

خوشی کہاں کی۔تردد کما نکا۔غم کیسا
مجھے تو ترکِ علائق کو اک زمانہ ہوا

بہار آئی تو اگلے گلوں کی یاد آئی
بلا نصیبوں کو رونیکا اک بہانہ ہوا

بگڑ کے تیری محبت میں پھر بنا بھی دل
لٹا تو اور بھی انمول یہ خزانہ ہوا

غرض بھلوں سے نہ مطلب بروں سے ہی انکو
الگ سبھوں سے ہوا جو ترا یگانہ ہوا

انہی کی موت ہے اے نذر قابلِ حسرت
جنہیں شباب ہی خود موت کا بہانہ ہوا

غزل جناب علی اسط صاحب رشک فتحپوری ازبانده

تری یاد ہیں سب ستمگار باتیں
وہ دلدوز طعنے دل آزار باتیں

قطعہ بند

تری مست آنکھوں نے ہنگام مستی
وہ کیں جیسی کرتے ہیں ہشیار باتیں

کسیکو رولایا کسیکو بنایا
اشاروں میں کیں وہ طرحدار باتیں

وہ گویائی کو دی ہے طاقت خدا نے
عیاں کرتی ہیں گنج اسرار باتیں

نہیں ضعف سے تاب گفتار باقی
کرے تجھسے کیا تیرا بیمار باتیں

بڑی تیری رحمت بڑی تیری بخشش
یہ کرتے ہیں تیرے گنہگار باتیں

مزہ آگیا رشک تیری بیاں ہیں
کئے جا تو ای میرے غمخوار باتیں

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خانبہادر مدظلہ

لقب کیونکر نہو طبعِ رسا۔ معجز رقم میرا
عصا موسیٰ نبی کا۔ تیغ حیدر کی۔ قلم میرا

تماشہ ہے کہ دم میں کچھ نہیں۔ دم بھر میں سب کچھ ہوں
عجب دھوکے کی ٹٹی ہے وجودِ کالعدم میرا

رہے یا جائے دونوں حالتیں یکساں ہیں کیا پروا
نہ روح اپنی۔ نہ صبر اپنا۔ نہ دل میرا۔ نہ غم میرا

ترے رستہ میں ثابت پا کے اک حسرت سی ہوتی ہے
خود اپنی نقشِ پا کو پھر کے تکتا ہے قدم میرا

جہاں روشن ہے جس سے داغ سینہ میں وہ لایا ہوں
بہ حسرت کیوں نہ منہ دیکھا کرے شمعِ حرم میرا

اسی سے لطفِ صحبت دلکو ہے۔ دل ملگیا جس سے
خوشی جانیکو جائے۔ پر نہ چھوڑے ساتھ غم میرا

گرہِ دلکی ہمیشہ کھولتا ہوں پر نہیں کھلتی
الٰہی ہاتھ میں تیرے ہے یہ کارِ اہم میرا

ہوا کھائی ہے ایک مدت یہ میدانِ معانی کی
کہ روکے اب نہیں رکتا ہے کلکِ تیز دم میرا

مجھے الجھا نہ رکھنا روزِ حشر اپنی زیارت میں
کہ اے رحمت بہت مشتاق ہے باغِ ارم میرا

ہوس سو کی نہ دو سو کی۔ اسی اک خم کا طالب ہوں
تری سرکار سے ساقی نہ روزینہ ہو کم میرا

بس اے دشمن دوئی کو چھوڑ دے۔ آ صلح کر مجھسے
خوشی تیری نہ پائندہ۔ رہے گی اور نہ غم میرا

فقط شکر و شکایت کے لئے اک آڑ رکھ لی ہے
حقیقت میں جو سچ پوچھو کرم میرا ستم میرا

مجھی سے زندگانی فنِ شعر و شاعری کی ہے
غنیمت اس عظیم آباد میں ہے شاد دم میرا

جانے بھی دے یہ محل نہیں کبر و ناز کا
آخر ہے رات وقت ہے راز و نیاز کا

قیدِ مکاں سے مجھ کو چھڑایا عتاب نے
شرمندہ میں نہیں نگہِ دل نواز کا

صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ کر نظر
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

اس عیشِ مستعار پہ ہونے دیا نہ خوش
احسان مانتا ہوں غمِ دل نواز کا

عالم کو خود پسند ہیں نیرنگ سازیاں
اسمیں قصور کیا نگہِ فتنہ ساز کا

جکڑے ہوئے ہیں دونوں جہاں قیدیوں کی طرح
اللہ رے سلسلہ تری زلفِ دراز کا

اُنکی نگاہِ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

اللہ رے بلندیٔ بامِ ثنائے دوست
جھک جھک گیا ہے سر قلمِ سرفراز کا

ترکِ امید بھی مری آنکھوں میں ہے اُمید
اے یاس حوصلہ نہ رہا امتیاز کا

غفلت میں زندگی کا زمانہ بسر کروں
خمیازہ میں اٹھاؤں ترے خوابِ ناز کا

کس طرح دل کو فتنۂ محشر کا ہو اثر
ہنگامہ یاد ہے تری رفتارِ ناز کا

مطلب فغاں سے یہ کہاں آہ کی مجال
اس کا تو کام ہے فقط افشائے راز کا

شاید ضعفِ فغاں میں تھوڑی سی جا ملے
اے شاد ہم بھی رکھتے ہیں دعوا نیاز کا

تجھ میں پوشیدہ دلا نالۂ غماز بھی تھا
کیا سمجھتے تھے کہ اک خانہ برانداز بھی تھا

ٹھوکریں کھانے لگا کاسۂ سر گلیوں میں
اس سے انکار نہیں پہلے سرافراز بھی تھا

جا و بیجا شبِ غم میں کئے ناحق نالے
یہ نہ سمجھے کہ کوئی گوش برآواز بھی تھا

اب تو ہلنے کی بھی طاقت نہیں باقی صیاد
کبھی اس بازو میں لائقِ پرواز بھی تھا

سب یہ کہتے ہیں کہ اب حصر بھی ناممکن ہے
اس سے پہلے تری غمزوں کا اک انداز بھی تھا

سادگی تھی مگر اُس نامے کے ہر فقرے میں
کچھ ادائیں تھیں۔ کچھ انداز تھے کچھ ناز بھی تھا

شاد چپکی سے لگی رہتی ہے برسوں اب تو
وہی میں ہوں کہ کبھی زمزمہ پرداز بھی تھا

کسی طرح سے تو آئے اُنہیں خیال اپنا
ضرور چاہئے اُن سے بیان حال اپنا

نگاہِ ناز نے تفصیل تک نہ کرنے دی
ہزار حیف کہ مجمل رہا سوال اپنا

ہزاروں کام معطل ہیں ایک دل کے بغیر
چلا گیا ہے پرائے کے بس میں مال اپنا

اُمیدِ وصل نے کس کس کے گھر کئے نہ تباہ
مگر ہمیں بہ خدا کچھ نہیں ملال اپنا

کبھی تو دیر تک اے چشم اشکِ خوں رو لے
بخار کچھ تو خدا کے لئے نکال اپنا

کوئی تو روئے گا ای شاد اپنی محنت پر
کوئی تو یاد کرے گا کبھی کمال اپنا

اُردوی معلّٰی

بتمام و کمال تصحیح اشعار کا ایک اچھا اور قابل دید رسالہ ہے [illegible] کے غیر مطبوعہ دواوین کی [illegible] حصے میں شائع ہوتے ہیں۔ حجم ۴۰ صفحے لکھائی چھپائی کاغذ نہایت پسندیدہ نمونہ کا پرچہ ۲ آنے کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔ (۱) رسالہ و دواوین معہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) سالانہ (برائے طلبہ و غیر مستطیع حضرات) مقاصد مفصلہ منجملہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالٹکس۔ درخواست خریداری بنام منیجر اُردوئے معلّٰی علیگڈھ آنا چاہیے۔

علہ چنانچہ سنہ ۱۹۰۵ء میں (۱) رپورٹ انجمن [illegible] کانگرس (۲) دیوان میر سوز (۳) اور [illegible] شاگرد [illegible] (۴) شائع ہوچکے [illegible] آخر میں دیوان حسرت [illegible]۔

دیوان غالب

سفید کاغذ پر خوشخط چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گزرا تھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے۔ ایڈیٹر اُردوئے معلّٰی علیگڈھ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲ جزو قیمت مع محصول صرف عمر

فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ [illegible] تا صفحہ ۲۴ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ [illegible] تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ یعنی غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

درخواست خریداری بنام منیجر اُردوئے معلّٰی علیگڈھ آنا چاہیے

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ ایڈیٹر اُردوئے معلّٰی۔ غزلوں کا انتخاب اس احتیاط اور خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیکھ لینے کے بعد بالاستیعاب دواوین [illegible] کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کاغذ [illegible] تقطیع [illegible] حجم [illegible] جزو قیمت صرف (۸) مع محصول ڈاک۔

درخواست خریداری بنام منیجر اُردوئے معلّٰی علیگڈھ

دی [illegible] کمپنی بھاگلپور

حضرات [illegible] کی اصلی [illegible] بالالتزام [illegible] ہے جسکی ہرگز یہ نیت نہیں کہ وہ صرف [illegible] سے مستفید ہو بلکہ تجارتی دنیا کے لئے [illegible] ثابت ہوکر رہے۔ منشا اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے پائدار نفیس دیسی [illegible] کپڑے از قسم لنگی چادر دھوتی و صافہ و رومال دستی و [illegible] و ساڑھیاں ہر قسم ہر رنگ کی و تھان [illegible] و ہر رنگ کا دھوپ چھاؤں و سادہ و چیک و دوشالہ [illegible] لائق تیاری شیروانی و اچکن و عمامہ و کوٹ انگریزی [illegible] و بیرون ہندوستان ہر جگہ بآسانی پہنچائے جائیں۔ لطافت و پائداری میں یہ خاص بھاگلپوری کپڑے آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اس قدر مقبول ہر خاص و عام ہوچکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔

فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کروائے جا سکتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت [illegible] ہر نمونہ ہندوستان و بیرون ہند مفت بھیجے جاتے ہیں خط و کتابت ذیل کے پتے سے آنی چاہئیں۔

ڈاکٹر [illegible] سیکرٹری رئیس [illegible]

[illegible] تاترپور

رجسٹرڈ نمبر اے (۲۵۱)

اردوئے معلّیٰ

جلد (۶) بابت ماہ مارچ و اپریل سنہ ۱۹۰۶ء نمبر (۳) و (۴)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلّیٰ علیگڑھ

احسن المطابع علیگڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول ۱۲/ سالانہ
دوم عہ/ سالانہ }

میں چاہتا ہوں کہ

چاہتا... آہ چاہتا ہوں کہ تم اسیطرح مجھے نہ پہچانو، نہ جانو اپنا تغافل قائم رکھو اور میں تلخکام زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں- ہجر میں زخم کھا کھا کے، رو رو کے تڑپ تڑپ کے مرجاؤں، داغوں کی سوزش سے جل جاؤں-

اور تمہیں خبر نہو کہ میں نے تمہارے لئے جان دیدی، تمہاری برق نگاہ کے خیال میں جلکر راکھ ہوگیا، خاک ہوگیا، تمہیں خبر نہو کہ ایک پژمردہ دل تمہارا خیال کر کر کے تمہاری یاد کر کر کے اپنی تمام جوانی، اپنی تمام عمر کاٹ رہا ہے اُسکی تمنائیں امیدیں حسرتیں تمہارے لئے ہیں، وہ تمہاری خاطر غمزدہ زندگی بسر کرنا، اور تمہاری خاطر غمزدہ موت، مرنا چاہتا ہے- وہ بیچارہ دل بس یہی، صرف یہی چاہتا ہے! جب پروانہ کی طرح، سایہ کی طرح رات دن میں تمہارے پاس تھا، تب تو کبھی ایک نگاہ غلط انداز لطف سی شاد کام نہ کیا، بس اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ کبھی شاد کام نہ ہوں- آہ! اسیطرح مرجاؤں، اسی طرح مہجور، مقہور اسی طرح وطن سی دور، اسی طرح مشتاق، اسی طرح حسرت کش شوز تمہاسے ہنائی مرجاؤں...

میں چاہتا ہوں کہ جسطرح صبح سویرے نور کے تڑکے، باغ میں چھوٹی چڑیاں ایک شاخ گل سے دوسری شاخ گل تک اُڑتی پھرتی ہیں، اور گلاب کی پنکھڑیوں پر سی شبنم کے قطروں کو گرادیتی ہیں، اور نہیں سمجھتیں کہ کیا ظلم کیا، اسی طرح تم بھی کبھی نہ سمجھو- نہ میری جینے کی، تمہارے لئے جینے کی، نہ میرے مرنے کی، تمہارے لئے مرنے کی، تمہاری چاہ میں مرنیکی تمہیں خبر ہو تم مجھے نہ دیکھو، شاید... آہ شاید میرے مرنیکے بعد قبر پہ.... مگر میں اسے بھی نہیں چاہتا، میں اسکا بھی قائل نہیں-

میں چاہتا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم اسی طرح مجھے کبھی نہ جانو نہ پہچانو، اپنا تغافل قائم

رکھوادر میں تلخکام، زہرناک ہجر میں زندگی بسر کروں - ہجر میں زخم کھا کھا کے، رو رو کے، تڑپ تڑپ کے مرجاؤں، داغوں کی سوزش سی جل جاؤں - (ییلدرم) (ترجمہ)

تجارت ہند

[میں ناظرین سی معافی چاہتا ہوں کہ فری ٹریڈ - پروٹکشن اور بائکاٹ - یہ تین انگریزی الفاظ جابجا اس مضمون میں استعمال کئے گئے ہیں - کیونکہ مرادف الفاظ اُردو میں مروج نہیں اور عربی کے الفاظ ان سی زیادہ غیر مانوس ہیں - فری ٹریڈ کے معنی یہ ہیں کہ ملک کے مال درآمد برآمد پر کسی طرح کا محصول نہ لگایا جائے اور پروٹکشن یہ کہ ملک کی ترقی تجارت کے لئے محصول درآمد برآمد حسب ضرورت لگایا جائے -]

، سوقت ملک کی ترقی تجارت کے لئے سدیشی اور بائکاٹ وغیرہ کے ذریعے سی کوشش کیجارہی ہے مگر کبھی کبھی بعض تعلیم یافتہ اصحاب بہ شکل ناواقفوں کے کہہ اُٹھتے ہیں کہ تجارت آزاد ہونی چاہئے اور اسمیں کسیطرح کی عارضی روک اور عارضی ترغیب کو دخل نہ دینا چاہئے اور اپنی اس کلئے کی بنا پر جو انگریزی علم الاقتصاد کے مطالعے کے اثر سے ان کے دلونمیں راسخ ہوگیا ہی، وہ محبان وطن کی کارروائیوں پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ کیوں مقابلے کی پالیسی کو چھوڑ کر یہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں - ان اصحاب کو جاننا چاہئے کہ

فری ٹریڈ - قدرت کا ناقابل ترمیم قانون نہیں ہی

علم الاقتصاد کے موضوع یعنی دولت کے دو حصے ہیں "تحصیل" اور "تقسیم" - تحصیل یعنی کسی چیز کا پیدا کرنا قانون قدرت کے تابع ہے - انسان صرف اتنا کرسکتا ہی کہ مختلف اشیا کو خاص طور پر ترکیب دی اور پھر وہ قدرتی اثر سی ایک خاص نتیجہ پیدا کریں - برخلاف اس کے "تقسیم" ہی کہ وہ تمامتر انسانی اختیار میں ہے - جب انسان نے ایک چیز حاصل کرلی تو وہ اُسے جسطرح چاہے تقسیم کرسکتا ہی - یہیں سی اُصول تبادلہ کے اختلافات شروع ہوتے ہیں ایک گروہ کا خیال ہی کہ گورنمنٹ کو تجارت کے کاروبار میں مداخلت نکرنی چاہئے درآمد

اور برآمد پر کوئی ٹیکس قائم کرنا چاہیے۔ تمام دنیا کو ایسا سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک "قوم" ہے اور "اقوام" کو "افراد" تصور کرنا چاہیے۔ برخلاف اسکے دوسرا گروہ ہے جو گورنمنٹ کی مداخلت معاملات تجارت میں نہ صرف اختیاری بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔ درآمد اور برآمد کے ٹیکس کو بھی وہ اپنے موقع سے مناسب خیال کرتا ہے۔

اول الذکر فرقہ فری ٹریڈر کہلاتا ہے اور موخر الذکر پروٹکشنسٹ۔ انگلستان کے علماء اقتصاد المدن فری ٹریڈ کے معین ہیں اور وہ اسے تمدن کی ایک ناقابل ترمیم شرط خیال کرتے ہیں، اور چونکہ انگریزی خیالات کا پرتو ہندوستانی تعلیم یافتہ گروہ پر پڑتا ہے اسلئے انہیں بھی اکثر اس خیال کے حامی ہیں اور ہندوستان کے لئے فری ٹریڈ کو مفید سمجھتے ہیں۔ مگر دیکھنا چاہئے کہ انگلستان نے کس وقت دنیا کو فری ٹریڈ کا سبق پڑھایا۔ آخر اٹھارہویں صدی تک انگلستان میں قیود تجارت تمام ملکوں سے زیادہ سخت تھی۔ اور اسی زمانے میں اسنے اپنی تجارت کی بنیاد مستحکم کی۔ انگلستان کی اس پالیسی کی نسبت جو الفاظ پرنس بسمارک نے استعمال کئے ہیں ان سے بہتر الفاظ نہیں ملسکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"شہزور اور توانا انگلستان نے جب اپنے بازو مضبوط کر لئے تو میدان میں آیا اور للکارا کہ کون میرے سامنے آویگا میں ہر ایک کے مقابلے کے لئے تیار ہوں۔"

پرنس بسمارک کے اس خیال کی تائید خود انگلستان کے سب سے بڑے حامی فری ٹریڈ یعنی مسٹر کابدن کے قول سے ہوتی ہے۔ فری ٹریڈ کی حمایت کرتے ہوئے وہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ "انگلستان ہمیشہ دنیا کے لئے بمنزلہ کارخانہ کے رہا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہیگا۔"

نپولین کی تہ و بالا کرنے والی یورشوں نے تمام یورپ کی تجارت کو درہم و برہم کر دیا تھا، ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو کر اسکی تجارت تباہ ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں انگلستان کے لئے اس سے بہتر کوئی پالیسی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ تمام دنیا کو اپنے اپنے بندرگاہ کھولدینے کی صلاح دے اور خود اسپر عمل کرے۔ مگر اسبارے میں مسٹر چیمبر لین کا

مقولہ آب ذر سے لکھنے کے قابل ہے جو فرماتے ہیں کہ

"طبعی امر ہے کہ بیڑے اپنے لئے آزادی کی خواہش کرینگے لیکن اگر بیٹریں بھی یہی خواہش ظاہر کریں تو اسکے سوا کیا ثابت ہوتا ہے کہ وہ بیٹریاں ہیں۔ یعنی جسطرف کسیکو چلتے دیکھا اسطرف چلنے لگیں۔ بلا خیال اسکے کہ آگے کنواں ہے یا کھائی۔

اکثر ممالک پر انگلستان کی تحریص اور مغالطہ دہی کا کوئی اثر نہیں ہوا اور جو اس طلسم میں پھنس گئے تھے انہوں نے بھی بہت جلد نجات حاصل کرلی۔ چنانچہ اڈورڈ ڈائیس کہتا ہے کہ "انگلستان کے ہمسایوں نے اسکی مثال کو بجائے ستارہ رہنمائی سمجھنے کے اپنے حق میں مضر سمجھا" اور اسپر عمل پیرا نہوئے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ فری ٹریڈ قدرت کا ایسا قانون نہیں ہے جو ہر جگہہ اور ہر وقت یکساں مفید ثابت ہو۔ اور اسکے اثرات تغیر حالات سے متغیر نہوں۔ انگلستان میں تو ایک زمانے تک اصول فری ٹریڈ نیچرل لا کے برابر سمجھا جاتا تھا مگر انیسویں صدی کے اوائل میں جرمنی میں اسکی مخالفت شروع ہوئی۔ اور لسٹ نے فری ٹریڈ کے خلاف کہنا اور لکھنا اختیار کیا انگلستان کی پالیسی کی نسبت لسٹ نے بھی قریب قریب وہی خیال ظاہر کیا ہے جو نصف صدی بعد بسمارک کے زبان اور قلم سے ادا ہوا۔ لسٹ کہتا ہے کہ "انگلستان بجائے خود ایک دنیا ہے اور ایسی دنیا جو باقی تمام دنیا سے دولت اور قوت میں برتر ہے"

اب چند اقوال مسلم الثبوت علما کے اسکی تائید میں نقل کئے جاتے ہیں کہ فری ٹریڈ کو اصول موضوعہ نہ سمجھنا چاہیے۔

(الف) پروفیسر شمولر:۔ "پروٹکشن اور فری ٹریڈ اصول نہیں ہیں بلکہ تمدنی اور سیاسی بیماریوں کے علاج ہیں جو قوم کی حالت کے مطابق تجویز کئے جاتے ہیں"

(ب) پروفیسر باسٹیبل "پروٹکشن اور فری ٹریڈ اگر صحیح طور پر سوچا جائے تو اصول سے تعلق نہیں رکھتے"

(ج) اڈورڈ ڈائسی: "دو اور دو چار ہوتے ہیں" یہ خاتمہ عالم تک صحیح رہیگا مگر فری ٹریڈ ملک کی ایک حالت میں مفید اور دوسری حالت میں مضر ہے - ۱۲

(د) "فری ٹریڈ خاص زمانے اور خاص حالت میں ملک کے لیے مفید ہوسکتی ہی مگر دوسری زمانے اور دوسری حالت میں وہی فری ٹریڈ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے قطعی مہلک ثابت ہوگی، فری ٹریڈ میں سب سے اول یہ فرض کرلیا جاتا ہی کہ تمام دنیا مثل ایک قوم کے ہی اور مختلف قومیں اسمیں مثل افراد کے ہیں۔ سب ایک ہی غرض اور ایک ہی مقصد کے واسطے کام کرتے ہیں - اور جو شخص جس کام کو بہتر کرسکتا ہی وہ اس کام کو انجام دیتا ہے مگر عملاً ایسا نہیں ہے -

"جب تک انسان مختلف سلطنتوں میں منقسم ہے اور ہر ایک کے جداگانہ اغراض ہیں کوئی سلطنت خود کو اس میں نہیں ڈالیگی کہ ملکی پیداوار کو غیر ملکی زبردست مقابلے سے تباہ کردے - یہ بلا دقت تجارتی بلا نہیں ہے بلکہ اسمیں پولیٹیکل اور سوشل خطرات بھی ہیں"

فری ٹریڈ کا یہ اصول اسوقت عملاً اختیار کیا جاسکتا ہی کہ تمام پولیٹیکل اختلاف دنیا کے دور ہوجائیں مگر ایسا نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا - ان خیالات کو صرف ان فلسفیوں کے دماغی تفریح کے لئے نہ چھوڑ دینا چاہیے جو تمام دنیا کو ایک کرنا چاہتے ہیں - ایک عملی منتظم اور قومی عالم اقتصاد ان کو قبول نہیں کرسکتا - خود انگلستان میں مختلف اغراض کے لوگ مختلف پالیسی کے حامی ہیں مینچسٹر میں زیادہ لوگ فری ٹریڈ کے طرفدار ہیں مگر پرنس بسمارک ان کے نسبت کہتا ہے کہ "منچسٹر کا ایجیٹیشن (فری ٹریڈ کے بارے میں) ایسی بڑی اور دلیرانہ سیاسی اور تمدنی دغابازی ہے کہ ابتک کبھی دنیا میں ایسی دغابازی نہیں دیکھی گئی" -

انگلستان کے زمیندار اور کوئلے کی کانوں کے مالک ہمیشہ فری ٹریڈ کے خلاف رہی ہیں اور اسوقت بھی مسٹر چیمبرلین کے طرفداروں میں زیادہ تر وہی لوگ ہیں - جن علماسے

اس پالیسی کو ملک میں رائج کیا تھا اسمیں یا تو ایسے لوگ ہیں جنہیں علی انتظامات ملکی سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا یا ان کے تعلقات ایسے تھے کہ وہ فری ٹریڈ میں اپنا فائدہ دیکھتے تھے۔ چنانچہ آدم سمتھ - مالتھس اور مل پادری تھے رکارڈو دلال تھا کابڈن دیوالیہ تھا۔ برائٹ کپڑے کا کارخانہ کرتا تھا اور ولیر قانون پیشہ تھا - ان حالات کو دیکھتے ہوئے تھا لرڈ راجرس کے قول سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ

"بہترین اقتصادی حالت وہ نہیں ہے جسمیں زیادہ سے زیادہ مقدار کم سے کم صرف میں پیدا کیجا سکے اور روپیہ والے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرسکیں بلکہ بہترین حالت وہ ہے جسمیں زیادہ سے زیادہ کام کرنیوالے زیادہ سے زیادہ ممکن آرام اور اطمینان سے رہ سکیں"

یہ ہے اصل غایت کسی ملک کی تجارتی پالیسی کی خواہ وہ فری ٹریڈ سے حاصل ہو یا پروٹکشن سے۔ جرمن نے اس امر کو سمجھا اور باوجود انگلستان کی ترغیب اور تحریص کے بسمارک کی کوشش سے چند برسوں اس نے یہ ثابت کردیا کہ کیونکر ایک

زراعتی ملک تجارتی ملک ہوجاتا ہے

نائنٹینتھ سنچری کے پرچہ اگست ۱۹۰۳ء میں مسٹر آٹو ائزبیکر کا ایک مضمون جرمنی کی تجارتی پالیسی پر شائع ہوا ہے اسکی تفصیلات اور جزوی بحثوں کو چھوڑکر چند اہم امور کا بیان اقتباس کیا جاتا ہے جو حالت اس وقت ہندوستان کی ہے وہی حالت ساٹھ برس پیشتر جرمن کی تھی۔

لسٹ سب سے پہلا شخص ہے جسنے ۱۸۴۰ء میں جرمن کا خیال اپنی تجارت کو پروٹکشن کے ذریعے سے ترقی دینے کی طرف رجوع کیا - چھ برس تک اس نے لگاتار کوششیں کیں مگر اسکی آواز کا کچھ اثر نہوا - رعایا میں بیشک اس کے مسائل کا بڑا چرچا ہوا مگر گورنمنٹ نے اسکی صلاح کو شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا - بالآخر ناامید ہوکر اس نے ۱۸۴۶ء میں خودکشی کرلی - اس شخص نے دنیا کے اکثر ممالک کا سفر کیا تھا اور وسیع معلومات رکھتا تھا اس کی رائیں عملی بنیاد پر قائم تھیں

نہ کہ محض کتابی بنا پر۔ جسوقت لسٹ نے اپنی کتاب شایع کی تہی انگلستان بہت دولتمند ملک تہا۔
برخلاف اسکے جرمن کی تجارت ابتر حالت میں تہی اسکا انحصار زیادہ تر زراعت پر تہا انگریز
جرمن کی پیداوار اپنے ملک کو لیجاتے اور اسکے عوض میں انہیں تیار شدہ مال دیتے تہے (جیسا کہ
اسوقت ہندوستان کا معاملہ ہے) خدا نے لسٹ کی کوششوں کو ضایع نہیں کیا اور ۱۸۳۸ء کے بعد
جرمن میں کسیقدر پروٹکشن قایم ہو گیا۔ اور جنگ فرانس کے بعد بسمارک نے ہمہ تن کوشش کر کے
پروٹکشن کو مستحکم کر دیا بسمارک کی تحریریں پروٹکشن کی نسبت دلچسپی سے خالی نہیں مگر بخوف طوالت
قلم انداز کیجاتی ہیں۔ ازبکیہ جرمن اور انگلستان کا مقابلہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"نصف صدی کے قریب انگلستان میں مسلسل فری ٹریڈ قایم رہی اور جرمن میں
پروٹکشن رہا۔ جرمن اُسوقت ایسا ملک تہا جسے تجارتی۔ مالی اور جہاز رانی کے معاملات میں
کچھہ تجربہ نہ تہا۔ جسکے پاس نہ تو سرمایہ تہا نہ نو آبادیاں تہیں اور نہ عمدہ کوئلے کی کانیں ہی تہیں
صرف ایک عمدہ بندرگاہ اسکے پاس تہا۔ وہ جنگی خدمات سے دبا ہوا تہا۔ تین جنگوں اور ایک
انقلاب نے اسکا شیرازہ ابتر کر دیا تہا۔ باوجود ان تمام دشواریوں کے جرمن اسوقت بہت
ہی دولتمند ملک ہو گیا ہے۔ ہر جگہ انگریزوں سے اسکا تجارتی مقابلہ جاری ہے یہانتک
کہ انگریزی بازاروں میں بہی جرمنی نے اسے دبا رکہا ہے" جرمن کی ترقیوں کو دیکہکر انگریز
انگشت بدندان ہیں "حقیقت یہ ہے کہ جرمن نے اس نسبت کو جو پچاس برس پہلے انگلستان
اور جرمن میں تہی اُلٹ دیا ہے۔"

پس جو لوگ انگلستان کی ترقی کو فری ٹریڈ سے متعلق کرتے ہیں وہ جرمن کی ترقی
پر کیا رائے دینگے اگر انگلستان نے فری ٹریڈ کے زیر سایہ گذشتہ نصف صدی میں ترقی
کی ہے تو جرمن نے پروٹکشن کی حمایت میں اس سے بدرجہا زیادہ ترقی کی ہے اسلئے دونوں
ملکوں کی نظیر سامنے رکہکر ہمیں دیکہنا چاہئے کہ۔

ہندوستان کی کیا حالت ہے اور کون سی پالیسی اسکے لئے مفید ہے

ہندوستان کی قریب قریب ہی حالت ہے جو نصف صدی پیشتر جرمن کی تھی ۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہو گیا ہے اور ۸۰ فیصدی آبادی کا گزران زراعت پر ہے ۔ اس بیسویں صدی میں کوئی ملک جو خالصتاً زراعتی ہو ہرگز آسودہ حال نہیں ہو سکتا ۔ وائے برحال ہندوستان کہ اس ایک ذریعہ زندگی میں بھی گورنمنٹ کی پالیسی مالیہ اراضی زمینداران اور کاشتکاروں کو شکم سیر نہیں ہونے دیتی ۔ اگر اسمیں انصاف برتا جائے تو بھی یہ ممکن ہے کہ ہم مثل بہائم کے زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہو جائیں مگر ہم اس ترحم کے قابل بھی نہیں !! پھر بھی ناامید ہونیکی کوئی وجہ نہیں بہت سے ملکوں نے اس سے زیادہ ابتر حالت سے ترقی کی ہے اور بہت سی خودسر گورنمنٹوں نے بالآخر رعایا کے واجبی مطالبات تسلیم کئے ہیں ۔

میں یہاں بہ تفصیل نہیں بیان کرنا چاہتا کہ انگریزی گورنمنٹ نے کیونکر ہندوستان کی تجارت کو تباہ کیا ۔ اردوی معلے کے پرچہ ماہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں مسٹر کشن پرشاد کول نے اپنے مضمون میں اسپر کافی بحث کی ہے اور ہر شخص جسنے واقعات پر غور کیا ہے یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کی تجارت کو تباہ کر کے انگریزی تجارت نے ترقی حاصل کی ہے "اگر یہ ترقی شریفانہ اور تاجرانہ طریق پر ہوتی تو بڑے اطمینان کا باعث تھا" (ولیم ڈگبی) مگر افسوس کہ بنگال اور کارناٹک کی لوٹ سے یہ غرض حاصل کی گئی ہے ۔

مسٹر بروک آدم اپنی کتاب "قانون ترقی و تنزل" میں لکھتے ہیں کہ

"جنگ پلاسی کے بعد ہی بنگال کی لوٹ لندن میں آنے لگی اور اسکا اثر فوراً ظاہر ہوا" تمام محققین اس امر پر متفق ہیں کہ انگلستان کا تجارتی انقلاب (جسنے انیسویں صدی کو گزشتہ زمانے سے ممیز کر دیا) ۱۷۶۰ء شروع ہوا ... ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی ہوئی اور جیسا تیز تغیر اسکے بعد واقع ہوا شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا" یعنی ہندوستان کی دولت انگلستان میں جانے لگی ۔

ایک دوسرے اہل الرای کا قول ہے کہ :-

"بہت سی واقعات ہندوستان کی تجارت کے خلاف جمع ہوگئے تھے اٹھارہویں صدی
میں انگلستان نے محصول درآمد کے ذریعے سے نہیں بلکہ قطعی ممانعت کے ذریعے سے کپڑے کی تجارت
کو تباہ کیا" تمام اٹھارہویں صدی انگلستان نے ہندوستان کو اپنے ہنروں یا الٹکس کا
آماجگاہ بنالیا تھا - اور متنزلزل فری ٹریڈ پالسی کے مہمل اور لایعنی تجربے اسپر کئے جاتے تھے
(اڈورڈ ساسون) یہ شہادتیں یہ ظاہر کرنیکو کافی ہیں کہ ہندوستان کی تجارت کو انگریزی
مقابلے سے برباد نہیں کیا بلکہ بزور تباہ کیا ہے - اب اسوقت ہندوستان کی تجارت کی یہ
کیفیت ہے کہ :-

ہندوستان سے ایک ارب ۴۶ کروڑ کا مال سالانہ باہر جاتا ہے اور ایک ارب کروڑ
ملک میں آتا ہے - یعنی درآمد سے برآمد بقدر ۵۰ کروڑ زیادہ ہے ۔ واضح ہے کہ زیادتی
بصورت سرمایہ ہندوستان دوسرے ممالک میں کام نہیں آرہی ہے بلکہ انگلستان کو جو خراج ہوم چارجز
کے نام سے جاتا ہے اسمیں یہ رقم دینی پڑتی ہے -

اس تجارت میں غور طلب امر یہ ہے کہ ہندوستان سے کیا مال جاتا ہے اور دوسرے ممالک
سے کیا آتا ہے - ہندوستان سے جو کچھ مال جاتا ہے قریب قریب سب خام پیداوار ہوتی ہے اور
باہر سے جو کچھ مال آتا ہے وہ اسی نسبت سے تیار شدہ ہوتا ہے - لیکن یہ صورت تجارت
کی ایسی ہے کہ کوئی ملک اسحالت میں رہکر خوشحال نہیں ہوسکتا - اسکی وجہ سے ملک کا سرمایہ
اور محنت بیکار پڑے ہیں، اور جس چیز کو ہم ادنیٰ قیمت پر دیتے ہیں اُسکو پھر اعلیٰ قیمت پر خریدتے
ہیں - اسی خام پیداوار سے ہم خود ضروری چیزیں تیار کریں تو ہمکو دوہرا فائدہ ہو - اگر ملک کی
ضرورت کی چیزیں خود ملک میں تیار کی جائیں تو اس سے دوہرا فائدہ کیونکر ہوگا اسکو میں
ایک مثال سے صاف کرنا چاہتا ہوں - فرض کرو کہ تین جزیرے ہیں (الف) اور (ب) قریب
قریب واقع ہیں اور ایک (ج) دور واقع ہے جزیرہ الف میں لوہے کی کان ہے اور
ب میں کوئلا بہت عمدہ پیدا ہوتا ہے - اگر جزیرہ الف کو کوئلہ کافی ملجائے تو وہ ایک

ﮯ چنانچہ جو ششماہی رپورٹ شائع ہوئی اس سے واضح ہوتا ہے کہ یکم اپریل ۱۹۰۹ء سے ۳۱ ستمبر ۱۹۰۹ء تک ہندوستان کی تجارت ...

لاکھ من لوہا سالانہ گلا کر کام میں لا سکتا ہے۔ جزیرہ ب سے وہ کوئلہ بقدر ضرورت کے حاصل کرتا ہے اور تیس ہزار من لوہا اسکے عوض میں دیتا ہے۔ اور ستر ہزار من لوہا خود بچاتا ہے مگر جزیرہ ج میں بھی کوئلے کی کانیں ہیں اور وہ بیکار پڑی ہیں اسوجہ سے کہ جزیرہ الف خرچ بار برداری کی زیادتی کے سبب سے اس سے کوئلہ نہیں لیتا۔ اب خیال کیجئے کہ جزیرہ الف اور ج ایک گورنمنٹ کی تحت میں آجائے اور جزیرہ ب دوسری قوم اور گورنمنٹ کا مقبوضہ ہو جائے اور اولی الذکر گورنمنٹ جزیرہ الف کے کارخانہ داروں سے کہے کہ آئندہ تم کوئلہ جزیرہ ب سے مت لو بلکہ جزیرہ ج سے لو وہ عذر کریں کہ اس حالت میں ہمیں پچاس ہزار من لوہا سالانہ دینا پڑیگا۔ گورنمنٹ اسکی پروا نہ کرے اور انہیں مجبور کرے۔ اسکا نتیجہ کیا ہوگا؟ لوہے کی کان والوں کو بیس ہزار سالانہ کا نقصان ہوگا مگر انہیں کے دوسرے ہم قوموں کو پچاس ہزار سالانہ ملیگا۔ یعنی مجموعی طور پر اس سلطنت میں تیس ہزار من لوہے سالانہ کی مالیت بڑھ جائیگی۔

اب اس مثال کی ہندوستان سے تطبیق کیجئے۔ فرض کیجئے کہ ایک کپڑے کا کارخانہ ہے اور وہ ایک لاکھ سالانہ کا سوت دوسرے ممالک سے خریدتا ہے۔ اگر وہ مجبور کیا جائے کہ سوت ہندوستان سے خریدے تو اسے دس ہزار سالانہ کا نقصان ہوتا ہے مگر ملک کو مجموعاً نوے ہزار کا فائدہ ہوتا ہے۔ اور اسیطرح ہر ایک شے تجارت کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہندوستانی اپنی ملک کی خوشحالی کے لئے آمادہ ہو جائیں اور ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنیکے لئے تیار ہو جائیں تو انہیں اپنے اس ارادے کے حاصل کرنے میں

کیا کیا دقتیں پیش آوینگی

سب سے اول دقت کا سامنا انگلستان سے ہوگا مگر میں دوسرے ممالک کے حالات بیان کرنے کے بعد اسی بیان کرونگا۔ ہندوستان کے مال درآمد میں ۵۰ فیصدی انگلستان سے آتا ہے اور باقی دوسرے ممالک سے۔ یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ ہم کل تجارت کو ایک دم سے روک دیں البتہ بتدریج ایسا کر سکتے ہیں مگر جب اسکی کوشش کرینگے تو دوسرے ملک بھی خاموش نہیں رہینگے۔ لیکن اس

معاملے میں پالسہ ہندوستان کے ہاتھ ہے۔ چونکہ اکثر ممالک ہندوستان کی خام پیداوار اس غرض سے لیتے ہیں کہ اپنے ملک میں ان سے مال تیار کریں، وہ ہر حال میں اسکے لینے پر مجبور ہیں دوسرے خاص شے ہندوستان کی برآمد کی غلہ ہے۔ جو ملک اسوقت ہندوستان سے غلہ خریدتے ہیں وہ ہر حال میں اسکی خریداری پر مجبور ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی ملک اسوقت ہندوستان کے ساتھ کسیطرح کی رعایت نہیں کرتا ان کے مقاصد جہانتک اجازت دیتے ہیں وہ ہندوستان کے مال پر محصول درآمد لگاتے ہیں اور وہ اس سے زیادہ نہیں لگا سکتے۔ فرض کرو کہ تمام دوسرے ممالک ہندوستان کے مال پر محصول بڑھا دیں تو وہ محصول کسکو ادا کرنا پڑے گا؟ کیا ہندوستان پر اسکا کچھہ اثر پڑیگا۔ بالکل نہیں۔ خود انہیں ممالک کے کارخانہ داروں کو وہ ٹیکس ادا کرنا پڑیگا۔ بلکہ اسوقت حالت ایسی ہے کہ اگر خود ہندوستان کے بندرگاہوں میں ہندوستان کے مال پر محصول برآمد لگایا جائے تو اسکا کوئی جزو بھی ہندوستان کو نہ دینا ہوگا اور وہ بالکل ممالک غیر پر پڑیگا۔

جنوری ۱۹۰۵ء کے پرچہ اشیاٹک کوارٹرلی ریویو میں ہندوستان کی تجارت کے متعلق ایک مضمون سر راپر لتھبرج کے۔سی۔آئی۔ای کا شائع ہوا تھا۔ اسمیں انہوں نے مدراس میل کے پرچہ ۲۶ راکتوبر ۱۹۰۴ء سے ایک اقتباس درج کیا ہے وہ اقتباس ایسا ہے کہ اس موضوع پر اس سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ میں اسیکا خلاصہ لکھتا ہوں۔

روس کے اعتبار سے ہندوستان کا پلہ غالب ہے کیونکہ اس ملک میں سالانہ تین کروڑ سے زاید کا تیل روس سے آتا ہے۔ اگر ضرورت ہو تو یہ تیل برما اور امریکہ سے لیا جاسکتا ہے۔ برخلاف اسکے گذشتہ سال یہاں سے صرف ۱۲ لاکھ کا مال روس کو گیا۔ اور اسپر بھی سخت محصول درآمد لگایا گیا۔

ممالک متحدہ امریکہ کا حال اس سے مختلف ہے۔ وہاں سے صرف ایک کروڑ سالانہ کا مال آتا ہے اور یہاں سے آٹھ کروڑ کا مال وہاں جاتا ہے مگر وہ سب خام پیداوار ہے اور امریکہ کے کارخانہ داروں کو ان کی ضرورت ہے اسلیئے انپر کسیطرح کا محصول درآمد بھی نہیں لگایا جاتا۔ اگر امریکہ

ان پر محصول لگا دیگا تو آخر میں اسکو نقصان اٹھانا پڑیگا۔

جرمن تین کروڑ سالانہ کا مال ہندوستان میں بھیجتا ہے اور دس کروڑ کا یہاں سے خریدتا ہے مگر تفصیل کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرمن تمام تیار شدہ چیزیں ہندوستان میں بھیجتا ہے اور ہندوستان سے وہ صرف خام مال لیتا ہے اسپر وہ اپنی مصلحت کے مطابق مختلف شرح سے محصول درآمد بھی لگاتا ہے۔

فرانس بلجیم آسٹریا۔ اور اٹلی کی کیفیت بھی قریب قریب وہی ہے جو جرمن کی ہے وہ تیار شدہ مال ہندوستان میں بھیجتے ہیں اور یہاں سے خام مال لیتے ہیں۔ اور یہاں کے مال پر ٹیکس بھی لگاتے ہیں چنانچہ فرانس میں کافی پر ۱۳۲ فی ہنڈریڈ ویٹ (یعنی ایک من ۵ اسیر) ٹیکس لگایا جاتا ہے کیونکہ وہ تیار شدہ بیچی جاتی ہے اور مرچ پر جو صرف مسالے کے کام آتی ہے ۲۲ فی ہنڈریڈ ویٹ ٹیکس لگایا جاتا ہے۔

ان بیانات کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یورپ کے مقابلے میں ہندوستان کا پلا غالب ہے یورپ سے ۴ کروڑ سالانہ کا تیار شدہ مال آتا ہے اور اسکے عوض ہندوستان سے صرف خام مال جاتا ہے جہاں تک ممکن ہوتا ہے ٹیکس لگایا جاتا۔ ہندوستان ممالک غیر کے اسباب پر صرف ۵ فیصدی ٹیکس لگاتا ہے۔ اسلئے ہندوستان کو اپنے ٹیکس کے بڑھانے کا بہت موقع ہے اور یورپ والے ہندوستان کے مال پر بہت کم ٹیکس بڑھا سکتے ہیں۔

یورپ کو چھوڑ کر دوسرے ممالک سے ۱۰ کروڑ سے کچھ زاید کا مال ہندوستان میں آتا ہے۔ ان ممالک میں جاپان کا معاملہ آجکل خاص توجہ کے قابل ہے کیونکہ ہندوستانی جاپان کو اپنا معلم بنانا چاہتے ہیں۔ اسلئے ابھی تک جاپان کے خلاف بائیکاٹ ہی نہیں کیا گیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کیا روش اختیار کیجائیگی۔

سب سے زیادہ توجہ طلب جو مسئلہ ہے وہ انگلستان کا ہے۔ جب تک انگلستان کا مال نہ روکا جائیگا ہندوستان کی صنعت وحرفت ترقی نہیں کر سکتی۔ مگر سوچنا یہ ہے کہ کیا فائدہ ہوگا

انگلستان کے مال پر اسقدر ٹیکس لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی تجارت اسکا مقابلہ کرسکے۔ میں اس قضیہ نا مرضیہ کو مسٹر تھارتھرن سابق فنانشل کمشنر پنجاب کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

"تیس برس پیشتر ہندوستان کے باشندوں میں اپنی پستی کا کچھ احساس پیدا ہوا اور انہوں نے تجارتی کارخانے اور خاص کر کپڑے کی کلیں قائم کرنی شروع کیں۔ لنکا شایر کو خوف ہوا کہ انکی تجارت کو نقصان پہونچیگا۔ چونکہ لنکا شایر کے ممبر پارلیمنٹ میں بہت با اثر تھے انہوں نے مسلسل ایسے قانون پاس کرائے جس سے ہندوستان کی ترقی رک جائے۔ اور آخر کار ۱۸۸۲ء میں محصول درآمد یک قلم موقوف کیا گیا۔ حالانکہ اسوقت جنگ، قحط اور روپئے کی قیمت گھٹ جانیکے سبب ہندوستان دیوالیہ ہو رہا تھا۔ چند دنوں بعد ہندوستان کا خزانہ خالی ہو جانیکے سبب ایک خفیف محصول درآمد لگانے کی اجازت دیگئی۔ مگر لنکا شایر کو تاب نہ آئی اور ہندوستان کے کارخانوں میں بھی ایک ٹیکس لگایا گیا۔ حالانکہ تمام ہندوستان میں اسکے خلاف سخت جوش پھیلا ہوا تھا کیا سرکاری اور کیا غیر سرکاری اہل الرای کیا ہندوستان اور کیا انگریز سب اسکے مخالف تھے"

اسکی نسبت سر راپر لتھبرج کہتے ہیں کہ وائسرائے کی اگزیکٹیو کونسل میں بھی کوئی ممبر سوائے فنانس ممبر کے محصول درآمد کے موقوف کرنے پر رضامند نہ تھا۔ وائسرائے نے پارلیمنٹ کے دباؤ سے صرف اپنی ذاتی ذمہ داری اور اختیار سے ایسا کیا۔

پس غور کرنا چاہئے کہ اگر ہندوستان کی گورنمنٹ خود یہ کوشش کرے کہ انگریزی مال پر زیادہ محصول لگائے تو گزشتہ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اسے کامیابی نہیں ہوگی۔ لیکن اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ ۱۸۹۴ء میں جو جد و جہد گورنمنٹ نے کی اسکا مقصد ہندوستان کی تجارت کو فروغ دینا نہیں تھا بلکہ خزانے کی ضرورت کا پورا کرنا اصل مقصد تھا۔ گورنمنٹ کی طرف سے ہمکو زیادہ امید نہ رکھنی چاہئے۔ قانونی اختیار سے گورنمنٹ کی مدد سے علحدہ ہوکر جو کچھ ہم کرسکتے ہیں اسپر بھروسہ کرنا چاہئے۔ اور وہ کیا ہے یہ کہ خود ہم اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور اس امر کا عہد کریں کہ صرف اپنی ملک کی چیز استعمال کرینگے۔ لیکن جب تک

دوسرے ممالک آزادانہ طور پر ہندوستانی مال کا مقابلہ کرتے رہینگے یہ غرض نہیں حاصل ہو گی پس سوا اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے کہ

بوائیکاٹ کیا جائے

سب سے بڑا اعتراض بعض زائد از ضرورت دوراندیش اصحاب کی طرف سے یہ پیش کیا جاتا ہے کہ گورنمنٹ ناراض ہو گی لیکن ہماری غرض ایسی ہے کہ بغیر گورنمنٹ کو ناراض کئے ہوئے وہ حاصل نہیں ہو سکتی ہے، ہندوستانی صنعت و حرفت کی ترقی انگریزی تجارت کو نقصان پہنچائے بغیر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوستان کی سب سے زیادہ تجارت انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے اور اس تجارت کا سب سے بڑا حصہ کپڑا ہے اور یہی ایسی چیز ہے جسکو ہندوستانی بہت جلد اپنے ملک میں مہیا کر سکتے ہیں۔ پس ہندوستانی ترقی کے معنی یہی ہیں کہ انگریزی تجارت کو نقصان ہو اور انگریزی تجارت کے خسارے کے معنی یہ ہیں کہ انگلستان کے لوگ ہندوستان کے ناراض ہوں اور اہل انگلستان کی ناراضی کا برداشت کرنا بالفاظ دیگر گورنمنٹ کی ناراضی کا برداشت کرنا ہے۔ پس اب ہمیں دو امور کے درمیان فیصلہ کرنا چاہئے کہ

آیا ہم ملک کی ترقی کا خیال چھوڑ دیں یا گورنمنٹ کو خوش رکھیں

ہر شخص کو اسکا فیصلہ خود اپنے دل میں کرنا چاہئے کہ اسکا فرض عین کیا ہے۔ لیکن یہ جو کچھ کہا جاتا ہے صرف زاید از ضرورت دوراندیش لوگوں کے خیال سے کہا جاتا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی گورنمنٹ کو خود یہاں کی تجارتی ترقی کا خیال ہے اور تمام جلیل القدر عہدہ دار بارہا اسکے متعلق اپنی زبان سے کہہ چکے ہیں۔ اسلئے ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال کرنا حماقت ہے کہ گورنمنٹ ہماری کوشش سے ناراض ہو گی۔ چنانچہ ۵ راکتوبر ۱۹۰۵ء کا بنگالی لکھتا ہے کہ

"بوائکاٹ شدیسی تحریک نہیں ہے بلکہ وہ صرف ہندوستان کی ترقی حاصل کرنیکا ذریعہ ہے اور اگر ہمارے وائسرائے اور گورنروں نے بالقصد ہمکو دھوکا نہیں دینا چاہا ہے تو انہیں اس تحریک کا خیر مقدم اور اسکی تائید کرنی چاہئے"

دوسرا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے اور یہ اکثر سہل انکار لوگوں کی طرف سے ہوتا ہے کہ جب ایک عمدہ اور سستی چیز کہیں ملتی ہے تو بدی اور مہنگی چیز کیوں خریدیں۔ مسٹر چیمبرلین سے مسٹر بھاؤنگری نے دریافت کیا تھا کہ آپ اپنی اسکیم میں ہندوستان کو کیا حصہ دینا چاہتے ہیں اسکے جواب میں جو خط مسٹر چیمبرلین نے لکھا تھا اس میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کی خواہش معلوم کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کیجا سکتی ہے" اور ہندوستان کی خواہش جیسا کہ سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ثابت ہو چکا ہے پروٹکشن ہے۔ پس فرض کیجئے کہ ہندوستان انگلستان کی مرضی کے تابع نہوتا تو ضرور تھا کہ یہاں پر ٹکشن کی پالیسی اختیار کی جاتی۔ اسوقت غیر ممالک کے مال پر اتقدر محصول درآمد لگایا جاتا کہ ہندوستانی مال انکا مقابلہ کر سکتا۔ اس محصول کے سبب سے چیزوں کی قیمت جو گراں ہوتی وہ کسے دینی پڑتی؟ ہندوستانیوں کو پس اس قانونی اختیار کی کمی کو حب الوطنی سے پورا کرنا چاہئے اور یہی مقصد ہے بائکاٹ کا اس سے زیادہ کچھ نہیں جب تک لوگ کسیقدر تکلیف برداشت نکرینگے اور ملکی فوائد کو ذاتی فوائد پر مقدم نکرینگے کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایک اور امر خیال رکھنے کے قابل ہے کہ بائکاٹ اگرچہ بظاہر پروٹکشن معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً وہ فری ٹریڈ کا پیش خیمہ ہے کیونکہ جو ملک جس چیز کو بہتر پیدا کر سکتا ہے وہ اسے پیدا کرے۔ پس فطرتاً ہندوستان اپنی قدرتی فوائد اور سستی محنت کے سبب جن چیزوں کے پیدا کرنیکا مستحق ہے اگر وہ بزور اس سے چھین لی گئی ہیں تو فری ٹریڈ کا اصول یہ چاہتا ہے کہ اسے چند روز بیرونی مقابلے سے پناہ دیجائے تاکہ جس غرض کے لئے اسے قدرت نے بنایا ہے وہ اسے باحسن وجوہ انجام دیسکے اور فری ٹریڈ کے اصول پر دنیا میں پورا پورا عمل ہو۔ اگر اہل انگلستان واقعی فری ٹریڈ کے حامی ہیں جیسا کہ گزشتہ الکشن سے ثابت ہو چکا ہے تو انہیں ہندوستان کے بائکاٹ کو بطیب خاطر منظور کرنا چاہئے کیونکہ وہ دراصل ان کے اصول فری ٹریڈ کا

معاون اور مددگار رہے۔

پس جبکہ ہر طرح پر اہل ملک حق پر ہیں تو ان کو کسیکی عارضی خوشی اور ناخوشی کی پروا نکرکے اپنے کام میں مشغول رہنا چاہئے۔ خدا ان کی مدد کریگا۔

تلمذ حسین مدرسۃ العلوم علی گڈھ۔

بندے ماترم

(بنگال کا قومی گیت مصنفہ بنکم چندر چٹرجی مرحوم مشہور ناولسٹ)

آہ! یہ جان بخش پانی یہ ہوائے خوشگوار
ٹھنڈی ٹھنڈی عطر میں مہکی ہوئی باد جنوب
ظل شفقت ہو ترا ای مادر مشفق دراز
اُف! یہ تیری چاندنی راتوں کا منظر خوش نما
تو تبسم تیرے انداز تکلم پر نثار
سرزمین عیش ہے ای مادر دلسوز تو
لاکھوں آوازیں ہیں تیری گھر میں سرگرم خروش
نوجوانوں کی ہے ہمت تو دلیروں کی سپر
نور دانش تو فروغ جلوۂ ایماں ہے تو
قوت بازو ہے میری مادر غمخوار تو
تیرا دیوا ستھان دیوی! دلکے کاشانے میں ہے
لچھمی تو ہے زمانے میں اُجالا ہے ترا
سرستی کا روپ ہے۔ درگا کا ہے اوتار تو

یہ ترو شاداب شیریں میوہ ہائے خوشگوار
سبز کھیتوں کی فضائیں اور یہ میدانوں کی دب
خاک پر کیا کیا تری تیرے مکینوں کو ہے ناز
آہ! یہ اشجار یہ پھولوں کا زیور خوش نما
دل کو کرتی ہیں تری شیریں صدائیں بیقرار
آرزوں کی ہے بزم انبساط افروز تو
جان نثاروں میں ہیں لاکھوں تیری دست سرفروش
کانپتے ہیں دشمنوں کے تیری ہیبت سی جگر
دل ہے تو۔ سرمایۂ صبر و شکیب جاں ہے تو
سینۂ پرغم میں ہے میرے نفس کا تار تو
تیری تصویر مقدس ہر صنم خانے میں ہے
ہر کنول کا پھول پانی میں سنہوالا ہے ترا
نطق و دانش کی ہے دیوی مادر غمخوار تو

اُف! یہ سُندر چھب تری یہ سالونی صورت تری
دل کے مندر کی ہے زینت موہنی مورت تری

ادریمان آبادی

دولت عثمانیہ کی مختصر تاریخ

دولت عثمانیہ کی مختصر تاریخ بیان کرنیکے لئے ہم اسکو تین مختلف دوروں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) امارۃ (۲) سلطنت (۳) خلافت۔ پہلے دور سے وہ ابتدائی زمانہ مراد ہے جبمیں اس سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اور اسکا بادشاہ ایک امیر کے لقب سے سرفراز ہو سکتا تھا اس زمانہ کے عثمانی امرا صرف تین ہیں عثمان اول جس نے اس سلطنت کا بنیاد ی پتھر رکھا اورخان اور مراد اول۔ ان تینوں کی حکومت سنہ ۶۹۹ ہجری سے ۷۹۱ تک رہی۔

دور ثانی میں یہ دولت وسیع ہو گئی اور اسکا مالک سلطان کے لقب سے ممتاز کیا گیا پہلا سلطان بایزید اول ہے اور آخری سلطان بایزید ثانی۔ اسکے قیام حکومت کی مدت سنہ ۷۹۱ ہجری سے سنہ ۹۱۸ھ تک ہے۔

تیسرے دور میں عثمانی سلاطین نے اپنے لئے خلافت کا لقب اختیار کیا۔ پہلا سلطان جو اس لقب سے مشہور رہا سلیم اول ہے جو تخت سلطنت پر سنہ ۹۱۸ھ میں بیٹھا تھا مصر کے فتح ہونیکے بعد اس نے اپنا لقب خلیفہ مقرر کیا جو سنہ ۹۲۳ھ میں اسکے مفتوحات میں شامل کیا گیا تھا۔ یہ لقب خلافت ابتک ان میں نسلاً بعد نسلٍ اور کابراً عن کابرٍ چلا آتا ہے اور موجودہ عثمانی سلطان عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ بھی اسی لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ عثمانی سلاطین کی اب تک کل تعداد ۳۴ تک پہونچی ہے جنمیں سے تین امرا۔ پانچ سلاطین اور چھبیس خلفا ہیں۔

عثمانیوں نے اپنی حکومت محض اپنی بہادری سے قائم کی جیسا کہ انکے پہلے سلاجقہ نے دینی حکومت قائم کی تھی۔ بخلاف اور ترکی دولوں کے کہ وہ زیادہ تر پادشاہوں یا جنرلوں کے رعب داب کی وجہ سے قائم ہوئی تھیں۔ کوئی قومی بہادری انکی نہ تھی

اور نہ عصبیت کا جوش تہا۔ جیسے طولونی حکومت مصر تہی یا افغانستان اور ہند کی غزنوی سلطنت۔ یا اتابکی کی حکومت جو خلفا سلجوقی کو بل پر مصر و شام اور دیگر ممالک اسلامیہ کو اپنے تصرف میں لائے تہے۔ دولت عثمانیہ کی بنا ایک معزز اور پُرجوش بہادر قبیلہ غور کی ڈالی ہوئی ہے جنہوں نے خود اپنی ہی ایک ہم قوم سلیمان شاہ کو افسر بناکر اس کے جہنڈے کے نیچے غیر قوموں کو پامال کیا۔ اور ممالک فتح کرکے خود مختاری کا علم بلند کیا۔

سلیمان شاہ اور اُسکا قبیلہ خراسان کے چٹیل میدانوں میں اپنی سکونت رکہتا تہا جب مغلوں نے چہٹی صدی ہجری کے آخر میں چنگیز خاں کی افسری میں اسلامی ممالک کو روند ڈالا۔ اور دنیا میں بے گناہوں کی خون کی ندیاں بہنے لگیں اُسوقت یہ قبیلہ خراسان کی سرزمین سے نکلکر اس ارادے سے چلا کہ کہیں اپنے لئے امن اور اطمینان کی جگہ تلاش کرے۔ ایسا نہو کہ مغلوں کا بیباک لشکر ان کو پامال کردے چنانچہ اپنے حسب منشا جگہہ تلاش کرتے ہوئے یہ لوگ آرمینیہ میں آئے۔ یہاں کئی سال تک ان کی سکونت رہی لیکن واپسی میں مغلوں کا لشکر ادہر ہی سے ہوکے گذرا خبر پاتے ہی یہ لوگ وہاں سے بہی بہاگے۔ بلکہ فرات کو عبور کرتے ہوئے انکا سردار سلیمان شاہ گہوڑے سے گرا اور مرگیا۔ وہیں اُن لوگوں نے اوسکو دفن کردیا۔ اور ابتک اوسکی قبر ترکی قبر کے نام سے مشہور ہے اُس قبیلہ میں یہ رسم تہی کہ جب سردار مرجاتا تو تمام قبیلہ اوسکے اولاد میں تقسیم ہوجاتا تہا۔ چنانچہ سلیمان شاہ کے چار بیٹے تہے ہر ایک کے ساتہ ایک ایک چوتہائی قبیلہ ہوگیا۔ اور ہر ایک بیٹے نے معہ اپنے قبیلہ کے اپنے قدیمی وطن یعنی خراسان کی راہ لی مگر ارطغرل جو غالبًا سلیمان شاہ مرحوم کا بڑا بیٹا تہا اوسنے کہا کہ میں پہر اُس سرزمین پر پلٹکے کیا جاؤں جسکو میرے باپ نے چہوڑدیا اور بالآخر وہ اپنے آدمیوں کو لیکر مغرب کی طرف بڑہا۔ اوسکی خوش تقدیری اوسکو ایشیائی کوچک کی سمت راہنمائی کرکے لے گئی جو کہ اُسوقت

سلاجقہ کی حکومت میں باقی رہگیا تھا۔ سلاجقہ کی سلطنت پانچویں صدی ہجری کے اوائل میں قائم ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ اسکے پانچ حصے ہوگئے تھے (۱) سلاجقہ اُوسطے (۲) سلاجقہ کرمان (۳) سلاجقہ شام (۴) سلاجقہ عراق وکردستان (۵) سلاجقہ ایشیاے کوچک۔ خاندان سلجوقیہ میں یہ عام قاعدہ تھا کہ خلفا جنرلوں کو اقطاع ولایات پر حکمرانی کرنیکے لیے بھیجتے تھے۔ اور اُنکو اتابک کہتے تھے۔ اس اصول کی وجہ سے بہت تھوڑے ہی عرصہ میں اتابکوں نے اکثر اپنی قوت بڑھاکر اپنے آپ کو خود مختار کرلیا۔ اور آخری چھٹی صدی ہجری گذرنے بھی نہ پائی تھی کہ سلاجقہ کی عظمت اور سلطنت اکثر اسلامی ممالک سے اُٹھ گئی۔ صرف یہی حصہ ایشیاے کوچک کا اُنکے قبضہ میں تھا۔ اور یہ ساتویں صدی ہجری کے آخر تک رہا لیکن اسمیں بھی سلجوقی خاندان کے آٹھ خود مختار حکمران الگ الگ حکومت کررہے تھے۔

ارطغرل جسوقت ساتویں صدی ہجری کے آخر میں وہاں پہونچا تو اُسوقت ایشیاے کوچک انہیں آٹھ طاقتوں میں بٹا ہوا تھا جیسا ہمنے اوپر بیان کیا۔ جسوقت قونیہ پہاڑ کے اوپر یہ چڑھا تو اسنے دیکھا کہ ایک بہت بڑا غبار اُڑ رہا ہے جو تمام شمالی افق میں پھیلا ہوا ہے فوراً ایک ٹیلے پر چڑھکر غور سے نظر جمائی۔ اور دیکھا۔ معلوم ہوا کہ دو فوجیں آپس میں لڑرہی ہیں۔ اسکے دلمیں اسوقت جوش پیدا ہوا۔ اور فوراً میدان کی طرف چلا کہ جو ضعیف ہو اوسکی مدد کرے۔ چنانچہ اسکی مدد سے زبردست فوج کو شکست ہوئی۔ اتفاقاً لڑائی ختم ہونیکے بعد جب یہ اوس امیر لشکر سے ملا جسکی اسنے مدد کی تھی تو معلوم ہوا کہ وہ امیر علاءالدین سلجوقی ہے جسکے ماتحت اسکے ہم قبیلہ لوگ ہیں۔ اس سے اوسکو اور بھی خوشی ہوئی کہ میں نے اپنے ہی ابناء جنس کی مدد کی۔ علاءالدین نے اسکی شجاعت اور بہادری کی وجہ سے اسکے لئے اپنے ملک میں سے ایک قطعہ اراضی کا الگ کردیا جسمیں ارطغرل اور اوسکا قبیلہ سکونت کرسکے۔ ارطغرل نے اپنی تمام زندگی وہیں بسر کی۔ اوسکے مرنیکے بعد اوسکا بیٹا عثمان اُس قطعہ زمین کا وارث ہوا۔ یہ ایسا شجاع اور عالی ہمت نوجوان

تہا اپنے باپ سے بہت بڑہگیا۔ جسوقت علاؤ الدین نے وفات پائی اور اُسکے کوئی اولاد نہ تہی تو دوسرے سلجوقی امرا نے اوسکی سلطنت تقسیم کرلی۔ عثمان بہی سنہ ۶۹۹ھ میں خودمختار ہوگیا۔ یہ پہلا استقلال تہا جو اوسکو حاصل ہوا۔ اسکے بعد وہ اپنی سلطنت کے بڑہانیکے لئے کوشش کرنے میں مصروف ہوا۔ سلجوقی امرا میں علاؤالدین کی سلطنت کے تقسیم کے بعد جہگڑے پیدا ہوئے۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجہا اور علاءالدین کی تمام سلطنت پر لڑ بہڑ کر خود ہی قبضہ کرلیا۔

عثمان کا باپ ارطغرل اپنی زندگی بہت سادہ بسر کرتا تہا جیساکہ دیہاتی اور گاؤں کے باشندے بسر کرتے ہیں۔ گرمیوں میں وہ مع اپنے تمام جانوروں۔ بہیڑ۔ بکری اونٹ گہوڑے وغیرہ اور قبیلہ کے پہاڑ و نپر جاکر رہتا۔ اور جاڑے میں میدانوں میں آجاتا اُسکے راستہ میں ایک بہت بڑا قلعہ پڑتا تہا جسپر رومیوں کا قبضہ تہا۔ ارطغرل نے اونکے ساتہ عہد کیا تہا کہ اگر وہ ہمارے جانوروں اور جانوں کی حفاظت کرینگے تو اونکو سال میں ایک معین تعداد اونٹوں کی دیتے رہینگے۔ چنانچہ اوس کے زمانہ میں برابر اسپر عملدرآمد ہوتا رہا۔ کیونکہ ارطغرل کو یہ خوف تہا کہ معاہدہ پورا نہ کیاگیا تو یہ لوگ ہمارے تمام جانور لوٹ لینگے۔ اور ہمکو بہی صدمہ پہونچائینگے۔ اسلئے کہ اُسوقت ترکوں کی دہشت ہرایک کے دل پر جمی ہوئی تہی۔ اور اونکا رعب بہت غالب تہا۔ عثمان کو اس معاہدہ کے مطابق خراج دینا ناگوار تہا۔ وہ اپنے بہادر ہمراہیوں کو لیکر عورتوں کے بہیس میں اُس قلعہ میں چلاگیا۔ اور بہت آسانی سے اُسپر قبضہ حاصل کرلیا یہ قلعہ گورنمنٹ قسطنطنیہ کے قبضہ میں تہا۔ جسکے مظالم سے لوگ بہت زیادہ پریشان ہوگئے تہے۔ اسلئے اس فتح کے بعد اُس دیار میں عثمان کو ہردلعزیزی حاصل ہوگئی اور وہ لوگ اسکے حامی اور وفادار ہوگئے۔

عثمان کا منچلا دل اب کہاں اسکو نچلا بیٹہنے دیتا تہا۔ کچہ ہی عرصہ کے بعد اسنے

شہر نیقیہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن چونکہ اسکو معلوم تہا کہ یہ آسانی سے فتح نہیں ہوسکتا اسلئے خود اوسکے محاصرہ میں رہا۔ اور اپنے بہادر بیٹے اورخاں کو کچہہ فوج کے ساتہہ دوسری طرف روانہ کیا کہ وہ ملک فتح کرے۔ اوسنے مختلف قلعے اور شہر فتح کئے اور بروصہ تک جو اوس زمانہ میں بڑا مشہور شہر تہا پہونچگیا۔ عثمان ابتک نیقہ کے محاصرہ ہی پر تہا شہنشاہ قسطنطنیہ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اسکو اندیشہ ہوا۔ اوسنے ایک دوسرا پہلو اختیار کیا کہ عثمان کے پاس ایک رئیس کو جو اوسکا ماتحت تہا بہیجا اور کہا کہ میں اپنی لڑکی سے تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عثمان نے اسکو نہ مانا اور نہ کچہہ پرواہ کی۔

بروصہ کے فتح کی خبر پاکر اسنے اپنے بیٹے اورخاں کو واپس بلالیا۔ اور بہت خوش ہوا خود اسوقت مرض الموت میں گرفتار ہوچکا تہا۔ اور جینے کی کچہہ امید نہ تہی اسلئے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ میں مرتا ہوں لیکن مجکو اپنے مرنے پر کوئی افسوس نہیں ہے جبکہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرا ایک حقیقی خلف اور قائم مقام موجود ہے۔ اے میرے بیٹے تو عدل کا معاون اور ظلم کا مخالف رہنا۔ اور احکام شریعت کی ادائی میں کوتاہی نہ کرنا اپنا پایہ تخت بروصہ میں بنانا اور وہیں مجکو دفن کرنا" چنانچہ بروصہ میں وہ دفن کیا گیا اور وہی پایہ تخت بنایا گیا۔ یہی پہلا عثمانی کیپٹل ہے جو ایشیاء کوچک کے شمالی غربی جانب بحر احمر کے سواحل پر واقع ہی۔

سلطان عثمان نے ۲۷ سال حکمرانی کرنیکے بعد ۷۲۶ھ میں وفات پائی۔ یہی ارطغرل کا بہادر بیٹا عثمان ہے جسکے نام نامی سے ابتک سلطنت ٹرکی فخر کرتی ہی یہ نہایت خوبصورت آدمی تہا اور اسکے بال معمولی سے زائد سیاہ تہی یہانتک کہ اسکا لقب (قارا) یعنی سیاہ بالوں والا پڑگیا تہا۔ یہ ایک نہایت افتخار کا لقب ہی۔ کیونکہ اُس قبیلہ کے لوگ سیاہ بالونکو بہت پسند کرتے تہی اسکے دونوں ہاتہہ بہت لمبے لمبے تہی یہانتک کہ گٹہنوں کے نیچے تک پہونچ جاتے تہی۔ جیسے بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کے

تہی۔ اسکا لباس بہت معمولی ہوتا تہا۔ البتہ سر پر ایک تاج رکہتا تہا جو تاج خراسانی کہلاتا تہا۔ اسمیں وہ تمام خوبیاں موجود تہیں جو ایک حقیقی فاتح اور سچے بہادر کے لئے ہونی چاہئیں۔ اسلئے تمام اسلامی جنرلوں میں اسکو سب سے اعلیٰ درجہ پر رکہتے ہیں اُسکا بیٹا اورخاں بہی ملک گیری کا بیحد شائق تہا۔ اسنے اپنے نام کا سکہ چلایا۔ اور اسی کے نام کا خطبہ پڑہا جانے لگا۔ ترکوں کی طرح اسنے یہ نہیں کیا کہ سلطنت کو تقسیم کردیتا۔ بلکہ اپنے بہائی علاءالدین کو اپنا وزیر مقرر کرلیا۔ اور نظام حکومت اسکے ہاتہ میں دیدیا۔ اسمیں ملکہ انتظام بدرجہ غایت تہا۔ چنانچہ اُس نے سلطنت کو بالکل شایستہ طور پر منتظم کردیا خاندان سلجوقی کی طرح اوسنے ولایات کی حکومت کے لئے اتابک نہیں بہیجے بلکہ پاشا مقرر کئے جو اوسکے ماتحت رہیں۔ پاشا فارسی کے دو لفظوں سے مرکب ہے جسکے معنی بادشاہ کا پاؤں ہیں۔ اہل فارس میں یہ ہمیشہ سے رسم ہو کہ وہ لوگ وزرا اور اپنے دیگر ماتحتونکو ہاتہ۔ پاؤں۔ آنکھ وغیرہ وغیرہ کہا کرتے تہے۔

اسوقت لشکر بہی باقاعدہ نہ تہا۔ ضرورت کے وقت قبائل لڑنیکے لئے اکٹہے کرلئے جاتے۔ علاءالدین نے فوج کو مرتب کیا۔ اور اُنکے الگ الگ فرقے۔ رسالے وغیرہ قائم کئے۔ پہلے اسمیں اوسکو بہت دشواری پیش آئی لیکن آخر اوسنے یہ ترکیب کی کہ دوسرے قبائل سے لوگونکو فوج میں بہرتی کرنا شروع کیا اسلئے مجبوراً اوسکے ہم قبیلہ لوگوں کو اُسکا انتظام تسلیم کرنا پڑا۔ اورخاں نے مختلف لڑائیوں میں بہت سے عیسائی گرفتار کئے تہے۔ اُنکے بچوں کو اسلامی تربیت دیکر اوس فوج میں بہرتی کیا۔ جو ابتک دولت عثمانیہ کی تاریخ میں انکشاری مشہور ہیں۔ اورخاں کے بعد مراد اول اُسکا جانشین ہوا۔ اس نے اوسی انکشاری فوج سے تمام ایشیائے کوچک پر قبضہ کرلیا اور سبکو ایک سلطنت بنالیا۔ دوسری طرف ڈارڈنیلز سے یورپ تک پہونچا اور اڈریانوپل کو فتح کرلیا۔ اب قسطنطنیہ کے بادشاہ کے دل پر اسکا بہت خوف طاری

ہوا۔ بلقان کے پہاڑ اوسکی دہشت سے لرزنے لگے۔ اور تمام ٹرکی ریاستیں تھرا اُٹھیں لیکن وہ اس زبردست فاتح کو روکنے کی بالکل طاقت نہیں رکھتے تہی۔ یہ فتوحات کا سلسلہ بڑہاے چلا جاتا تہا۔ آخر ۷۹۲ھ میں مرگیا۔ اسکے بعد اسکا بیٹا بایزید اوّل اسکا جانشیں ہوا۔ جس سے اس دولت کا دوسرا دور شروع ہوتا ہی۔ بایزید اوّل پہلا شخص ہے جسنے اپنا لقب سلطان رکہا۔

اسیکے زمانہ میں تیمور لنگ تہا۔ جس نے کہ تماشہ گاہ عالم کی اسٹیج پر وہی ایکٹ کرکے دکہلا دیا جو اس سے ڈیڑہ صدی پہلے چنگیز خاں نے دکہلایا تہا۔ اسنے ماوراء النہر سے نکلکر بہت سی لڑائیوں کے بعد بلاد فارس کو فتح کیا۔ خراسان۔ جرجان۔ مازندران سجستان۔ افغانستان۔ آذربیجان اور کردستان کو روندتا ہوا عراق میں پہونچا اور بغداد پر قبضہ کرلیا۔ وہاں سے مشرق کی طرف رُخ کیا اور ایک تیزرو گرجتے برستے بادل کی طرح کشمیر۔ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے شہروں میں خون کی ندیاں بہاتا ہوا۔ ایشیائے کوچک کی طرف چلا۔ اسوقت یہی بایزید اوّل حکمران تہا جسے تیمور نے قید کرلیا۔ اور آخر یہ مظلوم قید ہی میں مرگیا۔ اوسکی وفات کے بعد دولت عثمانیہ میں خرابی واقع ہوگئی۔ اسوقت اورنٹس سے ڈانوب تک اسکی سرحد پہیلی ہوئی تہی۔ بایزید کی مختلف اولادوں نے الگ الگ سلطنتیں قائم کریں۔ اور اس عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے لیکن اُسکا منجھلا بیٹا محمد چلبی جو نہایت دانشمند اور بہادر تہا اوسنے بڑی حکمت عملیوں سے پہر ایک ہی سلطنت کرلی۔ اسکے بعد مختلف سلاطین ہوئے جو مغرب اور مشرق دونو جانب سلطنت کے حدود کو وسیع کرتے رہے۔ اور انگریزی جنرلوں اور اونکے بادشاہوں سے لڑتے رہے یہانتک کہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کو فتح کرلیا جسکے فتح کرتے ہی روم کی باقی حکومت کا فیصلہ انہیں کے ہاتہ پر ہوگیا۔

اسلام کی فتوحات میں قسطنطنیہ کی فتح کا واقعہ تاریخی لحاظ سے ایک عظیم الشان

واقعہ ہے کیونکہ ابتدا اسلام سے مسلمان اسمیں نہیں جاسکے - اور ہمیشہ اُن کو دلونمیں
یہ اُمنگیں جوش مارا کیں کہ یہ شہر ہمارے قبضہ میں آئے - آخر محمد فاتح عثمانی کے ہاتہ
سے یہ مرادیں پوری ہوئیں - اور وہ ۲۹ رمئی ۱۴۵۳ء کو ۸ بجے صبح کے وقت رعب و
جلال کے ساتہ اپنے وزار امرار اور جنرلوں کے ہمراہ رومانوس دروازہ سے گھوڑی
پر سوار قسطنطنیہ میں داخل ہوا - شارع عام سے گذرتا ہوا دونوں رخ کی عمارتیں دیکہتا
ہوا جنہیں اوسکے دیکہنے کے لئے ہر کہڑکی اور دروازے سے لوگ جہانک رہے تہے
آصیدان پہونچا جسمیں کنیسہ ایاصوفیا ہے - اوسکی نظر ایک ستون پر پڑی جسمیں تین سانپونکی
تصویریں بنی ہوئی تہیں جو آپسمیں لپٹے ہوئے تہے - سلطان نے سنا تہا کہ لوگ عقیدۃً
سانپوں کو اپنا محافظ خیال کرتے ہیں - چنانچہ اپنے صولجان سے اوس نے ایک سانپ
کا پہن توڑ ڈالا - اسکے بعد کنیسہ کی عظیم الشان عمارت دیکہی - اوسکے ایک ساتہی نے
اپنی تلوار سے اوسکے نقش و نگار میں سے ایک سُنہرا پہول توڑنا چاہا اوس نے منع
کیا اور عصائے شاہی سے مارا بہی اور کہا کہ ہرگز اس معبد مین سے کوئی چیز نہ توڑو
اسکے بعد حکم دیا - کہ اسمیں صلیبیں اور قرنار و صور نکال کے پہنکدو - اور موذن کو حکم دیا
اُس نے اذان کہی اور جمعہ میں نماز پڑہی - اور اُسی روز سے اسکا نام جامع ایاصوفیہ کہا گیا -

دوسرے دن دو انکشاری سپاہی اوسکے سامنے شہنشاہ بالیولوگوس کی نعش لائے
جو مقتولوں میں تلاش کرنے سے اُن کو ملی تہی - سلطان نے اوسکو نہایت اکرام اور
عزت سے دفن کرایا - فتح قسطنطنیہ میں جو لوگ قید کئے گئے تہ اونمیں گرینڈ ڈیوک لوکاس
نوکر بوس بہی تہا جو وزیر خزانہ تہا - سلطان کے سامنے جب وہ لایا گیا تو اوسکو چہوڑ
دیا اور کہا کہ بتلاؤ خزانہ کہاں ہے اوس نے تمام خزانہ معائنہ کرایا - جو بہت ہی زیادہ
تہا - سلطان نے کہا کہ تم لوگوں نے اسکو اپنی مدافعت اور ملک کی حمایت میں کیوں نہیں
صرف کیا - اوس نے جواب دیا کہ اللہ تعالی نے اسکو تمہارے لئے رکہا تہا " محمد فاتح

قسطنطنیہ ہی کو اپنا پایہ تخت بنالیا جو کہ ابتک ہو اور اسکے بعد اُس نے ممالک یورپ میں اپنے فتوحات بڑہانے کی کوشش کی۔ انکشاری فوج اس کام کے لئے بہت موزوں تہی۔ اور بالآخر اسی کے ذریعہ سے وہ آگے بڑہتا چلا گیا یہانتک کہ اٹلی کے قلعہ اورنٹو پر اپنا جہنڈا گاڑ دیا۔

اُسکے بعد سلطان سلیم اول نے جو اُسکا جانشین تہا مشرق کی طرف عنان توجہ منعطف کی۔ اور اپنی قلیل مدت حکومت یعنی صرف آٹھ سال کے عرصہ میں اسقدر ممالک فتح کئے جو دوسرا صدیوں میں نہیں کرسکتا۔ فارس پر پورا قبضہ کرلیا۔ کردستان دیاربکر شام مصر۔ بلاد عرب۔ حرمین شریفین وغیرہ سب اُسکے تصرف میں آگئے قاہرہ میں بجائے علم عباسی کے عثمانی پرچم لہرانے لگا۔ اور اُن لوگوں نے سلطان سلیم کے ہاتہ پر خلافت کی بیعت کی۔ یہاں سے دولت عثمانیہ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اور یہی عظیم الشان دور ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں ان کی سلطنت کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تہا

سلطان سلیم کے بعد اُسکا بیٹا سلیمان خلیفہ ہوا۔ اسکا اقتدار اور اوسکی سلطنت بنسبت تمام سلاطین عثمانیہ کے زیادہ تہی۔ اور اسکے زمانہ میں عثمانی سلطنت اعلیٰ معراج کمال پر پہونچی ہوئی تہی جسطرح کہ دولت عباسیہ ماموں کے زمانہ میں۔ اسنے بہی بہت سے ممالک فتح کئے مثلاً بلگیریا وغیرہ۔ اسکے جرار لشکر نے ایسا سخت تہلکہ دنیا میں مچادیا جسکے ذکر سے تاریخ کے صفحات بہرے ہیں۔ آسٹریا کی سرزمین کو اسکے گہوڑوں کی ٹاپوں نے روند ڈالا۔ ۱۵۲۹ء میں وائنا کا محاصرہ کیا۔ گو اُسکو فتح نہیں کیا۔ لیکن جزیہ لیا اسکے زمانہ میں نہایت شائستہ آئین اور قوانین مرتب ہوئے۔ اور ٹرکی سلطنت ہر لحاظ سے ایک زبردست اور عظیم الشان طاقت ہوگئی یورپ کے حکمرانوں مثلاً شارلکن۔ فرڈیننڈ۔ فرنسیس اول ولیم دہم اور کورٹس وغیرہ سے عہدنامے کئے اسوقت عثمانی سلطنت شرقاً وغرباً فرات سے جبل طارق تک۔ اور شمالاً وجنوباً بوداپسٹ

جو ٹرانو کے ساحل پر ہے آجتک تہی اُسی کے بعد سے اس سلطنت کا زوال شروع ہوا جسکی بڑی وجہ یہ تہی کہ عثمانی سلاطین نے خود لڑائی میں جانا چھوڑ دیا۔ اور عیش آرام میں پڑگئے۔ اسکا تقہقر اور تنزل اُسوقت سے برابر اٹھارہویں صدی عیسوی کے اور آخر تک چلا آیا۔ لیکن اوائل اُنیسویں صدی میں جب سلطان محمود ثانی تخت نشین ہوا تو اوس نے از سرِ نو انتظام شروع کیا۔ اور جدید تمدن کے مطابق قوانین اور آئین مرتب کئے۔ انکشاری فوج سلطنت کے خلاف تہی۔ اور وہ در پردہ اپنی الگ طاقت قائم کرنا چاہتی تہی لیکن اسنے اونکو اپنی بہادری اور نیز لطائف الحیل سے اپنے قبضہ میں کیا۔ اور وہی روشس اختیار کی جو اسکے مشہور جنرل محمد علی پاشا نے مصر میں اوسکے فتح کرنیکے بعد اختیار کی تہی۔ یہ پہلا عثمانی سلطان ہے جس نے طربوش اور انگریزی لباس پہنا۔ اور فٹن پر سواری کی۔ ورنہ اسکے پہلے عثمانی سلاطین عمامہ اور جُبّہ پہنتے تہے۔ اور گھوڑے پر سوار ہوتے تہے۔ اُسیوقت سے اسمیں کچہہ جدید تمدن کا اثر پھیل چلا جو اب تک بڑہتا جاتا ہی لیکن بہت آہستگی کیساتہہ۔

دولت عثمانیہ بہ نسبت دیگر دول اسلامی کے کئی خصوصیتوں میں ممتاز ہی۔

(۱) اس نے ایسی عظیم الشان فتوحات حاصل کئے جو دوسری اسلامی سلطنتوں کو نہیں نصیب ہوئے۔ خاصکر فتح قسطنطنیہ۔ کیونکہ بنی امیہ اور نیز بنی عباس ہمیشہ اسکے فتح کرنے کی کوشش میں رہے۔ لیکن اُن کو غلبہ نہ ہو سکا۔ اس عظیم الشان فتح کو جدید اصول تمدن سے بہت کچہہ تعلق ہے۔ کیونکہ نئی روشنی کا دُہندلا اجالا پہلے اسی شہر کی چار دیواریوں میں محصور تہا۔ جو بعد کو دنیا میں نکلکر آفتاب کی طرح نورانی ہو گیا۔ جسوقت یہ پایہ تخت فتح کیا گیا تہا۔ اسوقت اسمیں سے کئی فرقے یوروپ میں جا بسے تہے۔

(۲) اسلامی بادشاہوں میں سب سے پہلے سلاطین عثمانیہ ہی نے یوروپ کی طرف

رُخ کیا اور اسکو فتح کیا۔ بنی اُمیہ نے اگرچہ اندلس (اسپین) کو فتح کیا تھا۔ لیکن اسکے بعد وہ قسطنطنیہ ہی کی فتح کی ادہیڑ بن میں لگے رہے۔ اگر اسوقت وہ ذرا بہی کوشش کرتے تو تمام یوروپ اونہیں کا تہا۔ اسلئے کہ یوروپ کی حالت اُسوقت نہایت سقیم تہی۔ اور کوئی طاقت تمام ملک میں ایسی موجود نہ تہی جو بنی اُمیہ کی فتوحات میں بڑی نام بہی رکاوٹ پیدا کر سکتی۔ اور عثمانیوں نے خصوصیت کے ساتھ یورپ کی طرف توجہ کی۔ اور باوجود اسکے کہ صلیبی جنگ نے اہل یوروپ کو بیدار کر دیا تہا۔ اور اُن کی حالت بہت کچھ سنبہل گئی تہی لیکن پہر بہی عثمانیوں نے بہت بڑا حصہ یوروپ کا اپنے قبضہ میں کر لیا۔

(۳) سلاطین عثمانیہ باوجود اسکے کہ اہل عرب میں سے نہ تہے۔ ان کی خلافت پر بعیت کی گئی۔ حالانکہ دوسرے اسلامی سلاطین مثلاً محمود غزنوی۔ تیمور لنگ وغیرہ کو اگرچہ اونکے ملک بہت وسیع تہے اور اُن کی خواہش بہی تہی لیکن یہ درجہ خلافت نہ حاصل ہو سکا۔ سلطان سلیم نے جب مصر فتح کیا تہا تو اُسوقت آخری خلفاء عباسیہ میں سے جو کہ ہلاکو کی فتح کے بعد بغداد سے مصر میں چلے آئے تہے۔ متوکل علی اللہ خوجو تہا یہ اپنے مسند خلافت سے اُتر آیا۔ اور سلطان سلیم کی خلافت پر اوسکی ہاتہ پر بعیت کی۔ آثار نبوامیہ یعنی علم۔ سیف اور چادر اوسکے حوالہ کئے۔ حرمین شریفین کی کنجی سپرد کی اور اُسیدن سے عثمانی سلاطین تمام اسلامی عنصر میں سیاست اور دین دونوں کی حکومت کے مالک تسلیم کئے گئے اور اُن کا لقب "خلیفہ امیر المومنین" ہوا جو اب تک وراثتاً چلا آتا ہے۔ اسکی ایک وجہ اور بہی ہے کہ تمدن اسلامی میں جسقدر دولتیں قائم ہوئیں مثلاً فارس۔ ترک۔ کرد۔ دیلم۔ سلجوقی۔ ایوبی وغیرہ اُن کی سلطنت کا رقبہ اسکا نصف بہی نہیں تہا جتنا عثمانی سلطنت کا تہا علاوہ بریں ایک ہی خاندان میں کوئی اسلامی سلطنت اتنے زمانہ تک باقی بہی نہیں رہ سکی جسقدر کہ دولت عثمانیہ رہی۔ عربی

خلافت میں سب سے طویل مدت خلافت عباسیہ کی ہے۔ حالانکہ وہ تین صدی بھی چل نہ سکی اور اُسکے بعد دینی خلافت رہگئی۔ اس لحاظ سے دولت عثمانیہ نے تمام دیگر اسلامی سلطنتوں سے زیادہ عمر پائی۔ اللہ اور بڑہائے۔

(۴) دولت عثمانی کی چوتھی سب سے ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے اسلامی عظمت کی بہت کچھہ نگہداشت کی اور اگر یہ سلطنت قائم نہ ہوتی تو اسلامی سلطنت کا چراغ دنیا سے کبھی کا گل ہو گیا ہوتا۔ اس نے نہ صرف دوسری قوموں کے حملے سے اسکو محفوظ رکھا بلکہ اسلام کی توڑنے والی طاقتوں کو توڑا۔ خاص کر مغل اور اہل یوروپ کو۔

یہ دولت آٹھویں صدی ہجری کے آوائل میں قائم ہوئی۔ اسوقت اسلامی سلطنتوں کی یہ حالت تھی کہ مصر متعدد سلاطین کے قبضہ میں تھا جنمیں دن رات فساد برپا رہتا تھا۔ شام میں ایوبی خاندان کے سلاطین نے الگ الگ کئی خود مختار سلطنتیں قائم کر رکھی تھیں۔ عراق اور بلاد فارس ایلخانی حکمرانوں کے قبضہ میں تھا۔ ماوراالنہر اور افغانستان پر مغلوں کی حکومت تھی۔ ہندوستان میں دہلی کے بادشاہ راج کر رہے تھے دیگر مشرقی ممالک میں آتابکہ اپنے کو مستقل حکمران تصور کرتے تھے۔ ایشیا کوچک کے خاندان سلجوقی کے امرا نے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھی اندلس میں دولت ناصری کا تقریباً خاتمہ ہو رہا تھا اور وہ صرف غرناطہ میں محدود تھی۔ مرینیہ۔ زبانیہ اور حفصیہ اُمرا شمالی افریقہ میں جنگ و جدل کر رہے تھے۔ اُسوقت اگر دولت عثمانیہ ایسی زبردست اور وسیع سلطنت نہ قائم ہوتی جس نے بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کو اپنے دامن میں لیکر سنبھال لیا تو یقیناً اسلامی حکومت دنیا سے رخصت ہو جاتی۔ اسلئے یہ سلطنت نہ صرف ملکی بلکہ مسلمانوں کی مذہبی لحاظ سے بھی اس قابل ہے کہ وہ اسکے سلطان کو خلیفہ تسلیم کریں۔

اسلم جیراجپوری

ہارس شاعر رومی

ورجل کے بعد روم کا نامی شاعر ہارس (Horace) ہے یہ شاعر ورجل
کیطرح رزمی شاعر نہیں ہے اسکے اشعار غزل وقصیدہ دونوں کے رنگ رکھتے ہیں
راقم کے خیال میں اس شاعر کا کلام سفّو شاعرہ اور پنڈار کے رنگوں سے
ممزوج معلوم ہوتا ہے۔ ہارس نے بیشتر آوڈ لکھے ہیں جو قصاید کی تشبیب سے
مشابہت رکھتے ہیں اوسکے کلام کا کچھ ترجمہ ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔
کلام ذیل ایک آوڈ ہے جسمیں ہارس اپنی معشوقہ پیرا کی بیوفائی اور تلون
مزاجی کی شکایت کرتا ہے اور یہ عورت جو ایک درباری عورت تھی اُسی سمندر
سے تشبیہ دیتا ہے۔ تشبیہ سمندر کے ساتھ اس مشابہت سے دیتا ہے کہ سمندر جب ٹھیرا رہتا
ہے تو مسطح شکل ہوتا ہے اور اُس سے باسباب ظاہر کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا ہے مگر جس دن
میں متموج ہو جاتا ہے اور ہلاکت کا نقشہ دکھلانے لگتا ہے ویسی ہی پیرا کی کیفیت
ہے کہ پہلے نہایت مطبوع انداز دکھلاتی ہے مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُس کے
تلون کا سمندر موجزن ہونے لگتا ہے اور عاشق کی جان پر آبنتی ہے اس تشبیہ کے
بعد اپنی معشوقہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ ہم بھی تیرے فریب کے سمندر میں ڈوب چکے تھے
مگر کسی طرح بچ نکلے اگر اسکی تصدیق درکار ہو تو کوئی جا کر دیکھ لے میری تصویر اور
بھیگی پوشاک خدائے بحور کے مندر میں آویختہ ہیں یہ بیان قصہ طلب ہے اور وہ یہ
ہے۔ کہ اہل روم جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے بڑے بت پرست تھے منجملہ انواع
اقسام کے دیوتاؤں کے ایک بہت بڑا دیوتا مانا جاتا تھا کہ جسکا نام نیچوں تھا
(Neptune) یہ دیوتا سمندروں کا مالک تھا اور تمام معاملات بحری
اُس سے متعلق سمجھے جاتے تھے اس دیوتا کے لئے ایک بہت بڑا مندر بھی تعمیر
کیا گیا تھا اور اہل حاجت وہاں پرستش اور پرستاری کی نظر سے جایا کرتے
تھے منجملہ اور رسومات مذہبی کے رومیوں کا یہ بھی دستور تھا کہ اگر کوئی رومی سفر

بحری اختیار کرتا تہا اور اتفاق وقت سے اُسکا جہاز تباہ ہوجاتا تہا اور وہ خود کسی صورت سے بچکر وطن کو واپس آتا تہا تو اداے سپاس کی نظر سے وہ نجات یافتہ شخص نیچون کے مندر میں حاضر ہوتا اور ایک تصویر اُسمیں آویزاں کرآتا اس تصویر مین اُس شخص اور اوسکے جہاز کی صورت کہچی رہتی تہی مراد اس تصویر آویزی سے یہ تہی کہ خدای بحور نے تصویر کے آویزاں کرنیوالے پر رحم کیا ہے اور ہلاکت سے نجات دی ہے اسواسطے ادای سپاس کی نظر سے ایسی تصویر کا آویزاں کرنا ضرور ہوا ایسے وہمی مراسم سے رومیوں کی مذہبی عقل کا انداز خوب کہلتا ہے باوجود افراط عقل و دانش کے یہ قوم مذہبی خیالات کی صفائی مطلق نہیں رکہتی تہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقل دنیا اور عقل دین مختلف چیزیں ہیں اس زمانہ میں بہی بہت سی عاقل قومیں دیکہی جاتی ہیں جو باوجود پیدا کرنے ہرطرح کی دنیاوی ترقیوں کے مذہبی معاملات میں عاجز نظر آتی ہیں یہ قومیں ہزاروں علمی طریقے دنیا حاصل کرنیکے جانتی ہیں اور اسوقت علوم و فنون میں درجہ کمال حاصل کرچکی ہیں مگر مسئلہ توحید سے تمامتر بےخبر ہیں خدای واحد کی پرستش کا مضمون اُن کی سمجہ میں آتا ہی نہیں ہے خیر اہل یونان اور اہل روم یا اور بہی بہت سی موجودہ قومیں جو دنیاوی شایستگی کا نمونہ سمجہی جاتی ہیں اگر بت پرستی سے خالی نہیں تو نہوں تعجب ہے اُن اہل اسلام سے جو خواجہ خضر کا بیڑا یا کاغذی کشتی بنانے والے ہیں۔ ہر سال ہزاروں جہال زبانی توحید کے قایل۔ برسات کے دنوں میں گنگا کاتکی ساون بہن بہن اور اسیطرح ندیاں اور نالوں میں کاغذی کشتیاں دہوم دہام سے حضرت خواجہ خضر کی نذر کیا کرتے ہیں اعوذ باللہ من ذلک بہرحال ہارس کے اُوڈ کا مفہوم راقم ذیل میں عرض کرتا ہے۔ اُمور بالا کے عرض کردینے سے یہ غرض تہی کہ قصہ طلب مضامین کے بیان سے کلام شاعر آسانی کے ساتہ

ذہن نشین ہو جاسکے کسواسطے کہ ہر ملک کی شاعری کچھ نہ کچھ رسوم ملکی سے متعلق ہوا کرتی ہو اور نا واقفیت کی حالت میں نہ سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ سامع کے دل کو لذت یاب سخن کرسکتی ہے مثلاً اگر کوئی شخص اس رسم سے واقف نہو کہ ایک وقت میں یہ دستور تھا کہ جو کوئی فریادی ہوتا تھا وہ دادخواہی کی غرض سے پیراہن کاغذی پہنتا تھا تو ایسا شخص مرزا نوشہ کے اس مطلع کو یعنی ؎

نقش فریادی ہی کسکی شوخی تحریر کا	کاغذی ہی پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نہ سمجھ سکتا ہی اور نہ کوئی اُس سے لطف سخن اُٹھا سکتا ہے خیر حضرات ناظرین اب ہارس ہے کے اُوڈ کی طرف توجہ فرمائیں گو ترجمہ سے اوسکے اصلی کلام کا لطف حاصل نہیں ہوسکتا ۔

خطاب بہ پیرا

ای پیرا تو کس جوان حسین کو جو عطریات میں ڈوبا ہوا ہی خلوت کدوں میں ہم آغوش کر رہی ہی کسکے لئے تو اپنی زلفیں اس سادگی کیساتھ سنوارا کرتی ہی ہزار حیف کہ وہ تیری طرف سے مطمئن ہو رہا ہی اُسے کیا معلوم کہ اُسے تیری بیوفائی کی بدولت کیا کیا نہ اشک ریزی کرنی ہوگی اُسے اسکی کیا خبر ہے کہ تو ابھی کیا سے کیا ہوجانیوالی ہی وہ بیچارہ کیا جانتا ہی کہ تو وہ سمندر ہے کہ جو ہر تموج ہوا کیساتھ کیفیت گوناگون پیدا کرتا ہے اسے پیرا جسنے تجپر اعتماد کیا ہے کہ تو اوسکی ہو رہی ہے اوسکو ہوا کی غیر استقلالی سے تمامتر بیخبری ہی کمبخت وہ ہیں جن کی آنکھوں میں تو بھلی لگتی ہی مگر اونہیں تیری حقیقت سے اطلاع نہیں ہی میری سرگذشت تو میری اُس تصویر سے ظاہر ہے جو خدای بحر کے مندر کی دیوار پاک سے آویزاں ہے اور اون تر کپڑوں سے جو وہاں لٹکے ہوے ہیں ۔ یہ چیزیں اسبات کی شہادت دیتی ہیں کہ ہم

غرق ہونے سی بدشواری بچ نکلے ہیں ۔"

واضح ہو کہ ہارس اپنے کلام بالامیں اُسی مضمون کو شرح و بسط کیسا تہہ حوالۂ قلم کرتا ہی جسکو مرزا صاحب نے مطلع ذیل میں باندہا ہے۔ ؎

چو می بینم کسے از کوی تو دل شادمی آید	فریبے کز تو اول خوردہ بودم یادمی آید

مگر معشوقہ خود کام سے نجات پانے کے مضمون کو حافظ علیہ الرحمۃ نے نہایت خوبصورتی اور بیحد تاثیری کے ساتہ غزل ذیل میں فرمایا ہے۔

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند	و ندراں ظلمتِ شب آب حیاتم دادند
بیخود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند	بادہ از جام تجلّیٔ بصفاتم دادند
چہ مبارک سحری بود و چہ فرخندہ شبی	آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
چوں من از عشق رخش بیخود و حیراں گشتم	خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند
من اگر کام روا گشتم و خوش دل چہ عجب	مستحق بودم و ایں رہ بزکاتم دادند
بعد ازیں روی من و آئینۂ حسن نگار	کہ درینجا خبر از جلوۂ ذاتم دادند
ہاتف آں روز بمن مژدۂ ایں دولت داد	کہ بآں جور و جفا صبر و ثباتم دادند
اینہمہ قند و شکر کز سخنم مے ریزد	اجر صبریست کزاں شاخ نباتم دادند
کیمیائیست عجب بندگی پیر مغاں	خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند
بحیاتِ ابداں روز رسانید مرا	خط آزادگی از حسن مماتم دادند
عاشق آندم کہ بدام سر زلف تو فتاد	گفت کز بند غم و غصہ نجاتم دادند
شکر شکر بشکرانہ بفشاں اے دل	کہ نگار خوش و شیریں حرکاتم دادند

ہمت حافظ و انفاس سحرخیزاں بود
کہ ز بندِ غم ایام نجاتم دادند

واضح ہو کہ خواجہ حافظ علیہ الرحمۃ کے عہد شباب کی معشوقہ شاخ نبات

تہی جسکا نام غزل بالا میں آیا ہی یہ عورت لولیاں شیراز سے تہی - مگر حسن و جمال ایسا رکہتی تہی کہ شاہزادگان و امرازادگان اوسکے اوپر جان دیتے تہے اتفاق وقت سے حافظ علیہ الرحمۃ اوسکے گہر پہونچے وہ عورت انکے انداز عاشقی کو دیکہکر کہنے لگی کہ بغیر نقش درم کوئی عمل کارگر نہیں ہو سکتا - حضرت مالدار نہ تہے مگر کچہہ عرصہ میں زر کافی بہم پہونچا کر اوسکے گہر گئے اس بار حسب طریق زنان بازاری وہ نہایت اخلاق سے پیش آئی - مختصر یہ ہے کہ اوسکے گہر شب بسر کرنیکی ٹہہری صحبت اغیار سے پاک تہی اور عشق خواجہ زور دل پر تہا اُس عورت سے قریب نصف شب کے تک ہمکلام رہے جب اوسنے استراحت کیطرف میل دکہلایا خواجہ کو اُسوقت ایک بات یاد پڑی جو اوس شب کو عمل میں لایا کرتے تہے اتفاق سے وہ شب شب آدینہ تہی جسمیں خواجہ کا یہ معمول تہا کہ دو شمع مومی لیکر مصلای شیراز کو جاتے اور وہاں قبر پر ایک امام زادے کے جو وہاں آسودہ ہیں نہایت خلوص دل سے اُن دو شمعوں کو روشن کرتے یہ خدمت خواجہ سے کبہی ترک نہیں ہوئی تہی الا اوس شب میں کہ شاخ نبات کے زور فریفتگی میں فراموش ہونے کو تہی - جبوقت خواجہ حسب درخواست اوس عورت کے مایل استراحت ہونے کو تہے کہ وہ خدمت قدیمہ امام زادے کی یاد آئی یہ سوچکر کہ مصلای شیراز بہت دور نہیں ہے دو گہنٹے کی تو بات ہی فوراً پہر کر چلا آونگا - شاخ نبات کے نزدیک سے اُٹہنا چاہا شاخ نبات نے آستین پکڑی مگر خواجہ نے نہیں مانا گہر آکر دو شمع مومی لیکر مصلای شیراز کی طرف روانہ ہوئے اور قبر حضرت امام زادہ پر اُنہیں روشن کیا اس جوش خلوص کا یہ اثر ہوا کہ شاخ نبات کی آرزو بالکل دل سے جاتی رہی اور مزاج پاک میں کچہہ ایسا ولولۂ عشق حقیقی پیدا ہوا کہ دنیا سے دل اوٹہا اوسکے کل متعلقات کی

ہوس دل سے جاتی رہی - واقعی یہ اُن کی پاکی خیالات کا اثر ہے کہ اُن کا کلام اسقدر مقبول عالم ہو رہا ہے شاعر ہوس باز و ناپاک خیال میں یہ حسن قبول کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے - خواجہ کا یہ شعر ؎

اینہمہ شہد و شکر کز سخنم مے ریزد	اجر صبریست کزاں شاخ نباتم دادند

اُن کی پاکبازی اور اُن کی پاک خیالی کی بخوبی شہادت دیتا ہے - واقعی خدمت امام زادہ بہت کام آئی اور کیوں نہ دوستداری خاندان پیغمبر کا اگر اتنا بھی صلہ نکلے تو اوس خاندان کی دوستداری سے کیا فائدہ متصور ہے بہرحال خواجہ کو شاخ نبات کے بکھیڑے سے ویسی ہی نجات ہوئی جیسا کہ ہارس کو پیر کو اسکے دام فریب سے - مگر دونوں کے کلام کو موازنہ کرنے سے خواجہ کا معاملہ ہارس کے معاملے سے بہت زیادہ روحانی انداز رکھتا ہے - حضرات ناظرین کے آگے اسکے بیان کی حاجت نہیں ہے -

جاننا چاہیے کہ یہ شاعر آٹھ برس قبل ظہور حضرت مسیح علیہ السلام کے زندہ تھا اسکے کلام مقبول خاص و عام ہیں اور یورپ میں اسکا نام ابھی تک زندہ ہے - فقط امداد امام

اجلاس نیشنل کانگرس منعقدہ بنارس بابت دسمبر ۱۹۰۵ء کے فیصل شدہ رزولیوشن اور مسلمانان ہند کا نفع نقصان

راہ پر اُن کو لگالائے تو ہیں باتوں میں	اور کھل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں

جبکہ ہم اپنے ایک مضمون میں (جو اردوی معلی کے گزشتہ اگست و ستمبر کے متحدہ پرچے میں شائع ہوا تھا) اس دعوے کے ثبوت میں کافی دلائل بیان کر چکے ہیں کہ کیوں کانگرس کو مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کا لحاظ رکھنا چاہیے پھر ہم اُنکو یہاں دہرانا غیر ضروری سمجھتے ہیں لیکن اسباب کو پھر زور سے کہتے ہیں کہ اگر انڈین نیشنل

کانگرس بالاستحقاق یہ دعوے کر سکتی ہے کہ "وہ ہندوستان کے .... ہر قوم اور ہر فرقے کی بہبودی کا خیال کرتی ہے اور وہ کسی خاص فرقے کی طرفدار نہیں ہے بلکہ تمام ہندی قوموں کی خیراندیش اور بہی خواہ ہے" تو اوسکو مسلمانوں کے حقوق کا خاص لحاظ رکھنا ہوگا ورنہ کانگرس کا یہ دعوی باطل سمجھا جائیگا - ہم بحیثیت مسلمان ہونے کے مشکور ہیں کہ کانگرس کے پچھلے اجلاس میں خدا جانے کس وجہ سے اس ہماری فروگزاشت کی تلافی کی جانب توجہ کی گئی تھی اور مسلمانوں کے قومی حقوق کا گونہ لحاظ رکھا گیا تھا۔ اسسال ایسا کیوں کیا گیا؟ یا تو اسکا باعث مسلمانوں کی ایک عرصے سے چیخ پکار ہو یا اسکا یہ باعث ہو کہ اس دفعہ کانگرس ایسے صوبے میں منعقد ہوئی تھی جو بلحاظ اثر کے مسلمانوں کا سینٹر مان لیا گیا ہے اور خاص ایسے وقت میں جبکہ مسلمان اپنی پولیٹکل خواہشات کے اظہار کے ذریعہ کی تلاش میں تھے کانگرس والوں نے مسلمانوں کے پرچانے کے واسطے انکے حقوق کی جانب اپنی توجہ دکھائی ہو۔ اُن بعض الظن اثم" اور اگر ہم تعلّی کی بات کو ناپسند نہ کریں تو عجب نہیں کہ منتظمین کانگرس پر ہماری اُس تحریر کا اثر پڑا ہو جو اُردو ئے معلی کے اگست و ستمبر ۱۹۰۸ء کی مشترک نمبر میں شایع ہوئی تھی، غرض کچھ ہی ہو نتیجہ ضرور مسلمانوں کی توجہ کو کانگرس کی جانب مائل کرنے والا ہے۔

اُوپر ہمنے لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے قومی حقوق کا گونہ لحاظ رکھا گیا تھا" اس فقرے میں ہمنے "لفظ گونہ" اسوجہ سے استعمال کیا ہے کہ ابھی اصولاً اور فروعاً بہت سی ایسی باتیں ہیں جنکے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ہنوز کانگرس میں پورے طور پر مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ اور اُن کی نگہداشت نہیں کیجاتی، مثلاً اصول انتخاب ہی کو لیجیے جو نیشنل کانگرس کی خواہشات کا جزو اعظم ہے بلحاظ فوائد مسلمانان ہند اوسوقت تک مستحسن نہیں سمجھا جائیگا جب تک کہ مسلمانوں کو یقین نہ ہوگا کہ ہم اکثر

بلحاظ نسبت آبادی وہ ہر جگہ انتخاب میں ضرور کامیاب ہوجائینگے خواہ اسطور پر کہ مسلمان
مسلمان کو منتخب کریں اور ہندو ہندو کو خواہ منتخب کنندہ کوئی بھی بلاتفریق ہوں
لیکن قواعد انتخاب ایسے وضع کئے جائیں کہ مسلمان بقدر اپنی نسبتی تعداد کے لازمی طور پر
منتخب ہوجایا کریں - اور یا اس سے بھی خوبصورت اور اتحاد بڑھانے والا یہ طریقہ ہے
کہ مسلمان ہندوؤں کو اور ہندو بلحاظ نسبت آبادی مسلمانوں کو منتخب کیا کریں اسطریقہ
سے نہایت عمدہ نتائج برآمد ہونگے اور ضرور ہندو مسلمانوں کی باہمی منافرت میں کمی
ہوگی، لیکن جب تک کہ کانگرس کی تجاویز، اُسکے کاغذات، اور اوسکی اسپیچوں میں
مذکورہ طریقوں میں سے کسی طریقے کی پوری تفصیل نہیں ہوگی مسلمان ایسے موہوم
انتخابی تجاویز کی جنسے وہ عملاً نقصان اٹھا چکے ہوں ہرگز تائید نہیں کرینگے -
مسلمان ایسی تجویز پر راضی نہیں ہونگے خواہ ایسی کسی تجویز کے موید مثل گزشتہ کانگرس
کے مسٹر فضل الحسن ہی ہوں جو اس ہماری رائے کو اپنی تنقید مندرجہ اُردوی معلیٰ اگست
ستمبر سنہ ۱۹۰۵ء میں پسند کرچکے تھے - یہ اس کی جائز خواہش ہے اور کانگرس اگر مسلمانوں
کو ہم خیال بنانے میں اپنا فائدہ سمجھتی ہے اور اونکو اپنا موید بنانا چاہتی ہے تو اسکو
ماننا پڑیگا اور ایسی تشریح کرنی پڑیگی جس سے مسلمانوں کو اطمینان ہوجائے کہ اصُول
انتخاب میں مثل سابق اونکے حقوق پامال نہیں ہونگے - صرف ہمارے ناشناسا
بھائی "مسلمان" کے نوٹ مندرجہ اُردوی معلیٰ شہر اکتوبر سنہ ۱۹۰۵ء میں یہ لکھدینے سے
کہ "ہر ایک چھوٹے بڑے عہدے کیلئے تعلیم کی شرط ہے اور مسلمان اُنمیں پورے نہیں
اُتر سکتے"، یا یوم اجرائے کونسل ایکٹ سے آجتک چند منتخب شدہ مسلمان ممبران کونسل
کے نام گنادینے سے جو بلحاظ نسبت اُس تعداد کے عشر عشیر بھی نہیں ہیں جو مسلمانونکو
کونسلوں میں حاصل کرنی چاہئے تھیں جبکہ ہم اُن ممبروں کی تعداد کو دیکھیں جو بذریعہ انتخاب
کونسلوں میں نشستیں حاصل کرچکے ہیں اور بڑا لطف یہ ہے کہ اُس نوٹ میں بڑی تجسس

اور ہوشیاری سے جو نام مسلمان ممبران کونسل کے گنائے گئے ہیں مع حاشیہ اڈیٹر
اُن کی کل تعداد پانچ سے نہیں بڑھ سکی، اگر بلحاظ آبادی بقیہ چار حصے دیگر اقوام کے
ممبران کونسل کی اور شامل کر دیئے جائیں تو منتخب شدہ ممبران کونسل ہائے ہند کی
کل تعداد پچیس ہوتی ہے۔ کیا ابتک یوم اجرائے ایکٹ کونسل ہائے ہند یعنی ۱۸۹۲ء
سے صرف پچیس ہی ممبر تمام ہندوستان کی کونسلوں میں منتخب ہوئے ہیں؟ اگر ایسا
ہی تو تو ہم مطمئن ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے اور یقینی نہیں ہے تو ہم ضرور زور سے کہینگے
کہ موجودہ طریقہ انتخاب بلحاظ فوائد مسلمانان ہند ضرور قابل ترمیم ہے، ہم دعوے
سے ہر صوبے میں ایسے لایق مسلمانوں کی کافی تعداد شمار کرا سکتے ہیں جو کسی طرح دیگر
اقوام کے منتخب شدہ ممبران کونسل سے قابلیت میں کم نہیں ہیں اور ممبری کونسل کی
پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور اُن کی قابلیت ملک اور سلطنت دونوں تسلیم کرتے
ہیں۔ وہ کیوں منتخب نہیں ہو سکے اُسی طریقہ انتخاب کے ناقص ہونے کے باعث۔
ہمنے مسلمانوں کی ممبری کونسل سے محروم رہنے کو جا بجا نہیں لکھا کہ ہم اوسکو صرف
ذاتی عزت ہی سمجھتے ہیں۔ نہیں بلکہ یہ لوگ اپنی قوم کی اصل رائے حکمران گروہ کے
کانوں تک پہونچانے کے اور اپنی قومی حقوق کی نگرانی کا (جنہیں بوجہ ناواقفیت
حکام وقت خلل آنے کا اندیشہ ہو) مابین رعایا اور سلطنت کے ایک آلہ ہوتے ہیں
اور جس قوم کے ہاتھ میں نے ایسی ضروری آلوں کی کمی ہو ضرور اوسکے قومی حقوق اور
حاجات ہر وقت معرض خطر میں ہیں، اگر ہمارے قائم مقام گروہ کی کافی تعداد وائسرائے
کی کونسل میں ہوتی تو پانچ سات برس تک عازمان حج کیوں قرنطینہ کی ناقابل برداشت
تکالیف اُٹھاتے، کیوں ریل کی واپسی ٹکٹ لینے کو مجبور کئے جاتے جنکے حصول
میں میدان حشر سے زیادہ تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے، کیوں فرسٹ سکنڈ اور تھرڈ کی طرح
نہ ہوتی یا کثرت سے ٹکٹ گھر نہ کھولے جاتے، کیوں گورنمنٹ یہ غلط خیال ذہن

نہیں کر لیتی کہ تمام حج کو جانے والے مسلمان تیسرے درجے ہی کے لوگ ہوتے ہیں اور گستاخی معاف کیوں سردار محمد حیات خاں مرحوم کے ہندی والے سوال کو لارڈ کرزن سرسری طور پر اوڑا دیتے اور کیوں باوجود سخت مخالفت اُن پرنس (یکے از خاندان شاہی اور وہ مرحوم جنکا نام مجھکو یاد نہیں رہا) کے جو اُس زمانہ میں والسرائے کی کونسل میں ممبر تھے (جب قانون حجاج پاس ہوا ہے) قانون مذکور میں بہت سے نقائص باقی رہجاتے جنکا ادنیٰ اثر موجودہ تکلیف وہ قرنطینہ ہے۔ یہ حالات صرف اسوجہ سے ہوئے کہ ہمارے قائم مقاموں کی کافی تعداد والسرائی اور گورنر بمبئی کی کونسلوں میں نہیں تھی دو ایک کے ہونے سے کچھ کام نہیں چلسکتا سلطنت بیچاری کیا کرے وہ اُسوقت تک ہماری ضروریات سے واقف نہیں ہوسکتی جب تک کہ اُنکو بتایا نہ جائے ہم اسی بتانے والے گروہ میں آزاد اور سچے قومی بہی خواہ مسلمانوں کی کافی تعداد دیکھنے کے آرزومند ہیں انڈین نیشنل کانگرس والوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم ہندی قوموں کی بہی خواہی کا دم بھرتے ہو تو انتخابی خواہشیں کرتے ہوئے مسلمانوں کے حقوق محفوظ رکھو یہ غریب بھی ہندوستانی ہی ہیں۔

اب ہم دسمبر ۱۹۰۵ء کے اجلاس کانگرس منعقدہ بنارس کی فیصل شدہ تجاویز پر سرسری نظر ڈالتے ہیں اور اُن کو مسلمانوں کے فوائد کے لحاظ سے مثل سالگذشتہ کے جانچتے ہیں۔

کانگرس کی پہلی پاس شدہ تجویز یہ ہے "یہ کانگرس بحیثیت قائم مقام جملہ اقوام گروہ و فرقہائے رعایا ہند کے دیر رائل ہائنس شاہزادہ اور شاہزادی پرنس ویلز کے ورود ہند پر اپنا ناچیز اور خیر خواہانہ خیر مقدم عرض کرتی ہے دیر رائل ہائنس نے باشندگان ہند کی نسبت جس تلطف آمیز خوش خیالی کا اظہار فرمایا ہے کانگرس نے اسکا گہرا اثر قبول کیا ہے اور اُسے یقین ہے کہ جو ذاتی معلومات اس سفر میں حاصل ہوئی ہیں

ان سے اس مربیانہ توجہ میں جو باشندگان ہند کی طرف مبذول ہے اور ترقی ہوگی کانگرس
بہت جوش کے ساتھ یہ امید رکھتی ہے کہ ویسرائے ہائنس بر از راہ مرحمت اعلیٰ حضرت
شہنشاہ ہند (دام اقبالہ) کے جناب میں اس کانگرس کی دلی التجا پیش کردینگے کہ جو
اصول حکمرانی ملکہ مرحومہ کے اعلان میں قائم کئے گئے ہیں وہ اس ملک کی گورنمنٹ میں
داخل کئے جائیں"۔ یہ وفادارانہ رزولیوشن ایسا ہے جس میں تمام مسلمان صدق دل سے نہ صرف
کانگرس کے ہمزبان ہو سکتے ہیں بلکہ ہمزبان ہیں ہاں اسکا پہلا حصہ "خوش آمدید" رزولیوشن
میں بے موقع ہے اگر اسکی ضرورت ہی سمجھی گئی تھی کہ حضور صاحب عالم سے التجا کی جائے
کہ حضور قیصر ہند دام اقبالہ کی درگاہ میں یہ گزارش پیش کریں تو اسکو جداگانہ رزولیوشن
بناکر پاس کرنا تھا اس حصے کے شامل ہوجانے سے رزولیوشن کا لطف جاتا رہا جس کی
بنا محض وفاداری سمجھی جاتی اگر یہ حصہ نہ ہوتا۔

بنارس کانگرس کا دوسرا رزولیوشن یہ ہے" اس کانگرس کی رائے میں وہ وقت
آگیا ہے کہ سپریم اور پراونشل کونسلوں میں اصلاح کیجائے، تاکہ وہ ملک کا بہتر قائم مقام
ہوسکیں اور غیر سرکاری ممبروں کو معاملات ملکی میں واقعی اور حقیقی مداخلت حاصل
ہو۔ کانگرس سفارش کرتی ہے کہ غیر سرکاری اور منتخب شدہ ممبروں کی تعداد بڑھائی
جائے اور انہیں اختیار دیا جائے کہ ان مسائل پر جو اونکے روبرو پیش ہوں کونسل
کو اظہار رائے پر مجبور کرسکیں حاکم اعلیٰ مجاز ہو کہ کونسل کی کسی فیصلہ کو مسترد کردے"
یہ رزولیوشن صرف ایسے الفاظ کی ایزادی کا محتاج ہے جس سے مسلمانوں کا نسبتی حق
ممبری محفوظ ہوجائے جسکے بعد مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس تجویز کی تائید کریں۔

۳- تیسری تجویز جسکی کانگرس سفارش کرتی ہے متعلق صیغہ آبکاری ہے مسلمان
کانگرس کی تائید میں اس سے بھی بڑھکر اگر منظوری کی امید ہو تو یہ خواہش کرسکتے ہیں
کہ ان مخرب اخلاق اشیاء کا ہندوستان سے وجود ہی مٹا دیا جائے۔ ورنہ کم از کم کانگرس

کے رزولیوشن کی سفارشیں تو منظور ہی کیجائیں۔

۵۔ چوتھے رزولیوشن کے الفاظ یہ ہیں "اس کانگرس کی رای میں وقت آگیا ہو کہ باشندگان ہند کو ملک کے انتظام اور نگرانی میں زیادہ حصہ دیا جائے۔ اور یہ غرض اسطرح حاصل ہوسکتی ہے کہ (الف) ہندوستان کے ہر صوبے کو اختیار دیا جائے کہ برٹش ہاؤس اوف کامنس میں کم از کم دو ممبر بھیجیں (ب) کم از کم دو ہندوستانی جن کی لیاقت اور تجربہ مسلم ہو سکرٹری اوف اسٹیٹ کی کونسل میں ممبر مقرر کئے جائیں (ج) گورنر جنرل کی اگزیکٹو کونسل میں دو ہندوستانی ممبر مقرر ہوں اور اسیطرح گورنران مدراس اور بمبئی کی کونسلوں میں ایک ایک ہندوستانی مقرر ہو" اسمیں بھی ایسی ترمیم کی ضرورت ہی جس سے مسلمانوں کا نسبتی حق محفوظ ہوسکے ورنہ بغیر اس ترمیم کے مسلمان اس تجویز کے عمل میں آنے سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

۶۔ پانچویں تجویز بعینہ بمبئی کانگرس کی پہلی تجویز ہے جسکے متعلق بلحاظ فوائد مسلمانان ہماری بھی پہلی رائے ہے کہ یہ تجویز ایسی صورت میں مسلمانوں کے مفید مطلب ہوسکتی ہو کہ اسمیں ضمن (ب) کے ان الفاظ کے آگے "اعلیٰ خدمات پر ہندوستانی مقرر کئے جائیں" یہ الفاظ بڑھا دئے جائیں "بلحاظ نسبت آبادی ہندو مسلمانوں کا خیال رکھتے ہوئے" اس اضافہ کے بعد مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس تجویز کی تائید کریں۔ ہم یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو رعایتاً ملازمتیں دیجائیں بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور قابل آدمیوں کو جگہہ ملنی چاہیے اور اگر امتحان مقابلہ کے ذریعے سے کوئی ملازمت ملے تو اسمیں شریک ہونے کا بھی مسلمانوں کو موقع ملنا چاہیے یعنی امیدواردن امتحان اسطرح سے نامزد کئے جائیں جسمیں مسلمانوں کی نسبتی جگہ محفوظ رہسکے اگر مسلمان اُس تعداد سے کم کامیاب ہوں تو اور مسلمانوں کو شرکت امتحان کا موقع ملنا چاہئے تاانکہ مسلمانوں کی جگہیں بھر جائیں یا لائق مسلمان دستیاب نہ ہوں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ مسئلہ

لوکل کانگرس میں طے ہونا چاہئے" مگر ابھی نصف سے زیادہ ایسے صوبے ہیں جنہیں لوکل کانگرسیں
ندارد ہیں پھر آل انڈیا کانگرس میں اسکی چارہ جوئی نہ کیجائے تو کیا کیا جاے ہماری (مسلمانونکی)
حقوق ملازمت تو اب سلب ہو رہے ہیں لوکل کانگرس بننے کا انتظار کریں تو کیسے ایک
بدرالدین طیب جی صاحب بنگئے تھے اب ہندوستان کی ہائی کورٹوں میں مسلمانوں کا صفر
رہگیا آخر کیوں کانگرس اس جانب توجہ نہیں کرتی کیا بمبئی کلکتہ الہ آباد میں ایک بھی اس
قابل مسلمان نہیں ہے جسکو بنچ پر بیٹھنے کی قابلیت ہو؟ نہیں نہ صرف بار میں بلکہ
سرکاری ملازموں میں اب بھی بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو بنچ میں بیٹھنے کی پوری لیاقت
رکھتے ہیں لیکن اُن کی کہنے والا کون ہے۔

۹۔ چھٹے رزولیوشن کی تائید مسلمانونکو کرنی چاہئے وہ ضروری اور مفید ملک تجویز
ہے جسکا نسبتاً فائدہ مسلمانوں کو بھی پہونچیگا اور وہ تجویز یہ ہے "یہ کانگرس گورنمنٹ کی اس
کارروائی کی قدر کرتی ہے کہ اس نے گزشتہ مارچ میں بجٹ کا ایک حصہ ان امور پر
صرف کیا جن کی کانگرس نے سفارش کی تھی۔ مگر ساتھ ہی کانگرس کی یہ رائے ہے کہ جو مالی
سبکدوشی ادا کنندگان ٹیکس کو دیگئی ہے وہ بہت ہی ناکافی ہے اور کانگرس کو افسوس ہے
کہ گزشتہ بجٹ سے فائدہ اُٹھا کر فوجی اخراجات بہت بڑھا دئے گئے ہیں بعض محکموں میں
یوروپین افسروں کی تنخواہوں میں ترقی کی گئی ہے اور بہت سے نئے عہدے انکے لئے
قائم کئے گئے ہیں۔ کانگرس باصرار یہ درخواست کرتی ہے کہ آئندہ جو بجٹ ہو وہ
ٹیکسوں کے کم کرنے میں صرف کیجائے اور بعد ازاں ایسے کاموں میں صرف ہو جس سے
بلاواسطہ باشندگان ہند کو فائدہ پہونچے مثلاً سائنٹیفک صنعتی زراعتی تعلیم گاہوں کا
قائم کیا جانا طبی امداد میں آسانی پیدا کرنا میونسپل اور لوکل بورڈوں کو مدد دینا
کہ اشد ضروری انتظامات حفظان صحت کی اصلاح اور ترقی وسائل آمد و رفت وغیرہ
میں صرف کر سکیں۔

۱۰۔ ساتویں تجویز جسکو بنارسی کانگرس نے منظور کیا ہے یہ ہی۔ (الف) یہ کانگرس بہت وثوق سے اپنے اعتراض کا اعادہ کرتی ہے کہ فوجی اخراجات کی مسلسل ترقی غیر ضروری غیر منصفانہ اور باشندگان ہند کے حد برداشت سے باہر ہے (ب) یہ کانگرس صاف طور پر ظاہر کرتی ہے کہ چونکہ اس ملک کی فوجی اخراجات صرف اسی ملک کے فوجی ضروریات اور اغراض پر لحاظ کرکے قرار نہیں دیجاتے بلکہ مشرق میں برٹش پالیسی کے خیالات بھی مدنظر ہوتے ہیں اسلئے انصاف یہ ہے کہ ایک مناسب حصہ اس خرچ کا خزانہ انگلستان اور کل سلطنت کو برداشت کرنا چاہیے نہ یہ کہ سارا خرچ سلطنت کے ایک ہی حصہ پر ڈالدیا جائے جو سب سے زیادہ غریب اور سب سے زیادہ اس بوجھ کے برداشت کرنیکے ناقابل ہے ہم اب بھی اس اصول کو نادان کی دوستی سمجھینگے کہ فوجی ترقی روکنے کی سرکار کو صلاح دیجاوے اور فوجی اخراجات کی مسلسل ترقی "غیر ضروری" بتائی جائے جبکہ دیگر ایشیائی طاقتیں جو بزعم خود ہندوستان پر دانت تیز کرتی ہیں پہلے سے زیادہ طاقتور اور زبردست ہو گئی ہیں جن کی [illegible] کو تمام دنیا خطرے کی نظر سے دیکھتی ہے ہاں اسمیں شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان فوجی طیاری کا بار غریب ہندوستان کو خزانے پر ڈالنا ضرور نامناسب ہے خاص کر جبکہ اُن اخراجات کی بیشی کی حقیقی غرض ایشیا میں برٹش تفوق ہو تو لازم ہے کہ خزانہ انگلستان ہی اس خرچ کے بڑے حصے کا متحمل ہو۔

۱۱۔ کانگرس بنارس کا آٹھواں پاس شدہ رزولیوشن۔ "ہندوستانی تارکان وطن ساکن جنوبی افریقہ کی حفاظت حقوق" کے متعلق ہے۔ مسلمانان ہند کو اسکی پوری طور پر تائید کرلی چاہیے۔

۱۲۔ جبکہ لارڈ کرزن گئے سے والسرائے جنھوں نے اپنے دوران حکومت میں کانگرس کی بیخ کنی کو اپنا فرض اعلیٰ سمجھ لیا تھا اس بات کے اعتراف کرنے سے گریز نہ کرسکے کہ جڈیشل اور ایگزیکٹو اختیارات کی علیحدگی کا نیشنل کانگرس نہایت مناسب مشورہ

دیتی ہے اور جبکہ آئے دن اس گڈمڈ اختیارات کے چکر میں ہندو مسلمان دونوں بعض اوقات نقصان اُٹھاتے رہتے ہیں پھر کیوں مسلمان بنارس کانگرس کی نویں فیصل شدہ تجویز کی تائید سے چشم پوشی کریں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایگزیکٹو اختیارات کو جوڈیشل اختیارات سے پوری پوری طور پر جدا کرنیکی فوری ضرورت ہے۔

۱۳ اصلاح پولیس کا رزولیوشن جس کا ترجمہ کہ ۱۹۰۵ء کی کانگرس نے پاس کیا ہے ٹھیک ہے

۱۴ کانگرس کی تجویز متعلق تقسیم بنگال یہ ہے "یہ کانگرس اس امر پر اعتراض کرتی ہے کہ تمام صوبہ کے ایسی سخت مخالفت کے باوجود تقسیم بنگال عمل میں لائی گئی بدیں خیال کہ تمام بنگالی قوم میں ان کے صوبہ کی تقسیم کے سبب سے سخت ناراضی پھیلی ہوئی ہے اور وہ اس تقسیم کو مکمل بے انصافی تصور کرتے ہیں۔ یہ کانگرس گورنمنٹ ہند اور سکریٹری آف سٹیٹ سے اپیل کرتی ہے کہ وہ موجودہ انتظام کو بدل دیں یا اس میں کچھ ایسی ترمیم کریں کہ عام رائے کو طمانیت حاصل ہو اور جو اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے وہ کم ہو۔ یہ کانگرس سفارش کرتی ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ جس سے انتظامی خوبی بھی قائم رہے اور تمام بنگالی قوم ایک حکومت کے تحت میں رہے" جبکہ یہ بات عملاً ثابت ہوگئی کہ تقسیم بنگال سے مسلمانان بنگال کو بلحاظ اُن کے شمول گورنمنٹ سروس یا کسی اور لحاظ سے زیادہ فائدہ نہیں ہوا اور جبکہ مخالفت تقسیم میں مسلمانوں کے نام بھی پائے جاتے ہیں پھر مسلمانوں کو اس تجویز کی تائید میں کوئی بڑا ہرج نہیں معلوم ہوتا لیکن دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو مسلمان باشندگان بنگال کی رائے کی تابع ہونا چاہیے۔

۱۵ کانگرس کا بارھواں رزولیوشن یہ ہے کہ یہ کانگرس اپنا سچا اور پُر زور اعتراض حکام کی اُن جابرانہ کارروائیوں پر پیش کرتی ہے جو اُنہوں نے بنگال میں اختیار کی ہیں۔ باشندگان بنگال کے پاس جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو اُنہوں نے غیر ملکی مال کے خلاف ہڑتال

کی کیونکہ یہی ایک باضابطہ اور بااثر ذریعہ اُنکے پاس باقی رہگیا تہا جس سے وہ برٹش پبلک کے خیالات
کو گورنمنٹ کی تقسیم بنگال کے مصمم ارادہ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں جو اُس نے باشندوں کی
عالمگیر استدعا کے خلاف اختیار کیا تہا" افسوس اور تعجب ہوتا ہے کہ نیشنل کانگرس
کا سا مجمع جو اعلیٰ درجے کے عقلا تعلیم یافتہ، مہذب - متین - سمجہدار اور تعلیم یافتہ ہوتی کے
ہندوستانیوں کا ایک گروہ ہونیکا مدعی ہے اُس نے یہ تجویز پاس کی! کیا اس تجویز
کے الفاظ میں متانت پائی جاتی ہے ؟ کیا اس تجویز سے کانگرس کی وقار پر خراب اثر
نہیں پڑتا میں صرف بحیثیت مسلمان ہونیکے بلکہ بحیثیت صرف ایک ہندوستانی ہونیکے
کسی ہندوستان کے باشندہ کو اس تجویز کی تائید کا مشورہ ہرگز نہیں دونگا - اس تجویز
کے دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ سودیشی کی سی مقدس اور مفید تحریک کی بنا نیک نیتی
اور ملکی مفاد پر نہیں ہے بلکہ محض ہٹ دہرمی اور ضد پر ہے جو تقسیم بنگال کے باعث
پیدا ہوئی ہی جسکا صاف نتیجہ یہ ہے کہ اگر گورنمنٹ تقسیم بنگال کی تجویز کو واپس لے
لے تو ہماری عارضی الفت دیسی صنعت سے رخصت ہوجائیگی کیا کوئی بہی خواہ
ملک اتنا عظیم الشان نقصان گوارا کریگا! مسلمان یہی تو کہتے ہیں کہ کانگرس کو اپنی
تجاویز میں اعتدال سے باہر نہیں ہوجانا چاہیے اور متانت اور بردباری کو ہاتہ
سے نہیں کہونا چاہیے - ایسی تجاویز سے کانگرس کے مجمع کی نہ صرف ہندوستان
بلکہ دیگر مہذب ممالک میں خفت اور سبکی پیدا ہونیکا اندیشہ ہے جس سے ہر بہی خواہ ملک
کو رنج اور افسوس ہوگا - کاش صرف اس تجویز کا ابتدائی جزو کانگرس میں پیش ہوتا -
ہم اہل کانگرس سے چاہتے ہیں کہ وہ آیندہ جلسہ کانگرس میں اس تجویز کو واپس لیں
سنہ۱۶ کانگرس کا تیرہواں رزولیوشن کانگرس کی تاریخ میں جہانتک ہماری یاد کام
کرتی ہی اپنی قسم کا پہلا رزولیوشن ہی جسکے الفاظ یہ ہیں " اس کانگرس کی رائے ہے
کہ جو پانچ روز کا قرنطینہ حاجیوں پر بمبئی میں لگایا جاتا ہے وہ بلا وجہ کی زحمت ہے

اور علاوہ وقت کے بے اطمینانی پیدا کرنیکا باعث ہے۔ قانون بین الاقوام کے رو سے دس روز کا قرنطینہ کامران میں ہوتا ہے اسلئے کانگرس کی رائے ہے کہ جو قرنطینہ بمبئی میں ہوتا ہے وہ یک قلم موقوف کیا جائے۔ یہی وہ تجویز ہے جسکے باعث مسلمان کانگرس کی جانب کن انکھیوں سے دیکھنے لگے ہیں اور کانگرس کی توجہ مسلمانوں کی ایسی ضروری خواہش کی جانب مبذول ہونے کو نظر استحسان سے دیکھ رہے ہیں۔ خواہ البشیر کتنے ہی غیظ و غضب کا اظہار کرے اور ملا عبد القیوم کے سے واجب التعظیم اور قابل ادب بزرگ کی شان میں کیسے ہی نا ملائم الفاظ کا بیجا طور پر استعمال کرے لیکن درحقیقت ایسے ضروری مسئلے کی جانب کانگرس کی توجہ منعطف کرانے سے ملا صاحب موصوف نے نہ صرف مسلمانوں کی گردنوں کو مرہون منت کیا ہے بلکہ خود کانگرس پر بڑا بھاری احسان کیا ہے جسکو بتایا ہے کہ اس قسم کی مسلمانوں کی حاجات ہیں جن کی طرف اگر کانگرس اپنی توجہ منعطف کرتی رہے تو ایک حد تک مسلمانوں کو اپنا بنا سکتی ہے، گو ملا عبد القیوم صاحب نے حجاز ریلوے کے فنڈ جمع کرنے میں اپنی زندگی وقف کر کے جائز طور پر گروہ لیڈران قوم مسلمانان میں اپنا نام پیش کیا ہے لیکن حاجیوں کی تکالیف کی طرف متوجہ ہو کر بذاتہ قرنطینہ کی تجویز کانگرس میں پیش کر کے اپنی عزت و وقار کو نہ صرف مسلمان پبلک میں بلکہ تمام ہندوستان کی قوموں کی نظر میں دوبالا کر دیا ہے ہمارے عنایت فرما البشیر اگر بمبئی میں ہوتے اور حجاج کی تکالیف کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو یقین ہے کہ ملا عبد القیوم صاحب کی اور بہت بڑھاتے۔ بہرحال ہم ملا صاحب کے دل سے ممنون ہیں جو ایسی ضروری تجویز کے کانگرس میں پیش ہونے کے باعث ہوئے اور آنریبل مسٹر پارکھ اور دیگر ممبران کانگرس کی بھی تعریف کرتے ہیں کہ انہوں نے مبتلائے مصیبت غریب حجاج کی دردناک حالت کی جانب اپنی عادل گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی اور اوسکو سچے اور اصلی واقعات سے آگاہ

کیا ہم نہ صرف اس تجویز کی تائید کرتے ہیں بلکہ ادب اور عاجزی کے ساتھ گورنمنٹ عالیہ سے استدعا کرتے ہیں کہ بقدر جلد ممکن ہو مسلمانوں کو ان تکالیف سے نکالے اور نہ صرف بمبئی بلکہ کل ہندوستان سے قرنطینہ موقوف کرکے مفلوک حجاج کو دلال اور شقی القلب لٹیروں کی دست برد سے نجات دے۔

۱۷ بنارس کانگرس کی چودہویں پاس شدہ تجویز صرف ایک الفاظ کی زیادتی کی محتاج ہے جس سے بوقت انتخاب پنجاب مطلوبہ وسیع شدہ کونسل میں مسلمانوں کی تعداد اُن کی نسبت سے کم نہ ہوسکے ایسی ترمیم کے بعد مسلمان ضرور اس تجویز کی تائید کرینگے۔

۱۸ افسوس ہے کہ کانگرس کی پندرہویں تجویز پاس کرنے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور ہندوستان ابتک جب التعظیم گرینڈ اولڈ مین کی پارلیمنٹری خدمات سے محروم رہا۔ کاہر ایک ہندوستانی کو دل سے تعلق ہونا چاہئے اور اس تجویز کے الفاظ کا بیان دہرانا لاحاصل ہیں۔

۱۹ بیشک مسٹر گوکھلے اور لالہ لاجپت رائے ہندوستان کی اُن خدمات کے باعث جو اُنھوں نے پچھلی مشن میں انگلستان جاکر انجام دیں ہر ہندوستانی کی جانب سے ہزار شکریہ کے مستحق ہیں خصوصاً مسٹر گوکھلے۔ پس ہم ہر مسلمان کو کانگرس کی سولھویں تجویز کی تائید کرنیکا مشورہ دینگے۔

۲۰ کانگرس کی سترہویں تجویز یہ ہے "چونکہ ضرورت ہے کہ کانگرس کی اہم مسائل کی طرف موجودہ وقت میں انگلستان کی ذمہ دار عہدہ داروں کی توجہ منعطف کرائی جائے۔ اسلئے یہ کانگرس اپنے پریزیڈنٹ مسٹر گوکھلے کو مقرر کرتی ہے کہ ہندوستان کی وکالت کا کام انجام دیں۔ مسٹر گوکھلے کی قومی خدمات ضرور اُنکا اعتبار ہندوستانیوں کی دلوں میں بڑھاتی ہیں اور یہ تجویز قابل تسلیم ہے۔

۲۱ اٹھارہویں تجویز میں بلحاظ نسبت آبادی ایک مسلمان ممبر کی کمی ہے۔
۲۲ انیسویں تجویز میں ایک جنٹ سکرٹری نواب سید محمد کو ہونا چاہئے تھا۔

۲۳ بیس اکیس اور بائیسویں تجویز ضابطے کی تجویزیں ہیں اور ٹھیک ہیں۔

۲۴ اگر کانگرس ہمارے مذکورہ ترمیمیں اپنی تجاویز میں کردے اور تھوڑی توجہ اور مسلمانوں کی خاص حقوق کی حفاظت کی جانب مائل کردے اور کسی نئی تجویز کے پیش کرتے وقت مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ رکھا کرے تو یقین ہے کہ بہت جلد باہمی اختلافات مٹ سکتا ہے اور مسلمان کانگرس کے ساتھ ہمدردی کرسکتے ہیں ہم تو اپنا فرض پورا کرچکے اب کانگرس کے سرگروہ جانیں۔ اس سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی کے باعث کانگرس کو بہت نقصان پہونچ رہا ہے کانگرس کو اُن کی شکایات کی جانب اپنی توجہ مائل کرنی چاہئے اور اُنکے دفعیے کی کوشش کرنی چاہئے فقط

محمد موسیٰ خاں دتاولی ضلع علی گڑھ

انتخاب بیاض

(حضرت انور شمس بھوپالی)

سعدی شیرازی

ساربان آہستہ رو کآرام جان در محمل است — اشتران را بار بر پشت است ما را بر دل است

شاپور طہرانی

نہ گل چیدم ازیں بستان نہ نام یاسمن بردم — دلی پر درد از غوغای مرغان چمن بردم

فغانی شیرازی

چہ باشد عاشقی خود را بغمہا مبتلا کردن — بصد خونِ جگر بیگانہ را آشنا کردن

ملک قمی

اگرچہ مجلس مستان تہی ز غوغا نیست — ولیک صحبت شان خالی از تماشا نیست

گل محمد خاں ناطق مکرانی

بکف تیغ جفا باز آں وفا بیگانہ می آید — شفاعت پیشگان رحمی کہ بیرحمانہ می آید

ملا محمد طاہر غنی کشمیری

عاشقاں را جنبش مژگاں چشم یار کشت — عالمی را اضطراب نبض ایں بیمار کشت

حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی

دل گرفتند و ز دلدار نشانم دادند — آنچہ بردند ز من بہتر از آنم دادند

ہنر ور خاں عاقل دہلوی

بسکہ میدارد حیا در پردہ محبوب مرا — پردہ دیدہ بیگانہ داند مہر مکتوب مرا

نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیہ بھوپال

افتاد نہ گذر آں سرو رواں را — من مردہ خوشم زیست مبارک دگراں را

میرزا اسملی ہروی

غایت نا [illegible] کہ [illegible] رسوائی را — اگر از یار بپرسند مرا نشناسد

مستورہ کردستانیہ

ہر کس بدلا راست دارد سر سودائی — تو شوخ پری پیکر آرام دل مائی

شاعرہ نہانی قائنی

ہمچو من برخ خوباں نظر پاک انداز — ہر کجا دیدہ آلودہ بود خاک انداز

نہانی اکبرآبادیہ

روز غم شب درد بے آرام پیدا کردہ ام — درد مند یا درین ایام پیدا کردہ ام

شاعرہ نسائی

بعالم ہر کرا بینی بدل دردو غمی دارد — ز دست غم منال ای دل کہ غم ہم عالمی دارد

شرر و سرشار

حکیم برہم صاحب گورکھپوری نے اگست و ستمبر کے اُردوی معلیٰ میں حیرت انگیز قابلیت و نکتہ سنجی سے شرر و سرشار کا موازنہ کیا ہی جسمیں آپنے حضرت شرر کو ایسا آسمان پر چڑہایا ہے کہ بیچارے سرشار کا نام تک اُن کے مقابل میں لیا جانا روا نہیں رکھتے۔ اُن کے مضمون کا لب لباب یہ ہی کہ سرشار کا اُردو لٹریچر کے گردن پر کوئی احسان نہیں ہی۔ بہتر ہوتا کہ ایسا مضمون لکہنے کے قبل حکیم صاحب نے یہی دیکھ لیا ہوتا کہ ان سے زیادہ قابل نقادوں نے جن میں شیخ عبد القادر بی۔ اے بھی ہیں زبان اردو میں سرشار کا کیا درجہ قائم کیا ہی۔ یہ واضح رہے کہ اُردو شعرا یا اُن کی شاعری پر ہر صحیح المذاق اُردو دان رائے زنی کر سکتا ہی۔ مگر اُردو ناول پر کچھ لکھنے کی جوابدہی وہی شخص لے سکتا ہے جو کم از کم انگریزی زبان کے مشہور ناولسٹوں کی تصانیف سے حظ وافی رکہتا ہو۔ اس لحاظ سے شیخ صاحب کی تنقید حکیم صاحب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وقیع ہے۔ علاوہ بریں مسٹر چکبست نے سرشار کے حالات و تصنیفات پر جو تنقید لکھی تہی اور جس نے برہم صاحب کو ایسا برہم کر دیا۔ اُسمیں شرر کا تذکرہ محض ضمناً آیا تہا اُسکے پڑھنے سے یہ مترشح ہوتا ہی کہ لکھنے والا واقعات لکھکر اُن پر رائے زنی کرتا جاتا ہی خواہ کسیکو اچہا لگے یا بُرا۔ اُسکا منشا یہ ہرگز نہیں کہ کسیکا دل دکھائے۔ برعکس اسکے حکیم صاحب کا مضمون اوّل سے آخر تک محض دل دکہانیکے لئے اور ایک خداداد قابلیت کے مصنف کو مٹانے کے لئے لکھا گیا ہی۔

مسٹر چکبست کا مضمون تنقیدی تھا۔ اُسمیں سرشار کے محاسن کے ساتھ ساتھ انکی معائب بہی روشنی ڈالی گئی تہی مگر حکیم صاحب نے سرشار کی خامیاں تو سب کی سب دکہا دیں گو فرضی ہی سہی۔ مگر شرر کو مرفوع القلم سمجھا۔ حالانکہ عوام پر ظاہر ہے کہ آجتک کوئی شخص ایسا نہیں گذرا

جسمیں خوبیوںکے ساتھ برائیاں نہ پائی جائیں۔

ہم حکیم صاحب کے کہنے سے اسبات کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت شرر عربی کے فاضل علامہ فارسی کے عالم اجل۔ اور ہمہ دانی میں یگانہ روزگار ہیں۔ انکو متعدد السنہ یورپ پر بھی عبور حاصل ہو ڈکشنری کی مدد سے ترجمے کرسکتے ہیں اور اردو نثر میں تو ایک نئے رنگ کے موجد اور موجودہ لٹریچر کے بانی ہیں۔ اور کوئی انکے گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ برعکس اسکے غریب سرشار فارسی میں کچا اور عربی میں امی محض ہے۔ تاریخ جغرافیے سے اسکو مطلق مس نہیں۔ اور السنہ یورپ کا کیا ذکر۔ اردو میں بھی کافی دستگاہ نہیں رکھتا۔ مگر ہمکو اسوقت ان بزرگواروں کی ذاتی کمالات سے بحث نہیں۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ فسانہ نگاری کے میدان میں کس کا قلم طرارے بھرتا ہے۔ اور اس فن سے کون زیادہ ماہر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ ناول نویسی اور بات ہے۔ اور فاضل ہونا دوسری بات۔ بعینہٖ اسیطرح یہے شاعری کا حال ہے۔ گولڈسمتھ شیلی۔ بائرن کے سے نامی گرامی شعرا اپنے کالج کے رانده درگاہوں میں تھے۔ اسیطرح تھیکری اور ڈکنس علمیت و جامعیت کے لحاظ سے اپنے وقت کے او رعلما سے کہیں کمتر تھے۔ مگر فسانہ کے آسمان پر یہی دونوں نام تارے ہو کر چمکے اور جو روش انہوں نے اختیار کی اور جس رنگ کا انہوں نے رواج ڈالا اسکے مقلد بھی آج مشکل سے نظر آتے ہیں۔

الفاظ "فسانہ" "ناول" ہمکو اس الوکھے امتیاز کی یاد دلاتے ہیں جو حکیم صاحب نے ان کے مابین رکھا ہے۔ حکیم صاحب کو معلوم ہوگا کہ ناول انگریزی لفظ ہے اور اگر اسکا اردو ترجمہ ہو سکتا ہے تو فسانہ ہے۔ لفظی حیثیت سے دونوں میں کچھ فرق نہیں۔ مگر مفہوم کے لحاظ سے البتہ نمایاں فرق ہے۔ ناول اس فسانہ کو کہتے ہیں جو زمانہ کا جسکا وہ تذکرہ کر رہا ہو صاف صاف چربہ اتارے۔ اور اسکی رسم و رواج۔ مراسم آداب۔ طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے۔ اور ما فوق العادت واقعات کو دخل نہ دے۔ یا اگر دے تو ان کی تاویل بھی ایسی خوبی سے کرے کہ عوام ان کو واقعہ سمجھنے لگیں

اسی کا نام ہی ناول۔ یا فسانہ بہ طرز جدید۔ فسانہ عجائب۔ یا گل بکاولی۔ یا قصہ ممتاز۔ یا داستان امیر حمزہ۔ یا طلسم ہوشربا۔ یا بوستان خیال سب پرانے ڈھنگ کے قصے ہیں جنمیں جدید فسانہ کی خوبیوں کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ہاں میر امن دہلوی کی مقبول عام کتاب باغ و بہار یا داستان الف لیلہ ایک حد غیر محسوس تک مرقومہ بالا خوبیاں رکھتی ہیں یعنی اپنے زمانہ کی تہذیب پر ایک نہایت دُھندلی روشنی ڈالتی ہیں۔

اس معیار کو پیش نظر رکھکر اگر سرشار کے فسانوں کو دیکھئے تو ایسی کون سی خوبی ہے جو اُمیں بدرجہ اتم موجود نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اُن کی سب کتابیں اپنے زمانہ کی سچی تصاویر ہیں۔ اگر آج سے سو برس بعد کوئی شخص فسانہ آزاد کا مطالعہ کرے تو اُسکو آج سے پچیس برس پہلے کی تہذیب و روش خیالات و مذاق عامہ کی جھلکیاں صاف نظر آئینگی۔ جو تاریخ کے مطالعے سے۔ چاہے وہ کیسا ہی وسیع و دقیق کیوں نہو۔ ہرگز نہیں نظر آسکتیں۔ طرز تمدن کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسپر سرشار کی زبان نے اپنے نرالے انداز سے گلفشانی نہ کی ہو حتی کہ مداریوں کے شعبدے۔ بھانڈوں کی نقلیں، ساقن کے غمزے اور ایسی ہی بیشمار باتوں کی تفصیل میں بھی کمال مصوری دکھایا ہے خلاصہ یہ ہے کہ "تصویر زمانہ" جتنے جزئیات پر حاوی ہے اُن سب پر سرشار کے طلسمی قلم نے جادو طرازی کی ہے۔

برعکس اسکے حضرت شرر کے جو ناول مشہور ہیں وہ کوئی تو صلیبی لڑائیوں کے زمانہ کا ہے کوئی محمود غزنوی کے حملے کے زمانہ کا کوئی روس و روم کی لڑائی کے وقت کا۔ کوئی اوس زمانہ کا جب مسلمانوں کے قدم اسپین سے اُکھڑ چکے تھے۔ الغرض سبھی ناظر کو دو دو پانچ پانچ صدیاں پیچھے لیجاتے ہیں۔ اور چونکہ حضرت شرر کو ان باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اسلئے وہ اُسوقت کے واقعات کی ایسی تصویریں ہرگز نہیں کھینچ سکتے جو اصل سے مطابقت رکھے۔ اُن کی معلومات کا سب سے زرخیز ذریعہ تاریخ ہے۔ اور تاریخی معلومات چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہوں ذاتی و عینی شاہدے سے لگا نہیں کھا سکتیں۔ آلفرڈ لائل جو ایک مستند انگریزی نقاد ہے لکھتا ہے کہ آجتک کسی ناول

نویس کو تاریخی ناول لکھنے میں کامیابی نہیں حاصل ہوئی اور نہ اسکا حاصل ہونا ممکنات سے ہے۔ ایک ایسے زمانہ کے خیالات و واقعات کا فوٹو اُتارنا جسکو گذرے صدیاں گذر گئیں سراسر قیاسی امر ہے۔ ہم یہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسی حالتوں میں ایسا ہوا ہوگا۔ یقینی طور پر یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ ایسا ہوا۔ جارج الیٹ نے اپنی ساری عمر میں ایک ہی تاریخی ناول لکھا جسمیں اٹلی کا ایک تاریخی واقعہ بیان کیا۔ اور گو کئی ماہ تک اُنہوں نے وہاں کی طرز معاشرت کا مطالعہ کیا۔ اور جتنی مستند تاریخیں وہاں کے کتب خانہ میں دستیاب ہو سکیں اُن کو غور سے پڑھا تاہم رومولا کے نسبت انگریزوں کا خیال ہے کہ وہ واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ سر والٹر اسکاٹ جسکی حضرت شرر نے تقلید کی ہے تاریخی ناولسٹوں کا سرتاج خیال کیا جاتا ہے مگر باوجودیکہ اوسکا تخیل بہت روشن تہا اور قوت بیانیہ نہایت پر زور تاہم اوسکے تاریخی ناول انگریزی مبصرون کی نگاہ میں نہیں جچتے اُسکے رچرڈ یا سلطان صلاح الدین بالکل نقلی معلوم ہوتے ہیں۔ لائل نے صاف صاف لکھدیا ہے کہ اسکاٹ کے صلاح الدین میں بجز ایک دستار کے اور کوئی عربی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔ چاہے زبان کا رنگ قدیم بنایئے، چاہے اپنے کیرکٹروں کو پُرانے لباس سے سجایئے، چاہے اپنے سپاہی پُرانے وضع کے اسلحہ سے مسلح کیجیے۔ مگر کسی گذشتہ واقعہ کی سچی تصویر کھینچنے میں ہرگز کامیابی نہوگی۔ جب اسکاٹ اور جارج الیٹ کے سے جادو نگار بھی تاریخی ناول کامیابی سے نہیں لکھ سکتے تو حضرت شرر غیر مکمل تاریخوں کی مدد سے جس حد تک ایسے ناولوں کے لکھنے میں سرخرو ہو سکتے ہیں اُسکا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک امر مسلم ہے کہ خیال کبھی مشاہدے کا ہموزن نہیں ہو سکتا۔ سرشار نے پہلے ہی سے ان دقتوں کا اندازہ کر لیا اور جس ترغیب میں پڑکر اوروں نے اپنی محنت رائگاں کی اُس سے محترز رہا۔ حضرت شرر اسکاٹ کی تقلید کے جوش میں بالکل بہول گئے اور وہی غلطی کر بیٹھے۔

مگر جب حضرت شرر کے اُن ناولوں کو دیکھیے جسمیں اُنہوں نے موجودہ سوسائٹی کے مرقعے کھینچنے کی کوشش کی ہے تو خیال ہوتا ہے کہ بہتر ہوا اُنہوں نے تاریخی ناول ہی لکھے ورنہ شہرت تعزاد

دیا۔ کیونکہ خدا نے انکو وہ تصویر نگاری کی قابلیتیں عطا نہیں فرمائیں جنکے بغیر شاہدات کی سچی تصویر کھینچنی امر محال ہی اور تاریخی ناولوں نے اُن کی اس خلقی کمزوری پر پردہ ڈال دیا کیونکہ اگر انہیں یہ قابلیت حد کافی تک ودلیعت ہوتی تو اُن کے موجودہ زمانہ کے ناول اُنکے تاریخی ناولوں سے زیادہ شہرت پاتے اور زیادہ مقبول ہوتے۔ الیٹ ٹیکرے اور اسکاٹ نے تاریخی ناول لکھے اور وہ مقبول ہوئے مگر اُن کی شہرت کے لئے وہی ناول طرۂ دستار ہیں جنمیں اُنہوں نے اپنے زمانہ کے حالات پر قصے لکھے ہیں۔

افسوس ہو کہ باخبر حضرات بعض اوقات تنقیدیں لکھنے میں جادۂ اعتدال سے ایسے متجاوز ہو جاتے ہیں کہ تنقید کا مطلب ہی فوت ہو جاتا ہے۔ ہمکو حیرت ہوتی ہے کہ حکیم برہم سا شخص یہ لکھنے کی کیونکہ جرات کر سکا کہ سرشار کے فسانہ آزاد یا اور ناولوں میں کوئی پلاٹ یا کوئی نتیجہ نہیں ہے اور نہ اُنکا کوئی مبحث ہیں اور نہ اونیں کوئی غرض رکھی گئی ہے یہ کہنا تو ویسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شرر کے سب ناول لچر اور پوچ ہیں۔ اس قابل ہی نہیں کہ ان پر نگاہ ڈالی جاوے۔ مگر ایسا کہنے والا حکیم صاحب کو عقل سے خالی معلوم ہوگا۔ ہاں جنکو خدا نے انصاف پسند آنکھیں عطا فرمائی ہیں وہ چاہیں تو دیکھ سکتے ہیں کہ سرشار کا کوئی ناول نتیجہ یا غرض سے خالی نہیں فسانہ آزاد ہی کو لے لیجیے۔ کیا اسمیں کوئی پلاٹ نہیں؟ آزاد کا محقتانہ نگاہیں لیکر گلیوں بازاروں کی خاک چھاننا۔ نواب کے دربار میں ملازمت کرنا شیر کی تلاش میں جانا۔ اور بی بٹیاری کے ترچھی چتونوں کا شکار بننا پھر حسن آرا کے عشق میں گرفتار ہونا۔ انتہا درجہ کی علو ہمتی کو کام میں لاکر روم کو جانا۔ وہاں شجاعت کے جوہر دکھانا۔ پولینڈ کی شہزادی کے دام میں پھنسنا پھر مظفر و منصور ہندوستان کو واپس آنا حسن آرا کو عقد میں لانا۔ یہ پلاٹ نہیں ہی تو کیا ہے۔ معترض کہیگا کہ پلاٹ ہی تو ضرور۔ مگر بالکل معمولی۔ ہاں بہت درست۔ پلاٹ بالکل معمولی ہے اور وہ بھی سرا سر ظاہری باطنی پلاٹ سے ذرا بھی کام نہیں لیا گیا لیکن واضح رہی کہ ناول نویسی کے فن کی معراج یہی ہے کہ سادہ اور معمولی بندشوں میں

رنگینی اور جادو نگاری کی بابت ۔ جارج ایلیٹ کا قاعدہ تہا کہ وہ اپنے ناولوں کے پلاٹ کبھی بیان
نہیں کیا کرتے تہے۔ اس موقعہ پر یہ عرض کرنا اور بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی ناول کے لئے
ہر دو قسم کے پلاٹ کی اشد ضرورت ہے بلا اسکے قصہ چل ہی نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناولوں کے
لئے جنمیں سوسائٹی کے مرقعے دکہائی جاویں اکثر اوقات پلاٹ اشخاص قصہ کو اس گھر سے
اس گھر اور اس شہر سے اُس شہر لیجانے ہی پر ختم ہوجاتا ہے تاکہ مصنف کو سوسائٹی کے
ہر ایک پہلو پر تسلط رہنے کا موقعہ ملے ۔ چارلس ڈکنس کی مقبول تصنیف پک وک پڑہیے اور
اس کلام کی تصدیق کیجئے ایسے ناولوں کے پلاٹ عموماً ظاہری ہوا کرتے ہیں۔ اُسپر سرشار
نے یہ کمال کیا ہے کہ آزاد کے قصہ کے ساتھ ساتھ شہزادہ ہمایوں فر اور بی اللہ رکھی کا قصہ
بہی لکہا ہے۔ تاکہ ناظر کا دل ایک ہی قصہ پڑہتے پڑہتے گہبرا نہ جاوے ۔ اسکے علاوہ وقتاً فوقتاً
سوسائٹی کے عیوب دلکش پیرایئے میں دکہاتا گیا ہے ۔ جنکا سلسلہ قصہ سے نہیں ملتا اور یہ مصنف
کی یہ نیت تہی ۔ ناظرین جانتے ہیں کہ فسانہ آزاد اخبار کی صورت میں شایع ہوا کرتا تہا۔ اور
اس سرخی سے کبھی کبھی ایسے مضامین بہی نکلا کرتے تہے جنکا تعلق قصہ سے نہیں ملتا ۔ اور گو اس
کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے مگر پبلشروں نے کبھی اتنی تکلیف گوارا نہ کی کہ ان مضامین
کو فسانہ آزاد سے علیحدہ کرادیں تاکہ قصہ مسلسل ہوجاوے ۔ اور اوسکی روانی میں کوئی امر حارج نہو۔
علاوہ فسانہ آزاد کے سرشار کے تین ناول اور ہیں جو مقبولیت کا زیور پہن چکے ہیں۔ یعنی
کامنی ۔ سیر کہسار اور جام سرشار ان تینوں کتابوں میں پلاٹ کا وہی رنگ اور طرز ہے جو فسانہ
آزاد کا مگر کسیقدر زیادہ سلجھا ہوا ۔ روزمرہ کے واقعات ایسی ظریفانہ لفاست کیساتھ لکھے گئے
ہیں کہ ناظر صفحے کے صفحے پڑہتا جاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا ۔ کوئی دوسرا شخص جسنے وہی دماغ
اور وہی دل نہ پایا ہو ایسے خشک معمولی واقعات میں ایسی رنگینی اور دلچسپی نہیں پیدا کرسکتا
ایسے پلاٹ کو دلچسپ بنانا جسمیں حیرت انگیز واقعات کی چاشنی ہو مقابلتہً کہیں آسان ہے
جسطرح نظم میں سہل ممتنع کہنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ۔ اسی طرح فسانہ نگاری میں بھی روکہے

پھیکے مضامین میں حلاوت پیدا کرنا بعضوں ہی کا حصہ ہوتا ہے۔

اب ہم حکیم برہم صاحب کے ریمارک کے دوسرے حصہ پر آتے ہیں جسمیں اُنھوں نے فرمایا ہو کہ سرشار کے ناولوں میں نہ کوئی غرض ہے نہ بحث جتنا ہی اسپر غور کرتے ہیں اُتنا ہی پس وپیش ہوتا ہے کہ ایا اسپر ہنسیں یا سنجیدگی سے جواب دیں۔

سرشار نے اُن معاشرتی امراض کے معالجے کا بیڑا اُٹھایا تھا جنکے پنجے میں پھنسکر سوسائٹی جاں بلب ہو رہی تھی۔ اور دیگر تجربہ کار اطبار کی طرح اُسنے بھی تلخ۔ بدمزہ دوائیں قند ومصری میں گھول کر پلائیں۔ اہل بصیرت پر روشن ہے کہ قبائح کے انسداد کا کوئی آلہ ایسا کارگر اور با اثر نہیں ہی جتنا کہ تضحیک کا تازیانہ۔ اور سرشار نے بڑی بیرحمی سے ایسے تازیانے لگائے ہیں۔ بیخبر پڑھنے والا غلطی سے سمجھتا ہے کہ مصنف ہمکو ہنسا رہا ہی مگر ارباب بینش خوب جانتے ہیں کہ وہ رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے۔ شلاً روسینو کمپنیٹ اور سلامت بخش جو تو وہ ظرافت بنائے گئے ہیں۔ اُس سے صرف وکلار کی کثرت اور اُن کی بیوقعتی کا خاکہ اوڑانا مقصود ہے اور اُس واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کور باطن حضرات بھولی بھالی عورتوں کو کیسی کیسی ظاہرداریوں سے دام فریب میں لایا کرتے ہیں۔ ڈکنس نے بھی سرجنٹ بزفز کے پردہ میں وکلار کی خوب خبر لی ہے۔ مگر سرشار کی بیباک ظرافت ڈکنس کے متین طنز سے زیادہ موثر ہے۔ علی ہذا الی اللہ رکھی کا اپنے کھوسٹ شوہر کے نام خطوط لکھوانا اُن خبط الحواس بوالہوس بوڑھوں پر حملہ ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوتے ہیں مگر کم سن عورتوں سے شادی کرنیکے مشتاق۔ بلکہ بڑھاپے کے زمانے میں اپنی خبرگیری وخانہ داری کے لئے شادی کرنا امر لازمی خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح نواب دربار گہربار کا جو خاکہ کھینچا ہے اُس سے وثیقہ خواروں کی سادہ لوحی اور اُن کے مصاحبوں کی عیاری دکھانی مدنظر ہے۔ اور جام سرشار تو اول سے آخر تک شرابخواری کے نتائج بد سے عبرت دلانے پر وقف کر دیا گیا ہے۔ کامنی ایک حیادار۔ وفادار۔ شوہر پرست بیوی کی اعلیٰ

ترین مثال ہے اور نیز آزاد کا قومی جوش جو نفسانیت پر غالب آگیا ہے سن تانگیل کے لئے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ سرشار کے جتنے ناول ہیں وہ انسان کے خیالات و حرکات نیک و بد و جذبات اعلیٰ و ادنیٰ کی سچی تصویریں ہیں۔ جنپر ظرافت کا شوخ رنگ نہایت خوشنما و لطیف معلوم ہوتا ہے اور ایسا کوئی واقعہ نہیں جسکو سرشار نے اپنی کتابوں میں بلا ضرورت بیکار درج کیا ہو۔ یہاں پر یہ کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات کسی واقعے کا بیان کرنا بجائے خود ایک نتیجہ ہوتا ہے۔

مگر غالباً حکیم صاحب اپنے نتیجوں کو نتیجہ نہ خیال فرمائیں گے اُنکے نزدیک اُس ناول کے شیشے میں نتیجہ ترش اور تلخ بشکل بدرجہ بہتر ہوتے ہیں جسکے لیبل پر اس قسم کی کوئی عبارت نہ ہوتی ہو "اس ناول میں پردہ کے نتائج بد دکھائے گئے ہیں" یا "اس ناول میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نارضامندی کی شادیاں ہمیشہ بُرے انجام کو پہونچتی ہیں" یا "اس ناول میں مذہبی لڑائیوں کا جوش وخروش اور باہمی تنازع مذہبی کے خوفناک نتیجے بڑی خوبی سے دکھائے گئے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ حضرت شرر اور اون کے مقلدین عاشق حسین صاحب لکھنوی مرحوم اور مولوی محمد علی صاحب مرقع عالم کے کل ناولوں کے ٹائٹل پیج پر اس قسم کی کوئی نہ کوئی عبارت ضرور ملتی ہے۔ گویا ناول نہوے۔ کوئی فلسفہ کی کتاب ہوئی جسمیں کسی نئی تھیوری کو قائم کرنیکی ضرورت ہی اسطرح نتیجہ نکالنا چاہے ایسے قصوں کے لئے جائز قرار دیا جا سکے مگر اعلیٰ درجے کے ناولوں کے لئے ہرگز شایاں نہیں ہے لطف تو جب ہے کہ نتیجہ سرتا سر آمد ہو اور ایک بیساختہ پن کے ساتھ ناظرین کے دلوں میں کھب جائے کسی قصے کے سرنامے پر اُسکا مقصد لکھا ہوا دیکھکر ہمکو اُسکے پڑھنے کی خواہش نہیں باقی رہجاتی انگریزی میں شاید ہی کوئی ناول ایسا ہوگا جسمیں ایسے مذموم طریقے سے نتیجے دکھائے گئے ہوں بلکہ آسکر برآڈنگ نے تو علانیہ کہدیا ہے کہ

"ناولس ود اے ٹنڈنسی آر دی ورسٹ کلاس آف ناولس"

ادنیٰ ترین ناول وہ ہیں جنہیں کوئی خاص بحث رکھا جائے اور اُسنے بہت درست کہا ہی۔ کیفیات وجذبات انسانی ومناظر قدرت ودنیا کے کرشموں کی تصویر کھینچنا بجاے خود ایک نیتجہ ہے سائنس یا فلسفہ کے نکتے حاصل کرنیکے تئے ناول نویس بنایا ہی نہیں گیا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ فلسفی کبھی ناول لکھہ ہی نہیں سکتا۔

پلاٹ سے گذر کر جب اُن کیرکٹروں کو لیجئے جو ناول کے اسٹیج پر ایکٹ کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کے ناولوں میں خاص خاص کیرکٹروں کے عادات اطوار وطرز خیال میں ایک نہ ایک خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اور یہی خصوصیات مختلف موقعوں پر اور مختلف حالتوں میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے ادنےٰ درجہ کے ناولوں میں یا تو کیرکٹر معمولی سیدھے سادے انسان ہوتے ہیں۔ یا اُن کی خصوصیات قومیت سکونت۔ پیشہ یا چند فرسودہ اُصولوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی ناول اُردو میں کثرت سے نظر آتے ہیں۔ بنگالی جب آئیگا اپنے بودے پن کا ثبوت دیگا مارواڑی ہمیشہ بخل وخست کا پتلا بنایا جاتا ہے۔ لالہ صاحب بیچارے ہمیشہ اپنی خانہ ساز فارسی بولتے ہوئے سُنائی دیتے ہیں۔ راجپوت ہمیشہ اکھڑ۔ اور تند مزاج ہوتا ہے۔ [illegible] اور بہاچ میں آٹھوں پہر داتا کلکل ہوا کرتی ہے۔ مولوی صاحب ہمیشہ اپنی عمر [illegible] کے فکر میں غلطاں پیچاں رہتے ہیں۔

مگر یہ ہرگز نہ خیال کرنا چاہئے کہ مستند ناولسٹ اس قسم کے کیرکٹروں سے کام نہیں لیا کرتے۔ بلکہ واقعی اچھے ناولوں میں ہر دو اقسام کے کیرکٹر موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ڈکنس کے پک وک کو لے لیجئے۔ اسمیں پک وک ونکل۔ سناڈگراس ٹپ مین۔ وارڈل اور ولر میں جو خصوصیات ہیں وہ سراسر امتزاجی ہیں۔ اور برکر۔ بزفز۔ ڈاڈسن وفاگ باٹ سنگنس وغیرہ میں جو تفریق کی گئی ہے وہ کسی خاص پیشے کی تضحیک کے لئے علیٰ ہذا اور مثالیں بھی دیجا سکتی ہیں۔

سرشار کے کیرکٹروں کا ذکر کرتے ہوئے حکیم صاحب فرماتے ہیں "صرف تین کیرکٹر ہیں۔ ایک کا ایک عورت کا ایک مسخرے کا اُن کی عورت چاہے کسی قوم اور کسی ملک کی عورت ہو لکھنؤ مسلمان عورت ہے علی ہذا القیاس اُنکا مرد چاہے کوئی اور کہیں کا ہو لکھنؤ کا ایک آوارہ اور بازاری بیفکرا ہے۔ اور مسخرا چاہے کوئی ہو لکھنؤ کا ایک افیونی ہے"

سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں پر سرشار کے کیرکٹروں کی تقسیم جو تین حصوں میں کی گئی ہے کس اصُول پر کی گئی ہے۔ جنس کے لحاظ سے تو دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مسخرا قسم اول میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اور سرشار پر کیا موقوف ہے دنیا کا سب سے بڑا ناولسٹ جب کیرکٹر لائیگا تو یا مرد ہوگا یا عورت۔ کوئی درمیانی قسم وہ کہاں سے لائیگا اب یہ دیکھنا چاہئے کہ ان دو جنسوں کے کیرکٹر سرشار کے ناولوں میں ہمیشہ اور ہر حالت میں یکساں ہوا کرتے ہیں یا نہ اوچھی نگاہ والوں کو تو وہ بالکل یکساں ہی نظر آتے ہیں۔ مگر جنکے واقعی باریک نگاہ پائی ہیں وہ دیکھ سکتا ہے کہ جس کمال سے اُنہوں نے اپنے کیرکٹروں میں خصوصیتیں کی ہیں اوسکی نظیر کم ناولوں میں ملیگی۔ پنڈت بشن نراین صاحب نے بالکل صحیح فرمایا تھا مذاق عامہ ایسا سلیم نہیں ہے کہ سرشار کی باریکیوں کو سمجھ سکے۔ اور ابھی کچھ دنوں تک سرشار ایسے ہی حملوں کا شکار ہوا کرے گا۔ مگر جوں جوں مذاق سدھرتا جائیگا۔ سرشار کی زیادہ ہوتی جائیگی۔

چارلس ڈکنس کی طرح حضرت سرشار نے بھی اعلیٰ اور ادنیٰ ہر دو قسم کے کیرکٹروں مدد لی۔ یہ بہت صحیح ہے کہ سب کیرکٹر لکھنوی ہیں۔ مگر جب اوس نے سارے قصے لکھنوی لکھے تو کیرکٹر کیا لندن سے لاتا۔ ہاں یہ دیکھنا چاہئے کہ انہیں لکھنؤ کے بیفکروں کی امتیازی خصوصیات کس نفاست سے دکھلائے ہیں۔ مرزا ہمایوں فر بھی لکھنوی ہے اور آزاد بھی لکھنوی مگر دونوں کے عادات میں بین فرق رکھا گیا ہے۔ اگر آزاد کی جگہ ہمایوں رکھدیجئے تو قصہ بالکل پلٹ جائے گا۔ نواب صاحب بھی لکھنوی ہیں۔ مگر ہمایوں

سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ مرزا عسکری بھی لکھنوی ہیں۔ مگر ہمایوں فر یا آزاد سے اُن کو
ملائیے تو مطلق میل نہیں کھاتے۔ اسیطرح حسن آرا۔ جہان آرا۔ سپہر آرا۔ گیتی آرا۔
بہار النسا سب لکھنؤ کی شریف زادیاں ہیں مگر سبھوں کے مزاجوں میں نازک و دقیق
خصوصیات موجود ہیں۔ بہار النسا کو بھولکر بھی حسن آرا کا مقام نہیں سمجھ سکتے اور نہ سپہر آرا
کو حسن آرا سے ملاسکتے ہیں۔ اسی کو فن ناول کا کمال کہتے ہیں۔

ادنی درجے کے کیرکٹر بھی کثرت سے موجود ہیں۔ مولوی صاحب نے تغلقلین و بی اللہ رکھی
و بی عباسی، حکیم صاحب۔ اور روسیوا ایجنٹ وغیرہ وغیرہ ہزاروں اشخاص ہیں جو کسی خاص
فرقہ یا خاص پیشے کا مضحکہ اُڑانیکے لئے بلائے گئے ہیں۔

مگر اسکے ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ سرشار جب کبھی اپنے کیرکٹروں کو لکھنؤ سے باہر
دور دراز کے مقامات پر لیگیا ہے۔ تو وہاں اُن کو غیر لکھنوی بنانیکا خوب لحاظ رکھا ہے
مس میڈا یا مس روز یا پولینڈ کی شہزادی لکھنؤ کی شریف زادیاں نہیں کہی جاسکتیں۔ اسیطرح
علیقو پاشا یا قسطنطنیہ کے ہوٹل کا سوداگر لکھنؤ کے آوارہ مشرب اور بازاری بیفکرے نہیں
ہیں۔ اب حضرات شرر کے کیرکٹروں کو دیکھیے تو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ حکیم صاحب نے
جو کمزوریاں سرشار میں دکھائی تھیں وہ سب کی سب حضرت موصوف کے کیرکٹروں میں پائی
جاتی ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے کیرکٹروں کا انتخاب بڑی خوبی سے کیا۔ کسی
کو روم سے بلایا۔ کسی کو عرب سے۔ کسی کو مصر سے۔ کسی کو فارس سے مگر نہ تو اُنکے قومی خاصیتوں
کو اور ذاتی امتزاجی خصوصیات کو کامیابی سے دکھاسکے۔ اُنکے جتنے ہیرو ہیں وہ سب منچلے
غیور۔ خوشرو۔ بلند بالا اور مہذب ہیں بس اگر حسن نے جگہہ ملک العزیز چلا آوے تو وہ بھی
اپنا حصہ اُسی خوبی سے ادا کرے گا۔ اسی طرح اُنکے اُناث میں بھی یہی نقص موجود ہے
عذرا۔ ورجنا۔ اینجلنا۔ فلورنڈا۔ سب کی سب بہ استثنار اسکے کہ غیر قوموں کی عورتیں
بتلائی گئی ہیں اور ہر حالت میں بالکل ایک سی ہیں۔ ہم ایک کو دوسری سے تمیز نہیں کر سکتے

اگر عذرا کا حصہ انجلنا کو دیدیا جاوے تو بھی نفس قصہ پر کچھ اثر نہو گا۔ یہ خامی سرشار کے سب ناولوں میں پائی جاتی ہے۔ اور جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ جس ناول میں ایسی معمولی کیرکٹر پائے جاتے ہیں اُسکا شمار ادنیٰ درجہ کے ناولوں میں ہوتا ہے۔

سرشار پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ اُسکے سب کیرکٹر لکھنؤ ہی کے مرد و عورت ہیں۔ پھر اُسمیں ہرج ہی کیا ہے؟ ایک شہر تو کیا ایک محلے اور ایک کنبے میں مختلف عادات و اطوار کے اشخاص ہو سکتے ہیں۔ اور ایک واقعی پُرفن فسانہ نگار اُنہیں کے روزمرہ کے حالات میں طلسم کی سی تاثیر پیدا کر سکتا ہے۔ علاوہ بریں ایک خاص مقام کے مناظر۔ وطرز تمدن کا تفصیلی مرقعہ دکھانا بجائے اسکے کہ سارے زمانے کے جغرافی نقشے دکھا دئے جاویں کہیں بہتر ہے۔

مگر اسکا ہمیشہ خیال رکھنا چاہئے کہ ناول نگاری کا کمال یہی نہیں ہے کہ کیرکٹروں میں صرف خصوصیات پیدا کر دئے جائیں۔ یہ تو کچھ ایسا مشکل کام نہیں۔ سچی صناعی تو اسمیں ہے کہ کیرکٹروں میں جان ڈالدی جاوے اُن کی زبان سے جو الفاظ نکلیں وہ خود بخود نکلیں نکالے نہ جاویں جو کام وہ کریں خود کریں۔ اُنکے ہاتھ پانوں مروڑ کر زبردستی اُنسے کوئی کام نکرایا جاوے۔ اس معیار پر سرشار کے کیرکٹروں کو آزمائیے تو وہ عموماً کھرے نکلیں گے۔ اُنمیں وہی چلت پھرت ہے جو جیتے جاگتے آدمیوں میں ہوا کرتی ہے۔ اُنمیں وہی چھیڑ چھاڑ۔ وہی ہنسی۔ مذاق۔ وہی رمز و کنائے وہی غل غپاڑے ہوتے ہیں جو ہم اپنی بے تکلفی کے مجلسوں میں کیا کرتے ہیں۔ اُن کی ایک ایک بات سے ہمکو ہمدردی ہو جاتی ہے وہ ہمکو ہنساتے ہیں رُلاتے ہیں۔ چڑھاتے ہیں ستاتے ہیں۔ اُنکے قہقہے کی آوازیں ہمارے کان میں آتی ہیں۔ ہمارے دل میں گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ اور ہم خود بخود کھلکھلا پڑتے ہیں اُنکے گریے کی دل ہلا دینے والی صدائیں ہم سُنتے ہیں۔ اور ہمارے آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آتے ہیں۔ کون ایسا سنجیدہ شخص ہے جو بُوا زعفران۔ اور خواجہ بدیع کی لگاوٹ

بازیوں پر ہنس نہ پڑے ایسا کون سنگدل ہوگا جو شہزادہ ہمایوں فر کے قتل کے وقت موثر نہ ہو جائے یا کامنی کو رنڈاپے کا بلاپ کرتے دیکھکر رونے نہ لگے۔ اور کیرکٹروں کو جلنے دیجیے سرشار کا خوجی ہی ایک ایسا غیر فانی مخلوق ہی جو دُنیا کی کسی زبان میں اُسکے کمال شہرت کا سکہ بٹھانیکے لئے کافی ہی۔ ماشا اللہ کیا ہنستا بولتا آدمی ہے۔ صبح ہوئی۔ آپ اُٹھے افیون گھولی۔ حقہ کا دم لگایا۔ ریش پھٹکاری۔ اور اپنے ڈنڑ بل کو دیکھتے اکڑتے۔ اپنے زعم میں مست چلے جا رہے ہیں۔ جوں ہی راستے میں کسی مہ پارہ نازنین کو خراماں خراماں آتے دیکھا وہیں آپ کی باچھیں کھل گئیں۔ ذرا اور اکڑ گئے۔ اُس نے جو کہیں آپ کی وضع و قطع پر ذرا مُسکرا دیا تو آپ ریشۂ خطمی ہو گئے۔ گمان ہوا مجھپر عاشق ہو گئیں۔ فوراً موچھوں پر تاؤ دیا اور مُسکرا کر تیکھی۔ بانکی چتونوں سے آس پاس کے آدمیوں کو دیکھنے لگے کہ پاؤں میں ٹھوکر لگی اور چاروں شانے چت۔ یاروں نے قہقہ لگایا مگر کیا مجال کہ حضرت کے چہرہ پر ذرا بھی بل آنے پائے۔ گرد جھاڑی اُٹھ کھڑے ہوئے اور بس یا "اوگیدی" کا نعرہ بلند کیا۔ قرولی میان سی نکل پڑی اور چاروں طرف سنّاٹا ہو گیا۔ سر دھڑوں سی الگ نظر آنے لگے اور لاشیں پھڑکنے لگیں۔ شاباش! خوجی تجھکو خدا ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے۔ تیرے احسانوں سے ایک دنیا کا سر گرانبار ہی۔ تیری قرولی ایسے میٹھے زخم لگاتی ہے کہ کسی کا تیر نیمکش بھی ایسی پیاری خلش نہیں پیدا کر سکتا۔ اور تیرے تیور بدلنے میں وہ مزا آتا ہے جو کسی معشوق طرحدار کے روٹھنے میں بھی نہیں آسکتا۔ بیشک تو ظرافت کا پتلا اور لطافت کی جان ہی۔

حضرت شرر نے بھی متعدد کیرکٹر ایجاد کیے اور اُنکے ناول مقبول بھی ہوئے مگر اُنکے فرزندان معنوی میں سے کسی نے بھی ایسی شہرت حاصل کی کہ اُسکا نام ہر شخص کے زبان پر ہو؟ حق تو یہ ہی کہ اُنکی طبیعت میں وہ زور اور جدت جو غیر فانی کیرکٹروں کی خلاقی کیلئے درکار ہی، موجود ہی نہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ جب وہ کسی نئے کیرکٹر کی دعوت کرتے ہیں تو پہلے اُسکا استقبال بڑی گرما گرمی سے کرتے ہیں اور ناظرین سے

اُسکا لقارت کراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ایسے ہیں اور ویسے ہیں آپ کی ذات بابرکات صوری ومعنوی محاسن کی کان ہے وغیرہ وغیرہ مگر محض اُن کی تمہیدوں سے کیرکٹر میں جان نہیں پڑتی کیونکہ وہ بولتے ہیں تو شرر کی زبان سے اور اُن کی ایک ایک حرکت اُن کی ایک ایک ادا اُن کی ایک ایک بات ثابت کرتی ہے کہ مصنف پردہ کی آڑ میں بیٹھا ہوا کیرکٹر کا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ ہمارے دل میں خود بخود یہ خیال نہیں پیدا ہوتا کہ ہم چند بے تکلف دوستوں کی صحبت کا مزہ لے رہے ہیں۔ وہ روئیں ہمکو پرواہ نہیں۔ وہ ہنسیں ہمکو خبر نہیں ہم جانتے ہیں کہ وہ خیالی ہیں۔

شرر نے عرب۔ عجم۔ فارس۔ ترکستان۔ روس۔ روم۔ علیگڈھ۔ لکھنو اور خدا جانے کتنے مقامات کے سین دکھائے۔ مگر اُنکے کسی ناول سے وہاں کی عوام کی طرز معاشرت و طرز خیالات کا پتہ نہیں چلتا۔

سرشار کے جادو کار قلم نے ہمکو لکھنؤ کے گلی کوچوں۔ میلوں ٹھیلوں اور باغ بغیچوں کی سیر ایسی خوبی سے کرادی کہ شاید ہم وہاں خود جا کر اُن کو دیکھتے تو اتنا حظ نہ اٹھا سکتے ہمکو قدم قدم پر لکھنؤ کے امیر۔ فقیر۔ گنوار۔ عیار۔ بھانڈ۔ ظریف۔ سخرے۔ ترچھے۔ بانکے شریف۔ وضیع۔ مہذب غیر مہذب بوڑھے جوان۔ غرض ہر رنگ و ہر انداز کے آدمی نظر آتے ہیں وہ ہنستے بولتے ہیں۔ دل لگی مذاق کرتے ہیں ناچتے ہیں گاتے ہیں مگر اسلئے کہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ یہ اُنکا روزمرّہ کا وطیرہ ہے۔ ہمارا جی چاہے تو ہم بھی دیکھ لیں آسکر براؤننگ نے لکھا ہے کہ ناول نویس میں ان چار دماغی اوصاف کا موجود ہونا ناول کے لئے بمنزلہ اربعہ عناصر ہے (۱) پرزور قوت بیان (۲) ظرافت یا بذلہ سنجی (۳) فلسفہ (۴) ڈراما یا کسی واقعے میں بیساختگی سے تاثیر پیدا کر دینا۔ اب سرشار کو دیکھئے تو وہ بجز فلسفہ کے اور تینوں اوصاف سے حصہ وافی و کافی رکھتا ہے۔ اور حضرت شرر اگر ان اوصاف میں سے کوئی رکھتے ہیں تو وہ ایک حد تک فلسفہ ہے مگر وہ فلسفہ نہیں جو انسان کے دل

اور دماغ کی جانچ پڑتال کرتا رہتا ہے۔ یا جو نوع انسانی پر وسیع نگاہیں ڈالتا ہے بلکہ وہ فلسفہ جو مذہب اور قوم سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دلوں میں تعصب پیدا کر دینا جس کا خاص الخاص کام ہے۔

یہاں پر ایک ایسے امر کا تذکرہ کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو بعض اصحاب کو بتاب ناگوار گذرے۔ سرشار نے جتنی کتابیں لکھی اُنمیں ایک بھی ایسی نہیں کہ جسکو ہندو یا مسلمان یا عیسائی یکساں دلچسپی سے نہ پڑھے۔ وہ سب مذہبی تعصبات سے بری ہیں برعکس اسکے حضرت شرر کے ہیرو تو ہر حالت میں مسلمان ہوتے ہیں مگر ہیروئن کبھی ہندو ہوتی ہے اور کبھی عیسائی حضرت شرر تو غالباً سفر ہیں اُنکے ذہن کو کم از کم اتنی رسائی ضرور ہوتی چاہیے کہ وہ اُس اشتعال کا اندازہ کرلے جو ہندو اور عیسائیوں کے دل میں اُن کی اس اغوائی سے پیدا ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں میں اتنی حسین وعصمت پرور مستورات نہیں ہیں جنکو ہیروئن بننے کا فخر حاصل ہو سکے۔ غالباً کوئی صاحب فرمائینگے کہ بعض ہندو اصحاب نے بھی ہندو ہیرو سے مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا ہے۔ مگر کیا ضرور ہے کہ حضرت شرر بھی اُسی غلطی کے مرتکب ہوں۔ ہمنے خود دیکھا ہے کہ اکثر ہندو اصحاب منصور و موہنا کو نفرت و کراہیت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسیطرح جیسے کہ بعض مسلمان اصحاب دُرگیش نندنی کو دیکھتے ہیں عشق و محبت کا یہ رویہ نہایت مذموم ہے۔ کمزور دماغ والے چاہے ان تعصبات کے شکار ہو جائیں۔ مگر ایک مستند شخص کی ذات سے اُن کا ظہور میں آنا نہایت نامناسب ہے ہے۔ ہندوستان میں یہ عام رواج ہے کہ لڑکی کے ہمقوموں یا رشتہ داروں اور بیاہی ہندونکی وقعت لڑکے والوں کے رشتہ داروں سے کم ہوا کرتی ہے۔ اور عوام میں بھونڈے مذاق والے دوسرونکو اپنا خسر زادہ بنا کر خوش ہوتے ہیں گویا شوہر کا طرفدار ہوا بیوی کے طرفداروں پر غالب ہوتا ہے۔ اکثر اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ لغو بکنے والے شہدے اپنی ست رنگی بحث کا بڑی فخر سے تذکرہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت شرر

انہیں ادنیٰ ترین جذبات کا شکار ہو گئے۔ بہت کم ایسے ہندو ہونگے جو اُنکے مدّاح ہوں
حالانکہ سرشار کے سامنے سر تعظیم خم کرنے والوں میں اکثر مسلمان اصحاب ہیں یہاں اُن
لوگوں کا ذکر نہیں ہے جو قومی اتحاد کے آڑ میں نفاق کا بیج بوتے ہیں۔ ناول نویس
کے لئے رسیلی رنگیلی چلبلی۔ شوقین طبیعت کا ہونا ضروری ہے۔ بجائے اسکے حضرت
شرر کو مجتہدوں کا جوش اور ملاؤں کا دل ملا ہے جو اُس کام کے لئے موزوں نہیں۔
کسی آدمی کی قابلیت کی ایک یہ دلیل بھی ہے کہ وہ سمجھ جائے کہ میں کونسا کام بہترین
طور پر کر سکتا ہوں۔ سرشار نے اپنی مافی الضمیر کو جانا۔ حضرت شرر نہ جان سکے۔
مگر سب سے بڑا ظلم جو حکیم برہم صاحب نے سرشار پر کیا ہے وہ اُسکے طرز تحریر پر ہے۔ ہم
یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس موقع پر بڑی بیرحمی سے انصاف کا گلا گھونٹا گیا ہے۔
اب آج اُس ذی کمال کے اُن حقوق کو جھٹلانا جو زبان اُردو پر قیامت تک رہینگے
سراسر تعصب و کوتاہ نظری کی دلیل ہے۔ کوئی کتنی ہی زباندرازیاں کرے مگر اس امر کو
نہیں مٹا سکتا کہ سرشار ہی وہ پہلا طباع ہے جسنے انگریزی طرز جدید کے فسانے اُردو میں
لکھنا شروع کئے اسکے ساتھ ہی تقلید کے جوش میں یہانتک نہیں بڑھا کہ اُردو زبان اور
اُسکے انداز تحریر کو مسخ کر دے۔ صرف طرز انگریزی سے لیا۔ یا یوں کہو کہ خاکا انگریزی
لیا اوسپر ہندوستانی رنگ چڑھائے۔ انگریزی ناول کی کوئی خوبی ایسی نہیں جو سرشار
کے تصانیف میں نہ پائی جاوے۔ برہم صاحب کہتے ہیں فسانہ آزاد اور فسانہ عجائب
کی عبارتوں میں کوئی فرق نہیں ہے ہمکو یقین نہیں آتا کہ حکیم صاحب کے قلم سے یہ ریمارک
نکلا۔ جام سرشار سے جو دو اقتباسات کئے گئے ہیں وہ خود اس دعوے کی تردید کرتے
ہیں۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ کہیں کہیں پنڈت جی نے سرور کے رنگ میں لکھا ہے مگر
یہ اون کا رنگ خاص نہیں ہے۔ بلکہ جہاں کہیں ترچھے بانکے چھیلوں کی گفتگو لکھی
ہے وہاں عبارت کی رنگینی و قافیہ بندی پر زیادہ زور دیا ہے اور اسکی اُن کو داد

دینی چاہئے کہ بیفکروں سے متانت آمیز سنجیدہ گفتگو نہیں کرائی جو بالکل بیگانہ معلوم ہولی۔ یہ بھی خیال رہے کہ گو ناول نویس کا خاص رنگ ایک ہی ہوتا ہے مگر چونکہ وہ ہر قماش و فیشن کے آدمیوں کو بناتا بگاڑتا رہتا ہے اسلئے اوسکی زبان بھی ہر موقع پر رنگ بدلتی رہتی ہی۔ شلاً فسانہ آزاد میں جب کبھی حکیم صاحب تشریف لاتے ہیں تو پشتو میں باتیں کیا کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی اُن کی زبان کو سرشار کی زبان تبلائیے تو اُسکا جواب بجز خموشی کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ حکیم صاحب نے جدت کے معنی سمجھنے میں غلطی کی۔ جدت اس کا نام نہیں ہو کہ انگریزی کے غیر مانوس ترکیبوں۔ بندشوں۔ تشبیہوں اور استعاروں کو بے جوڑ۔ روکھے۔ غیر فصیح ترجمے کردئے جاویں۔ جیسا حضرت شرر نے کیا ہے۔ اسی کا نام تو نقالی ہے۔ اسپر طرہ یہ کہ بیچارے سرشار پر نقالی کا الزام اسلئے لگایا ہے کہ وہ اپنے کیرکٹروں سے حسب حال باتیں کرواتا ہی۔ حکیم صاحب پر روشن ہو کہ اُردو فسانہ نگار ہی یں اسیکو جدت کہتے ہیں۔

حضرت شرر جب کسی ناول کی ابتدا کرتے ہیں تو پہلے سینری کا بیان بڑی طوالت کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بعد ازاں ہر باب کے ابتدا میں ایسے ہی بیانات ہوتے ہیں جو قصے کی روانی میں حارج ہوتے ہیں۔ اور عام پڑھنے والا گبھرا کر اُنکو چھوڑ دیتا ہے۔ حکیم برہم صاحب نے بھی حال ہی میں ایک ناول لکھا اُسمیں شرر کی تقلید اس حد تک کی کہ نوے صفحے کے ناول میں پچیس صفحوں سے زاید محض سینریوں ہی پر وقف کردئے تھے۔ یہ نقص فن ہی۔ یہاں پر اتنا اور عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ہیروئن کی تصویر جو حکیم صاحب نے ہمارے سامنے بڑے فخر سے پیش کی ہے کاٹ چھانٹ کر چند لفظوں میں بیان کی جاسکتی ہے۔ یہ امر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ مصنف کسی کیرکٹر کے خط و خال۔ چہرہ مہرہ کا بیان کیسی ہی خوبی سے کیوں نکرے مگر ناظرین کے سامنے جیسی تصویر کھینچنا چاہتا ہے ہرگز نہیں کھینچ سکتا۔ جتنے جدید انگریزی ناول ہیں اُنمیں جسمانی کمالات کا بیان چند لفظوں میں

ختم ہوجاتا ہے۔ اور دماغی اوصاف کا پہلے سے ظاہر کرنا تو اپنے کو ناول نویسی کے اصولوں سے بیگانہ ثابت کرنا ہے۔

یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت سرشار کے رنگ میں لکھنے کی بہتوں نے کوشش کی مگر کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ جیسے آزاد کی تقلید محال ہے اسیطرح سرشار کے رنگ میں بھی لکھنا سخت ہے حالانکہ بعض ناول نگاروں نے شرر سے بالا مار لیا ہے چنانچہ انکی ناولوں کی جتنی قدر ملک نے کی ہے انکی آدھی بھی شرر کے کسی ناول کی نہیں ہوئی فقط "نواب رائے"

"دیوان شبلی"

تمام دنیا کے لٹریچر کی تحلیل صرف دو اجزاء پر ختم ہوتی ہے "نظم و نثر" عموماً تمام خط و کتابت۔ تحریر و تقریر۔ مکالمہ۔ نثر میں کیا جاتا ہے۔ لیکن اس ذریعے سے لٹریچر پر من حیث الفن کوئی احسان نہیں ہوتا کیونکہ اسمیں علماء جہلا۔ عوام سب کے سب برابر کے حصہ دار ہیں۔

اسمیں کوئی شبہ نہیں۔ کہ نثر انشا پردازی کے سانچے میں ڈھل کر ایک مستقل فن کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن انشاء پردازی بجائے خود ایک تشریح طلب لفظ ہے۔ تمام اہل فن نے بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد انشاء پردازی کے جو ضروری اجزاء و ارکان قرار دیے ہیں وہ یہ ہیں۔ تشبیہ۔ استعارہ۔ کنایہ۔ سجع وغیرہ۔ اب خیال کرو کہ اگر کوئی فقرہ اس خیالی سانچے میں ڈالدیا جائے۔ تو اسمیں اور شعر میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہوگی؟ اس موقع پر موزونیت اگرچہ ذہنی تشخص کا کام دے سکتی ہے۔ لیکن یہ تشخص بھی غالباً اسی زمانہ کے حوادثات میں سے ہے جب کہ منطق نے تمام اہل فن کو جامعیت اور مانعیت کے لفظ سے روشناس کر دیا تھا۔ ورنہ فطرتی طور پر اس جگہ کوئی امر فارق نہیں۔ اثر دلکشی۔ واقعے کی تصویر۔ نشست الفاظ۔ فی الجملہ موزونیت۔ کونسی چیز اس فقرہ میں نہیں۔ اور یہی چیزیں شعر کی علت مادی

اور علت صوری ہیں۔

اس لحاظ سے ہر قوم کا لٹریچر۔ نظم ہی کے دائرہ میں آکر علوم و فنون کا تماشا گاہ ہو سکتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ جو لوگ ادبی معرکوں کے علم بردار رہ چکے ہیں، اُنکے دست کمال میں یہ خوشنما تلوار بھی ضرور تھی۔ فرزدق۔ امرءالقیس۔ فردوسی۔ نظامی۔ ہومر۔ ملک محمد جائیسی۔ شکسپیر اسی اکھاڑے کے نامور پہلوان ہیں۔ مختصر یہ کہ لٹریچر کو اگر علمی نگاہ سے دیکھئے تو اُسکا ریشہ ریشہ، لوازمات شعر کے شکنجہ میں جکڑا ہوا نظر آئے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خود ہماری قوم نے لٹریچر کے ساتھ من حیث الفن کیا سلوک کیا۔

آج "حملۃ العلم" کا خطاب نہایت فیاضی کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ اور قدیم طرز تعلیم کے جانداروں کو دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں شمع ادب کو انہیں کی انجمنوں میں ڈھونڈھنا چاہئے۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ علما کے گروہ میں اس شمع کی وقعت چراغ مردہ سے زیادہ نہیں۔ اس بزم میں اُردو۔ فارسی کو نامانوس آواز سمجھ کر چھوڑو۔ لیکن عربی زبان کی حلاوت سے کیوں شکر رنجی ہے۔ لیکن اس سے بھی قطع نظر کر لو۔ صرف مذہبی حیثیت سے کام لو۔ آج اس آواز سے دنیا کا گوشہ گوشہ گونج اُٹھا ہے کہ قرآن پاک معجزہ ہے اور بہت سی تحقیق کے بعد یہ بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ اعجاز کی اصلی وجہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ہے۔ اس لحاظ سے اس معزز گروہ کا یہ فرض تھا کہ ادبی دنیا کا ذرہ ذرہ چھان ڈالتا۔ اور کلام مجید کے نقطے نقطے کو آفتاب کی طرح چمکا دیتا۔ لیکن ہمارے علما بنات خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اُنہوں نے قرآن مجید کے مقابلے میں شعراء عرب کے کلام پر بجز (الشعراء یتبعھم الغاوٗن) کے کوئی معمولی ریویو بھی کیا ہے۔؟

جدید تعلیم یافتہ اگرچہ اس عام افسردگی میں شامل نہیں۔ دائرہ زبان کو وسیع کرنیکے لئے دوسری زبانوں سے الفاظ لئے جاتے ہیں۔ اُن کی تنقیح کیجاتی ہے۔ اور اُن کو ایک

ندہ نشست کے ساتھ روزمرہ میں لاتے ہیں۔ لیکن خوب غور سے دیکھو کہ اس گروہ نے لٹریچر پر من حیث الفن کیا احسان کیا۔ یہ گروہ چونکہ عربی لٹریچر کے ذائقے سے ناواقف ہی۔ اسلئے ہمکو عربی کے متعلق ان سے کوئی شکایت نہیں۔ اُردو زبان چونکہ مادری زبان ہی اسلئے اُسکے ساتھ۔ اعتنا۔ چنداں قابل داد نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس گروہ کو اکبری اور جہانگیری سکہ کی رام رنگی کا کسقدر ذوق ہے؟۔

حقیقت یہ ہی کہ سلطنت مغلیہ کے فرمانروا اور اُس زمانے کے شعراء کو ہندوستان کے ساتھ نسب ونام کے لحاظ سے اگرچہ کوئی خصوصیت خاص حاصل نہ تھی۔ تاہم اسلام نے قومی دائرے کو اسقدر وسیع کردیا تھا۔ کہ ایک یگانہ سے بیگانہ مسلمان حقیقی بھائی کے حکم میں داخل ہوسکتا ہے۔ انما المومنون اخوۃ۔ اسکے علاوہ ان بزرگوں نے تخم شاعری بونے کے لئے۔ جس زمین کو منتخب کیا۔ اُسکا فخر دہلی یا اُس کے اطراف کی زمین بلند آہنگی کے ساتھ کرسکتی ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ اُردو زبان کے اکثر شعراء دہلی ہی کی خاک سے اُٹھے۔ اور خود اُردو بھی دکّی ہی میں پھلی پھولی۔ ان وجوہات نے مسلمانوں میں ان بزرگوں کی یہ وقعت پیدا کردی کہ ان کا معمولی سے معمولی کارنامہ بھی نہایت جانسوزی کے ساتھ چمکایا جاتا ہی۔ اس خوش اعتقادی اور صحبتہائے دیرینہ کا سب سے بڑا یہ اثر ہوا کہ آج اُردو کا تمام لٹریچر، فارسی زبان کا دوسرا قالب نظر آتا ہے۔

اس لحاظ سے اس گروہ کا فرض تھا کہ جس دلچسپی کے ساتھ قلعہ اکبر۔ تاج محل۔ سکندرہ جامع مسجد کا نظارہ کیا جاتا ہے۔ اور عظمت گذشتہ کی یاد دلانے کے لئے اُن کی درازی عمر کی دعائیں کیجاتی ہیں۔ اُسی طرح فیضی۔ ابوالفضل۔ عرفی۔ کی غیر محسوس عمارت کے بقا کی بھی تدبیر کیجاتی۔

لیکن ہمارے نوجوان خود انصاف کریں کہ اُنہوں نے بی۔ اے کورس کے سوا اور وہ بھی مجبوراً فارسی کی کوئی کتاب پڑھی ہے۔ وہ شعراء کے کلام پر ریویو کرسکتے ہیں؟

عرفی کے کلام کی خامی دکھا سکتے ہیں؟ فارسی زبان میں شعر کہہ سکتے ہیں؟ افسوس کہ نہیں کہہ سکتے
اور نہیں کہہ سکتے۔

ان دونوں گروہوں کی یہ افسردگی اور بے اعتنائی اگرچہ ایک عام افسوسناک واقعہ ہے۔
تاہم اس عموم میں ہمارے مسلم لیڈر شمس العلما مولانا محمد شبلی ثانی داخل نہیں۔ مولانا چونکہ ماء العنب[1] کو انگریزی گلاس میں پیا کرتے ہیں۔ اسلئے اُن کی تمام خصوصیتیں اُن کو ہمیشہ انگریزی خواں اور عربی خواں دونوں گروہوں سے ممتاز رکھتی ہیں۔ انہیں خصوصیات میں شاعری بھی ہے۔ عربی ادب میں مولانا کو اگرچہ دستگاہ کامل حاصل ہے، اس لحاظ سے ان کے نتائج فکریہ کا ظہور اسی پردہ میں ہونا چاہئے تھا لیکن وہ دقیقہ سنج بزرگ خوب جانتا تھا کہ آج زمانہ کا فونوگراف اس زبان کو اپنے اصلی لہجے میں نہیں ادا کر سکتا۔ اُردو عام مروجہ زبان ہے۔ لیکن آخر کچھ شان علم کا بھی لحاظ چاہئے۔ اسلئے اظہار خیالات کے لئے اُس زبان کو چُنا جو ایران کی نفاست پسندی کا سچا نمونہ اور اُردو شاعری کا اصل الاصول ہے یعنی فارسی۔

ان اشعار کا ایک مختصر سا مجموعہ ہمارے پیش نظر ہے۔ جسکا نام زیب عنوان ہے اس مجموعہ میں اگرچہ تمام اصناف سخن موجود نہیں۔ صرف چند قومی نظمیں مراثی، نا تمام غزلیں ہیں۔ تاہم ان سے مولانا کی ذکاوت وطباعی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ اسلئے اس مضمون میں ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ مولانا کا رنگ کیا ہے۔ کلام میں زور ہے یا نہیں کلام میں فارسیت ہے یا نہیں۔ واقعے کی اصلیت ظاہر کی گئی ہے یا نہیں؟ اس لحاظ سے ہم الگ الگ عنوان قائم کر کے مولانا کے کلام پر مختصر سا ریویو کرتے ہیں۔

رنگ کلام

بہت سے تجربہ اور تحقیق کے بعد طے ہو چکا ہے۔ کہ کلام کی مقبولیت۔ اور عدم مقبولیت

---

[1] عربیت اور ضروریات زمانہ مراد ہے

کا دار مدار صرف رنگ کلام پر ہے۔ اور رنگ کا انحصار صرف زبان اور مضمون آفرینی میں ہو سکتا ہی۔ اور چونکہ من حیث الاغلب شیرینی زبان کے لطف اٹھانیوالے اور اُسکے جاندادہ زیادہ تر پائے جاتے ہیں اسلیئے مولانا بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اُنکے کلام کو خوب غور سے پڑہو صاف ظاہر ہوگا کہ لفظ لفظ میں مصرع مصرع میں زبان کی چاشنی کا کسقدر لحاظ رکہا ہی۔ چنانچہ ہم چند شعر پیش کرتے ہیں ؎

تا کے[1] زغم نہان نگویم — گویند مگو چسان نگویم
دارم جگرے و میتوانم — کافسانۂ باستان نگویم
از عربدۂ فلک ننالم — از نیک و بد جہان نگویم
از نالۂ دل اثر نخواہم — از داغ جگر نشان نگویم
رفت انچہ نبود بر سپہر بر من — یک حرف ازان میان نگویم
این جملہ ہمیں توانم اما — نتوان کیں داستان نگویم
در ماتم خان اعظم الدین — جز قصہ خونچکان نگویم

آہ از غم این چنیں امیرے
شیر افگن و شیر گیرے

ہوش[2] میگفت باں فتنہ گر ہوش ربائے — یکرہ از جلوہ بیارام کہ آیم بر جائے
جائے راحت بنود سینۂ پرسوز ایدل — آہ و در سایۂ مژگان ترم می آسائے

بہ تحسین[3] صبوری چند بفریبی مرا ناصح — دمے بگذار تا در ماتم فیض الحسن گریم
چہ در دل داشتی تا از کہ رنجیدی چرا رفتی — زبان بگستہ ای مولای ما آخر کجا رفتی
کہ یارت بود آنجا با کہ امیں ہمنشیں خفتی — ہنر را پایہ بالا بردی و خود در زمیں خفتی

زبان پر قدرت اور عربی ادب کے مذاق کا یہ اثر ہے کہ فارسی اشعار میں عربی زبان کے جملے۔

[1] از مرثیہ جنرل اعظم الدین خاں [2] از مرثیہ مولوی فیض الحسن صاحب [3] از ترکیب بند ندہ

اور ضرب المثلوں کو اس خوبی کے ساتھ تضمین کر جاتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عرب اپنے اصلی مرکز (یعنی زبان عربی سے ہٹکر) پھر قدرتی طور پر اُسیکی طرف رجوع کر جاتا ہی۔

درد[1] ز اندازہ گذشت و بلغ السیل زباہ	رفت سر رشتۂ صبر از کف وللدہر فنوں
شاہ[2] فلک کوکبہ عبد الحمید	ایدہ اللہ بنصر مزید
طرز[3] اندیشہ نو کنم اکنوں	نشنیدی کہ الحدیث شجوں
حضرت[4] خواجہ امین اوصلنی اللہ بہ	صاحب لطف و کرم صیّر نی اللہ فداہ
باصد اندیشۂ غرض دل بنہادم بسفر	بزباں بود کہ لا قوۃ الا باللہ
چوں حدیث من وحیرانی من باز شنید	گفت لا حول و لا قوۃ الا باللہ

رعایت لفظی اگرچہ ایک مستقل چیز ہے۔ لیکن چونکہ زبان کے رنگین بنانے کا ایک ذریعہ ہی۔ اسلئے زبان ہی کے سلسلہ میں داخل ہی۔ آج چونکہ اس صنعت کو اکثر شعرا نے مقصود بالذات بنا لیا ہے۔ اس لئے اب یہ طریقہ معیوب خیال کیا جاتا ہی۔ خود مولانا بھی اسکے مخالف ہیں۔ لیکن جہاں کہیں اس صنعت کو کام میں لائے ہیں۔ وہاں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عیب کو ہنر کے قالب میں ڈھالدیا ہی۔

فاش[5] گویم کہ سخنگوئی زماں روی نہفت	تیرہ شد دہر کہ نیّر ز جہاں روی نہفت
درجہاں نخل ہنر را ثمرے بود نماند	نظم را خانۂ اقبال ویرے بود نماند

زباں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہی۔ کہ شعر کے تمام اجزا ایک دوسرے سے الگ اور ممتاز ہوں یعنی پھر وہ نثر میں نہ ادا ہو سکیں۔ اس خوبی کو مولانا کے ان اشعار میں ڈھونڈ ہو۔

زین[6] دو سہ حرف فزوں نیست مغان اسخنے	کہ بہار آمد و ابر آمد و باراں آمد
دو جہاں ایںہمہ برہم شدہ چوں است وچہ ہست	آسماں حلقۂ ماتم شدہ۔ چوں است وچہ ہست

[1] مثنوی جس میں سلطان المعظم کے سواری کا سماں دکھایا گیا ہی [2] مثنوی تمام بوزالیغی فرحت [3] نامہ بسوی خواجہ امین اللہ [4] ... [illegible]

مہر داغ دل عالم شدہ چوں است و چہ ہست | اختراں دیدۂ پرنم شدہ چوں است و بہرچہ است

شاید روز بمرگ کہ بماتم بنشست
از چہ؟ لیلائے شب آشفتہ و درہم شکست

مولانا کے کلام میں زبان کی اور بھی بہت سی خوبیاں ہیں جو مستقل عنوان میں نہیں بیان کیجا سکتیں۔ اسلئے ہمنے اُن کو نظر انداز کر دیا۔ مثلاً اس تقسیم کو دیکھو اور لطف اُٹھاؤ۔

در جلوہ گاہ حسن دل پارہ پارہ را
نیمے ازاں بہ نرگس مستانہ باختم

شبلی نگر کہ تا بچہ عنوان فروختم
نیمے دگر بہ غمزہ پنہاں فروختم

زورِ کلام

مولانا کا دل چونکہ قومی جوش سے لبریز ہے۔ اسلئے اُنہوں نے جو قومی نظمیں لکھی ہیں۔ اُن سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ایک عرب رجز خوانی کر رہا ہے۔ اور زبان کی صفائی نے اس جوہر کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ مولانا حالی زمانے کے نشیب و فراز کی تصویر خوب کھینچتے ہیں۔ لیکن تعریض اور انبعاث میں مولانا کا پلہ اُن سے بھاری ہے۔ ان دونوں بزرگوں میں خطیب اور حزن خواہ کا فرق ہے۔

می نہنید کہ رسید ما آنکہ بفضل
چیست آخر کہ بایں پیری و ایں ضعف بدن
تا چہ حال است کہ آتش زنفس مے بارد
ایں ہمہ غلغلہ آخر نہ بود بے چیزے
حضرت حالی و شمس العلماء را بنگر
تا چہ پیش آمدہ کیں ناموراں را بجہاں
شرح ایں قصۂ جانسوز نگفتن تا کے

رہبر قافلۂ ماست بہر راہ گذار
از علیگڑھ بہ دکن آید و جوید تیمار
تا چہ حال است کہ خوں میچکدش از گفتار
ایں ہمہ ولولہ بے صرفہ نباشد زنہار
واں دگر دیدہ ورانے کہ بودش انصار
در بدر گشتن و دریوزہ گری گشت شعار
سوختم سوختم ایں سوز نہفتن تا کے

لہ غزل ۴۵ ترکیب بند قومی براے حیدرآباد۔

ہاں وہاں گوش بدارید کہ می گویم باز	داستانے کہ غم افزا بود و زہرہ گداز

واقعہ کی اصلی تصویر کھینچنا شعراور شعر کی حقیقت میں داخل ہی لیکن کسی شعر میں یہ صفت کمال نہیں پایا جا سکتا۔ جب تک شاعر قادر الکلام نہو۔ مولانا کو اسمیں اسقدر کمال حاصل ہی کہ لفظ واقعے کی اصل تصویر ہوتا ہے۔

واعظ آراستہ عمامہ وازروی شرف	شملہ را کرد چو سر رشتہ امید دراز
زاہد سادہ ہم از کلبۂ تنہائی خویش	با کہن خرقۂ خود رفت بروں بہر نماز
باہمہ شوکت و فر باہمہ تمکین و شکوہ	خلق در عید گہ آمد زرہ صدق و نیاز
نفسے چند نشستند دو زانو وانگہ	راست چوں سرو ستادند پے ذکر و نماز
مفتی شہر ہم از جا با ماست برخاست	باہمہ صدق و صفا باہمہ اخلاص و نیاز
آنچہ بایست ز ترتیل و سکوں در قرأت	ہمہ بر وجہ حسن کرد ادا آں ممتاز
پس دگر خطبۂ لفب سود آں از ملبسہ	خطبہ چوں سخن قامت محبوب دراز

تاریخی واقعات۔ مختلف شہروں کے بھدے نام۔ امرا کا طول وطویل لقب۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر شعر میں لائی جائیں۔ تو ترکیب کی چستی۔ زبان کی صفائی بندش الفاظ میں ایک نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہی۔ مولانا کے اکثر قصیدی اس قسم کے القاب اور ناموں سے بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے زبان اور ترکیب کی چستی میں بال برابر فرق نہیں آتا۔ اور لطف یہ کہ اکثر تخفیف کا قاعدہ بھی نہیں جاری کرتے۔ اور یہ اونکے قادر الکلامی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

داور داد گر خسرو اقلیم دکن	میر محبوب علیخاں کہ بود زش وقار
آسماں جاہ فلک پایہ بشیر الدولہ	بازوے دولت و دستور شہ ملک آرا
منتخب حضرت غرناطہ و بغداد و حوزی	قدمے رنجہ کن و در حرم مسجد آئے

لہ قصیدہ عیدیہ ؎ ترکیب بند قومی سیر آباد

بدورش جائیست کہ تا چشم زنگہ کارکند	زورق وکشتی دو ز ایوب بود سر تا سر

(فارسیت)

آج تمام دنیا میں فارسی زبان کی ہمدردی کا غلغلہ مچا ہوا ہے - یہ آواز قومی حیثیت سے گو ایک دلکش آواز ہے - لیکن فارسی لٹریچر اس سے کچھ نہیں متاثر ہو سکتا یہ تو عام حالت ہی - بعض لوگوں نے اس نقطے سے قدم آگے بڑھا کر فارسی کی مزاج پرسی بھی کی - لیکن اوپری دل سے - مولانا حالی کی ایک آدہ نظمیں فارسی زبان میں ہم نے دیکھیں - اور سنجر تو خود ایرانی شاعر ہی - جو مدتوں ہندوستان میں پھر کر اپنی طباعی کی داد لیتا رہا - اوسکی بھی ایک نظم ندوہ کی سالانہ روئداد میں شائع ہوئی ہے - جو ہمارے پیش نظر ہی - اس موقع پر ہم کوئی کلی رائے تو نہیں قائم کرسکتے - مگر یہ نظمیں درحقیقت ملایانہ نظموں سے زیادہ قابل قدر نہیں ہو سکتیں اصل یہ ہی کہ فارسی زبان کا اصلی لطف اُسیوقت شعر میں قائم رہ سکتا ہی: جب امور ذیل کا لحاظ رکہا جائے -

(۱) خالص فارسی ہو -

(۲) جو خیالات دل میں آئیں فارسی ہی زبان میں آئیں ورنہ شعر محض ترجمہ ہوگا -

(۳) جو محاورے ہوں اُسی زبان کے ہوں -

(۴) عربی الفاظ ہوں مگر وہی جو فارسی الفاظ کے مشابہ ہیں -

(۵) ایرانی رسم ورواج کا بھی لحاظ ہو -

اب اس معیار پر مولانا کے کلام کو پرکہو تو ایک ذرہ فرق نہ پاؤ گے - چنانچہ ہم زیادہ وضاحت کے لئے ہر ایک کی مثال دئے دیتے ہیں -

خواجہ[2] از خانہ برون آئے کہ دیدن دارد	ایں ہمہ گرمی ہنگامہ واین زینت وساز
مردمان بسکہ زہر گوشہ فراز آمدہ اند	تنگہ از تنگی جا بار نیابد بدباز

[1] قصیدہ سفریہ [2] قصیدہ عیدیہ ۱۲

آں یکے جلوہ فروش آمدہ در خانہ زین	واں دگر برزدہ بر ہودج زر بالش ناز
ہمت بہ نگاہی کند و حوصلہ بشکرد	کان نیز گہے با من دگہ باد گرو داشت

ان اشعار میں صرف ہمت - جلوہ - زینت عربی الفاظ ہیں لیکن اگر محض فارسی داں سے پوچھو تو شاید بمشکل تفریق کر سکے۔

ای کشتۂ ظلم ای خبر گیر	ویں نالہ بگوش در گیر
ایں مہ بخسوف مے نیرزد	از چہرہ نقاب خاک برگیر
برخیز و ہماں برسم پیشین	ہم تیغ بدست و ہم سپر گیر
ترکانہ کلہ بفرق بشکن	چار آئینہ و زرہ ببر گیر
مردانہ خرام و ہمرہی را	اقبال و سعادت و ظفر گیر

ردیف کا مختلف پہلوؤں سے نبھنا - زبان کی صفائی، بیساختگی، رقت - حلفی شہادت دی رہے ہو کہ یہ اشعار اردو تصورات کا ترجمہ نہیں - محاورے کا یہ التزام ہے کہ ایک قدم بھی اہل زبان کے مرکز سے نہیں ہٹتے - چنانچہ انہیں اشعار میں دیکھو - نالہ بگوش درگرفتن - بخسوف نمی ارزیدن - از چہرہ نقاب گرفتن - کلہ بفرق شکستن کس زبان کے محاورے ہیں - کیا کوئی فارسی شاعر اس سے بڑھکر محاورونکا التزام کر سکتا ہے؟

عربی الفاظ کی طرف بھی انہیں اشعار میں توجہ کرو - ظلم - خبر - خسوف - نقاب - فرق - اقبال - سعادت - ظفر - عربی زبان کے الفاظ ہیں - مگر اسکی ساتھ فارسی خزانے کے بھی لعل و گوہر ہیں۔

ایرانی رسم و رواج کا لحاظ بھی انہیں اشعار میں کرو - چار آئینہ و زرہ ببر گرفتن کنکا کام ہے میرے نزدیک تو لکھنؤ کے شربتی پسند اسکے مستحق نہیں - اسیطرح در خانہ زین بجلوہ فروشی آمدن - بر ہودج زر بالش ناز زدن - عجمی ہی جشن و طرب کے لوازمات ہیں۔

[1] غزل [2] مرثیہ جنرل عظیم الدین خاں۔

واقعہ کی اصلیت

یہ وہی جوہر ہے جسکی بنا پر اردو اور فارسی شاعری کو مجموعۂ توہمات کا لقب دیا گیا ہی۔ اسی جوہر نے آج میر۔ ناسخ۔ آتش۔ غالب۔ عرفی۔ نظامی وغیرہ کو باوجود ادعائے حسب وطن شکسپیر کا ناک پا بنا دیا ہی۔ آج اسی جوہر کے سر پر "نیچرل شاعری" کا خوشنما سہرا نظر آتا ہے لیکن سوال یہ ہی کہ اس لفظ کے معنی کیا ہیں۔

اسکا جواب عموماً تمام انگریزی خوانوں کی طرف یہ دیا جاتا ہی کہ واقعات کسی قسم کا تصرف نکیا جائے حقیقت حال اسطور پر بیان کیجائے۔ کہ اگر مخاطب خود اس موقع پر موجود ہوتا تو اسکو وہی کیفیت حاصل ہوتی جو شعر سننے سے حاصل ہوئی ہی۔ اس بنا پر محض لفظوں کی نشست۔ اور اُنکے الٹ پھیر کا نام شاعری ہے۔ مثلاً تم نے ایک سیاہ آدمی کو دیکھا تو شاعرانہ حیثیت سے تمہارا صرف یہ فرض ہی کہ یوں کہدو کہ وہ سخت سیاہ آدمی تھا۔

لیکن یہ سخت غلطی ہے۔ شاعر کا حاسّہ عموماً قوی ہوتا ہے۔ اسلئے محسوسات کا اثر نہایت شدت کے ساتھ اُسکے حواس پر پڑتا ہے۔ اس بنا پر وہ چاہتا ہے کہ اسی شدت کے ساتھ وہ کیفیت سامع کو بھی محسوس ہو۔ لیکن اپنا سا حواس مخاطب میں پیدا کردینا شاعر کا کام نہیں۔ اسلئے وہ فطرۃً اس کیفیت کو تشبیہ سے استعارہ سے نازک الفاظ سے مختلف طرز بیان سے مخاطب کے خیال میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسکی مثال بالکل عید کے چاند کی ہی۔ ایک ہی شخص جوش شادمانی میں کبھی اُسکو دوربین سے۔ کبھی مسجد کی چھت سے کبھی دریا میں غرض مختلف حیثیتوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن ان دیدہ ریزیوں کا حاصل صرف اسقدر ہی کہ چاند کی پوری تصویر آنکھوں میں اُتر آئے۔ تاکہ عید کی خوشی دوبالا ہوجائے۔ اور اسکو کوئی شخص معیوب نہیں سمجھتا۔ اسیطرح نازک استعارہ۔ واقعہ کا نشیب و فراز۔ تشبیہ طرز بیان کا چڑھاؤ اتار کوئی عیب نہیں۔

اسی اُصول کا پیمانہ جب ضرورت سے زیادہ وسیع کردیا جاتا ہی۔ تو اُردو اور فارسی

کی موجودہ سرحد کا راستہ کھلجاتا ہی۔ فرض کرو کہ تم نے ایک خوبصورت شخص کو دیکھا۔ اب اگر تم اوسکے حسن کی تصویر کھینچنا چاہتے ہو تو تمہارا صرف یہ فرض ہے کہ پھول سے رنگ لیلو۔ آفتاب سے چمک۔ چیتے سے کمر۔ ہرن سے آنکھ اور اس ذریعہ سے اُسکے حسن کا نقشہ دکھادو لیکن[1] اسطور پر نہیں کہ یہ تصویر بجای خود ایک مستقل تصویر بنجائے۔ اور اسکے دیکھنے سے صرف اُس شخص کی خیالی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائے بلکہ اس طور پر کہ اوسکی تصویر خود آنکھوں کے سامنے کھڑی کر دیجائے۔ اور یہ چیزیں بطور رنگ آمیزی کے کام لائی جائیں حاصل یہ کہ فرقۂ جدید کی سادگی۔ اور قدیم فرقہ کا تصنع دونوں میں بڑا اعتدالی پائی جاتی ہے۔

آج انہیں غلط فہمیوں سے اُردو زبان کے شعرا میں رقابت ہو چلی ہے۔ لیکن مولانا نے اس نکتہ کو خوب سمجھا ہے۔ چنانچہ ندوۃ العلما کے سالانہ جلسہ میں اُنہوں نے جو ترکیب بند پڑھا تھا۔ اوسکے تمہیدی بند ہم نقل کئے دیتے ہیں۔ ناظرین خود انصاف کریں کہ علما کی حالت کی جو تصویر اُنہوں نے کھینچی ہے وہ حقیقت حال سے کسقدر دست و گریبان ہی۔ اور اسکے ساتھ شاعری کے لوازمات کا بھی کسقدر التزام ہے۔ اسکے ساتھ انہیں اشعار میں بعض امور متذکرہ بالا کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔

ایکہ پرسی چہ کسانیم و چہ سامان داریم	آنچہ باہیچ نیرزد بجہاں آں داریم
ما نہ آنیم کہ دیہیم سکندر طلبیم	ما نہ انیم کہ اورنگ سلیماں داریم
ما نہ آنیم کہ برشیوۂ ارباب حشم	روی ورا ہے بدر دولت سلطاں داریم
ما نہ آنیم کہ باحاجب دربان باشیم	ما نہ آنیم کہ بام و در و ایوان داریم
ما نہ آنیم کہ با مسند و بالیں ارزیم	ما نہ آنیم کہ سرداب و شبستاں داریم
ما نیرزیم بدان پا نہ کہ چوں محتشمان	جامہ از قاقم و استبرق و کتاں داریم

[1] یہی قدیم شاعری ہے اور یہی ہماری نوجوانوں کے لئے باعث اعتراض ہی ورنہ یہ طرز چھوڑ دیا جائے تو یہ اعتراض کی کوئی وجہ نہیں

ما نہ آنیم کہ یک شیوہ بآئیں گیریم | ما نہ آنیم کہ یک کار بسامان داریم
خاکساران جہانیم وز اسباب جہاں | بوریائیست کہ در کلبۂ احزاں داریم
جز سیۂ خامہ و اوراق پریشاں نبود | بیش و کم آنچہ بہ پیدا و بہ پنہاں داریم
گاہ گاہے بسوی کلبۂ ما باز خرام | تا بہ بینی کہ چہ برگ و سر و ساماں داریم
تو کباب برہ و شہد و شکر میجوئی | ما ہماں پارۂ نانے بسر خواں داریم
تو غلاماں کمر بستہ بفرماں خواہی | ما غلام خود و خود گوش بفرماں داریم

ہم بیک حال بود بے سر و سامانے ما
کہنہ ہرگز نشود جامۂ عریانے ما

عجز و افتادگی و طوع و رضا خواہی ہست | گر ز ما شیوۂ پشمینہ ما خواہی ہست
افسر و تاج و کمر بند و کلہ جوئی نیست | جامۂ کہنہ و پارینہ ردا خواہی ہست
قصر و بام و حرم و گنبد اگر خواہی نیست | مسجد و منبر و محراب و دعا خواہی ہست
آں مئی کوز فرنگست نداریم بجام | بادۂ خمکدۂ صدق و صفا خواہی ہست
شرح افسانۂ روم نتواں جست ز ما | ور ولا ویز حدیث خلفا خواہی ہست
ما ہداوا سے تپ و درد ندانیم ولے | گر ز رہ بخوری الکا و شفا خواہی ہست
ما خرافات کہن یاد نداریم ولے | گر ز ما سلسلۂ حمد و ثنا خواہی ہست
گفتۂ بیکن و دیکارٹ نداریم بیاد | ور حدیثے ز رسول و کبرا خواہی ہست

بے نوائیم ز ما فرۂ دنیا مطلب
آنچہ در کیسہ نداریم تو از ما مطلب

مولانا کے کلام میں اسکے علاوہ اور بھی بہت سی خوبیاں - اور جدید مضامین ہیں - لیکن ہم بخوف تطویل اُن اشعار کو نظر انداز کرتے ہیں - لیکن اسکے ساتھ ہمنے اور بھی ایک خوبی بلکہ نظر انداز کر دیا ہے - یعنی کلام کا عیب و قبح دکھانا - اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ میں

اسقدر وسیع النظر نہیں کہ ماہرین فن کا کھوٹا کھرا صحیح طور پر پرکھ سکوں - حالانکہ یہ نکتہ تنقید کا عرض لازم تھا - بہرحال کتاب - منیجر المعین - دار العلوم ندوۃ العلما سے ۸ر قیمت پر مل سکتی ہی - اب ہم اپنے مضمون کو خود مولانا کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں -

روشنم شد ز نوا سنجی شبلی کامروز	ہند را نیز قمی ہست و صفاہانی ہست

عبد السلام طالب علم دار العلوم ندوۃ العلما - از لکھنو -

مکتوبات امیر مینائی

حسب خواہش جناب اڈیٹر صاحب اُردو ی معلی ہر نمبر رسالۂ اردوی معلی میں دو صفحے مکتوبات کے دیے جائینگے - اور یہ سلسلہ اسوقت تک جاری رہیگا کہ احباب تلامذۂ استاذ امیر مرحوم ایک معتدبہ ذخیرہ مکتوبات کا بندۂ ثاقب کے پاس بہیجدیں - جب کافی تعداد خطوط کی ہو جائیگی تو علیحدہ کتابی صورت میں انشاء اللہ تعالی شایع کیے جائینگے -

دفتر قند پارسی علی گڈہ — محمد احسن اللہ خاں ثاقب

حکیم عابد علیصاحب کوثر خیرآبادی کے نام

پیارے کوثر - ملفوف کاغذ میں لکھوا کر بہیجتا ہوں اسکو آپ دیکھ کر اپنے مراسم کے موافق احمد علیخانصاحب منصور آبادی کو جلد لکھ کر بہیجدیں اور کوئی دقیقہ کاربراری کا فروگذاشت نکریں بلکہ مجہی جلیل سی سخت انفعال ہی اور اُن کی کامیابی کا نہایت ہی خیال ہی - افسوس ہی کہ عوارض و مکارہ کی وجہ سے سفر نکر سکا ورنہ ضرور وعدہ اُنسی وفا کرتا اور بسبب اسکے کہ جلیل کو دفتر سی علیحدہ ہونے دینا بہی پسند نہیں اور اُنکے والد درویش صفت وضعیف دنیا کے تعلقات سے کنارہ مکان پر ہیں اُنسے کوئی دنیاوی کارروائی ہو نہیں سکتی بلکہ وہ خود پیرانہ سالی سی ایک دلسوز خدمتگزار کے محتاج ہیں ان وجوہ سی جلیل کا دور جانا نہیں چاہتی ورنہ دکن میں انکا نوکر رکہوانا ممکن تہا - آدمی یہ ایسے اچہی ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پہیلیں - میں اُن کی علحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں مگر مجبوری گوارا کرتا ہوں بشرطیکہ اسی جوار یعنی قرب وطن میں انکی بسر کی صورت نکلے چونکہ مجہو خوب معلوم ہی کہ اس جوار میں عموماً لوگ تمہارے معتقد اور خصوصاً احمد علیخانصاحب کو

بہت ہی تمہارا لحاظ ہو تم تہ دل سے کوشش کروگے تو ضرور جلیل کامیاب ہوجائینگے لہذا بہت ہی اصرار سے لکھتا ہوں کہ سرگرم حاجت روائی ہو جئے۔ زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں۔ آپ خود مجمع اوصاف حمیدہ ہیں۔ اللہ آپ کی عمر دراز کرے اور اقبال بڑہائے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ میرا حال بدستور اور ممتاز احمد کو امید اندمالِ زخم تو قوی ہے مگر ہنوز رنجور و معذور ہے اور عزیز بھی گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ آج کل پریشانیاں بڑہی ہوئی ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔ میں بہت منتظر رہوں گا کہ کب آپ احمد علیخانصاحب کا خط مشعر طلب جلیل بھیجنگے۔ تعجیل و تکمیل کے ساتھ کوشش کیجئے فقط۔ سب اطفال اور اہل ذو مخصوصاً جلیل و آہ سلمہما اللہ ماد جب ساں ہیں۔ دلنوازا۔ اسوقت ڈاک سے ایک تھیلی مجھی پہنچی جسکے پر فقط ایک دوڑا لپٹا ہوا تھا اور دوڑے پر لاکہ کی مہر بھی نہ تھی شاید دہوکے سے یوں ہی روانہ ہوگئی۔ اب آپکا خط آے تو طریق استعمال معلوم ہو اطمینان کے واسطے یہ دو سطریں بطور رسید لکھدیں فقط

امیر فقیر۔ ۵ رفروری ۱۸۹۲ء

بنؔ ثاقب کے نام

آئینہ جمال فتوت۔ جمال آئینہ مروت اعلی اللہ شانکم۔ بعد سلام و شوق کے عرض کرتا ہے راقم تقصیر امیر فقیر کہ یہ رنجور ڈیڑہ مہینے سے دربار جانے سے معذور تہا اسی سے تعمیل حکم میں قصور ہوا۔ عذر خواہ ہوں و العذر عند کرام الناس مقبول آتش بید و دکا ایک نسخہ مجھے ہدیتہً پہنچا اسکا شکر کس زبان سے ادا کروں۔ میری عاجز کو پیرایۂ سپاسگزاری سمجھئے۔ جو نسخہ حضور میں مع عرضداشت گزرا تہا سرکار نے بہت شوق سے اُسکو ملاحظہ فرمایا اور ارشاد کیا کہ ہماری طرف سے بہت تعریف لکہو اور دیوان فارسی تذکر بہیجو۔ حسب الحکم پارسل دیوان کی روانہ کرتا ہوں۔ اس خط کو لکہتے وقت ایک عنایت نامہ مع حاشیہ اصغر للّاب بہجا اُسنے اور زیادہ منت پذیر کیا۔ امید وار ہوں کہ مجھکو مخلص ممنون تصور فرماکر ہمیشہ کار ہائے لائقہ سے سرفراز فرمایا کیجئے اور چونکہ دائم المرض و ضعیف النسیان ہوں تو دیر کو جواب لکھنا اگر کبھی واقع ہو تو عفو فرمانا۔ فقط معروضہ امیر احمد عفی عنہ۔ ۲۶ رشوال ۱۲۹۷ ہجری۔

سائنس و کلام

نئی روشنی کی سائنس نے ایک عرصہ دراز سے اپنی شفاف غیر مکدر شان انجلا کی وجہ سے ہندوستان کی چشم کمال بین میں مختلف طور پر اثر کیا ہے ہندوستان نے جو اس سے پہلے بھی مختلف قوموں کے آباد ہونے کی وجہ سے ہر قسم و ہر رنگ کے علوم و فنون کا سرچشمہ رہا ہے بہت خوشی کے ساتھ اس سائنس کا خیر مقدم کیا۔ یہ نئی سائنس اصولاً نئی نہیں ہے۔ اسکے کلیات اسکے طرق استدلال اسکے نتائج اشکال عقلیہ سب وہی ہیں جو قدیم سائنس میں موجود ہیں جسکو خواہ فلسفہ یونانی کہو یا عربی فلسفہ مگر جس چیز نے اسکو جدید سائنس کا خطاب دیا وہ میرے نزدیک اُسکی سلاست اور اُسکا سادہ طرز بیان ہے جسکو معمولی قسم کا آدمی سمجھ سکے۔ نیز اُس سے عملی تجربوں اور اختراعات متنوعہ کیطرف ایسی توجہ کی گئی کہ اُنہوں نے سائنس کو نمایاں طور پر چمکا دیا۔ ہمارے یہاں کی سائنس اور خصوصاً وہ حصہ سائنس کا جو ٹھیٹ مسلمانوں کا ہے یعنی علم کلام کچھ ایسا مدوّن ہوا ہے کہ سائنس کی دنیا میں تشکلانہ مذاق والوں کو اُس سے تشفی نہیں ہوتی اور ہر شخص بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔ اسمیں وہ مستثنیات نفوس نہیں داخل ہیں جو اپنی ممتاز عربیت و قابلیت کی وجہ سے بوجہ اتم مستفید ہو سکتے ہیں لیکن عام طلبہ کو کافی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔ فی زماننا نئی روشنی اور پُرانی روشنی والوں کی چند در چند کوتہ علمیوں و غلط فہمیوں کی وجہ سے یہ اصول قرار پا گیا ہے کہ جدید سائنس علاوہ قدیم سائنس سے مختلف ہونیکے مخرب و خلاف مذہب اسلام و آئین احکام شرعیہ ہے چونکہ اس اصول کے قرار پا جانے سے مختلف طبقوں میں خیالات غیر صحیح پہیلگئے تھے لہذا اکابر قوم نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ درحقیقت اس

غلط فہمی کو دور کرنیکے لئے طبقہ علمار سے بہتر کوئی طبقہ موزوں نہیں ہو سکتا ہے جسکے ذاتی اثر کے علاوہ علمیت کا اثر ہر طبقے پر بقدر استعداد موثر ہوتا ہے۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ اس طبقے میں اس خیال کے شیوع کے آثار نظر آتے ہیں اور نہ صرف تخیلاً بلکہ عملی حیثیت سے بعض علمار نے توجہ کی ہے ۔ میں اسوقت یہ تمہید جس مبارک کتاب کی ریویو کے لئے کر رہا ہوں وہ سائنس و کلام" کے خوش آیند نام سے ساتھ چھوٹی تقطیع پر مطبع نامی لکھنؤ میں طبع ہوئی ہے ۔ اس کتاب کے مصنف مولنا حافظ حاجی محمد قیام الدین عبد الباری صاحب عم فیضہ بہت ہی مغتنمات علمائے لکھنؤ سے ہیں فرنگی محل دار الاقامت ہے اور آپ وہیں کے مشاہیر علمائے سلف کے یادگار ہیں۔ علمائے فرنگی محل جس مرتبت کے گذرے ہیں اُن کا تذکرہ و فور شہرت کی وجہ سے تحصیل حاصل کی حکم میں ہے ۔ اس کتاب کا ایسے دار العلم کے عالم کی تصنیف ہونا ہی کتاب کا کافی ریویو ہے ۔ میں ذاتی طور پر مصنف ممدوح سے خادمانہ نیاز رکھتا ہوں اور نہایت سچائی سے لکھتا ہوں کہ ایسے روشن خیال متبحر و بے تعصب و جامع عالم اس زمانے میں کم ہونگے مصنف کا یہ خاص احسان مسلمانان ہند پر ہے کہ انہوں نے ایسی عمدہ تالیف فرماکے طبقۂ علمار میں عملی اور بہت موثر جوشیلی تحریک پھیلا دی جس سے امید ہے کہ اس خاموش طبقے میں نہایت بکار آمد بیداری پیدا ہو گی۔ یہ کتاب اُردو میں ایسی سلیس ہے کہ جیسی اس زمانہ میں مقاصد متذکرۂ صدر کیلئے ہونی چاہئے ۔ یہ کتاب سائنس و کلام کی سبجکٹ کا جزاوّل ہے امید ہے کہ بہت جلد پورا سلسلہ سبجکٹ کا مطبوع ہوگا ۔ اہل ملک کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ۔

سید آمین الحسن رضوی موہانی آنریری مجسٹریٹ از حیدرآباد دکن

"حقیقت میں کتاب سائنس و اسلام اسی تعریف کے مستحق ہے ۔ قیمت ۸ در درخواست خریداری بنام مولوی محمد سلامت اللہ صاحب فرنگی محل لکھنؤ کے نام جانا چاہئے ۔ فقط "الناظر"

تنقید

(۱) سودیشی تحریک ایک ایسی مفید اور مبارک تحریک ہے جسکے خلاف کوئی ہوشمند اور دانشمند آدمی اپنی آواز نہیں بلند کر سکتا یہی وجہ ہے کہ ملک کے بعض وہ دشمن بھی جو تمام ملکی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس تحریک سے علانیہ طور پر اظہار اختلاف کرتے ہوئے جھجکتے ہیں اور بمصداق "خوئے بد را بہانہ ہا بسیار" اس عذر کے ساتھ مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی سفارش کرتے ہیں کہ "ہم سودیشی تحریک کے حامی ہیں لیکن جس طور پر یہ تحریک آجکل جاری ہے اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ یعنی بوائکاٹ کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ بوائکاٹ وفاداری حکومت کے منافی ہے" لیکن ہم کہتے کہ بصورت موجودہ

سودیشی تحریک کی ترقی اور بوائکاٹ لازم و ملزوم چیزیں ہیں

جب تک لوگ مینچسٹر کے نرم باریک اور ظاہری بھڑک رکھنے والے کپڑوں سے قطعاً اجتناب نہ اختیار کرینگے تب تک ان کے مقابلے میں ہندوستان کے بنے ہوئے کپڑوں کی مانگ نہیں بڑھ سکتی اور جب تک ہندوستانی کپڑوں کی مانگ بڑھنے کی یقینی امید نہ ہوگی اُسوقت تک ہندوستان کی وہ سرمایہ دار اور کاریگر جو سالہا سال تک کاروبار تجارت سے مجبوراً علیحدہ رہنے کے سبب سے تجارتی حوصلہ مندی اور دور بینی سے تقریباً محروم ہوگئے ہیں اپنی دولت اور محنت کو اس صنعت پارچہ بافی سے دریغ رکھینگے جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس تحریک کی کامیابی ایک امر موہوم سے زیادہ نہ رہ جائیگی حالانکہ بوائکاٹ کی مدد سے ہندوستانی کپڑوں کی مانگ کا بڑھنا قطعی اور اسلئے مختلف کارخانوں اور ملوں کا قائم ہونا بھی یقینی ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ جب دیسی کپڑوں کے مختلف کارخانے قائم ہونگے تو اُن میں مقابلہ بھی ہوگا اور کاریگروں کی واقفیت اور کاریگری میں بھی ترقی ہوگی جسکا لازمی اثر یہ ہوگا کہ چیزوں کی خوبی میں بھی ترقی ہوگی اور کیا عجب ہے کہ کسیوقت میں اس خوبی کا درجہ یہانتک بڑھ جائے کہ پھر ہمکو انگریزی مال سے

مقابلے کا خوف ہی جاتا رہے اور بوائیکاٹ کی حاجت ہی نہ باقی رہے۔ کیونکہ ہندوستان میں محنت کی اُجرت کم ہونیکے علاوہ انگلستان کے مقابلے میں کرایہ آمدورفت اشیاکی اُجرت بھی بچیگی اور چند دیگر مشکلات کے باوجود بھی

ہم انگلستان سے علانیہ مقابلہ کرنیکے قابل ہوجا ئینگے

لیکن جبوقت تک ایسی حالت نہ پیدا ہو ہمارے نزدیک ہر محب ملک فرض ہے کہ

"غیر ملکی خصوصاً انگریزی چیزوں کو بوائکاٹ کرے"

انگریزی چیزوں کی خصوصیت اسلئے کی گئی ہے کہ سب سے بڑی تجارت یعنی کپڑے کی تجارت انگریزوں ہی کے ہاتھ میں ہے اور یہ ایک ایسی تجارت ہے جسکو ہم بہت جلد اپنے قبضے میں کرسکتے ہیں کیونکہ انگلستان کی بے انصافانہ پالیسی کے باوجود ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی بالکل مٹ نہیں گئی ہے اور بہت تھوڑی سی توجہ میں پھر اپنی اصلی حالت عروج پر پہنچ سکتی ہے۔ شاید اس موقع پر بعض حیلہ پسند و کمزور طبیعتیں یہ اعتراض کریں کہ انگلستان کے خلاف بوائکاٹ انگریزوں کی ناراضی کا باعث اور شان وفاداری کے خلاف ہوگا لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب انگلستان نے ہماری غفلت اور بے بسی کے زمانے میں صریح۔ بے انصافی کے ساتھ ہمارے صنعت پارچہ کو یہ محض ولایت والوں کے فائدے کے لئے دیدہ و دانستہ تباہ کرنا جائز سمجھا تو اب اپنی صنعت کو دوبارا ترقی دینے کے لئے

انگریزی مال کا بوائکاٹ ہرگز کوئی ملکی یا اخلاقی جرم نہیں ہے

اور اگر کسی کے نزدیک ہو بھی تو اُسے اپنی فرشتہ خصلتی۔ اور حکومت پرستی کا ناز بیجا ہو ہمارے نزدیک تو ایسے شخص کو ملک و ملت کا قطعی دشمن سمجھنا چاہئے بوائکاٹ کے خلاف سب سے زیادہ کمزور دلیل۔ یہ پیش کیجاتی ہے کہ بوائکاٹ چونکہ اہل بنگال نے شروع کیا ہے، اور تقسیم بنگال کے متعلق شروع کیا ہے اسلئے مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنا چاہئے۔

ہم کہتے ہیں کہ تقسیم بنگال مسلمانوں کے حق میں مفید ہو یا مضر لیکن جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس موقع پر اہل بنگال کی کوشش سے سودیشی تحریک کو ایسی تقویت پہنچی ہے جسکا اس سے قبل کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا یعنی یہ کہ تمام ملک میں اس تحریک کا غلغلہ مچ گیا ہے ایسی حالت میں اس عمدہ موقعہ سے فائدہ نہ اُٹھانا کسی عقلمند کا کام نہ ہونا چاہئے۔ ہم افسوس دیکھتے ہیں کہ بعض ناعاقبت اندیش مسلمان لیڈر اور اخبار نویس صرف بنگالیوں کی ناکامی کا تماشا دیکھنے کی غرض سے سادہ دل مسلمانوں کو دہوکا دینا اور انکو سودیشی تحریک اور بوائکاٹ میں شریک ہونے سے باز رکہنا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس قسم کی یعنی پرائی بدشگون کے لئے اپنی ناک کٹوانے کی صلاح دینا بڑے درجے کا ملکی گناہ ہے جسکی جوابدہی ان دشمنان ملک و قوم کو خدا کے روبرو کرنا پڑیگی ہوشمند مسلمانوں کو یاد رکہنا چاہئے کہ سودیشی تحریک کا خیال ایسا نہیں ہے کہ اب لوگوں کے دلوں سے محو ہو سکے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکہنا چاہئے اگر مسلمانوں کے لیڈر مسلمان سرمایہ داروں اور مسلمان کاریگروں کو اس تحریک کی جانب سے بے پروا رکہنے کی قابل لفرت کوشش میں کامیاب رہینگے تو دوسری قومیں اُن کی شرکت کی منتظر نہیں رہینگی بلکہ بربنائے ضرورت ان صنعتوں کو بھی ہاتھہ میں لے لینگی جو اب تک خاص مسلمانوں کا حصہ سمجھی جاتی ہیں جسکا نتیجہ یہ ہو گا کہ ۱۰-۱۵-برس کے بعد مسلمان پالیٹکس کی طرح میدان صنعت و حرفت میں بھی دیگر اقوام سے پیچھے رہ جائینگے اور اُسوقت ان کو معلوم ہو گا کہ جنکو ہم اپنا پیشوا سمجھتے تھے وہ درحقیقت ہمارے دشمن تھے۔

ہمارے نزدیک تقسیم بنگال کا جھگڑا ہمیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔ درانحالیکہ سودیشی تحریک کو جو امداد اس سلسلے سے ملی ہے وہ اب یقیناً قائم اور برترقی قایم رہینگی۔ پس جو لوگ آخر بین ہیں وہ تو تقسیم بنگال سے قطع نظر کر کے سودیشی تحریک اور بوائکاٹ میں شرکت کرینگے اور اسموقع سے ضرور فائدہ اُٹھائینگے لیکن جن لوگوں کی نظریں محدود اور دل تنگ ہیں

وہ صرف ہندو اور مسلمانوں کے عارضی یا مقامی جھگڑوں ہکیھڑ ونکے چکر میں پڑکر خود بھی محروم رہینگے اور خوف ہے کہ اپنی کم فہمی سے دوسروں کو بھی محروم رکھینگے۔

(۲) بنارس کانگریس اور مسلمانوں کا نفع نقصان | سال گذشتہ کی طرح جناب حاجی موسیٰ خانصاحب رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ نے اس سال بھی بنارس کے رزولیوشنوں پر مسلمانونکے فوائد کے لحاظ سے نظر ڈالی ہے اور عام طور کانگریس کی کارروائی کو مفید مسلمانان تسلیم کیا ہے اختلاف صرف چند موقعوں پر کیا گیا ہے مثلاً آپ چاہتے ہیں کہ انتخاب ممبران کونسل وغیرہ میں مسلمانوں کی نسبتی تعداد کا لحاظ ضرور ہونا چاہیے۔ اور اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی یہ خواہش بالکل درست ہے۔ البتہ جہاں آپ کانگریس کو اس امر پر پابند کرنا چاہتے ہیں کہ انتخاب میں مسلمانوں کی تعداد کا خاص خیال رکھے وہاں مسلمانوں کی جانب سے بھی کانگریس کو اس بات کا اطمینان حاصل ہونا ہے کہ مسلمان ممبر متفق علیہ مسائل پر ملکی فوائد کے خلاف گورنمنٹ کا بیجا طور پر ساتھ دیکر ملک کو بجای فائدہ کے نقصان نہ پہنچائینگے کیونکہ بصورت دیگر آپ کی تجویز کے یہ معنی ہونگے کہ کانگریس اپنے دشمنوں کو اپنا قائم مقام تسلیم کرے اور یہ کسیطرح جائز نہیں ہوسکتا۔

ہماری خیال میں جب تک مسلمانوں کے چند قائم مقام کانگریس کے لیڈروں سے ملکر تبادلہ خیالات نکریں اور متفق علیہ مسائل کی نسبت فیصلہ نہوجای اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جبتک مسلمانوں میں وہ اخلاقی ہمت پیدا نہو جسکو سالہا سال کی مضر پالیسی یعنی پولیٹکل معاملات سے علیحدگی نے تقریباً مٹا دیا ہے اسوقت تک حاجی صاحب کی بجا اور بالکل بجا خواہش مشکل سے پوری ہوسکیگی اور ہم پہلے بھی دکھلاچکے ہیں کہ جہاں کہیں مسلمانوں نے پولیٹکل معاملات میں ہمہوں کا ساتھ دیا ہے وہاں اہل کانگریس نے بھی اُنکے انتخاب کو بخوشی منظور کیا ہے۔

دوسرا اعتراض آپکا کانگریس کی اس رزولیوشن پر ہے جسمیں مشرقی بنگال میں سرکار کی جابرانہ کارروائیوں پر اظہار رنج کیا گیا ہے اور بنگالیوں کی تحریک بائکاٹ سے ہمدردی ظاہر کی گئی ہے۔

حاجی صاحب کے نزدیک یہ تجویز کانگریس کی شایان شان نہیں ہے۔ لیکن ہماری خیال میں جو جو ظلم بنگالیوں پر ہوئے ہیں انکے لحاظ سے کانگریس رزولیوشن کے الفاظ کو اس سے زیادہ سخت ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً حال میں بریسال کانفرنس کے موقع پر مسٹر سریندرناتھ بنرجی کی گرفتاری اور توہین کے واقعہ کو دیکھکر کوئی ہندوستانی جسکے دلمیں اپنے ملک کی کچھ بھی وقعت ہوگی بنگالیوں کو الزام نہیں دیسکتا

حصہ نظم

(روح)

از جناب مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

روح کیا ہے؟ امر رب ذوالجلال — دخل دے انسان کیا اسکی مجال

روح کیا ہے؟ آمر حصن بدن — خسرو کشور کشائی ملک تن

روح کیا ہے؟ معنی لفظ حیات — روح کیا در اصل ہے اک اسم ذات

روح سے قائم سب ارکان حیات — روح سے وابستہ ساری کائنات

باعث ایجاد عالم روح ہے — مورث شادی و ماتم روح ہے

ہے اطبا کا یہ قول اے ہوشیار — دل میں پیدا ہو جو پاکیزہ بخار

روح کہتے ہیں اسکو لاکلام — ہے اسی سے زندگی کا انتظام

روح وہ جوہر ہے سن لے اے حکیم — نفس کے اعراض ہیں جس پر مقیم

عین اشیا فی الحقیقت ہے یہی — آگ میں دیکھو حرارت ہے یہی

آب میں دیکھو برودت ہے یہی — پھول میں دیکھو تو نزہت ہے یہی

طبع میں دیکھو تو جودت ہے یہی — جسم میں دیکھو تو طاقت ہے یہی

بہتریں جملہ صنعت ہے یہی — حاصل معنی فطرت ہے یہی

سب جگہ ہے یہ خلا ہو یا ملا — ذرہ ذرہ میں ثبوت اسکا ملا

اسکا نفس ناطقہ بھی نام ہے — جسم اسکا بندۂ بے دام ہے

یہ وہ ہے قابض رہے اسے بیخبر — سب اثاث البیت تن پر عمر بھر

تھا اجازت سے اسکی خورد و نوش — ساری اعضا اسکے ہیں حلقہ بگوش

وہم اسکا بھر لی نہیں سب قوتیں — اسکی راحت سے تھیں سبکی راحتیں

تھا اسیکا دور دورہ ہر طرف ‏ ‏ کالبد اپنا سمجھتا تھا شرف

دلمیں اسکو دی جگہہ بالاتفاق ‏ ‏ ضعف ہی ہوتا تھا اسکا سبکو شاق

چونکہ پاتا ہے کمال اکدن زوال ‏ ‏ ہر خوشی کے ہے نتیجہ میں ملال

بادشاہ و ملک گیر و شہریار ‏ ‏ بینوا ہو جائینگے انجام کار

ایک وقت ایسا مصیبت کا پڑا ‏ ‏ موت نے اسپر تسلط کر لیا

قابل عبرت تھی اوسکی بیکسی ‏ ‏ اُف رے اُسکا زور اوسکی بیبسی

ہای کیسی شرم سی مُنہ موڑ کے ‏ ‏ ملک کو جاتی ہے اپنے چھوڑ کے

کوچہ ہر رگ بیاباں ہوگیا ‏ ‏ قلعۂ دل سارا ویراں ہوگیا

ہے وہی اب طارم قصر دماغ ‏ ‏ ہوگیا سنسان جو مانند راغ

ہوگئی بیکار سب فوج قویٰ ‏ ‏ ملک بھر میں اک تلاطم ہوگیا

سچ ہے اُٹھ جائے جہانکا بادشاہ ‏ ‏ ہوگی اوس اقلیم کی حالت تباہ

ہے چراغ روح گل اور رات ہے ‏ ‏ ملک جسم اک وادی ظلمات ہے

دور دورہ روح کا جب تک رہا ‏ ‏ راحت تن کی نہ تھی کچھ انتہا

اب وہی تو جسم ہے اے بیخبر ‏ ‏ چشم عبرت سے خدارا اکر نظر

سیج پر پھولوں کے جو بیچین تھا ‏ ‏ آج دیکھو خاک میں سب ملگیا

بیکلی تھی جسکو خسخانہ میں آہ ‏ ‏ حال پر اوسکے ذرا کرنا نگاہ

اب ہی اک سنسان جنگل ہولناک ‏ ‏ جسطرف دیکھو اُدھر انبار خاک

کھولتا ہے موسم گرما سی آب ‏ ‏ کب زمیں پر پانوں رکھنے کی ہے تاب

آندھیوں کے زور بجلی کی کڑک ‏ ‏ سُنکے جسکا ذکر دل جائے دھڑک

وہ گرج بادل کی وہ پانی کا زور ‏ ‏ وہ ہوا اونکا ہر اک جانب کو شور

سنسناہٹ کا وہ عالم الاماں ‏ ‏ جنبش چکر میں زمین و آسماں

ہے یہ ہنگامہ قیامت کا بپا
خاک کے کچھ ڈھیر میں ہے وہ دبا

شام مرقد اوسپہ آندھیاری وہ رات
اف معاذ اللہ سے کہنے کی بات

گھنگی سے تختہائے قبر سب
گر پڑے ہیں ٹوٹ کے سینہ پہ اب

ہے منوں مٹی کا ڈھیر اُس جسم پر
ایک عالم کا بنا ہے رہگذر

یہ شدائد اب وہ جسم نازنیں
سہ رہا ہے اُف بھی کر سکتا نہیں

کچھ تو کہہ اے سونیوالے اپنا حال
دیر سے کرتا ہوں میں تجھسے سوال

کل تو تھا تو بلبل نغمہ سرا
آج چپ ہے اسقدر یہ کیا ہوا

تیری مجبوری کے صدقے کچھ تو کہہ
دم گھٹا جاتا ہے اب تو چپ نہ رہ

بات کرنا بھی تجھے دشوار ہے
اللہ اللہ اسقدر انکار ہے

کیوں لب شکر و شکایت بند ہے
آج کیوں باب محبت بند ہے

بس عزیزا کدن یہی درپیش ہے
فکر کر گر عاقبت اندیش ہے

محوِ لعبت خانۂ دنیا نہو
ہستی موہوم پر شیدا نہو

غزل جناب شمس العلما مولوی سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی

عدو کی آزمائش جب ہمارے امتحان تک ہے
تو لازم ہے کہ دیکھو صبر اسمیں بھی کہاں تک ہے

کسیدن تم اڑاؤ آنکھ صحرا میں غزالوں سے
ہمیں بھی دیکھنا ہے دیدۂ آہو کہاں تک ہے

نقاب اسنے جو اپنے چہرۂ روشن سے اُلٹا ہے
نمایاں نور کا عالم زمین سے آسمان تک ہے

خزانِ زندگی ہے تفرقہ اہل محبت کا
مزا دنیا میں جینے کا بہار دوستاں تک ہے

نہیں کم راہ پیمائی میں ہوں اے واعظ تمسے
تمہاری دوڑ مسجد تک مری مئے کی دکاں تک ہے

قدم رکھا ہے اس صحرا میں میرے یوسفِ دل نے
کہ جسمیں گرد راہ شوق گردِ کارواں تک ہے

غم الفت کے افشا سے ہے رسوائی سی رسوائی
عدو کا دوست بیتابی سے میرا راز داں تک ہے

جہاں اندر جہاں ہی ای اثر ترکیب عالم کی
کسیکو کچھ نہیں معلوم کب سے ہی کہاں تک ہے

غزل جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

بے خطر شوق ملال عشق پنہانی کرے
جو فرشتے سے نہو وہ طبع انسانی کرے

کچھ نہیں بیماریٔ غم کی ترقی کا ملال
دم نکلنے میں مگر اللہ آسانی کرے

چارہ گر تا حد امکان کام اپنا کر چکے
اب خدا ہی کچھ علاج درد پنہانی کرے

ہو گئی برہم مزاجی بھی شریک ناز دوست
کیا سمجھکر کوئی اظہار پریشانی کرے

یہ جواب نامۂ دلدار آیا ہجر میں
بیٹھکر رو ئیے گا غم جو طغیانی کرے

اُٹھ گئی قسمت سے تاثیر دوا میرے لئے
کون تکلیف علاج درد پنہانی کرے

تین حرفو نہیں ہی شرح ماجرای وصل و ہجر
روبروی یار کیوں تقریر طولانی کرے

محشر شوریدہ سر بھی اُٹھ گیا مجنوں کے بعد
کہدو وحشت بند رسم چاک دامانی کرے

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ تلمیذ حضرت ثاقب پارسی

ہی جستجوی مرگ جواب ہجر یار میں
کیا آگ لگ گئی دل امید وار میں

میں ہوں تو ساری یاس کی سامان ہیں کہ ہی
دست طلب امید کا دامانِ یار میں

اترا رہا ہوں میں کہ ہوا خاک کوی دوست
عالم غرور کا ہی مری انکسار میں

ہے بیم پر فشانیٔ پروانہ ہای ہای
اتنا بھی دم نہیں مری شمع مزار میں

مطلب ہی سیر باغ سی افزایش جنوں
ورنہ دھرا ہی کیا ہے نسیم بہار میں

کیا دلکو بہا گئیں تری وعدہ خلافیاں
آنے لگا ہی مجھکو مزا انتظار میں

تنگ آ گئے تغافل صبر آزما سی ہم
چٹکی ہی کاش لین وہ دل بیقرار میں

شرمندہ ہو کے گر گئے اپنی نظر سی آپ
یعنی کہ ہم سما نہ سکے چشم یار میں

آنا ترا بھی روز قیامت سے کم نہیں
ہے انتظار مرگ ترے انتظار میں

ہوں گلفروشِ جلوۂ صبح وطن ہنوز
بے لطف کیوں ہو شام غریبی غبار میں

وحشت نہ پوچھ ہستی جیب و جنون دست
وحشت نے گل کھلائے ہیں فصل بہار میں

غزل جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اعظم اجیکرہ سنٹرل انڈیا

مر گیا مرنا مجھے منظور تھا
کیا عدو کی طرح میں مجبور تھا

کل کسی کی بزم میں دیکھا یہ رنگ
کوئی روتا تھا کوئی مسرور تھا

دیکھنے کو کسطرح ملتا سبب مجھے
وہ حجاب شرم میں مستور تھا

جب کہا ترک محبت کے لئے
بولے ہمکو بھی یہی منظور تھا

سچ ہے آپ انکو مٹائے کسطرح
مدعی داغ دل مجبور تھا

اب تجھے عاجز نوازی آگئی
اس سے پہلے تو بہت مغرور تھا

بزم میں پہلی تھی کیسی چاندنی
چاند گویا ساغر بلور تھا

روز روشن ہو گیا روز سیاہ
یہ بھی احسان غضب دیجور تھا

مر گیا اخگر تو وہ کہنے لگے
مہربان آتش مغفور تھا

جناب مولانا شفق عمادپوری ضلع گیا تلمیذ حضرت امیر مینائی

جگائے جاتے ہیں جادو کسیکی چشم فتنا میں
نگاہ سرمہ سا ہو فتنہ پردازی کی ساماں میں

نگاہ باغباں تو تاک میں اور گات میں گلچیں
یہ دو کانٹے ہیں بلبل کیلئے صحن گلستاں میں

ملائیں خاک میں کسطرح طفل اشک کو آنکھیں
بڑی نازوں سے پالا ہے اسی داماں مژگاں میں

سجھے کیا میری نظروں میں بہار خلد اے زاہد
نہ بہلیگا یہ دل نقش و نگار طاق نسیاں میں

اڑا کر دھجیاں مجکو پنہایا رخت عریانی
بچھوڑا تار باقی دست وحشت نے گریباں میں

کہاں ہی آکے مٹی دست غبار ناقۂ لیلی — کہ بے گور و کفن ہی لاشۂ مجنوں بیابانمیں
مقدر جانے اسکو وصل کا سامان کب ہوگا — کہ ہم گجبہ اور دشمن ہیں ہیں فلک کجباو سامانمیں
نکوئی شمع تربت ہے نہ کوئی چادر گل ہے — اداسی خاک اڑاتی پہرتی ہی گور غریبانمیں

دکہایا ہی یہ نیرنگ مضامیں طبع رنگیں نے
کہ ہیں ہر رنگ کی غزلیں شفق چہوٹے سے دیوانمیں

سمندر آنسوؤنکا موجزن ہی چشم گریانمیں — کہاں جاتا ہی تو ای دل نکلکر ایسے طوفانمیں
ہمارے کام آیا وقت پر سوز دروں آخر — بنا داغ جگر مشعل شب تاریک ہجرانمیں
بتونکے ناوک مژگانسے ای زاہد خدا حافظ — مجہے ڈر ہی کہ رخنے پڑ نجائیں تیری ایمانمیں
زیارت کعبۂ دلکی ہی میرا شغلہ زاہد — ادب سے سر جہکا رہتا ہی محراب گریبانمیں
زہے وحشت وہی سرگشتگی ہی خاک ہونے پر — بگولا بنکے میں چکر لگاتا ہوں بیابانمیں
یہ سودا ہی کہ نالے تک ہماری دود دل ہوکر — پریشاں پہر رہی ہیں الفت زلف پریشانمیں
لب زخم جگر پہ کیوں ہی شور العطش قاتل — بہری تہیں آگ کی چنگاریاں کیا آپ کی تیغمیں
برائے نام گویا ابروی اہل رفعت سے — نہیں اک بوند پانی چشمۂ مہر درخشانمیں

شفق یہ رنگ لائیں زمزمہ پردازیاں میری
کہ سنکر دنگ ہیں مرغان خوش الحان گلستانمیں

از میرزا لاابالی کا انار

کہتے احباب ہیں کچہہ مدحت رماں کہئے — میں جو خاموش ہوں فرماتے ہیں ہاں کچہ کہئے
(ق) نخل سرسبز میں جو سرخ لگا ہی یہ انار — چرخ اخضر پہ اسے مہر درخشاں کہئے
اسکو فرمائے رماں بہشتی، لاریب — قلم شاخ میں اک آیت قراں کہئے
لو فرضنا جو اسے کہئے ہی نخل سر طور — تو اسے بقعۂ نور رخ یزداں کہئے
سبزہ رنگ، اک بت ہندو ہی جو بالفرض نہاں — کیوں نہ پیشانی پہ اسکے اسے افشاں کہئے

باغ اندر میں کھڑی پا کہ یہ ہی سبز پری
کان میں اسکے ہی آویزہ مرجاں کہئے
ٹہنی کو اسکی جو کہئے ہی زمرد کی چھڑی
عوض دستہ اسے لعل بدخشاں کہئے
آتش تر کا چھلکتا ہوا ساغر کہئے
صاف مینائے مئ بادہ پرستاں کہئے
وجہ کیا باندہئے اسکو جو نہ قندیل فلک
کیا سبب اسکو نہ گوئے سر چوگاں کہئے
قمقمہ نور کا اک اسکو سمجھئے بے شبہ
اور فانوس سر شمع شبستاں کہئے
بے تکلف اسے اک آگ بھبوکا کہئے
بے تامل اسے اک گنبد گرداں کہئے
بے پس و پیش اسے حقہ دُر کیجئے فرض
اسکے دانوں کو مگر گوہر خنداں کہئے
مان لیجئے اسے اک شوخ کا ہنستا مکھڑا
ہیں نمایاں جو یہ دانئے انہیں دنداں کہئے
یا یہ ہی شعلۂ نار اس سے یہ پیدا ہیں شرر
بنجشاخہ اسے یا مشعل سوزاں کہئے

اور بہی کہئے جو کچہ آئے پسند خاطر
لا اُبالی کو مگر اسکا ثنا خواں کہئے

غزل جناب قاضی شمس الضحیٰ صاحب اخگر دہلی۔ اے قاضی پوری

بارا خگر کو زندگانی ہے
ناتوانی سے ناتوانی ہے
آکے مجھ تک پلٹ گیا ساقی
دور میں دور آسمانی ہے
دشت سے اک نگار خانہ چیں
پای مجروح دست مانی ہے
دل ہی اک داستان عبرت خیز
عشق پر درد اک کہانی ہے
عشق خوباں خلاصۂ صد عمر
زندگی مرگ ناگہانی ہے

عیش دنیا حباب ہے اخگر
ایک غم ہے کہ جاودانی ہے

غزل جناب محمد منور خاں صاحب گوہر مدراسی

کہولدی باب قفس چہوڑ دی صیاد نے مجہے
فصل گل آئی ہی آتا ہی چمن یاد مجہے

جذبۂ عشق میں ہوتی ہی بلا کی تاثیر / کیا یہ ممکن ہی کریں وہ نہ کبھی یاد مجھے

تونے اے پیر مغاں ایسی پلائی ہی شراب / کر دیا ہی غم کونین سے آزاد مجھے

داغ سا سحر بیاں اب ہی کہاں اے گوہر / نظر آتا نہیں ایسا کوئی استاد مجھے

غزل جناب سعود رضا صاحب جدت مدہ پور بہاگلپور

یہ ڈھٹائی نہیں تو پھر کیا ہے / کج ادائی نہیں تو پھر کیا ہے

ہم سے نفرت ہے غیر سے الفت / میرزائی نہیں تو پھر کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور تم بیزار / یہ رکھائی نہیں تو پھر کیا ہے

میں کشیدہ ہوں تم کشیدہ ہو / یہ لڑائی نہیں تو پھر کیا ہے

اسکے در تک نہ پہونچوگے جدت / جب رسائی نہیں ۔ تو پھر کیا ہے

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خان بہادر عظیم آبادی

وہ شوق وصل بڑھاتے ہیں ورنہ فرقت کیا / انہیں کا فیض ہی میں کیا مری صحبت کیا

بسی ہوئی ہے امیدوں کی اک نئی دنیا / اسی کی شان ہی اتنے سے دل کی وسعت کیا

تو کیا بس ہی نہیں ان عاشقوں میں اس قابل / مجھی کو سہو کرے گی تری عنایت کیا

مریض غم کو عبث پوچھتے ہیں مجھ سے آپ / گذر چکا ہو جو حالت سے اسکی حالت کیا

کسی سے کیا غرض اپنی سے آپ مطلب ہے / مرے زمانے کی اے شاد آدمیت کیا

نکل جائے گا اک دن حوصلہ امیدواروں کا / دعائیں کھول دیں گی مدعا پرہیزگاروں کا

بیابان جنوں میں رکھ گئی منہ دیکھ کر آخر / نہ پیچھا کر سکی اے گرد تو چابک سواروں کا

خیال یار رکھتا ہی کہ دل لی جان از خودی / کسی پہلو قصور اسمیں نہیں ہم غمگساروں کا

زر گل مفت لٹتا ہی خزاں کی مہمانی میں / الٰہی خیر ہو وارا نیارا ہے ہزاروں کا

نہ چھیڑ و داستانِ ہجر کو دیوانِ محشر میں
خدا کے واسطے پردہ نہ کھولو شرمساروں کا

تری زلفِ مسلسل کو نہ سلجھائیں کہ سلجھائیں
اسی سودے میں ناحق وقت گذرا ہیچ کاروں کا

تجھے بھی اے فلک تلووں کا میرے آبلہ سمجھے
تری جانب ہمیشہ منہ پھرا رہتا ہے غاروں کا

بہت توڑا ہے دل اے شاد تب شہرت ہوئی حاصل
کیا نقصان خود اپنا۔ کیا بگاڑا میں نے یاروں کا

جو اپنے آپ میں میرا دل حزیں ہوتا
تو کچھ مقام تردد نہ تھا کہیں ہوتا

محال تھا ترے کوچہ کی خاک کا ملنا
الٹ کے لاکھ اگر آسمان زمیں ہوتا

نواز تا کسی عاشق کو تو اگر اے حسن
تو پھر ضرور یہ چرچا کہیں کہیں ہوتا

بہت سے تنگ ترے دیدار میں بتا ہی گئے
کہیں کا میں نہ رہا تھا اگر یقیں ہوتا

کیا زباں نے مری بے خودی میں شکوہ یار
بڑا غضب تھا اگر کوئی نکتہ چیں ہوتا

جو شوق وصل سے تا دل فراق نصیب
تو مستحق صد احسنت و آفریں ہوتا

ہمیشہ غنچۂ خاطر مرا کھلا رہتا
جو شاد بزم میں حافظ کا ہمنشیں ہوتا

غزل حسرت موہانی

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی
رخصت اے صبر اے شکیبائی

حسن کو ہے سر خود آرائی
مژدہ اے آرزوئے شیدائی

نظر افروز اہل بینش ہے
تیری پنہانیوں سے پیدائی

مستحق ہے جلوہ رخ یار
متحیر ہے شخص بینائی

ہے وہ رنگین ادا بشان وفا
جان محبوبی و دلآرائی

مذہب عاشقی میں ہے اے عقل
بیخودی انتہائے دانائی

اثر حسن یار سے آخر
آگئی عشق میں بھی رعنائی

عشق کامل کے دونوں ہیں مرغوب
سحر وصل و شام تنہائی

بندہ بندگان حضرت عشق
حسرت سرفراز رسوائی

رسید کتب

(۱) لطافت کہستان یعنی سلسلہ کوہستان شملہ (ریاست پٹیالہ) کے باشندوں اور مقامات کے عجیب
حالات کا مجموعہ (۲۲×۱۸/۸ کی تقطیع حجم ۱۰۰ صفحے) مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور مع محصولڈاک ۱۲؍
اس مصنف یعنی منشی رائے بھگونت رائے صاحب اکال گڈھ ریاست پٹیالہ سے ملسکتی ہے۔

(۲) لطائف وظرائف یعنی دو ہزار تاریخی لطیفوں کا مجموعہ جنکی تلاش اور ترتیب میں مولف کتاب
منشی فاضل مولوی محمد عباس صاحب ایم۔ اے پروفیسر سینٹ زیویر کالج بمبی نے بڑی محنت اور
تحقیق سے کام لیا ہے۔ مہذب اور متین ظرافت کا مستند اور تاریخی نمونہ اس سے بہتر مشکل
سے ملیگا۔ تقطیع ۱۸-۲۰ حجم ۱۵۶ صفحے لکھائی چھپائی قابل اطمینان عہ رہیں مصنف سے (مسافر
خانہ کمو- فورٹ بمبی) دستیاب ہوسکتی ہے۔

(۳) تاریخ مصر تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۰۸ صفحے قیمت ۸؍ کار آمد اور ضروری کتاب ہے۔

(۴) حیات شمع جس میں شمع کی لو اور اسکی روشنی- وزن وماہیت وغیرہ کے متعلق مفصل اور باتصویر
علمی حالات درج ہیں تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۴ صفحے قیمت ۲؍

(۵) سرگذشت رابن سن کروزو یعنی ڈیفو کی مشہور عالم کتاب رابن سن کروزو کا اردو ترجمہ نہایت
دلچسپ ہے۔ اور اس قابل ہے کہ لڑکوں کو پڑھایا جائے۔

مندرجہ بالا تین کتابیں پنجاب ریلجس بک سوسائٹی- انار کلی لاہور سے ملسکتی ہیں

اُردوی معلّے

یعنی صحیح و فصیح اُردو کا ایک ماہوار ... اور قابل دید رسالہ جسکے ساتھ ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کسی دیوان بلا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں۔ حجم ۲۵ صفحے کی لکھائی چھپائی کاغذ بغایت پسندیدہ متوسط کا پرچہ ۲/ کے ٹکٹ آنے پر ارسال کیا جاتا ہے۔ (۱) رسالہ دواوین للعہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سے سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) ہے سالانہ (برائے طلبہ و غیر مستطیع حضرات) مقاصد ضروری کا مجلد دیگر مقاصد ... درخواست خریداری بنام منیجر اُردوی معلّے علیگڑھ آنا چاہئے

لہ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں (۱) رپورٹ اُردو بمبئی کانگرس (۸/) دیوان میر سوز (۲/) اور دیوان قائم چاندپوری شاگرد سودا (۴/) شائع ہوئے اور ۱۹۰۹ء کی ششماہی آخر میں دیوان حسرت استادِ جرات نذر کیا گیا۔

دیوان غالب طبع ثانی [لہ]

سفید کاغذ پر خوشخط چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گزرا تھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اُردوی معلّے علی گڈھ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم تقریباً ۱۶ اجزو قیمت مع محصول و خرچ ویلو صرف عہ/

درخواست خریداری بنام۔ منیجر اُردوی معلّے علیگڑہ آنا چاہئے فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ا تا صفحہ ... (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ... تا صفحہ ... (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ا تا صفحہ ۲۴۲ (۵) ... غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

لہ طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کردی گئی ہے اور اشعار کے مطالب میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ جا بجا ترمیم بھی کردی گئی ہے اور صحت کا بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اُردوی معلّے۔ غزلوں کا انتخاب اس احتیاط اور خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیکھکر مذکورہ بالا مختصر دواوین کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کاغذ سفید تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۷ جزو قیمت صرف (۸/) مع محصول ڈاک۔ المشتہر منیجر اُردوی معلّے علی گڑہ

شرح اجرت اشتہار اُردوی معلّے

	اعلیٰ ۲ کالم	نصف صفحہ یا ایک کالم	نصف کالم
سالانہ	للعہ	عہ	سے/
ششماہی	عہ	سے	سے/

رجسٹرڈ نمبر ا۔ ۲۵۱

اُردوئے معلّٰی

نمبر (۵)	بابت مئی سنہ ۱۹۰۶ء	جلد (۶)

مرتبہ سید فضل الحسن حسرتؔ موہانی بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اُردوئے معلّٰی علی گڈھ

احسن المطابع علی گڈھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول .... عہ سالانہ / قسم دوم .... عـہ سالانہ }

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنز

مسلہ

اور اس سلسلہ کوہستانی کے مفصل حالات کتاب لطف کہسار میں نہایت قابلیت سے بکمال محنت و تحقیق لکھے گئے ہیں۔ انگریزی اور اردو وغیرہ زبانوں میں ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی۔ خط پاکیزہ۔ کاغذ اعلیٰ۔ چھپائی مطبع رفاہ عام سٹیم پریس عبارت دلفریب طرز بیان طلسم خیز۔ انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے

مختصر فہرست مضامین

اور دیگر بیسیوں مضامین اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسنیر پونکے نام کے لکھے گئے ہیں قیمت مع محصول ڈاک عمل ۴ار

اردو ابہیر گوستگتا (یعنی مراۃ الغیب) ایکہزار جلد میں سے پچاس جلد بر باقی ہیں قیمت مع محصولڈاک عہر

ملنے کا پتہ۔ ڈاکخانہ اکال گڈھ ریاست پٹیالہ۔ منشی رائے بگونت رائے اڈیشنل نائب ناظم

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنے

ملفوظات وحالات حضرت شیخ العالم مخدوم عبدالحق ردولوی قدس اللہ سرہ

جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ

قیمت (۸/)

دیوان مجروح

حسین صاحب مرحوم شاگرد غالب قیمت

اردوی معلی جلد پنجم مکمل

از جولائی سنہ ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء مع ریورٹ بمبئی کانگرس

بلا قیمت

قیمت عہ مع محصول دفتر اردوی معلی علیگڈھ سے طلب کرو

المشتہر

منیجر اردوی معلی علیگڈھ

ملکہ فرخ مرزا

اس ناول کا لطف اور حسن بیان دیکھنے کے قابل ہے واقعات کو اس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے کہ ہر واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرجاتا ہے درد و مذاق لطیف حسن و عشق ... جو کچھ عدیم المثل مصنف کے پرزور قلم سے نکلا ہے وہ لکھنؤ کی مشہور زبان کا ایک دریا ہے کہ موجیں مار رہا ہے ساتھ ہی اوسکے انڈکوٹ کوٹ کر بہرا ہے کہ قلب پر ایک ... پیدا ہوتی ہے۔ یہ ناول نوجوان امرا کے لئے ایک ناص دلچسپی کا باعث ثابت ہوا ہے جسکی تصدیق اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ طبع ثانی کی بھی اب چند جلدیں باقی ہیں قیمت عمر محصول ذمہ خریدار۔

نشان ذیل سے دستیاب ہوسکتی ہیں۔

المشتہر

... محلہ افضل گنج مکان مولوی غیاث الدین صاحب وکیل

عصر جدید

یہ ایک ماہوار رسالہ تین جزو کا سوا تین برس سے شایع ہوتا ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ مسلمان بیکار اور **فضول بحثوں** میں پڑنے کی بجائے کام کی باتوں پر متوجہ ہوں۔ فضول ... بیکاری کو ترک کریں۔ پیشہ ور گداگری کو ... اور کام اور جائز ذرایع معاش کی طرف آمادہ ہوں۔ تعلیم معقولی سے بجائے فضول تقلید اہل فرنگ کے اتفاق و محبت کا سبق لیں۔ مذہب کا صحیح خیال اور خدمت خدا اوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رشد دی دفعی کی فضولیات اور قرض لینے کا مرض دور ہو۔

اسکے آنریری اڈیٹر خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے ایل ایل بی۔ وکیل ہائیکورٹ سکرٹری اصلاح تمدن (سابق چیف جج ریاست مالیر کوٹلہ) ہیں اور اس رسالہ نے مسلمانوں کو ایک حد تک بیدار کیا ہے۔ ...... قیمت نمونہ ۲ جواب طلب امور کے واسطے جوابی کارڈ۔

المشتہر

منیجر عصر جدید گولہ گنج۔ لکھنؤ

شیخ محمد عبد...

حمد بلگرائی

دنیا میں ہزاروں باکمال ایسے قبر میں آرام فرما رہے ہیں جن کے نام ونشان تک سے لوگوں کو واقفیت نہیں - اور ہوتی بھی تو کیونکر اس لئے کہ وہ بغیر اپنی کسی شہرت یا یادگار کے چھوڑے اس عالم سے رخصت ہوئے ہیں - اور اپنے کمال کے ساتھ اپنا نام ونشان بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں -

اسی طرح سے اب بھی دنیا باکمال حضرات سے خالی نہیں - تلاش کرنے سے بہت سے ایسے ملینگے جن کا نام بھی کبھی کسی نے نہ سنا ہوگا - اُن کو تو اس طرف توجہ نہیں نہ اور لوگوں کو اسکا خیال کہ جہاں تک ممکن ہو ایسے حضرات کا پتہ لگا کر کم سے کم اُن کا تذکرہ اور اُن کے کمالات کا حال تو لکھکر شایع کر دیں جس سے لوگ واقف ہو کر اُن کے کمالات کے فیض سے سیراب ہوں اور بعد اُن کے اُن کا نام عمدہ شہرت سے تواریخ کے اوراق میں جگہ پا کر صفحۂ ہستی پر باقی رہے - خدا کا شکر ہے کہ اب بہت سے اہل قلم اس طرف رجوع ہو کر بڑی سرگرمی سے آئے دن ترقی دکھا رہے ہیں -

مجھکو بھی عرصے سے اسکا خیال اور کوشش ہے لیکن بوجوہ چند میں اب تک اسکا کوئی عملی نمونہ نہیں دکھا سکا -

اب کی بار کانفرنس میں شرکت کی غرض سے میرا علی گڈھ جانا ہوا وہاں میرے خاص کرمفرمائے بامذاق شاہ محمد نذیر صاحب ہاشمی غازیپوری نے مجھکو مجبور کیا کہ جسطرح سے ہو میں علاوہ اور مشاہیر کا تذکرہ لکھنے کے سب سے پہلے اپنے اُستاد کا تذکرہ لکھوں اور اُردوی معلیٰ کے ذریعے سے اسکی اشاعت کروں - آخر مجھکو اُن کی یہ رائے پسند آئی اور اس کام کے لئے مستعد ہو گیا -

افصح الفصحا حضرت حمد لکھنوی مدظلہ العالی کے نام نامی سے آگاہی رکھنے والے اور اُن کے چیٹ پٹے کلام کے والہ دشیدا تو شاید ہی ہندوستان بلکہ اور غیر ممالک میں کوئی ایسا مقام ہوگا جہاں نہوں مگر اُن کے تاریخی حالات کے جاننے والے بیشک بہت کم ہوں گے اور یقیناً اُن کے کلام کے قدردانوں کو اُنکا تذکرہ دیکھنے کا اشتیاق بھی اُنکے کلام فصیح کے دیکھنے اور سُننے سی کچھ کم نہ ہوگا۔

حضرت حمد عثمانی لکھنوی کا نام نامی محمد محمود ہے اور رفیق الدولہ دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر متخلص بہ ظہیر کے خلف الصدق قوم شیخ حنفی مذہب ہیں۔ نسب کا سلسلہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ کے آباد اجداد کا قدیمی وطن شہر قنوج تھا جسمیں سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں اوّل اول آپ کے جد اعلیٰ حضرت حاجی محمد سالار تشریف لاکر سکونت پذیر ہوئے۔ اودھ کے نامی گرامی قصبہ بلگرام میں آپ کے پردادا شیخ امام الدین کا عقد ہوا جب سی وہاں کے لوگوں کے خواہش و اصرار اور اس رشتہ مندی سے اُن کو وہیں رہنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ آپ کے جد امجد منشی محمد مسعود صاحب وہیں پیدا ہوئے۔ اور عالم شباب میں سے اپنے پدر بزرگوار شیخ امام الدین صاحب کی عہد نواب سعادت علیخاں بہادر میں لکھنو تشریف لے گئے اور دربار نواب میں باریاب ہو کر تا حیات میر منشی دفتر وزارت و بخشی گری وغیرہ عہدہائے جلیلہ پر ممتاز رہے اور وہیں کی سکونت دائمی اختیار کی۔ آپ کے والد ماجد منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر کہ جنکو نواب معتمد الدولہ سید محمد خاں بہادر ضیغم جنگ وزیر اعظم شاہ اودھ عرف آغا میر نے متبنیٰ کیا تھا بعد وفات اپنے والد کے نواب صاحب موصوف کے ذریعے سے سنہ ۱۲۴۹ ہجریہ میں سکرٹری دفتر وزارت بمنزلہ نائب وزیر بخطاب دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر مقرر ہو کر خلعت زرین و جیغہ مرصع و مالائے مروارید وغیرہ

سے ممتاز ہوئے۔ بجائے مہر وزارت آپ ہی کی مہر ہوتی تھی عہد حضرت واجد علیشاہ بادشاہ اودھ تک اسیطرح برابر عہدہائے جلیلہ پر ممتاز رہتے چلے آئے۔ المختصر لکھنؤ کے اعلیٰ درجے کے رئیسوں میں تھے۔

جناب منشی محمد محمود صاحب حمد مدظلہم العالی ماہ جمادی الاولےٰ ۱۲۵۸ ہجری چوبیسویں تاریخ بروز پنجشنبہ وقت ظہر خاص شہر لکھنؤ محلہ بازار جھاؤلال میں پیدا ہوئے اور روز ازل زیر سایۂ عاطفت اپنے پدر بزرگوار کے تعلیم و تربیت پائی۔ بسم اللہ جناب مولانا شاہ محمد عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی کے سامنے ادا ہوئی۔ بایں ہمہ فیض آپ نے اپنے والد ماجد ہی سے پایا گو کبھی کبھی معلموں کی بھی تعلیم رہی۔

پانچ برس کی عمر میں کیننگ کالج میں جناب گورنر جنرل لارنس صاحب بہادر وائسرائے ہند اور بہت سے راجوں تعلقداروں وغیرہ کے سامنے ایسی حاضر جوابی کے ساتھ امتحان دیا کہ تمام حاضرین نے تعجب کیا۔ یہ عجیب خبر عرصہ تک بڑی دھوم دھام سے اخبارات میں شائع ہوا اس کیفیت کو آپ کے والد صاحب نے بالتشریح لکھا ہے۔ اس امتحان کی کامیابی میں کتاب لغت سرکار سے مرحمت ہوئی اور ارگن باجا جناب ... صاحب بہادر پرنسپل کیننگ کالج نے اور ایک قلمدان پر تکلف سجا ہوا مع دوات نقرہ جناب چودھری حشمت علی صاحب سندیلوی نے عنایت فرمایا۔ اسکے علاوہ ہر سالانہ امتحان میں آپ کی خداداد ذہانت کا ثبوت ملتا گیا اور برابر بہت سی واقعے درمیان میں اسی کے مثل ظہور میں آئے۔ سات برس کی عمر میں پارہ عم تیسا لون پڑھکر ناخواندہ پورا کلام اللہ استاد کو سنا دیا آپ نے چند کتب درسی سلیمان لکھنوی سے پڑھیں۔ جب آپ کے والد ماجد کو اس تعلیم پر پورا اطمینان نہوا تو یہ بار خود انہوں نے اپنے سر لیا۔ اور برابر آپ کو تعلیم دیتے رہے۔ آپ کی طبیعت بچپن ہی سے اسقدر موزوں واقع ہوئی تھی کہ کبھی دھوکے سے بھی کوئی شعر ناموزوں

نہیں پڑھا۔ ایام طفلی میں چاہے تلفظ میں غلطی باقی رہی ہو مگر ناموزوں زبان سے نکلنا غیر ممکن تھا۔ شاعری کا مادّہ خلقی ہی بچپن ہی سے اپنے والد ماجد صاحب کو اکثر متفرق اشعار کہکر سُنایا کرتے تھے۔ کوئی شعر کبھی ناموزوں نہیں کہا دس برس کی عمر میں بخوبی غزل کہتے تھے۔ جیسے کہ فی زمانا مبتدی موزوں طبع شعرا کہہ سکتے ہیں۔ کسی وقت فکر سخن سے غافل نہ رہتے تھے۔

آپ کے والد صاحب کو اُردو کی شاعری خصوصاً طرز عاشقانہ سے بالکل رغبت نہ تھی لیکن جب آپ کی طبیعت اور شوق کا یہ حال دیکھا تو غزل کہنے کی ممانعت بھی نہ کی بلکہ نہایت شوق کے ساتھ اکثر اوقات نکات شاعری سے آگاہ فرمایا کرتے تھے۔ آخر اُنہیں کے اشارے سے آپ ملک الشعرا جناب شیخ امداد علی صاحب بحر لکھنوی کے شاگرد ہوئے۔ شیخ صاحب آپ کے والد کے احباب میں سے تھے اور اُنکو بہت مانتے تھے۔ لہذا اُن کے پاس خاطر اور آپ کی رنگینی طبع کی وجہ سے بدل وجان اصلاح میں کوشش فرماتے اور تعلیم فن شعر گوئی میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑتے تھے۔ آپ کی فکر بلند اور ذہن رسا کو دیکھکر نہایت خوش ہو کر اکثر اپنے احباب سے آپ کی بہت سی تعریف کرتے اور فرماتے کہ اگر میری زندگی نے وفا کی تو میرے تلامذہ میں سے یہ ایک ایسے شاگرد ہونگے جن پر کلی اطمینان ہو سکے۔ ۱۲۹۲ سنہ ہجری میں جب آپ کے والد نے انتقال فرمایا اور کیننگ کالج میں اُن کی جگہ پر سخنور نامی وگرامی جناب منشی غلام حسین صاحب قدر بلگرامی پچاس روپیہ مشاہرے پر مدرس درجہ اول مقرر ہوئے تو چونکہ آپ پیشتر سے کالج مذکور میں اپنے والد سے کتب فارسی پڑھتے تھے اور نام درج رجسٹر تھا لہذا حضرت قدر سے پڑھنے لگے وہ بھی چونکہ آپ کے والد کو بہت مانتے تھے اسوجہ سے تعلیم وتدریس میں کوشش بلیغ کرتے تھے آپکا شوق شاعری تو حد سے بڑھا ہوا تھا جب حضرت قدر کو اس سے آگاہی ہوئی

تو انہوں نے شعر گوئی سے منع کیا اور فرمایا کہ تم اس خیال میں نہ پڑو ورنہ تحصیل علوم میں حرج واقع ہوگا - آپ نے یہ سال دیکھکر اپنی شعر گوئی سے انکار کر دیا - اور ان کی پوشیدگی میں مشق سخن ہوتی رہی اور برابر حضرت تجرؔ سے بدستور اصلاح لیتے رہے - البتہ بزم مشاعرہ کی شرکت سے پرہیز رکھا -

جب آپ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا امتحان پاس کرکے منشی کا خطاب پا چکے تو افسوس اُسی زمانے میں حضرت تجرؔ نے انتقال فرمایا - تحصیل کتب فارسی سے تو اطمینان کر ہی چکے تھے اور حضرت قدر بلگرامی سے حسن عقیدت رکھتے تھے ناچار شوق شاعری کا اظہار کرکے ایک غزل اصلاح کے واسطے پیش کی - اُن کو دیکھکر تعجب ہوا کہ پہلی غزل ایسی کیونکر ہوسکتی ہے - پھر آپ نے اپنی شعر گوئی کا ماجرا ابتدا سے کہ سنایا - انہوں نے فرمایا کہ تم شاگرد نہیں بلکہ میرے قوت بازو ہو اور امداد فن شعر و تعلیم عروض و قافیہ میں دل و جان سے کوشش کی - اور آپ کی اصلاح کا یہ ڈھنگ مقرر کر دیا کہ زیادہ اشعار کہوا کر اُن میں سے اپنی پسند کے لایق چن دیا کرتے تھے - اگر کسی شعر کا کوئی مضمون عمدہ ہوتا اور اُسمیں کوئی نقص پاتے تو اُسکو درست کر دیا کرتے تھے یہ بات آپ میں تو ابتدا ہی سے تھی کہ جو عیب شعر میں دکھا کر اصلاح ہوئی پھر دھوکے سے بھی اُسکو آپ کے کلام میں دخل نہ ہوتا تھا - یہ ذہانت اور یادداشت دیکھکر حضرت قدرؔ اکثر اپنے شاگردوں کی غزلوں پر آپ کے سامنے اصلاح دیا کرتے بلکہ آپ ہی کے ہاتھ سے بنواتے اور جملہ عیوب اور وجوہ اصلاح سے واقف کرتے جاتے تھے - بعض جگہ آپ ہی ایسا ایک نہ ایک لفظ بتا دیتے تھے کہ وہ پھڑک جاتے تھے حضرت قدرؔ نے خاص آپ ہی کے خیال سے بازار جھاؤلال میں آپ کے مکان کے متصل سکونت اختیار کی تھی - اسوجہ سے جو بات اور شاگردوں کو برسوں میں نہیں حاصل ہوئی وہ آپ کو دنوں بلکہ گھنٹوں میں حاصل ہوتی تھی - المختصر تھوڑے ہی

دنوں کے بعد آپکا کلام عیوب شعری سے پاک ہونے لگا فقط ترقی الفاظ کی اصلاح باقی رہگئی جس سے ہر شخص تاحیات استاد مستفید ہوتا رہتا ہے۔

جب آپ کی مشق سخن اس حد کو پہونچگئی تو قدر مرحوم نے اپنے بعض تلامذہ کی اصلاح آپہی کے تعلق کردی۔ اور عام طور سے اصلاح کی اجازت دیدی۔

قدر مرحوم کے بعض شاگرد ایسے ابتک موجود ہیں کہ اُنکے انتقال کے بعد شعرو سخن میں آپ ہی سے مشورہ رکھتے ہیں گو بظاہر قدر مرحوم کے شاگرد بنے ہوئے ہیں آپ کو قریبًا چار سال تک شعر و سخن میں اُن مرحوم سے مشورہ رہا۔

جبکہ امتحان میں کامیاب ہوکر آپکا اسکالرشپ منجانب سرکار مقرر ہوگیا اور اوّل زمانہ حضرت قدر بلگرامی کی شاگردی کا تھا تو کیننگ کالج میں جناب پرنسپل کیننگ کالج کی فرمائش سے ایک قطعہ فارسی جناب نواب گورنر جنرل بہادر وزیر اعظم قیصر بالقابہ کی مدح میں لکھکر اُسی کالج مذکور میں راجوں۔ تعلقداروں اور روساء شہر کے جلسۂ عظیم میں پیش کیا جسوقت حسب الحکم اُس قطعہ کو پڑھا تو جلسۂ مذکور میں ہر طرف سے سخن کی داد ملی اور نواب گورنر جنرل بہادر موصوف نے اٹھارہ کتابیں اور ایک گلاس نقرہ مینا کار اپنی ہاتھ سے بطور انعام کے مرحمت فرمایا۔

بعدہ قدر مرحوم کی زندگی تک کتب فارسی اور عروض و قافیہ اُنہیں سے پڑھتے رہے اُن کے انتقال کے بعد بطور خود شب و روز کتب بینی اور تحقیقات اور مشق سخن میں ہمہ تن مصروف رہے۔ گردش زمانہ سے بعد وفات اپنے والد مرحوم کے بہت پریشان خاطر رہے۔ چونکہ آپ کے جد امجد امیر الامرا جناب منشی محمد مسعود صاحب اور والد ماجد رفیق الدولہ دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر ظہیر ہمیشہ عہدہائے جلیلہ پر ممتاز رہے اور آپ نے بھی زمانے کے دیکھتے اپنے والد ماجد کے وقت میں نہایت عیش و آرام کے ساتھ پرورش پائی تھی اور

ہوے امارت سرشت میں تھی لہذا تھوڑی تکلیف بھی آپ کے لئے بہت ہو گئی چنانچہ خود اپنے حسب حال فرماتے ہیں ؎

ہو گیا خواب وہ جاہ وحشم آبائی		اے خدا یوں تو بنا کر نہ بگاڑا ہوتا

اُسی حالت بیکاری و پریشانی میں ایک مدرسہ موسوم جوبلی اسکول بلگرام میں قائم ہوا اور اسمیں ایک مدرس فارسی دان کی ضرورت ہوئی تو آپ نے پہلے اپنی سند بخدمت ڈپٹی انسپکٹر صاحب مدارس ضلع ہردوئی و ممبران کمیٹی مدرسہ مذکور روانہ کی بعد اسکے درخواست فارسی منظوم ارسال کی۔

یہ درخواست منظور ہو کر آپ کے نام پروانہ طلبی روانہ کیا گیا ۱۳۰۶ ہجری میں ماہ رمضان المبارک کی بارہویں تاریخ کو بلگرام میں پہونچکر مدرسہ مذکورہ بالا کے مدرس فارسی مقرر ہوئے اور اپنے جد امجد کے مولد میں پہونچنے کی خوشی میں یہ رباعی کہی۔

رباعی

صد شکر کہ حمد در وطن آمدہ است		چوں معنی خوب درسخن آمدہ است

بشگفت بہ بلگرام گلہاے سخن
کاین بلبل شیدا بچمن آمدہ است

اور مورخ نامی شیخ غلام حیدر صاحب ارشد بلگرامی نے یہ قطعہ تاریخ کہا

قطعہ

شکر حق حمد سخنور لکھنؤ بگزاشتہ		سرزمیں جائیکہ آورد در زیر قدم
سال تاریخ ورود ارشد بدست من سپید		در وطن حمد آمدہ یا در تن بے روح دم

۱۳۰۶ھ

اُسی زمانے میں آپ نے ایک خواب دیکھا اور عین خواب میں حضرت شیخ الاولیا مولانا شاہ محمد فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادی نور اللہ مرقدہ کی بیعت سے مشرف ہوئے اور خواب سے بیدار ہوتے ہی فی البدیہہ یہ رباعی کہی۔

رباعی

صد گونہ بجان سپاس یزداں کردم		کو روشن دل ز نور ایماں کردم
بختم بیدار گشتہ ای محمد بخواب		بیعت بر دست فضل رحمان کردم

اور اسکی اطلاع ۲ر شوال ۱۳۰۸ھ کو حضرت مولانا قدس سرہ کے حضور میں بذریعہ تحریر کی جسکے جواب میں مولانا صاحب نے سب ماجراے خواب پڑھکر خاص اپنے دست وقلم مبارک سے خط کی پیشانی پر ارقام فرمایا۔

(از فضل رحمن دعا سلام برسد خواب شما مبارک است مدام شاد کام باشند آمین) اور آپ کے بھائی جناب محمد میاں صاحب (جنکے ہاتھ یہ اشتیاق نامہ بھیجا تھا) سے فرمایا کہ وہ میرے مرید ہوگئے یہی ایک طریقہ ہے اب میرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں اگر ملاقات کے واسطے آجائیں تو مضائقہ نہیں۔ چونکہ آپکا حسن عقیدت مولانا صاحب کی طرف بہت تھا لہذا تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۱۳۰۹ ہجری میں ماہ جمادی الاولی کی بائیسویں تاریخ کو بروز جمعہ اپنے برادر موصوف کے ساتھ مراد آباد میں پہونچکر ظاہرا بھی مرید ہوکر دولت ارادت سے مالامال ہوئے۔

آپ ایک نہایت مستغنی المزاج۔ کم سخن اور آزادمنش آدمی ہیں عزلت گزینی پسند ہے لوگوں میں زیادہ بیٹھنے اور فضول باتوں سے سخت نفرت ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ کی ہر وقت کی مونس وہمصحبت کتب اور بارنع صحبت احباب اصلاح تلامذہ اور شغل تصنیف وتالیف ہی شعر وسخن کی طرف ایسی کچھ طبیعت محو ہے کہ اسکے سوا دوسری فکر ہی نہیں سارے مصائب وتکالیف دنیاوی ایک طرف اور ایک عمدہ مضمون نکل آنے کی خوشی ایک طرف چنانچہ خود ہی کہا ہے اور بہت ٹھیک کہا ہے ؎

اپنی کچھ فکر نہیں فکر مضامین کے سوا		تمنے اے تمد فن شعر نہ سیکھا ہوتا

باوجود کار ملازمت و افکار چند در چند اب تک تصنیف و تالیف کا ذخیرہ یہ ہے۔

(۱) قواعد صرف و نحو۔ (۲) مثنوی اُردو موسوم باسم تاریخی خرمن شوق ۱۳۰۲۔ (۳) مثنوی اُردو دیگر بطرز جواب گلزار نسیم۔

(۴) لغت زبان اُردو مسمّٰی بہ ہزار داستان۔ جسمیں ہر لغت اور محاورے کے ساتھ لکھنؤ اور دہلی کے اساتذہ کے اشعار مثال میں موجود ہیں۔ ناتمام۔

(۵) انسداد جرایم۔ یہ مسدس اودھ اخبار لکھنؤ میں طبع ہو چکا ہے۔

(۶) مراتب ستہ۔ چہ نصیحتانہ مسدس۔ یہ بھی اودھ اخبار لکھنؤ میں طبع ہو چکے ہیں۔

(۷) لوائے حمد۔ ذکر میلاد نبوی۔

(۸) مثنوی قند مکرر۔ جسکو منشی نولکشور صاحب مالک مطبع اودھ اخبار کی فرمایش سے ۱۳۰۸ھ میں تصنیف فرمایا اسمیں شکسپیر کے ترجمہ اُردو کے تین قصے نظم کیے ہیں قریب دو ہزار چہ سو اشعار کے اسمیں ہیں۔

(۹) مشاہیر بلگرام کا تذکرہ فارسی۔

(۱۰) دیوان فصاحت نشان موسوم باسم تاریخی ارمغان جدید ۱۳۱۳ھ۔

(۱۱) رسالہ متروکات وغیرہ موسوم باسمی تاریخی مخزن تحقیق ۱۳۱۵ھ۔

اسمیں تمام اپنے اور دیگر فصحا کے متروکات و غیر فصیح وغیرہ الفاظ مع عیوب شعر و غلطی املا و فوائد و تنبہات مفیدہ وغیرہ نہایت تحقیق کے ساتھ لکھا ہے۔

راقم نے جناب کا تذکرہ لکھنے میں بہت اختصار پر نظر رکھی فقط ضروری حالات وہ بھی مختصر طور سے قلمبند کیے۔ اکثر شعرائے نامی سے جو مباحثے اور معرکے ہوئے یا بعض کم مایہ معترضوں نے ٹوک کر دندان شکن جواب پائے اُن کی تصریح کرنی خالی از طوالت نہیں اگر مشرح سوانح عمری لکھی جائے تو پوری ایک کتاب ہو جائیگی۔ المختصر بالفعل آپ ملازمت گورنمنٹ اسکول بلگرام ضلع ہردوئی اوقات بسر کرتے ہے

ہیں۔ چونکہ عرصے سے قیام ہے اور بوجہ سلسلۂ قرابت بلگرام میں مکان ذاتی بھی موجود ہے اور استغنی المزاجی و بے پروائی انتہا درجے کی ہے لہذا ایسا کچھ اُنس ہوگیا ہے کہ اور کہیں باہر جانا پسند نہیں۔

افسوس کہ ایسے ایسے ہنرمند کس مجبوری کی حالت میں کس مپرسی کے زندان میں اپنی بے بہا زندگی کے دن پورے کر رہے۔ دعا ہے کہ جلد کوئی والیٔ ملک ایسا اعظم حسن لیاقت کے موافق قدر و منزلت کرکے آپ کے آبا و اجداد کے مثل آپ کو بھی مناصب اعلےٰ پر ممتاز فرمائے آمین۔ آپ کے اکثر شاگرد لائق و فائق موجود ہیں۔

آپ کے کلام سے عجب شوخی اور فصاحت ٹپکتی ہے زبان کی صفائی اور روز مرّہ میں تو اپنا نظیر نہیں رکھتے آجکل لکھنؤ کے نامور اُستادوں میں ہیں۔ آپ کے کلام کا رنگ و طرز اپنے اُستاد حضرت بحرؔ مرحوم لکھنوی سے بہت ملتا جلتا ہے بلکہ بندش کی صفائی اور طبیعت کا چلبلاپن زمانۂ حال کے موافق بڑھا ہوا ہے۔ اس موقع پر ایسی بات ہی نہیں کہ ہمارے سخن شناس احباب ایسے لایق اُستاد کے حال سے واقف ہو کر اُسکے کلام کے مشتاق نہوں لہذا پہلے ہم اُس دو غزلے کے اشعار ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جو عالیجناب نواب محمد ابراہیم علی خاں بہادر متخلص بہ خلیلؔ والی ٹونک کی طرح عطیۂ گلدستۂ ریاض سخن میں جناب ممدوح نے فرمایا تھا۔ اسطرح کا گدستہ بھی بپاس تخلص جناب نواب صاحب گلزار خلیل کے نام سے شائع ہوا تھا اور آپ کا ارشاد تھا کہ ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ شعرائے نامی اسطرح میں کیسے کیسے گل کترتے ہیں۔ حضرت داغؔ دہلوی مرحوم اور دیگر سخنوران نامی نے اسطرح میں خوب خوب زور لگایا تھا مگر جناب ممدوح نے ایسے ایسے شعر نکالے کہ گلدستہ شائع ہونے پر صدہا انصاف پسند سخن شناسوں کی زبان سے بھی سُننے میں آیا کہ حمد لکھنوی

کی غزل چڑھی بڑھی رہی اور بڑے بڑے نامیوں کی غزلیں اُسکے مقابلے میں پھیکی تسلیم کی گئیں۔

غزل

فرحت دلونکو دیتے ہیں اشعار بن کے پھول
کیا کیا مہک رہے ہیں ریاض سخن کے پھول

خوشبو طرح طرح کی سنگھاؤ چمن کے پھول
کچھ اس چمن کے پھول کچھ اُس چمن کے پھول

آغوش ہی میں آتے نہیں یہ دماغ ہے
پھولے نہیں سماتے ہیں گلرو چمن کے پھول

کیسے مہک رہے ہیں ذرا سونگھیے نہیں
اُترے ہوئی بھی کپڑے ہیں اُنکے بدن کے پھول

شادی ہر اک چمن رچی ہے بہار کی
نو سال بھر کے بعد کھلے اس دلہن کے پھول

خوشبو میں گیسوؤں کے تو دو خوں بسے ہوئے
مہکے شب وصال کرن پھول بن کے پھول

اشک اُن کی آنکھ سے گرے ماتم میں غیر کے
نرگس سے دیکھے جھڑتے ہوئے نسترن کے پھول

بلبل چہک قفس ہی میں ہو جائیگی بہار
منقار کی کلی سے کھلینگے چمن کے پھول

کانوں میں کہا رہے ہیں ہوا زلف یار کی
نافے بنے ہوئے ہیں غزال ختن کے پھول

یہ جو سنا کہ ہار تھے گوندھے ہوئے مرے
سب پھینکے نوچ نوچ کے مارے جلن کے پھول

گلرو جو ہیں تو سیر چمن سے بھی عار ہے
آئینہ دیکھ لیتے ہیں گھر میں بدن کے پھول

یہ رنگ وہی ہاتھ میں اُس گلعذار کے
کاغذ کے گل بھی کرتے ہو تو سب ہیں چمن کے پھول

ناوک فگن ہیں باغ میں جھونکے نسیم کے
رہ رہ گئی ہیں کانٹوں کی پیکاں سے چمن کے پھول

اے احمد لکھنؤ ہے نہ وہ سیر عیش باغ
غربت میں یاد آتے ہیں کیا کیا وطن کے پھول

کیا اشتیاق ہے کہ ہو تیار بن کے پھول
ہم بیٹھو نہیں جھونکتے ہیں چمن کے پھول

کہتے ہیں دیکھکر مرے باغ سخن کے پھول
ہم روز پھینک دیتے ہیں سیر دن چمن کے پھول

اللہ آپ سیر کو نکلے پہن کے پھول
تقدیر اُس چمن کی یہ ہیں جس چمن کے پھول

آنکھوں پہ بھی بٹھائے تو ہرگز نہ بار ہوں
اونکو ہوا یہ شوق ابھی سے ستم ہوا
فردوس ہی شہید ونکو اُس تیغ کا چمن
اللہ کرے بہار میں گلچیں کا پھینکے
رنگین کفن ہی ہو کریں رنگیں مزاج تھا
پیکر یقین ہے رند گنا ہو نسے پاک ہوں
کمسن ہو زلف بکھری ہی زنجیر او تار وہار
اُس گل کی ہیں ہوائے وفا میں کھلی ہوئے
بوئے گل مرادسی عاشق کو کردو مست
اللہ رے اُنکی بادبہاری کا زور شور

یہ نازنین جتنے ہیں سب ہیں بدن کے پھول
کچھ گل کھلا ئیوالے ہیں شاید بہن کے پھول
گل ہیں یہ سر کے خلد بریں کے چمن کے پھول
پڑجائے آتش گل گلزار بن کے پھول
نیچے کفن کے بوٹے ہوں اوپر کفن کے پھول
ساقی جو آئے شیخ کی پگڑ میں چین کے پھول
ملتے ہیں دونوں وقت نہ بیٹھو سجن کے پھول
سب رہ گئے ہیں زخم جگر اپنے بن کے پھول
اک دن لپٹ ہی جاؤ مرجاں بن کے پھول
ہیں ڈھیر اور بچھے بستر دلنسے ہاتھوں چمن کے پھول

کلک اپنا گلفشاں ہی صفت میں نظام کے
اے حمد اودہ میں پھول رہے ہیں دکن کے پھول

اب چند مختلف غزلوں کے منتخب اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے ہدیہ ناظرین بانمکین کئے جاتے ہیں ۔ ملاحظہ ہوں ۔

دل سے جب تک ہی خیال رخ جاناں نکلا
جب چلی دست جنوں بنکے چلی باد بہار
رہگیا طائر جاں بلبل شیدا بنکر
جستجو کی تو حسینوں میں لگا دلکا پتہ
خنجر و تیغ لئے بیٹھے ہو کیوں محفل میں

پھر جو اس گھر میں کیا غور تو ویراں نکلا
سو جگہہ سی ہے ہر اک گل کا گریباں نکلا
جوہر تیغ میں قاتل کے گلستاں نکلا
دیکھنا پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں نکلا
بزم میں کسکے لئے رزم کا ساماں نکلا

حمد مضموں جو کہا کھینچدی اوسکی تصویر
سارے عالم کا مرقع ترا دیواں نکلا

وله

بیوجہ کب یہ دلکی مری دیکہ بحال ہے
کہئے نہ کہئے آپ کی صورت سوال ہے

دن رات دلمیں موی کمر کا خیال ہے
ہم ایک شیشہ رکہتے ہیں اُسمیں بہی بال ہی

یوں اوسنے پوسنے دل کہیں جب جدا ملا نہ ہو
کیا آپ سمجہے ہیں کوئی چوری کا مال ہے

دل ابتو نذر زلف سیہ فام ہو چکا
کہتی ہی اوسے خوب کہ موذی کا مال ہے

باور اگر تمہیں نہیں آتا تو نہ آسے
اللہ جانتا ہے جو کچہہ دل کا حال ہے

خوش پاکر اپنے آنیسے فرماتے ہیں چہ خوش
ہمنے تو یہ سُنا تہا بہت غیر حال ہے

با تو نہیں دل لبہلاتے ہیں خوبان لکہنو
حمد انکی کیا زبان ہی کیا بول چال ہے

خود دیکہنے کی آنکہہ نہیں ہے نظر نہیں
ورنہ ظہور جلوۂ جانان کدہر نہیں

احوال کس سی پوچہئے یاران رفتہ کا
جاکر اُدہر کوئی بہی پلٹتا ادہر نہیں

ہے روز حشر اور شب غم کا ایک طول
اوسکی نہیں ہے شام تو اسکی سحر نہیں

آنکہوں سے روکے رُکتی نہیں رہی ہی قتل
جادوگرونکی باندہی بہی بندہتی نظر نہیں

اللہ ری بیخودی کہ وہ پہلو میں بیٹہکر
دلکو نکال لیگئے ہمکو خبر نہیں

یہ رنگ یہ زبان تو بیشک دہی ہی حمد
افسوس پر یہ ہے کہ جناب سحر نہیں

وله

آگئی فصل جنوں میلی ہیں ویرانونمیں
تہا لی پہرتی ہے وہ بیڑیا ہی بیا بانونمیں

ہوش جاتے رہے بینسکر تری دیوانونمیں
راستہ بہول گئے خضر بیابانوں میں

ہونیوالی ہی جدائی ترے دیوانونمیں
بیڑیاں کٹتی ہیں کہرام ہی زندانونمیں

ہر طرف فصل بہاری کی ہے گرما گرمی
آگ لالے نے لگا دی ہی بیابانونمیں

دل میں آکر مرے گبہرا کے وہ فرماتے ہیں
ہمتو لو آکے یہاں گہر گئے ارمانونمیں

نہ بچے تار بہاڑونکے گریبانونمیں دو ہرے بخئے کئے ہیں دشت کے دامانونمیں تیغیں سرڈالے ہیں سب اپنے گریبانونمیں	دہجیاں اکی جنوں دامن صحرا کی اڑیں پانوں دونوں چلے سوزن کیطرح وحشت میں شرم سے ابروؤں کے آگے کٹی جاتی ہیں

پہلے کب تھی یہ صفائی یہ زباں یہ بندش
تھمد منصف جو ہو وہ دیکھلے دیوانونمیں

سید مقبول حسین وصل بلگرامی

دارالسلطنت فرانس کی سیر

(۵) تابع ماقبل

یہ زمانہ جو میں نے پیرس جانیکے لئے تجویز کیا تھا کسیقدر بعد از وقت تھا کیونکہ مئی اور جون کے مہینے وہاں جانیکے لئے عمدہ ہوتے ہیں اور یہی مہینے پیرس کا "سیزن" کہلاتے ہیں مگر میرے دل میں جو سب بڑا خیال اس انتخاب زمانہ کے وقت تھا وہ یہ تھا کہ اُس مشہور و معروف دن یعنی ۱۴ جولائی کو جبکہ فرنچ نیشن (French nation) اپنی سلطنت جمہوری کی سالگرہ مناتے ہیں اور عروس پیرس اپنا گھونگھٹ اٹھاتی ہی وہاں کی بہار دیکھوں - اس ہفتہ میں ہزاروں دوسرے ملکوں کے لوگ آتے ہیں اُس قابل یادگار روز جشن کے لئے بڑی بڑی تیاریاں ہوتی تھیں - شہر کے بڑے بڑے چوک پھریروں سے سجائے گئے تھے - اور بڑے بڑے کونوں پر رات کے وقت بینڈ بجانیوالوں کے واسطے محرم کی سبیلوں کی طرح تخت وغیرہ باندھکر جگہ بنادی گئی تھی - جب یہ دن آیا تو صبح کے وقت فرانسیسی فوج کا بہت بڑا ریویو ہوا - میں تڑکے ہی لانگ شام (Long champ)

اس تماشے کو دیکھنے پہونچا۔ انگریزی سفارت کے ذریعہ سے مجھے یہاں کے ٹکٹ ملگئے تھے اور حسن اتفاق سے جو جگہہ بیٹھنے کے لیئے ملی وہ پریزیڈنٹ موسیو لوبے سے زیادہ دور نہ تھی یہ ایک مہتم بالشان نظارہ تھا مگر باستثنا رچند چیزوں کے یہانکے تماشوں نے میرے دل پر بہت کم اثر کیا۔ فرانسیسی پیدل فوج اور توپخانہ کو بہ لحاظ سپاہیوں کے جسموں کے یا اُن کی وجاہت یا وردی کے مین بہت اچھا نہیں کہتا۔ مارچ پاسٹ (march past) بہت اچھی طرح کیا گیا مگر اتنا اچھا نہیں جتنا کہ میں نے انگریزی فوج میں دیکھا رپبلکن گارڈز (Republican guards) بہت شاندار تھا اور انگلستان کی لائف گارڈز (Life guards) کی طرح تھا مگر انگریزی لائف گارڈز کے سپاہی ذرا زیادہ سیر تیلے اور قدآور ہوتے ہیں۔ فرانسیسی فوج کے اس رپبلکن گارڈز نے جو تمام فوج میں چوٹی کا دستہ کہلایا جاتا ہے [illegible] نیز دوسرے سواروں کے دستے نے اُس وقت بعض بعض کرتب نہایت عمدہ دکھلائے لوگوں نے مجھسے کہاکہ فرانسیسی سپاہی بہت بہادر ہوتے ہیں مگر انکے افسر لائق نہیں ہوتے ہیں اس رمارک کے سُنتے ہی مجھے وہ رمارک یاد آگئے جو عام طور پر ہم ترکوں کی فوج کے متعلق سنتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی فوج نے اب بہت کچھ ترقی کرلی ہی اور بمقابلہ گزشتہ زمانہ کے جبکہ نہایت ذلت کے ساتھہ اُنھوں نے جرمنیونکے مقابلہ میں شکست کھائی تھی اب اُن کی حالت بہت اچھی ہی مگر اسمیں کلام نہیں کہ جنرل اندری (General Andre) سابق وزیر فوج نے کچھہ زیادہ اصلاحیں نہیں کیں اور ابھی بہت کچھہ زمانہ چاہیے جب یہ جرمنیوں کے مقابلہ کے لائق سمجھی جاسکیں گے۔ مجھسے لوگوں نے کہاکہ بحری و بری سپاہ کے بعض اعلیٰ عہدہ دار اکثر اپنا وقت عیش و عشرت سستی و آرام طلبی میں گذارتے ہیں سپاہیونکے چہروں پر ڈاڑھیاں کچھہ مجھے اچھی نہیں معلوم ہوئیں اور بعض بعض کی شکلیں تو

اس ڈاڑہی سے نہایت ہیبت ناک معلوم ہوتی تہیں - افسر ہی کچہہ غیر معمولی طور سے تیز اور بہت تیلے
نہیں تہے -

یہ دن گویا عید کا دن تہا مگر رات دن سے کہیں زیادہ بڑہی چڑہی تہی - اس قومی
جشن کا اوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں بہت چرچا ہے اگر سچ پوچہئے تو یہ انہیں
لوگوں کے خوشی کا دن ہے - بڑے اور فیشن ایبل طبقہ کے لوگوں میں اس
روز کوئی غیر معمولی حرکت یا خوشی نہیں پائی گئی اُن کے لئے ہر روز عید ہوتا ہے
اور میں نے فیشن ایبل کوارٹرس میں روزمرہ سے کچہ زیادہ چہل پہل نہیں دیکہی -
رات کی حالت کچہ ہمارے محرم کی راتوں کی طرح تہی اور میں نے چند ایسے عجیب و
غریب تماشے دیکہے جو عمر بہر نہ بہولونگا - اٹیلین کوارٹر کے قریب تمام چوکوں پر اور
بڑے بڑے قہوہ خانوں میں ایسا ہلڑ تہا کہ میں محو حیرت کہڑا دیکہتا تہا - لوگوں کی آمد و رفت
بند ہوگئی تہی اور اُن تختوں پر جو سڑکوں پر لگائے گئے تہی نہایت دلکش بینڈ بج
رہا تہا اور بڈہے اور جوان چاروں طرف خوشی میں ناچتے پہرتے تہی - بعض بعض
چوکوں پر دو رویہ درخت چینی لالٹینوں سے سجائے گئے تہے اور تمام عالم چراغان
معلوم ہوتا تہا - ادہر اُدہر سڑکوں پر نہایت دلچسپ "میری گوراونڈ" ( )
بنائے گئی تہی جہاں کرسیاں اور نہایت سلیقہ کے ساتہہ سجی ہوئی کوچیں بچہی تہیں اور
غریب و امیر سب آکر ناچ دیکہتے اور پیرس کے ایک خاص محلہ میں جو منمیتر (Monmatre)
کے نام سے موسوم ہے بیشک غیر قابل بیان نظارہ تہا - تہوڑی دیر تک میں تصویر
کے مانند حیرت کے عالم میں کہڑا دیکہتا رہا - ناچ گہر میری گوراونڈز (Merry-go-round)
اور قہوہ خانے سب مردوں اور عورتوں سے بہرے تہی جو ایک دوسرے سے دل لگیاں
کرتے اور بادہ نشاط میں جہوم رہے تہی پیرس میں عام طور پر ہر رات عیش و نشاط
کے جلسے نظر آتے ہیں مگر اس رات کو اسقدر کثرت تہی کہ گویا لوگ اُبلی پڑتے تہی

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ فیشن ایبل محلہ مثل شانزی لیزی (Champs Elysées) وغیرہ میں کسی خاص قسم کی چہل پہل نہ تھی وہاں کی دلچسپیاں معمولی تھیں اور نسبتاً بہت سکون معلوم ہوتا تھا۔ یہ ہلڑ رات بھر رہا۔ حسن اتفاق سمجھیے یا سوء اتفاق خود اوس کمرے کے نیچے جہاں میرا بستر تھا سڑک پر ایک میری ایک گو راونڈ (Merry-go-round) کا سامان نصب تھا۔ اُس شب جب میں گھومتے گھومتے تھک گیا تو اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھکر نیچے لوگوں کا تماشہ دیکھنے لگا حتی کہ باجے کا نغمہ اب کانوں کو بُرا معلوم ہونے لگا اور بجائے لطف کے بے لطفی اور نیند کی وجہ سے تکلیف سی محسوس ہونے لگی۔ اب بھی جبکہ یہ لکھہ رہا ہوں کانوں میں اوس رات کی عورتوں کی چیخوں کی آواز گونج رہی ہے اور میں دیکھہ رہا ہوں کہ کہیں پر عورتوں اور مردوں کے چھوٹے چھوٹے مجمع ہیں اور کہیں صرف ایک ہی مرد اور ایک عورت ہے جو ہاتھوں میں ہاتھہ ڈالے بے باکانہ گویا نشۂ سرور میں مست ٹہل رہے ہیں اور ایک دوسرے کے بوسے لیتے جاتے ہیں اور سب ملکر ایک حالت مجموعی میں ایسا عجیب و غریب اور کسیقدر مضحک ڈرامابن گئے ہیں کہ اسکی نظیر دنیا میں کہیں اور پیرس کے سوا ملنا ممکن نہیں۔

میرے اثنائے قیام پیرس میں شاہ کجکلاہ ایران کی تشریف آوری کی وجہ ہر طرف ایک ہنگامہ سا تھا۔ شاہ شانزی لیزی ہوٹل (Hotel Champs Elysées) میں مقیم تھے۔ یہ ہوٹل گویا عیش و طرب کی مشین ہے اور لطف و عیش و نشاط و لوازمات عیاشی میں تمام یورپ میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ یہ ایک بہت عالیشان عمارت ہے جسمیں بکثرت پر تکلف و آراستہ سیلون (Saloons) کمرے ہیں جہاں ٹھہرنے والے کو عیش و عیافی کے ساتھہ گذر کرنے میں کسی چیز کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ یہاں کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور ایک چھوٹے سے کمرے کا روزانہ کرایہ بائیس تئیس ۲۲ ۲۳ روپیہ سے کم نہیں۔ مگر شاہ نے پوری دو منزلیں اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے

واسطے کرایہ پر لی تہیں۔ مظفرالدین قاچار کو دیکھنے کا کئی مرتبہ مجھے اتفاق ہوا لیکن اُن کی وجاہت کا اثر کبھی میرے دلپر نہ ہوا۔ پہلی مرتبہ تو اُن کی صورت یعنی نگوں چہرہ بڑی بڑی موچہیں۔ آنکہیں جنہیں عیاشی اور بے فکری کا خمار تہا۔ مجھے کچھ خوفناک سی معلوم ہوئی مگر دوسری مرتبہ جب دیکھا تو کسیقدر میرے خیال میں تبدیلی ہوئی اور میں نے کہا کہ پہلی مرتبہ جلدی سے رائے قائم کرنے میں میں نے شاید مبالغہ سے کام لیا تہا لیکن اسمیں شک نہیں کہ میرے دلپر اس بادشاہ کی عظمت بالکل قائم نہیں ہوئی کیونکہ میں جانتا تہا کہ اُس نے اپنی رعایا کے لئے کوئی کام نہیں کیا اور صرف عیش و عیاشی کی خاطر اپنے سفر میں لاکہوں روپئے صرف کرتا تہا۔ اگر اسی کو اپنے ملک و دولت کی ترقی اور رعایا کی رفاہ و تعلیم میں صرف کرتا تو کسقدر اچہا ہوتا شاہ کے ہمراہی پیرس کے سڑکوں پر ادہر اُدہر اڑتے پہرتے نظر آتے تہے۔ اُن کی جسم پر فراک کوٹ تہی اور سروں پر ایرانی ٹوپی۔ فرانسیسیوں نے انکے طرح طرح کے کارٹون اور مضحک تصویریں اخبارونمیں چہاپیں۔ انکی یہ حرکت بہت سخت قابل اعتراض اور انگریزوں کے طبیعت کے متضاد تہی کیونکہ آخرالذکر کسی طرح اپنے مہمانوں کا مضحکہ کرنا پسند نہیں کرتے۔

فرانس کی پولیٹکل لائف دیکھنے کا مجھے بہت شوق تہا۔ انگریزی سفارت خانہ سے نہایت آسانی کے ساتہ چیمبر آف ڈپوٹیز (chamber of deputies) کی مباحث میں شریک ہونیکے لئے ایک ٹکٹ مجھے ملگیا۔ چیمبر آف ڈپوٹیز جو گویا فرانس کا پارلیمنٹ ہی سلطنت جمہوری کا مبدار و منشا رہے۔ لیکن عمارت اندر اور باہر دونوں جانب بہت سادی ہی اور انگلستان کی عظیم الشان ہوسز آف پارلیمنٹ (Parliament) کے مقابلہ میں زیادہ شاندار نہیں معلوم ہوتی۔ مباحث کا کمرہ نصف دائرہ کی شکل کا ہے اور کالج تہیٹر کی مثال بنچیں بچھی ہوئی ہیں۔

افسوس ہے کہ میں فرانسیسی زبان اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا تھا اسلئے وہاں کے عالمانہ
تقریروں سے کوئی دلچسپی حاصل نہ کر سکا۔

میرے پیرس کے قیام نے اب ایک پلٹا کھایا اور ایک نئی صورت اختیار کی یعنی
مسز گالن۔ن واپس جانے والے تھے اور میرا ارادہ اُن کے بعد اُس مکان میں رہنے
کا نہ تھا اسلئے میں ایک ہوٹل میں اُٹھ گیا جسکا نام میرے ایک دوست نے لندن ہی
میں مجھے بتا دیا تھا - میرا قصد کچھ دن اور رہکر یہاں کے اسپتال وغیرہ دیکھنے کا تھا۔

یہ ہوٹل ایک بہت خوبصورت مختصر سا مکان تھا - اور اُن سڑکوں میں سے ایک سڑک
پر جو آرچ ڈی ٹرائمف (arch de triumph) سے شہر کے فیشن ایبل
محلوں میں سے ایک محلہ کی طرف مڑتی تھیں ایوینو ڈی فرای لینڈ ([illegible])
میں واقع تھا - اسکی مالکہ ایک انگریز لیڈی تھی - وہ اور اُسکے بچے کچے سب اسی
مکان میں رہتے اور کبھی کبھی بعض منتخب مہمانوں کو ٹھیرا لیا کرتے تھے - یہ عورت نہایت
نیک تھی اور گو کہ انگریز تھی مگر ہمدردی اور خیالات و جذبات میں بالکل فرانسیسی تھی -
وہ اور اُسکا خاندان سب فرانسیسی ما یا ہو گیا تھا - اُسکا مذہب پروٹسٹنٹ تھا (فرانس
میں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک اب بھی ایک دوسرے سے بہت زیادہ تعصب
رکھتے ہیں) اور تھیر ایسی مہربان تھی کہ میں ہمیشہ اپنا کھانا اوسکے اور اُسکے بچوں کے
ساتھ کھایا کرتا ہے - یہاں مجھ سے ایک انگلش جنٹلمین سے ملاقات ہوئی جو اسی
لیڈی کا عزیز تھا اور ظاہرا نہایت خوش مزاج دلچسپ اور نیک طبیعت آدمی معلوم
ہوتا تھا - ہماری ملاقات رفتہ رفتہ دوستی کے درجہ تک پہونچ گئی اور پیرس کے قیام
کے یہ چند روز اوسکی ہمراہی میں بہت دلچسپی کے ساتھ گذری کیونکہ وہ فرانسیسی زبان
خوب بول سکتا تھا اور یہاں کے لوگوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔

یہ گھر تمام امریکن لیڈیز سے جو ظاہرا عمدہ اور دولت مند طبقہ کی معلوم ہوتی

تھیں بھرا ہوا تھا۔ انہیں میں سے ایک لیڈی سے میری ملاقات ہوئی جسکی لڑکی میز پر مجھسے بہت ملکر بیٹھتی تھی اور کھانیکے بعد ڈرائنگ روم میں ہم دونوں خوب خوب باتیں بہت سی دلچسپ مضمونوں پر کیا کرتے تھے یہ دونوں ماں بیٹیاں مجھسے بہت دلچسپی ظاہر کرتی تھیں مگر خدا کا شکر ہے کہ ان تعلقات کے بیل زیادہ نہیں پھلے۔ امریکن عورتیں درحقیقت بہت حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ وہ اپنے شوہروں کو امریکہ میں پیچھے چھوڑکر تمام عالم میں ماری ماری پھرتی ہیں اور ہمیشہ اپنے ان وفادار شوہروں (کیا بلکہ نوکروں) سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتی رہتی ہیں۔ تمام دنیا کی عورتوں نیں جتنی آزادی انہیں حاصل ہے کسی دوسری عورت کو نہ ہوگی اور اگر ان کی یہ وفادار شوہر انکی مذاق کے موافق ثابت نہ ہوئی تو پرانے جوتے کیطرح تبدیل کرڈالنے میں بھی باک نہیں ہوتا اور امریکہ میں ایسے واقعات ایک دو نہیں ہزاروں ہی ہوتے ہیں۔ صرف اسبات کو خیال نہ کرو تو یہ عورتیں تمام یورپ کی عورتوں سے زیادہ مہذب اور شائستہ ہوتی ہیں۔ ان کی گفتگو کا عام رجحان جہانتک میں نے غور کیا لباس اور جواہرات کی طرف معمولاً ہوتا ہے۔ پیرس کی عورتیں اپنی لباس میں نہایت تکلفات اور نزاکت خرچ کرتی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ امریکہ کی عورتیں فیشن میں تھوڑی دنوں میں ان پیرس والیوں سے کہیں بڑھجائینگی۔ مسٹر پانیٹفکس (میرے دوست) کہتے ہیں کہ مجھے انکا گھماکر الفاظ ادا کرنا بہت بُرا معلوم ہوتا ہے اور میری کان ان کی چپڑ چپڑ نہیں سن سکتے تاہم میرے لئے اُن کی صحبت بہت دلچسپ تھی اور مجھے ان کی اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی طرز معاشرت کا کسیقدر اندازہ ہوگیا۔

پیرس کے ایک قہوہ خانہ میں میرے ایک انگریز دوست یکایک ملگئے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑے۔ اور بے انتہا خوش ہوئے اور کئی ایک فرانسیسیوں سی میری ملاقات کرائی جنھوں نے اپنے ہاں میری دعوتیں کیں اور اس طریقہ سے

پیرس کے عمدہ طبقہ کے لوگوں کی طرز معاشرت معلوم کرنے کا اتفاقاً ایک عجیب موقعہ مجھے ملا۔ شہر پیرس اور پیرس والوں کے متعلق میری رائے ابھی تک ڈانواڈول ہے اور ممکن ہے کہ دوسری تیسری مرتبہ جب وہاں جانے کا مجھے اتفاق ہو تو اسمیں استحکام اور شاید کچھ تغیر بھی ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ پیرس میں ڈومسٹک لائف اسقدر اچھی نہیں جسقدر کہ لندن میں ہے۔ لندن میں لوگ فرصت کی اوقات میں گھر میں رہکر اچھی طرح آزادی اور خوشی سے ساتھ بچوں کے ساتھ ڈومسٹک لائف کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ بخلاف اسکے پیرس میں زیادہ تر قہوہ خانوں اور ناچ تماشوں میں لوگ فرصت کی اوقات گذارتے ہیں اور اپنے ساتھیوں اور ہمجولیوں سے بھی بجائے گھر کے ایسے قہوہ خانوں میں ملاقات کرتے ہیں جو اُنکے مذاق خاص کیموافق ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کی زندگی خواہ وہ اعلیٰ طبقہ کے ہوں یا ادنیٰ کے اسقدر لہو ولعب میں بسر ہوتی ہے اور اسقدر بے اصول اور چھچھورے طریقہ پر وہ لوگ سامان عیش مہیّا کرتے ہیں کہ مجھے معلوم کرکے بہت نفرت ہوئی۔ اور موجودہ تہذیب کی جہاں اور بلائیں ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کو ذرا خود مختاری اور معاش کی طرف سے بیفکری حاصل ہے اُن کی ہمتیں اکثر پست اور طبیعتیں اکثر دنی ہوتی ہیں اور ہمیشہ یہ لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ہر روز ایک نیا سامان عیش مہیّا رہے اور روز ایک نت نئی چیز ہو جو عیش پسند طبیعت کی خلش دفع کرتی رہے۔ طبیعتیں حد سے زیادہ ذکی الحس ہیں اور ہوس عیش اسقدر ہے کہ اگر دنیا کے تمام سامان عیش میسّر ہو جائیں تب بھی اس آگ کا شعلہ بلند ہی رہیگا اور دلمیں لاکھوں ایسی خواہشات باقی رہینگی جنہیں حاصل کرنے کا شوق ہر وقت تڑپاتا رہیگا۔ اس ہوس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض قومی بالکل بیکار ہو جاتے ہیں اور قوموں کی خصوصیات پر اثر پڑنے لگتا ہے۔ ان عیش و عشرت کے بندوں کی زندگی جسطرح گذرتی ہے اُسے میں نے ذیل کے چند

صورتوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) ایک نہایت فیشن ایبل ہوٹل میں رہنا۔

(۲) بارہ بجے سو کر اُٹھنا اور پلنگ ہی پر پڑے پڑے کچھ چاء پینا۔

(۳) کپڑے پہننا اور ڈیڑھ بجے کھانا کھانا۔

(۴) پانچ بجے اپنے کسی آشنا کو ساتھ لیکر ٹمٹم پہ بیٹھکر بائی ڈی بولون کی سیر کرنا

(۵) شانزی لیزی (Champs Elysees) یاکسی اور جگہ کسی نہایت فیشن ایبل سٹان میں شب کا کھانا کھانا۔

(۶) کسی ناچ گھر یا ناچ کے تماشے میں جانا اور ۱۱ بجے تک کسی ناپاک مذاق میں منہمک رہنا۔ یاکسی اوپیرا (Opera) میں تماشا دیکھنے جانا۔

(۷) بارہ بجے کسی ایسے تھیٹر میں جانا جو رات گئے شروع ہوا کرتا ہو یا کسی ایسی قہوہ خانہ میں جانا جو رات بھر کھلا رہتا ہو اور وہاں کے تماشوں میں ہمہ تن مصروف ہوکر رات کاٹنا۔

(۸) پانچ بجے صبح کو سو جانا۔

اس طرح آزادانہ زندگی بسر کرنے کے لئے بے انتہا روپیہ کی ضرورت ہے یعنی کم سے کم ۱۰ پونڈ روزانہ چاہئیں۔ تمام قسم کی عیش و عشرت کے سامانوں کا جو دولت کے ذریعہ سے مہیا ہوسکتے ہیں تصور کرو اور خیال کرو کہ ان سامانوں کو اودھ کے رنگیلے بادشاہ نے کسقدر روپیہ صرف کرکے جمع کیا ہوگا گر تم اودھ کے ان تمام سامانِ نشاط کا مقابلہ اگر پیرس کے موجودہ عیش و نشاط کے سامانوں سے کروگے جو اسقدر کم خرچ سے نصیب ہوسکتے ہیں تو واجد علی شاہ کا عیش بے حقیقت نظر آئے گا۔

میں بے انتہا بے انصافی کرونگا اگر ایک ٹھیٹھ فرانسیسی کی طرز معاشرت کو جسطرح اوپر بیان کر آیا ہوں لکھکر خاموش ہوجاؤں اور یہ نہ بیان کروں کہ وہ لوگ جوان

عیش و عشرت کے مقامات کو عزت بخشا کرتے ہیں درحقیقت فرانسیسی نہیں بلکہ غیر ملک والے امریکہ ۔ انگلستان اور روس کے باشندے ہوتے ہیں ۔ پیرس تشریف لانے سے انکا مقصد صرف لہو و لعب ہوتا ہے اور ان سے زیادہ پیرس کے عیش و عشرت کے مقامات یا یوں کہئے کہ مہذب بدمعاشوں کے اڈوں کے سرپرست خود فرانسیسی نہیں ہوتے ۔ یہاں بعض بعض ناپاک مقامات ایسے ہیں جن کی سرپرستی اگر یہ غیر ملک والے نہ فرمائیں تو اُسکا چلنا محال ہے کیونکہ خاص پیرس والے ان تمام چیزوں کی زیادہ شوقین نہیں ہوتے ۔

ایک معمولی پیرس کے رہنے والے اور ایک معمولی لندن والے کا مقابلہ کیا جائے تو پیرس والا نہایت پرہیزگار معلوم ہوگا ۔ پیرس میں شراب کی مدہوش بہت شاذ کوئی نظر آئیگا بخلاف اسکے لندن میں یہ ایک معمولی بات ہے لندن کے پبلک ہاؤس ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا دوزخ کا کوئی طبقہ ہے جسمیں شرابی ہی شرابی بھرے ہیں لیکن پیرس میں یہ پبلک ہاؤس بہت صاف اور ستھرے نظر آئینگے اور یہاں لندن کا سا کبھی کوئی مجمع نظر نہ آئیگا جہاں میلے کچیلے کپڑے پہنے مزدور جمع ہوں اور شراب کے قدح کے قدح لنڈھاتے چلے جاتے ہوں ۔ یہاں کے مزدور لندن کے مزدوروں سے زیادہ اچھے اور ستھرے لباس میں نظر آئینگے ۔ شاید اسکی وجہ یہ ہے کہ لندن کی طرح یہاں غیر ملک کے مزدوروں سے مقابلہ بہت کم ہے ۔

میں ہر روز بغور دیکھتا ہوں کہ یہاں کے عام آدمی حتی کہ منیمتر (Manmatre) کے طبقہ غربا کے لوگ بھی اور اُنکے بچے نہایت ہی صاف اور پاکیزہ نظر آتے ہیں ان لوگوں کا اگر لندن کے اسی درجہ کے لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو کوئی نسبت نہ معلوم ہوگی ۔ لندن کے غریب لوگ ایسے گندے اور میلے کچیلے ہوتے ہیں کہ ایک منٹ بھی اُن کے پاس کھڑا رہنا محال ہے ۔

خود شہر (پیرس) کو صفائی کے لحاظ میں نے اپنے خیال کے مقابلہ میں بہت کچھ گرا ہوا پایا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عہدہ دار اس زمانے میں کچھ بے توجہ اور سست سے ہیں۔ سڑکیں گو کہ لندن کی سڑکوں کی طرح میلی اور خراب نہیں تاہم سوای شانزی لیزی (Champs Elysées) کے کوئی سڑک ایسی نہیں ہے جو سنگ مرمر کی سطح کی سی مصفا نظر آئے جیسا کہ میں ہندوستان میں سنا کرتا تھا۔ سنتا ہوں کہ برلن اس معاملہ میں دنیا کے تمام شہروں پر ترجیح رکھتا ہے۔ یہ طریقہ مجھے بہت پسند آیا کہ یہاں چوکوں کے کونوں پر لکڑی کی دکانیں لگی ہیں جنہیں بڑھیا عورتیں کاغذ بیچتی ہیں اور بکثرت ہر جگہ پھولوں کی دوکانیں ہیں سواری کا سامان بھی لندن کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔ یہاں کی آمنی بسیں (گاڑیاں) لندن کے بسوں سے زیادہ تیز ہیں۔ علاوہ ان کے بکثرت بجلی کی اور موٹر ٹرام گاڑیاں چلتی ہیں جن پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک جگہ سے دوسری جگہ ہم اُڑے چلے جارہے ہیں۔ آپ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک چاہے کتنا ہی فاصلہ ہو باآسانی سفر کر سکتے ہیں۔ اور انتظام ایسا معقول ہے کہ آدمیوں کے ہجوم سے نہایت آسانی کے ساتھ بیٹھے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح نہایت آسانی اور آرام سے بہت کم خرچ کر کے آدمی ایک جگہ سے دوسری جگہ پیرس میں آجا سکتا ہے۔ گاڑیوں کا کرایہ بھی نسبتاً بہت کم ہے اور ان میں ایک آلہ لگا ہوتا ہے ٹکسا میٹر (Taxameter) نام جو خود بخود طے شدہ فاصلے کے لحاظ سے کرایہ کا حساب کر کے بتا دیتا ہے۔ اس سے نو واردوں اور اجنبی لوگوں کو بہت آرام ملتا ہے فقط

"دو مالی"

از پیرس

انتخاب بیاض

جناب منشی سید انور علی صاحب انور متوسل بھوپال

نواب فصیح الملک داغ دہلوی

عبث بناہ کے وعدے سے تم توڑتے ہو | یہ کون بات ہے اک دن بگاڑ کر لینا

میرے دل کو دیکھکر میری وفا کو دیکھکر | ولہ | بندہ پرور منصفی کرنا خدا کو دیکھکر

میرزا حبیب فریبی اصفہانی این رباعی بحالت نزع گفتہ

یاران باہم چو عیش بنیاد کنید | در صحبت ہم خاطر خود شاد کنید
شکرانۂ عیش و کامرانی گاہے | از حسرت و ناکامی ما یاد کنید

قالغی خیوشانے

بجم بادہ نمک محتسب زخامی کرد | باہل میکدہ آخر نمک حرامی کرد

حکیم مومن خان مومن دہلوی

مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے | رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے

حکیم مومن خاں مومن دہلوی

پھر وہ وحشت کے خیالات کہیں ہیں پھرتے | دشت یاد آتے ہیں آہو ہیں نظر میں پھرتے

مائلی تاشکندی

رخ نمودی و مرا بے سر و ساماں کردی | آفریں باد عجب کار نمایاں کردی

شیدا

دریں چمن نہ گل و لالہ شبنم اندود است | کہ خندۂ گل ایں باغ گریہ آلود است

شہرت

نہ من شہرت تمنا دارم و نے نام می خواہم | فلک گرواگذارد یک نفس آرام می خواہم

فقط

کانگرس اور مسلمان

مارچ اور اپریل کے اردو معلی میں حاجی موسیٰ خانصاحب رئیس دتاولی کا مضمون کانگرس کے متعلق شائع ہوا ہے جسمیں آپنے اول کانگرس کے ان نقائص کو بیان کیا ہے جن کی وجہ سے مسلمان اسمیں شریک نہیں ہوئے اور بعدازاں بنارس کانگرس کے رزولیوشنوں کے متعلق بحث کی ہے اگر حاجی صاحب ممدوح اس مضمون میں وہ وطیرہ اختیار کرتے جو کہ اسلامی اخبارات میں اختیار کیا جاتا ہے یعنی جہاں کانگرس کا نام آیا وہاں گالیوں کی بوچھار ہوئی تو اسکے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ آپ نے اس نہایت ضروری مسئلہ کے متعلق معقول اور متین طریقہ سے بحث شروع کی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی چند غلط فہمیوں کے متعلق کچھ لکھا جاوے۔

آپ کی بحث کا ماحصل یہ ہے کہ جبتک مسلمانوں کے خاص حقوق کی حفاظت کا انتظام نہ ہو جاوے اُنکو کانگرس میں شریک ہونے سے نقصان پہونچیگا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو جسوقت کانگرس سے مخالفت شروع کی گئی تھی اسوقت دو بڑی وجوہ اس مخالفت کے لئے پیش کئے جاتے تھے اول یہ ہے کہ پولٹیکل اجیٹیشن ہماری حالت کے لئے موزوں نہیں ہمکو محض سرکار کی مہربانی پر بھروسہ کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ ہندوں کے ساتھ ملکر کام کرنے سے مسلمانوں کو نقصان پہونچے گا۔ شکر کا مقام ہے کہ اب سبب نمبر (۱) کا ذکر بہت کم یا بالکل نہیں کیا جاتا اب یہ نہیں کہا جاتا کہ ہندوستانیوں یا مسلمانوں کے لئے پولٹیکل اجیٹیشن میں دخل دینا کفر ہے محض فرشتہ صفت انگریزی گورنمنٹ کی خوشامد کرنا کافی ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو یہ ایک بہت

بڑی فتح ہے جو کانگرس والوں کو حاصل ہوئی ہے - اب ہمارے مسلمان دوست پولیٹیکل ایجیٹیشن کو اصولاً برا نہیں کہتے اور اسکی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں بحث اسمیں ہے کہ آیا کانگرس جس طریقہ سے کام کر رہی ہے اسمیں کہانتک ترمیم کی ضرورت ہے کیا عجب ہے کہ جسطرح تجربہ نے ایک غلطی کو رفع کر دیا اسیطرح چند دن بعد دوسری غلطی بھی خود بخود رفع ہو جاوے -

حاجی صاحب موصوف نے بھی مضمون مذکور میں یہ مان لیا ہے کہ ایجیٹیشن ضروری ہے اور کانگرس کا وجود ہندوستانیوں کے لئے نفع بخش ہے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کن شرائط کے ساتھ اسمیں شریک ہونا چاہئے - آپ کو یہ شکایت ہے کہ کونسل کی ممبری میں مسلمانوں کو کافی حصہ نہیں دیا جاتا - مسلمان اعلیٰ عہدوں پر کم مقرر ہوتے ہیں وغیرہ - اس بحث کے دو حصے ہوسکتے ہیں اول یہ کہ مسلمانوں کی کمی کی ذمہ دار کانگرس ہے یا وہ خود - اور دوسرا یہ کہ کسی خاص گروہ کی کمی کے پورا کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کہانتک اپنی آواز بلند کر سکتی ہے - میں حاجی صاحب کی خدمت میں ادب سے یہ عرض کرونگا کہ مسلمانوں کا پولیٹکل ایجیٹیشن میں شریک نہونا اور بعد ازاں اس ایجیٹیشن سے جو نفع حاصل ہوا ہو اسمیں حصہ رسدی نہ پانے کی شکایت کرنا کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا - اسکے معنی تو یہ ہوئے کہ مسلمان ہندوں پارسیوں اور عیسائیوں سے یہ کہیں کہ تم ایجیٹیشن کرو ہم تمہارے شریک نہونگے بلکہ جسوقت تم ایجیٹیشن کروگے اسوقت گورنمنٹ سے یہ کہینگے کہ یہ لوگ باغی ہیں بے ایمان ہیں اور گورنمنٹ اور مسلمانونکے دشمن ہیں ہم بڑے وفادار ہیں ہم گورنمنٹ کا ساتھ دینگے اور یہ باتیں کہکر ہم گورنمنٹ کی عنایت کو اپنے طرف منعطف کرینگے لیکن جسوقت باوجود ہماری علحدگی کے ایجیٹیشن سے کوئی نفع حاصل ہوگا مثلاً کاونسلوں میں ممبروں کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا اسوقت دیکھکر منتخب کرنا کہ ہم اسوقت تمکو گالیاں

دیتے ہیں پولیٹیکل ایجیٹشن کو بُرا کہتے ہیں اور اپنے اہل ملک کے خلاف ہو کر گورنمنٹ کے نکھو نمیں بیلے بنتے ہیں لیکن ان سب باتوں کو اسوقت تم بھول جانا اور ہم سے برادرانہ برتاو کرنا۔

حاجی صاحب موصوف نے تقسیم بنگال کے مسائل پر غالباً غور کیا ہوگا مشرقی بنگال کے مسلمان کن کن طریقوں سے بہکائے گئے اور انکے بعض سر برآوردہ لیڈروں نے اپنے تیئں عام بنگالیوں سے الگ کرلیا ممالک متحدہ اور پنجاب کے اخبارات مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو للکار رہے ہیں کہ دیکھو ہندوؤں کے شریک مت ہونا یہی موقع گورنمنٹ سے نفع حاصل کرنے کا ہے ہندوؤں کو بکنے دو تم بیلے بنے رہو اور سر بمفیلڈ فلر کی عنایتوں سے فائدہ اُٹھاؤ اب فرض کیجئے کہ دو برس یا چار برس بعد مشرقی بنگال کے کونسل میں ممبروں کے انتخاب کا وقت آوے اور اسوقت ہندو مسلمانوں کو اپنے ووٹ نہ دیں تو حاجی صاحب موصوف سخت ناراض ہونگے اور کہینگے کہ دیکھو ہمارے حقوق کی حفاظت نہیں ہوتی میں حاجی صاحب سے یہ پوچھتا ہوں کہ انکا یہ کہنا کہاں تک حق اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ جبکہ یہ بات عملاً ثابت ہوگئی کہ مسلمانان بنگال کو بلحاظ انکے شمول گورنمنٹ سروس یا کسی اور لحاظ سے زیادہ فائدہ نہیں ہوا اور جبکہ مخالفت تقسیم میں مسلمانوں کے نام بھی پائے جاتے ہیں پھر مسلمانوں کو اس تجویز (یعنی عام بنگالی قوم کا ایک حکومت کے تحت میں رہنا) کی تائید میں کوئی بڑا ہرج نہیں معلوم ہوتا" جسکے معنی یہ ہوئے کہ اگر واقعی مسلمانوں کو گورنمنٹ سروس سے فائدہ کی امید ہو تو ملکی اور قومی نمک حرامی میں کوئی ہرج نہیں۔ مجھکو تعجب ہے حاجی صاحب کی قلم سے یہ الفاظ کیونکر نکلے۔

اگر آپ ہندوؤں سے اچھا سلوک چاہتے ہیں تو آپ بھی انسے اچھا سلوک کیجیے

نہیں کہ ان سارے اخبارات میں جو خالص اسلامی جوش کے نمونے اور اسلامی پریس کے طرّہ دستار سمجھے جاتے ہیں ہر وقت اور ہر موقع پر ہندوں کو گالیاں دیجاویں پولٹیکل اجیٹیشن کو برا کہکر اور گورنمنٹ سے ہر موقع پر ہندوں کو باغی نمکحرام بتلاکر اپنا رسوخ جتلایا جاوے اور پہر ہندوں سے یہ امید کیجاوے کہ وہ باوجود ان سب باتوں کے ہمکو کونسل کی ممبری کے لئے منتخب کر دینگے حاجی صاحب کو یونیورسٹیز کمیشن کا قصہ یاد ہوگا اور آپ کو غالبًا یہ بہی یاد ہوگا کہ سر گرو داس بنرجی نے ہندوستانیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کیا لکہا تہا اور حضرت بلگرامی نے کمیشن کی رپورٹ پر کسطرح چپ چپاتے دستخط کر دئے تہے کیا انہیں باتوں سے اہل ملک کو دونوں میں اعتبار پیدا ہو سکتا ہے آپ کانگرس میں شریک ہوجیے پولٹیکل اجیٹیشن میں جن مصیبتوں اور صعوبتوں کا سامنا ہوتا ہے ان کو برداشت کیجیے گاڑہے وقت ہماری کام آئی اور پہر کامیابی کے وقت اپنا حصہ رسدی حاصل کیجئے - باوجود اس عام مخالفت کے جو جو مسلمان کانگرس کے شریک رہے ہیں انکو کانگرس نے اس اعزاز کے عطا کرنے میں دریغ نہیں کیا ہے جو اسکے اختیار میں تہا - مگر غضب تو یہ ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ کی خوشامد کرکے اور ہندوں کو گالیاں دیکر پہلے اس سے نفع حاصل کریں اور پہر ہندوں میں بہی اعتبار اور رسوخ قائم کریں - یہ کیسے ہو سکتا ہے مجھکو پہر مشرقی بنگال کا ذکر کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہ اس وقت اس پالیسی کی ایک بیّن مثال ہے دیکھیے اسلامی اخباروں میں بابو سرندرو ناتھ بنرجی کیساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ انکے ساتہ کیا گیا اور جسطرح کانفرنس کے ڈیلیگیٹوں کے ساتہ برتاؤ کیا گیا وہ نہایت مناسب اور زالنسب تہا میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بابو سرندرو ناتھ بنرجی نہایت نالائق سہی لیکن جسطرح مسٹر آمرسن نے انکے مقدمہ کا فیصلہ کیا اسکو کیا آپ انصاف کہہ سکتے ہیں پس مسلمان اخبار نویسوں سے

پوچھتا ہوں کہ آپ نے مسٹر امرسن کی کارروائی کو پڑھا ہے اور اگر پڑھا ہے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی کارروائی قانون کے موافق تھی - چور ڈاکو قاتل بھی جسوقت عدالت کے روبرو آتے ہیں اُسوقت وہ انصاف کی امید رکھتے ہیں کیا بابو سرندر ورناتھ ان سے بھی بدتر تھے - اور وہ بدتر ہی سہی - تب بھی جو ملزم عدالت کے سامنے آئے اسکے ساتھ عدل کیا جانا چاہئے اسکے ساتھ قانون کا برتاؤ ہونا چاہئے - مسٹر امرسن نے جو کچھ کیا وہ اظہر من الشمس ہے آپ ان کی اس حرکت پر آج محض اسوجہ سے بغلیں بجارہے ہیں کہ بابو سرندر روناتھ کانگرس والے ہیں بنگالی ہیں ہندو ہیں لیکن کل آپ انہیں بابو سرندر روناتھ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ کونسل میں اور کانگرس میں آپ کے خاص حقوق کی حمایت کریں اگر یہ ظلم وستم نہیں تو اور کیا ہے -

پس اسکے قبل کہ آپ کونسل کی ممبری کی خواہش کریں آپ کو اس جد وجہد میں کانگرس والوں کا ساتھ دینا چاہئے جس سے انتخاب کا حق حاصل ہوتا ہے تاکہ ان لوگوں میں آپکا اعتبار پیدا ہو - لیکن علاوہ اسکے ایک بات اور بھی ہے بغیر پولیٹکل ایجیٹشن میں شرکت کرنے کے پولیٹکل حقوق کے استعمال کی لیاقت نہیں پیدا ہوتی حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ ہر صوبے میں قابل اور لائق مسلمان موجود ہیں - ممکن ہے کہ ایسا ہو مگر انمیں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے پولیٹکل مسائل پر غور کیا اور ان مسائل پر تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے اپنی لیاقت کو اہل ملک پر ثابت کیا ہے ایک زمانہ تھا کہ جب محض دولت یا ریاست ممبری کے لئے کافی ہوتی تھی انگریزی زبان کا جاننا بھی ضروری نہیں خیال کیا جاتا تھا اب بھی کہیں کہیں ایسا ہے مگر اکثر اب ممبروں کے انتخاب میں علاوہ ان کی ذاتی وجاہت کے یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ یہ پولیٹکل مسائل کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں ان کو خدا نے ان مسائل کے سمجھنے

اور انپر بحث کرنے کے لئے دماغ بھی عطا کیا ہے یا نہیں اور اگر قابلیت ہے تو وہ آزاد خیالی کے ساتھ ہے یا نہیں - پولیٹکل قابلیت اور آزاد خیالی یہ دونوں باتیں ممبری کے لئے نہایت ضروری ہیں ممکن ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ ایسے ہوں مگر وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے - خاموشی کی پالیسی نے جس کی بنا بیس برس ہوئے علی گڈہ میں ڈالی گئی تہی انکو گونگا بنا دیا ہے جو لوگ مسلمانوں کے وکیل اور قائمقام سمجھے جاتے ہیں ذرا انکا حال دیکھئے - البشیر - وکیل وطن - ریاض الاخبار - ان اخباروں کو میں نمونے کے طور سے لیتا ہوں - اگر میں غلطی نہیں کرتا تو انکے اڈیٹر انگریزی زبان سے وہ واقفیت نہیں رکھتے جو آجکل ہندوستان میں اخبار نویسی کے لئے ضروری ہے اسکو میں صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے بدقسمتی خیال کرتا ہوں کیونکہ انگریزی نہ جاننے کی وجہ سے اکثر یہ اصحاب ایسی ایسی غلطیاں کرتے ہیں کہ جنکو پڑہکر ہنسی آتی ہے - جسوقت پنڈت مدنموہن صاحب مالوی نے الہ آباد کے کلکٹر کی بے اعتنائیوں سے مجبور ہوکر میونسپل کمشنری سے استعفےٰ دیا تہا اسوقت اسی صوبہ کے ایک اردو اخبار نے اظہار مسرت کرتے ہوئے لکہا تہا کہ اب غالبًا پنڈت صاحب کو کونسل کی ممبری سے بہی مستعفی ہونا پڑیگا - غالبًا مطلب یہ تہا کہ چونکہ آپ الہ آباد سرکل کے میونسپلٹیوں کی طرف سے کونسل میں منتخب ہوئے تہے - اسلئے میونسپلٹی سے علیحدگی کونسل سے علیحدگی کا باعث ہوگی کیا یہ امر قابل افسوس نہیں کہ ایک سربرآوردہ اخبار کو قواعد انتخاب سے اسقدر لاعلمی ہو - یا وہی مشرقی بنگال کے قصہ کو لیجئے - بابو سرندرو ناتہ کو گالیاں دیتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ سر بمفیلڈ فلر کو چڑہانے کے لئے اسسال پراونشل کانفرنس انکے صوبے کے ایک ضلع میں مقرر کی - اصل یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس اور پراونشیل کانفرنسوں کے اجلاسوں

کے مقامات ایک سال قبل طے ہو جاتے ہیں اور ہر سال کسی نہ کسی صوبہ یا شہر کی طرف سے کانگرس اور کانفرنسوں کو آیندہ سال کے لئے دعوت دیدیجاتی ہے چنانچہ پارسال جب ضلع میمن سنگھ میں بنگال کانگرس کا اجلاس ہوا تھا تو اسیوقت یہ طے ہو گیا تھا کہ آیندہ اجلاس بریسال میں ہوگا اسوقت نہ صوبہ مشرقی بنگال کا وجود تھا نہ اس صوبہ کے لفٹنٹ گورنر کا۔ یہ حال ان حضرات کی واقفیت کا ہے شاید یہ کہاجاوے کہ یہ معاملات جزوی ہیں میں کہونگا کہ جزوی معاملات کے بنا پر بھی اگر آپ کسی کی رنج و تکلیف پر اظہار مسرت فرمائیں یا کسی کو گالیاں دیں تو آپ کا فرض ہے کہ واقعات کو اچھی طرح جانچ لیجئے علاوہ بریں بڑے بڑے ملکی مسائل پر بھی کچھ حالت بہتر نہیں نظر نہیں آتی۔ ایک افلاس ہند کے مسئلہ کو لیجئے اسکی دو شاخیں ہیں ایک سرکاری مالگذاری کی زیادتی جو زراعت سے متعلق ہے دوسری کاریگروں کی تباہی جو حرفت سے متعلق ہے مسٹر رومیش دت نے اپنے مشہور و معروف لکھنو والے ایڈریس میں پہلے مسئلہ پر نہایت قابلیت سے بحث کی تھی اور انہوں نے اپنی تصانیف میں ان دونوں مسئلوں پر سرکاری کاغذات کی مدد سے بہت کچھ روشنی ڈالی ہے۔ انہیں مسائل پر مسٹر دادا بھائی نوروجی اور مسٹر ڈگبی نے ضخیم کتابیں لکھی ہیں اور اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ افلاس کا مسئلہ وہ مسئلہ ہے کہ جسپر آیندہ ہندوستان کی بہبودی اور تباہی کا بہت کچھ دارومدار ہے۔

میں حاجی موسیٰ خانصاحب سے پوچھتا ہوں کہ جن اردو اخبار نویسوں کی تحریر ہندوستان سعید کے ہزاروں مسلمانوں کی رائے پر اثر ڈالتی ہے انہیں ایک بھی ایسا ہے جسمیں ان کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے کی لیاقت ہو۔ ان میں ایک بھی ایسا ہے جس نے اس مسئلہ کو سیاست مدن کے اصولوں سے جانچا ہو۔

انہیں ایک بھی ایسا ہے جو مسٹر گوکھلے کے بجٹ اسپیچوں کو پڑھنے اور سمجھنے کی تکلیف گوارا کرتا ہو۔ مصارف فوجی ہی کے مسئلہ کو لیجئے۔ اگر کبھی اخبارات مذکور رائے زنی کی تکلیف گوارا کرتے ہیں تو کہدیتے ہیں کہ مسٹر گوکھلے کا اس مسئلہ پر کچھ کہنا فضول ہے کیونکہ فوج میں سرکار کمی نہیں کرسکتی وغیرہ وغیرہ مگر انہیں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس مبحث کی تاریخ پر غور کیا ہو۔ پہلے ہندوستان کی فوج انگلستان کی لڑائی لڑنے کے واسطے جب باہر جاتی تھی تو اسکا کل خرچ ہندوستان کے خزانے سے دیا جاتا تھا۔ چاہے ہندوستان سے فوج حبش انگریزی قیدیوں کو چھڑانے کے لئے جاتی یا مصر میں انگریزی اقتدار قائم کرنیکے لئے۔ اسکے کل مصارف ہندوستانی دیتے تھے۔ سالہا سال کی کوشش کے بعد جب اس فنافی القوم دادا بھائی نوروجی کے کہنے سننے سے ولبی کمیشن مقرر ہوا تو اس نے یہ طے کیا کہ جب ہندوستانی فوج انگلستان کی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے باہر بھیجی جاوے تو اسکا خرچہ انگلستان کے خزانہ سے دیا جاوے چنانچہ اب ایسا ہی ہوتا ہے مگر یہ کافی نہیں ہے حاجی موسیٰ خانصاحب خود فرماتے ہیں کہ "ہاں اسمیں شبہ نہیں کہ اس عظیم الشان فوجی تیاری کا بار غریب ہندوستان پر ڈالنا ضرور نامناسب ہے خاص کر جب کہ ان اخراجات کی بیشی کی حقیقی غرض ایشیا میں برٹش تفوق ہے تو لازم ہے کہ خزانہ انگلستان بھی اس خرچ کے بڑے حصے کا متحمل ہو" میں عرض کرتا ہوں کہ کیا اسلامی اخبارات کا فرض نہیں کہ وہ اس دقیق اور ضروری مسئلہ کے ان پہلوؤں پر غور کرکے اس پر بحث کریں اور ایسی رائے کا اظہار کریں کہ جس سے مسٹر گوکھلے ایسے آدمیوں کے دلیل اور حجت کو تقویت ہو۔ اور ایک افلاس کے مسئلہ پر کیا منحصر ہے جتنے بڑے بڑے پولٹیکل مسائل ہیں اور جنکے لئے کانگرس جدوجہد کرتی ہے ان سب کی طرف سے ایسی ہی لاپروائی برتی جاتی

ہی - وہاں تو اگر بحث ہوتی ہے تو ان مسئلوں پر کہ لڑکا نہیں دس بدقسمت مسلمان آریہ بنائے گئے اور پچاس خوش قسمت ہندو مسلمان ہوگئے - میں نہیں کہتا کہ ان مسائل پر بحث نہ کیجاوے نہیں ضرور کیجاوے اور اگر آریہ اخبارات ایک کہیں تو ان کو چار نہیں دس سنائی جاویں لیکن ان خفیف مسائل کو اخبار میں وہی درجہ دیا جاوے جسکے وہ مستحق ہے یہ نہیں کہ سارا اخبار اسی سے پُر ہو جیسا کہ آجکل ہوتا ہے - مگر مشکل یہ ہے کہ ان خفیف اور پیش پا افتادہ امور کے متعلق کالم کے کالم سیاہ کرنا آسان ہے - دقیق پولیٹیکل اور اقتصادی مسائل پر بحث کرنیکے لیے قابلیت اور محنت درکار ہے

غرض یہ کہ اگر حاجی موسیٰ خانصاحب چاہتے ہیں کہ کانگرس کے پلیٹ فارم اور گورنمنٹ کی کونسلوں میں مسلمانوں کو اعلیٰ رتبہ ملے تو وہ اپنے اہل مذہب کو خلوص دل سے پولیٹیکل ایجیٹیشن میں شریک کرانے کی کوشش کریں - محض مردم شماری کے اعداد سے وہ رتبہ اعلیٰ حاصل نہیں ہوسکتا - اسکے لئے ضرور چاہئے کہ اہل ملک کے دلوں میں اعتبار پیدا کیا جاوے اور پولیٹیکل فرائض کے ادا کرنے کی لیاقت کا اظہار کیا جاوے - اعتبار اور لیاقت یہی دو صفت ہیں جنھوں نے پارسیوں کے مٹھی بھر جماعت کو کانگرس کی صف اولین میں جگہہ دلائی ہے -

مسٹر دادابھائی نوروجی - سر فیروزشاہ مہتا - مسٹر واچا کون ہندوستانی ہے جو انکو اپنا بزرگ اور لیڈر نہیں سمجھتا - اگر پارسی بھی یہی بکتے کہ ہماری جماعت تو بہت ہی تھوڑی ہے - ہندو اور مسلمان تو ہمکو ملکر پیس ڈالینگے ہمارے لئے کانگرس کی شرکت نہایت خطرناک ہے ہم اسوقت شریک ہونگے جب ہمارے خاص حقوق کا انتظام ہو جاوے گا تو اسکا کیا نتیجہ ہوتا - اگر سر سید احمد خانصاحب نے بوجوہات کانگرس سے علیحدگی نہ اختیار کی ہوتی تو انکا وقار کسی حالت میں اور لیڈروں سے کم نہ ہوتا ان کی رائے کو کانگرس کے پنڈال میں وہی وقعت ہوتی جو بابو

سر نندر وناتھ یا سر فیروز مہتا کے رائے کو ہو۔ مگر انہوں نے مدرسۃ العلوم کی حفاظت اور استحکام کے خیال سے ایسا نہیں کیا اور صرف علٰحدگی پر اکتفا نہ کرکے کانگرس کی مخالفت بڑے زور شور سے کی۔ مسلمانوں کو یہ سبق پڑھایا کہ تمہارے لئے پولیٹکل ایجیٹیشن سے دور ہی رہنا اچھا ہے اس پالیسی کا اثر مسلمانوں کی تعلیم یافتہ گروہ کے اخلاقی جرأت پر جو کچھ ہوا اسکا اعادہ فضول ہے۔ اب اگر مسلمان اپنا اعتبار اور وقار از سر قائم کرنا چاہتے ہیں تو وہ محنت و کوشش کرنے سے حاصل ہوگا اخلاقی جرأت کے اظہار سے حاصل ہوگا۔ پولیٹکل مسائل پر تحریر و تقریر کرنے سے حاصل ہوگا اہل ملک کے ساتھ ملکر کام کرنے سے حاصل ہوگا۔ نکاح کی سی شرطیں کرنا فضول ہیں۔ فقط "حب بیند"

جنگ روس و جاپان

اسوقت ایک ایسی کتاب ہمارے سامنے ہے جس نے زبان اردو کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا ہے، یہ کتاب جنگ روس و جاپان ہے جو مولوی ظفر علی خان صاحب بی۔ اے کی لٹریری کوششوں کا قابل قدر نمونہ ہے جس طرح اس کتاب کا فاضل مصنف اس سے مستغنی ہے کہ کوئی اسکو پبلک سے انٹروڈیوس کرے اسیطرح اسکی اس قابلانہ تصنیف کا ایک ایک حرف اپنی خوبیوں کی آپ شہادت دے رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے اصل کتاب میں بطور دیباچہ جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس خوبی سے کتاب کی لفظی و معنوی محاسن پر ریویو کیا ہے اسکے بعد پھر کیا لکھوں؟ مگر مامور و مجبور کا معاملہ ہے۔ اور چونکہ ایک عزیز دوست کے اصرار پر انکار کرتے بن نہیں پڑتا اس لئے

ناظرین سے امید ہے کہ اگر میرے سرنگوں قلم سے ایک کرٹک کے فرائض پوری طرح ادا نہو سکیں تو مجھکو معذور رکھیں گے۔

چونکہ سب سے پہلے پڑھنے والے کی نگاہ مضمون کتاب کی نوعیت پر پڑتی ہے لہذا دیکھنا یہ ہے کہ جنگ روس و جاپان کے مضامین کس قسم کے ہیں کیا یہ کتاب قصے کی ہے؟ نہیں۔ کیا تاریخ ہے؟ نہیں۔ کیا کوئی فلسفی تصنیف ہے؟ نہیں کوئی عاشقانہ کلام کا مجموعہ ہے؟ نہیں۔ کسی پولیٹیکل مسئلہ کے متعلق ہے؟ نہیں۔ پھر کیا ہے؟ ایک ایسی معجون مرکب ہے جسکا تعلق ان سب سے ہے اور خصوصیت کسی سے بھی نہیں ہے!! اور یہی ڈراما کی اصل شان ہے۔ ڈراما نویس ہو یا ناول نگار اوسکی حالت یہ ہوتی ہے کہ ابھی میدان جنگ میں گھوڑے دوڑا رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد دیکھا تو پولیٹیکل حلقے میں بال کی کھال نکال رہا ہے؟ ابھی مجالس علمیہ میں فلسفی اور واعظ کی بھیس میں دُرفشانی کر رہا تھا اور اب راگ رنگ کی محفل میں طبلے پر تھاپ مارتا اور نغمہ سرائیاں کرتا ہے، کہیں صوفی ہے، کہیں مست، کبھی ناصح ہے کبھی شاہد پرست، مختصر یہ ہے کہ عمر عیار کا اوتار ہو تو ڈراما یا ناول لکھ دوسرا لکھ ہی نہیں سکتا۔

اچھا تو ان باتوں کو ظفر علی خاں نے کہانتک نباہا ہے۔ انصاف ہمکو اس کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ گو ڈراما ہمارے لئے بالکل نئی چیز ہے اور اوسکے نمونے اردو میں النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ تاہم جنگ روس و جاپان کے لائق مصنف نے اپنی کوشش میں خاص کامیابی حاصل کی ہے۔

ایک تاریخی ناول ہونے کی حیثیت سے جسقدر واقعات جنگ خوش اسلوب پیرائے میں اس مختصر مجموعے میں فراہم کئے گئے ہیں، وہ اس دنیا کی یادگار لڑائی کے متعلق ضروری معلومات کا کافی سرمایہ کہے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ شاعرانہ

پیرایۂ میں فردوسی اور میر انیس کی سی معرکہ آرائیاں نہیں دکہائی گئیں تاہم ابتدائے جنگ سے لیکر عہد نامہ صلح تک جاپان نے جو جوانمردی اور استقلال دکہایا ہے اور جو جو نمایاں فتوحات حاصل کی ہیں اُنکا بیان دلچسپ قصے کے پیرایۂ میں کیا گیا ہے اور ساتہہ ہی تاریخی حیثیت میں بہی کوئی فرق نہیں آنے پایا ہی۔

چونکہ تاریخ اور پالیٹکس کا ساتہہ چولی دامن کا ہے، لہذا اس میدان کو بہی ہمارے دوست نے ہاتہہ سے نہیں جانے دیا اور موقع بموقع سے دول عظام کی سیاسی پالیسی کو بیان کر دیا ہے جو خیالات اس بحث پر ظاہر کئے گئے ہیں وہ اگرچہ ضمنی اور مختصر ہیں تاہم کچہہ کم قابل قدر نہیں ہیں۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ دول اسلامی کو عیسائی پالیٹیشن جس نظر سے دیکہتا ہے اور جن حاسدانہ وسفیہانہ چالوں سے عرصہ پالیٹکس میں عیسائیت اسلام کو مٹانا چاہتی ہے اُن پر نہایت متانت اور آزادی سے روشنی ڈالی ہے یہ بہی دکہایا ہے کہ مدعیان تہذیب ابلہ فریبی کی باتیں بناکے قیام امن کے بہانے سے کسطرح حقوق انسانی کی پامالی میں رات دن کوشاں رہتے ہیں اور گورے رنگ والوں کے سوا دوسری مخلوق خدا کے ساتہہ انکا برتاؤ کیسا ہے۔ اس بحث کو مصنف دو جاپانی عورتوں کے زبانی اسطرح بیان کرتا ہے۔

ایمی۔ ..... یہ روس کا شہنشاہ وہی شخص ہے جس نے اب سے چند سال پہلے تمام دنیا کے تاجداروں کے سامنے یہ تجویز پیش کی تہی کہ اب عالمگیر امن وصلح کا دور آگیا ہے .... الخ"

سہیلی۔ میرے خیال میں شہنشاہ روس کا مطلب اس تجویز سے یہ تہا کہ مہذب یعنی مسیحی طاقتیں آپس میں جہگڑا فساد نکریں اُس نے اسبات کا ٹہیکہ کچہہ تہوڑا ہی لیا تہا کہ غیر مہذب قومیں جیسا کہ ایشیا کی کل اقوام سمجہی جاتی ہیں اور جنہیں جاپانی بہی

داخل ہیں امن وعافیت کی برکتوں میں شریک ہوں - ایشیا والوں کو یہ تہذیب اور شائستگی کے اوتار وحشی سمجھتے ہیں اور اسلئے اُنکے ساتھ سلوک بھی جانوروں کا سا کرتے ہیں - زار روس پر ہی کیا موقوف ہے اسٹریلیا کو دیکھ لو اتنے بڑے براعظم پر جو تیس چالیس کروڑ کی آبادی کے لئے کفایت کرسکتا ہے تیس چالیس لاکھ متنفس جنکو صرف اتنا امتیاز حاصل ہے کہ اُن کا چمڑا گورا ہے قابض ہوگئے ہیں اور کسی پیلے یا سانولے یہانتک کہ ایسے گورے رنگ کے شخص کو بھی جسکی رگو نمیں خاص یورپ کا خون نہ دوڑتا ہو داخل نہیں ہونے دیتے - ایشیا والوں کو جس نفرت اور حقارت سے یہ لوگ دیکھتے ہیں اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس جہاز پر گورے ملاح نوں اُس پر اپنی ڈاک تک کے لائے جانے کے روادار نہیں - میں نے امریکہ کے ایک میگزین میں ایک دفعہ پڑھا تھا کہ ہندوستان کے ہندوؤں کا کھانا اگر کوئی غیر قوم وملت کا شخص چھو لیتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ کھانا بھرشٹ ہوگیا یہ روایت بیان کرکے صاحب مضمون نے ہندوؤں کو غیر مہذب قرار دیا تھا اور اُن کی اس مذہبی رسم کو وحشیانہ پن سے تعبیر کرکے اُنکا مضحکہ اُڑایا تھا - لیکن معلوم نہیں وہ اسٹریلیا کے گورے چٹے مہذبوں کی نسبت کیا رائے قائم کرے گا جن کی چٹھیاں تک ایشیائیوں کے چھونے سے بھرشٹ ہوجاتی ہیں -

"اگرچہ اس تقریر کا خاتمہ بھی مصنف نے اپنی حسب عادت دبی زبان سے کیا ہے، اور بحث کے پولٹیکل رُخ کو پھیر کے اخلاق پر لا ڈالا ہے، لیکن مبتدا اور خبر کے اختلاف سے نتیجہ وہی نکلتا ہے جس سے تقریر کی ابتدا کی گئی ہے چھوت کی ابتدا بھی پولٹیکل ہی ہندوؤں کی تقسیم ذات کا قانون بھی پولٹیکل تھا - اور مسلمانوں کا مسئلہ "انما المشرکون نجس" بھی پولٹیکل ہے - پس ہم بھی کہینگے کہ جو کچھ

مغایرت یورپ ایشیا کے ساتھ برتتا ہے وہ سب پولیٹکل ہے اخلاق کو اسمیں مطلق مداخلت نہیں۔ بلکہ اصل حقیقت تو یوں ہے کہ جیسی جیسی ترقی علم وتہذیب کی یورپ میں ہوتی جاتی ہے، اُسیقدر وہاں ایشیائی فلسفہ اخلاق کا زور ہوتا جاتا ہے۔ کہ جو اصول ویدنے ہزارہا برس قبل اور اسلام نے تیرہ سو برس پہلے قرار دئے تھے۔ آج جرمن فرانس امریکہ وغیرہ کے فلاسفر ان کی سچائی کا اقرار کرنے پر مجبور ہیں پھر ہم اسکو کیونکر مان لیں کہ جو سلوک ہمارے ساتھ کئے جاتے ہیں وہ ہماری بد تہذیبی و بد اخلاقی کی وجہ سے ہیں۔

پولیٹکل مباحث کے ضمن میں انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کو نظرانداز نہیں کیا ہے تاہم روس کے انتظامات اندرونی اور رعایا کی بد دلی و بے اطمینانی کی حالت کا بیان اس خیال کو پیدا کرتا ہے کہ ہمارا نوجوان گراجوئٹ اس بات کو بنظر استحسان نہیں دیکھتا کہ بیسویں صدی کی کوئی مہذب گورنمنٹ رعایا کو جائز حقوق دینے سے چشم پوشی کرے مظفر خاں اور اقبال خاں کی گفتگو میں مسئلہ حقوق رعایا کی نسبت کسیقدر وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔ اقبال خاں کہتے ہیں "میری رائے میں وہ شخص جو کسی اصول کا پابند ہو (خواہ یہ اُصول بُرا ہی کیوں نہو) اُس شخص سے لاکھ درجے اچھا ہے جسکا کوئی اصُول نہ ہو۔ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنا یہ فوجی اصُول قرار دے رکھا ہے کہ کسی اعلیٰ فوجی خدمت پر کسی ہندوستانی کو مامور نہ کرینگے۔ اس۔ کو خواہ اُن کی بے انصافی سمجھو خواہ اُن کی دور اندیشی پر محمول کرو پھر بھی یہ اُن کی مشرقی حکمت عملی کا ایک ایسا مستحکم اصُول ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے اور اس لحاظ سے میں انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور یا۔ سچ پوچھو تو کوان اپنی داڑھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں دینا پسند کرتا ہے انگریز کچھ ہندوستانیوں کے تایا جان تو ہیں

نیں کہ وہ دلی عقیدت سے اُن کے سامنے زانوے ادب تہ کر کے بیٹھیں گے
بعض بعض ہندوستانیوں کا اگر آج بس چلے تو انگریزوں کو کان پکڑ کر باہر نکال
دیں" اسکے بعد چند اعلیٰ عہدوں کے نام گنا کر جن پر برائے نام ہندوستانی
ممتاز ہیں، لکھتے ہیں" اور یہ اور بات ہے کہ تجاہل عارفانہ یا جہل مرکب کی وجہ سے
محکوم ہو کر وہ (ہندوستانی) حاکموں کی برابری کا خیال کریں اور ایاز ہو کر
محمود کے ہمرتبہ ہونے کا دم بھریں اور بیحیائی اور شوخ چشمی کی راہ سے یہ تصور
کرنے لگیں کہ اُن کی زبان اُنہیں وہ حقوق دلوا دے گی جو صرف تلوار سے
حاصل ہو سکتے ہیں"

میرے خیال میں کانگریسی گروہ کی نسبت ریمارک ضرورت سے زیادہ سخت
ہے۔ مجھے ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں ہے کہ مسلمانوں
کی پست ہمت، نیم مردہ، اور ناتعلیم یافتہ قوم پولیٹکل معاملات میں دلچسپی لے یا نہ
لے اور اپنے حق کی قدر کرے یا نہ کرے؟ مگر اتنا ضرور کہونگا کہ تقریر مذکورہ بالا
میں مبالغہ آمیز خوشامد کے علاوہ دو جملے اسقدر نامناسب اور غلط خیال پھیلانے
والے ہیں جن کا کسی تعلیم یافتہ کے قلم سے نکلنا کبھی مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا اولاً
یہ کہنا کہ بعض ہندوستانی ایسے ہیں کہ اگر موقعہ ملے تو انگریزوں کو کان پکڑ کے
ہندوستان سے نکال دیں ایک بالکل مضر قوم اور غلط اتہام ہے جو اکثر ناعاقبت
اندیش اور جاہل مسلمان حامیان کانگریس پر عاید کرتے ہیں۔ دوسرا اُن لوگوں
کو جو عام انگریزوں کے مقابلے میں (نہ کہ شاہی خاندان کے) ہندوستانیوں
کے جائز حقوق اس بنا پر طلب کرتے ہیں کہ ہماری نہایت مہربان ملکہ مرحومہ نے
ان کے دینے کا وعدہ فرمایا تھا اور ہمارے شہنشاہ معظم خلد اللہ سلطنتہ نے پھر
اُس وعدہ کی تجدید کی ہے، شوخ چشم اور بیحیا بنانا، اور ایاز قدر خود بشناس

لیکے پبلک کو مغالطہ دینا کہ بیسویں صدی میں بھی آزادی نہیں بلکہ یہ دور بھی اُسی دور غلامی کے مثل ہی میں نہیں سمجھتا کہ کیسی باتیں ہیں۔

پھر جیسا کہ براکٹ کی عبارت (خواہ یہ اصول بُرا ہی کیوں نہ ہو) سے ظاہر ہے، ایک ہی بات کو محمود اور مردود قرار دینا بھی نئی منطق ہے۔ نیز یہ قول بھی غرابت سے خالی نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو فوج میں اعلیٰ عہدے دینے سے انگریزوں کی داڑھی انکے ہاتھ میں آجائیگی غالباً اکبر نے اپنی ڈاڑھی اسی خوف سے منڈوا دی تھی کہ ٹوڈرمل اور مان سنگھ جیسے اعلیٰ ہندو افسر کہیں اُسکی نہ لیں اور یہی اصلی راز تھا اُسکی سلطنت کی ترقی اور استحکام کا برخلاف اسکے یہ عالمگیر کے وقت میں جو مغلیہ سلطنت کی بنیاد مرہٹوں نے متزلزل کر دی اُسکا باعث شاید یہ ہوگا کہ اوسکی داڑھی بہت لمبی تھی! کیا ایسی غلط تاویلوں سے ہمارے دوست شاہ عادل را رعیت لشکر است کے مسلمہ اصول کو غلط ثابت کر سکینگے؟ بہرکیف، سیاسیات کے عنوان میں بعض ایسی متضاد مباحث ہو گئے ہیں جنسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مصنف اپنے دلی خیالات کو دبانا چاہتا ہے۔ جب ہم اخلاقی پہلو سے کتاب پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سی باتیں ہمکو ایسی ملتی ہیں جو قابل تسلیم اور لائق تقلید ہیں ڈراما کی بڑی خوبی یہی ہے کہ اُسمیں ایسے مضامین کافی مقدار میں ہوں جنسے سننے والوں کی فیلنگ پر اثر پڑے۔ اور باوجودیکہ اس کتاب کا پلاٹ تاریخی اور رزمیہ ہے، مصنف نے کوشش کی ہے کہ جابجا اخلاقی نتائج مترتب ہوتے جائیں۔ خود کتاب کا ہیرو (اوکیو) اور اُسکی ماں ایثار نفس اور حب قومی کی اعلیٰ ترین مثالیں پیش کرتے ہیں، بسکٹ فروش لڑکے اور نیز اُس قیدی کا قصہ جس نے اپنی لاش کو طبی کالج میں دینے کی وصیت کی تھی، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، تیسری مثال ایثار نفس کی جو میکاڈو کی پرائیوٹ لائف سے پیش کی گئی ہے وہ اور بھی زیادہ حیرت انگیز اور عبرت خیز ہے۔ شہنشاہ (جاپان) کے دسترخوان پر خلاف معمول چند قسم کے کھانے چنے گئے ہیں اور وہ اپنی ملکہ سے استفسار کر رہا کہ آج خاصے میں اسقدر اہتمام اور تکلف کیوں کیا گیا؟ کیا آغاز جنگ کے وقت ہمنے عہد نہیں کیا تھا کہ جب تک جنگ ختم نہ ہولیگی ہم برابر سادہ کھانا کھایا کرینگے اور وہ

بھی ندقسم سے زیادہ نہو گا اور جب ملکہ اس تھوڑے سے تکلف کا باعث جنگ ناتسن کی ہم تا بلسنٹ
نتج کی خوشی کو بتاتی ہے تو اسکو یوں جواب ملتا ہی "کیا تمہارا پاک اور بے لوث دل
اس بات کو جائز رکھتا ہے کہ تمہارا خاوند گوناگون نعمتوں کی طرف جو اس دسترخوان
پر تنی ہیں اسباب کے جانتے ہوئے ہاتھ بڑھائے کہ جاپان کی رعایا میں سے ہزاروں
بی بیوں کے شوہر ناتسن کی خونریز گھاٹیوں پر آلودۂ خاک و آغشتہ خون ہو چکے ہیں
میری آنکھیں ان بہادروں اور خصوصًا ان کے پس ماندوں کی یاد سے نمناک ہیں
اور دل داغدار" پھر جب ان واقعات کا مقابلہ بیگم روس کی اُس تقریر سے کیا جاتا ہے
جو اُسمیں اور زار میں اخراجات عطر اور رادگی بل کے متعلق ہوئی ہے اور من بعد
ان دونوں شاہنشاہوں (زار اور میکاڈو) کی اخلاقی حالت کو نتائج جنگ پر منطبق کرنے
سے خود بخود نپولین کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہی کہ "جنگ میں بھی قوائے جسمانی
پر قوائے روحانی کو دس گنا اقتدار حاصل ہی۔ یہاں پر مصنف نے جو طریقہ تقابل اختیار
کیا ہی، جس میں آورد کا شائبہ بھی نہیں معلوم ہوتا، اُسپر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا
ہی۔ جابجا متفرق اخلاقی مسائل بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ امیر البحر کراخاف اور میڈم
کراڈوسکی کے وحشیانہ تعلق کے تذکرے میں یوروپین طرز معاشرت پر نکتہ چینی کرتے
ہوئے پردۂ نسواں کی حمایت کی گئی ہے۔ اگرچہ اس مسئلہ میں ہمکو کسیقدر اختلاف ہے
مگر اسمیں شک نہیں کہ مصنف کا ریمارک نہایت باموقع ہے۔

مذکورہ بالا واقعہ سے اور نیز میدان جنگ میں گرانڈ ڈیوک بورس کی محفل رقص و سرود
کا سماں دکھلا کر ضمنًا یہ بتایا گیا ہی کہ قوم میں اخلاقی کمزوریوں کا پیدا ہو جانا ہی اسکے
زوال کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ اس مقام کو پڑھ کر بے اختیار نادر شاہ کا حملہ اور
محمد شاہ کا دربار یاد آجاتا ہے۔

یوروپین تہذیب کی اندھی تقلید پر سرجن میجر تموشی کی تقریر میں جس خوبی اور
قابلیت سی ریمارک کئے گئے ہیں وہ بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔ خصوصًا شراب کے نقصانات
کو طبی دلایل کے ساتھ ایسے پُراثر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس دو صفحے کے مضمون

[illegible] غالبًا کتابت کی غلطی ہو گی۔

کی قیمت کتب اخلاق کی کئی جلدوں سے بھی بڑھ گئی۔
اور بھی بہت سی بیش قیمت نصیحتیں مختلف مقامات سے اخذ کیجا سکتی ہیں مگر ہم بخیال طوالت سب کو ترک کر کے صرف ایک اور نظیر ایسی پیش کرتے ہیں جس سے بہتر مثال حسن خلق کے ہو نہیں سکتی اور وہ میکاڈو کا یہ تار ہے "اگر صلح و جنگ کا دارومدار چند ارب روپیہ جیسی بے حقیقت شے کے ملنے یا نہ ملنے ہی پر ہے تو جاپان ایسا طامع اور خودغرض نہیں کہ روپے کی خاطر خونریزی کو جائز رکھے"
یہی وہ تار ہے جس نے پریزیڈنٹ روزولٹ (نہیں بلکہ تمام دنیا) کی زبان سے یہ الفاظ کہلوائے کہ "میں آپ کو (سفیر جاپان کو) آپ کے شاہنشاہ کی اس فیاضی و فراخ حوصلگی پر جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ مبارکباد دیتا ہوں"
غرضکہ ساری کتاب ہندوستان کے ایک فاضل جرنلسٹ کے اس اجمالی گر پُر مغز ریمارک کی شرح تفصیل ہے کہ "اہل جاپان نے فلسفہ و ادب میں عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کر کے یورپ کے سامنے پیش کیں لیکن یورپ اُنہیں ناشائستہ ہی سمجھتا رہا! اسکے بعد اُنہوں نے رنگ برنگ کے سوتی اور ریشمی کپڑے اور چینی کے برتن اور آرائش و ضروریات کے سامان کے دلپسند نمونے تیار کر کے مغربی تہذیب کے نقادوں کی خدمت میں روانہ کئے لیکن پھر بھی وہ کودن اور جاہل اور غیر مہذب ہی رہے، آخر اُنہوں نے تلوار ہاتھ میں لی اور ڈیڑھ لاکھ روسیان ابیض کا گلا کاٹ ڈالا پس ان کو فوراً تہذیب و شائستگی کا تمغہ ملگیا اور وہ دفعتہً مہذب اقوام کے زمرے میں داخل ہو گئے"
اس فقرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یورپ جو مدعی تہذیب و اخلاق ہے اسکے قوائے ملکوتی قوائے بہیمی کے مقابلے میں کس قدر کمزور ہیں مگر یہیں سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ جب تک اخلاق درست نہوں، علم و ادب ترقی نہ پائے۔ صنعت و حرفت میں کمال حاصل نہو یعنی بالجملہ انسان انسان نہولے اُس وقت تک وہ محاربے تو کجا دوسرونکے

مقابلے میں اپنی محافظت بھی نہیں کر سکتا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ آج سے بیس برس پہلے بھی جاپان میں یہ ہمت تھی کہ وہ تلوار لے کے اٹھتا اور ڈیڑھ لاکھ روسیاں ابیض کا گلا کاٹ کے (اگر گلا کاٹنا ہی شائستگی ہے) یورپ سے تہذیب شائستگی حاصل کر لیتا ہے یہ محض قوائ ملکوتی کی تکمیل حب قومی کا جوش اور ایثار نفس کی برکت تھی جس نے اسکو اس درجہ پر پہونچایا کہ ایک بونے کو دیو کے مقابلے میں فتح ہوئی اور دنیا کو دکھا دیا کہ یوں تکبر عزازیل کو خوار کر دیتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مطالب کتاب کے متعلق اسقدر لکھنے کے بعد ایک نظر ادبی حیثیت سے ڈالنا بھی ضروری ہے۔ مولوی ظفر علی خانصاحب کو اردو کی لٹریری دنیا میں جو شہرت اور درجہ حاصل ہے اسکے اظہار کی حاجت نہیں۔ دکن ریویو جیسے معتبر پرچے کی ایڈیٹری کے علاوہ ان کی وہ متعدد تالیفات جنمیں خیابان فارس کی سی باوقعت اور ضخیم کتاب بھی شامل ہے، انکو کرسی اعتبار پر جگہ دینے کے لئے کافی تھیں تاہم وہ تالیفات تھیں اس تصنیف نے تو سونے پر سہاگہ کا کام کیا زبان اور شاعری کے لحاظ سے مولوی ظفر علیخاں قابل تعریف اور پنجاب کے ان اعلیٰ اہل قلم میں شمار ہونے کے مستحق ہیں جنکی زبان اردو بہت کچھ اہل زبان کے مانند ہے۔ مجھے اون لوگوں سے سخت اختلاف ہے جو چند غیر مانوس یا خلاف محاورہ الفاظ کے استعمال کے باعث خواہی نخواہی بھی اہل پنجاب کی مخالفت پر آمادہ اور اُن کی بیش بہا کوششوں پر خاک ڈالنے کی فکر میں رہتے ہیں جنکے عشر عشیر نمونے بھی ابھی تک دلی و لکھنؤ نہیں پیش کر سکے۔ سچ کہا ہے ہمارے قومی شاعر نے۔

پر آپنے بدنام کیا اپنے وطن کو	حالی کو تو بدنام کیا اسکے وطن نے

ناظرین میری مذکورہ بالا تحریر کی نسبت یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں اہل پنجاب کی عموماً اور ظفر علیخانصاحب کی خصوصاً بیجا پچ کر رہا ہوں اسلئے اصل مطلب کیطرف رجوع کر کے اپنے دوست سے اُس اختلاف رائے کی معافی چاہتا ہوں جو میرے انکے مابین واقع ہو جائے۔

یوں تو عموماً نظم و نثر کی خوبی یہ ہے کہ مطلب سہل الفاظ میں بیان کئے جائیں، عبارت میں بلا ضرورت طول نہ دیا جائے، تشبیہ و استعارات کا استعمال محض اُنہیں مواقع پر ہو جہاں اُنسے بیان میں کوئی لطف پیدا ہوتا ہو اور معنی کی توضیح ہوتی ہو کیونکہ وضاحت مضمون کے لئے تمثیل کی بالکل ایسی مثال ہے کہ پہلے کسی شخص کا حلیہ بیان کیا جائے اور پھر اوسکی تصویر پیش کردیجائے۔ پھر جسطرح ان امور کا لحاظ نظم کی بہ نسبت نثر میں زیادہ ضروری ہے اُسیطرح نظم و نثر دونوں کے مقابلے میں ڈراما زیادہ تر اس پابندی کو چاہتا ہے۔ ڈراما میں بجز روزمرہ کی گفتگو کے اور کچھ نہیں ہوتا، اور روزمرہ کی گفتگو کا یہ طریقہ نہیں کہ اُنہیں لغت لڑھکاسے جائیں ڈراما میں تو حسن اور نیز اثر جبھی پیدا ہوسکتا ہے جب معمولی بات چیت میں جوش پیدا کیا جائے۔ مگر جنگ روس و جاپان کا اسلوب بیان وہی ہے جو اس مصنف کی دوسری تصنیفات میں پایا جاتا ہے، مغلق الفاظ، پیچیدہ جملوں عالمانہ تقریروں، نثر میں بے ضرورت تشبیہوں اور استعاروں، نظم میں غیر مانوس ترکیبوں اور لغت کی بھرمار سے جو مولوی ظفر علی خانصاحب کی تحریر کی خصوصیات ہیں، یہ کتاب بھی باوجود ناٹک ہونے کے خالی نہیں ہے تمثیلاً ہم ذیل میں چند فقرے نقل کرتے ہیں۔

"میں حضور کو یقین دلاتی ہوں کہ جب میں نے اور شاہی خاندان کی دوسری شہزادیوں نے اپنے ہاتھوں سے فوج کے زخمی سپاہیوں کے لئے پٹیاں تیار کی ہیں تو شمع کیا تھا ہم سبنے اپنی جان نثار فوج کے مصیبتوں پر اتنے آنسو بہائے ہیں کہ پٹیاں تر ہوگئی ہیں لیکن میں اُس خاک کے ذرّوں کو جس سے ایک جیتی ہوئی فوج کے کام آئے ہوئے سپاہیوں کا جسم آلودہ ہو قبائے زرافشاں سے بہتر سمجھتی ہوں" یہ ٹکڑا اس طول طویل تقریر کا ہے جو ملکہ جاپان اور مکاڈو میں دسترخوان پر ہوئی ہے۔ ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ میاں بیوی کی باہمی گفتگو ہے یا مناظرہ۔ دوسرے موقعہ پر بلوائیوں کی زبانسے جوش اونگاکی کی بابت میں فرماتے ہیں "بھائیو بہو! ہم اُس نابکار رہوم سکرٹری کا گھر جو صلح کا سب سے بڑا ممد و موید ہے،

اسی کے مشورہ سے ہمارے شہنشاہ نے ایسی شرائط پر روس کے ساتھ صلح کر لی
جنسے تمام دنیا کے سامنے ہماری ناک کٹ گئی - کیا ہمارے ہزاروں لاکھوں
ہموطنوں کے خون سے منچوریا کے میدان اور بحر الکاہل کی موجیں اسی لئے
رنگی گئی نہیں کہ ملعون روسیوں سے تاوان نہ لیا جائے اور کیا ہماری گاڑھی
کمائی کے اربوں روپئے پانی کی طرح بیدریغ اسی لئے خرچ کئے گئے ہیں کہ انکے
معاوضے میں ہمکو سگہالین بھی جسپر ہم بزور شمشیر قابض ہو گئے تھے ملے تو نصف
یہ تمام الزام اسی بدبخت ہوم سکرٹری پر عاید ہوتے ہیں" یہ فقرہ بھی سراسر آورد
سے بھرا ہوا ہے اور جوش کا کہیں پتہ نہیں جبکا یہ خاص موقعہ تھا - باقی تمام کتاب
کا اندازہ مطالعہ سے ہو سکتا ہے -

نظم میں بھی یہی بات ہے کہ اکثر حصے پر زور ہیں مگر بہت کم پُر جوش ہیں - مثلاً پہلی تقریر ہکاڈو
کی جس سے کتاب کا افتتاح ہوتا ہے اگرچہ رجز ہے مگر اسمیں رجز کی شان مفقود ہے - تجہ تو
مضامین ایسے سیدھے سادے ہیں جو ایک مورخ کے قلم سے ضرور اچھے معلوم ہوتے ہیں مگر شاعر
کی زبان سے لطف نہیں دیتے - ثانیاً بحر ایسی اختیار کی گئی ہے جو بحر الکاہل کی مماثل اور
مولانا حالی کے قومی مرثیوں کے لئے زیادہ تر موزوں ہے - اسیطرح ایک موقع پر جبکہ گورنر
یونیشی کو پھانسی کا حکم سُنا کے دربار برخاست کرتا ہے اور تنہائی میں اُسکی آخری وصیت کو یاد کرکے
جو حب قومی کی حیرت انگیز مثال ہے، متاثر ہوتا ہے اور اُسحالت میں یہ اشعار پڑھتا ہے -

نکلا ہے آب و تاب سے خورشید خاوری	زیبا اسیکے واسطے ہے جلوہ گستری
شرمندہ اُسکی آب سے ہیں روشنان دہر	رخشندہ اوسکی تاب سے ہیں خشک و تری

یہ تمہید کی شعر تھیں ختم ہوئی ہے اور پھر اصل مدعا تین شعروں میں بیان ہوا ہے کہ جس قوم
میں ایسے ایسے جری اور جانباز لوگ ہوں اُسکو غنیم کی یورش کا کیا خوف - بلاشبہ اس قسم
کے اشعار اگر کسی قصیدے کی تشبیب ہوں تو نہایت شاندار اور شاعر کی طباعی کا عمدہ نمونہ
سمجھے جائینگے، مگر ایسے موقعہ پر جبکہ موت اور حب الوطنی مل کر انتہا درجہ کا عبرت خیز سماں
دکھا رہی ہیں بالکل بیمحل سے معلوم ہوتے ہیں -

اسی قبیل کے وہ اشعار ہیں جو آئیمی کی زبانی اُس موقعہ پر لائے گئے ہیں جبکہ آوکیو میدان جنگ کو جارہا ہے اور وہ اُس سے رخصت ہونے آئی ہے۔ نیز دوسرے ایکٹ کے پہلے سین میں امیر البحر ٹوگو کی تقریر کے ابتدائی حصے میں بھی بجائے اسکے کہ جنگ کے متعلق ہدایتیں ہوتیں یا پُرجوش رجز ہوتا جس سے سپاہیوں کے دل میں اُمنگ پیدا ہو، ابر اور سمندر کا سماں باندھ کر غیر ضروری تقصد پیدا کر دیا ہے، جسکو سوا طول کلام کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی نظیریں مل سکتی ہیں جنکو ہم بخوف طوالت نظر انداز کر کے ان اضافی باتوں کو محض جوان طبیعت کی اُمنگوں سے منسوب کرنا مناسب سمجھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ مشق اور سن کے ساتھ ساتھ خود بخود کلام میں سادگی اور روانی پیدا ہوتی جائیگی۔

غرضکہ مجموعی حیثیت سے کیا بلحاظ مضامین اور کیا بلحاظ شاعری و نثاری ساری کتاب لائق تعریف ہے جسکے لئے ہم اپنے دوست کو مبارکباد دیتے ہیں اور پبلک سے امید کرتے ہیں کہ وہ مصنف کی محنت کی داد دینے اور اس بیش بہا جوہر کی قدر کرنے میں کوتاہی نہ کریگی۔

ضامن کنتوری۔ محبوب نگر۔ حیاتم پیٹھ

مکتوبات امیر مینائی

(مرتبہ حضرت ثاقب مدیر قند پارسی علیگڈھ)

حکیم برہم صاحب کے نام (۷ رجون ۱۸۹۱ء) پیارے برہم دعائیں لو۔ نورچشم ممتاز نے امیر اللغات سے متعلق تمہارے حکموں کے تعمیل کر کے کارڈ اطلاعی تمکو لکھ بھیجا اب اس خط میں کوئی بات جواب طلب نہ رہی البتہ وہ قطعہ جسکا ایک مصرع تمنے لکھکر تین مصرع اوپر کے مانگے ہیں وہ بھیجتا ہوں۔ ٹھیک ٹھیک ہی لفظ جو عہد واجد علیشاہ مرحوم میں کہے تھے یاد نہیں رہے اسلئے کہ عہد شاہی تک جو کلام مرتب ہوا تھا وہ غدر میں تلف ہو گیا۔ اسوقت خیال کرنے سے جو مصرع یاد آئے وہ یہ ہیں ؎

مجھکو حصہ نہ دے کے تا لا غیر کو بوسہ دیا ۔۔۔ دیکھتا جا او مرے دمباز اپنے طور کو
حصہ کس کو دیدیا کسکو ذرا انصاف کر ۔۔۔ دو دو بے حلوا مجھے حلوائے بید و داد گو

منشی نظام الدین صاحب کے تنگ حالی سے بہت دل دکھا اللہ تعالیٰ رحم فرمائے آنکے صفات انسانی کا کیا حال ہے کبھی لکھیگا مگر نہایت راستی کے ساتھہ تحقیقی باتیں جو قابل اعتماد کامل ہوں فقط امیر فقیر۔ محمد احمد مع اخوان تسلیم رساں ہیں۔ جلیل سلام کہتے ہیں وسیم ایک برس سے اس دفتر میں نہیں ہیں راجہ جونپور کی سرکار میں نوکر ہیں سال بھر کے بعد کل اُنکا خط آیا ہے۔ امیر فقیر۔

بندہ ثاقب کے نام

مخدومی حضرت ثاقب سلمہ اللہ الواہب۔

سلام مسنون اخلاص مشحون قبول ہو اور دیر ی جواب معذوری واقعی پر محمول ہو۔ پیامحبت نامہ آیا تو مرآۃ الغیب بھیجنے کے فکر ہوئی اُسکو چھپے ہوئے کئی برس ہوئے جتنے دو سو نسخے لیے تھے وہ نذر دوستان نزدیک و دور ہو چکے۔ اس شہر میں تاجران کتب کے پاس بھی نہ ملا ناچار مطبع منشی نولکشور کو لکھا ابتک جواب نہیں آیا۔ میری پاس نعتیہ مسدسات جن کے نام ذکر شاہ انبیا۔ صبح ازل۔ شام ابد۔ لیلۃ القدر ہیں موجود ہیں۔ مرآۃ الغیب۔ گوہر انتخاب محامد خاتم النبیین۔ مضامین دل آشوب نہیں ہیں۔ موجودات میں جسکی طرف التفات ہو بھیجدوں اور کوئی امر تحریر اولین میں جواب طلب نہ تھا۔ تحریر ثانی سے امتحان انگریزی درجۂ اول میں کامیاب ہونا معلوم ہوا اور ایسا جی خوش ہوا کہ اپنی کامیابی کا مزہ ملا۔ حق تعالیٰ وہ دن لاے کہ مژدہ صدر آرائی سُننے میں آئے۔ الٰہی مدام مکارہ سے محفوظ اور لذائذ سے محظوظ رہیے زیادہ کیا لکھوں کہ نہ بیماری سے نجات ہوئی ہے نہ پرستاری سے۔ مکروہات دنیاوی اور اندیشہ ہائے آخروی علاوہ ہیں اللہم اغفر ذنوبے واستر عیوبی۔ راقم آثم۔
امیر احمد عفی عنہ۔ ۲ ر فروری ۱۸۹۱ء۔ محمد احمد تسلیم گذار ہے۔

قطعہ

کچھ عرصہ ہوا کہ اکثر اخبارات میں جناب مولوی محمد برکت اللہ صاحب بھوپالی مقیم ٹوکیو کی خبر وفات شائع ہوئی تھی [illegible]
کہ دریافت حال پر یہ خبر غلط نکلی۔ [illegible] قطعہ اس واقعے کی نسبت [illegible]

لوگ کہتے ہیں کہ وہ تو مر گیا
کاش اٹھتا تا یہ ہستی کا حجاب

عشق میں۔ مرنا تو پہلی چیز ہے
بن مرے عاشق ہو کیونکر کامیاب

زندہ دل مرنے سے جیتے ہیں سدا
صاف احیاء ہے قرآنی خطاب

واں کا عاشق جو مرے پردیس میں
خوب فرمایا: بھلا۔ اچھا۔ جناب

ہند کی الفت پہ یاں جیتے ہیں ہم
گرچہ ہے پردیس میں رنج و عذاب

خدمتِ قوم و وطن سے ہے زندگی
ہند کی خدمت میں جینا ہے ثواب

ہم ہیں اور غیر ہوں حکام ہند
یہ خطا ہے یہ نہیں ہرگز صواب

ہند کو آزاد دیکھیں ہے امید
ذالک یاتی عن قریب لاکحاب

دوست لکھتے ہیں کہ تم تو مر گئے
مر چکے ہم پھر تو کیونکر دیں جواب

گر خطائے دوستاں۔ فال نکو
در جفائے دشمنان۔ بانگِ غراب

احیاءٌ یرزقون فرحین بما آتاھم اللہ من فضلہ ۱۲

خواب اور خیال ایک ہی جنس ہیں۔ اور خواب میں کسی کو مردہ دیکھنا طول عمر پر حمل کیا جاتا ہے۔
کتنے بھلا کوؤں کے کوسنے سے بھی ڈھور مرے ہیں۔

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ عطیہ محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب [illegible]

جان اٹکی اداؤں پہ نکلتی ہی رہیگی
یہ پھیر جو چلتی ہے سو چلتی ہی رہیگی

ظالم کی تو عادت ہے ستاتا ہی رہیگا
اپنی بھی طبیعت ہے بہلتی ہی رہیگی

دل رشک عدو سے ہے سراپا آتش
[illegible] تری بزم میں جلتی ہی رہیگی

[illegible]
[illegible] کوچے میں چلتی ہی رہیگی

[illegible]
[illegible] تقدیر بدلتی ہی رہیگی

[illegible] شرارت [illegible]
[illegible] اک بات نکلتی ہی رہیگی

وحشت کو رہا انس جو یوں فن سخن سے
یہ شاخ ہنر پھولتی پھلتی ہی رہیگی

غزل جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

تری ستم نا روا کیا کہئے — حضور آپکے طرز جفا کو کیا کہئے
ملال خندۂ اغیار سے ہے دل تنگی — فغاں بے اثر و نارسا کو کیا کہئے
وہ حال پوچھتے ہیں یہ کسی خیال میں مست — خموشئ دل بے مدعا کو کیا کہئے
خود اپنی عمر کی بیگانہ وار اگر ہو روش — زبان سے پھر کسی نا آشنا کو کیا کہئے
فغان خاطر ناقوس کی ندا دل — برہمنو یہ تمہاری خدا کو کیا کہئے
یہ آیا کہ جا نہ بجا ہو اور اف نہ کرو — تری جفا کو اور اپنی وفا کو کیا کہئے
شکست رشتۂ امید سے بحال ہوا — فراق میں دل غم آشنا کو کیا کہئے
نوید آمد دلبر نے جان دی محشر — خلاف وقت نزول قضا کو کیا کہئے

غزل جناب مولوی مخدوم عالم صاحب اثر مارہروی

ہم سے [illegible] رسوائی مری یوں غیر کرے — ہاں اگر یہ ہی عنایت تو خدا خیر کرے
جب کہ دل ہی میں ہو موجود کسی کا جلوہ — کس لئے کوئی طواف حرم و دیر کرے
[illegible] کہ عیادت کو رقیب آتا ہے — کام جو دوست کے کرنیکا ہو وہ غیر کرے
اس ہوا میں ہے کہ جنت کی بہار — آکے رضواں ترے کوچہ کی ذرا سیر کرے
ہم نہ توڑینگے کبھی عہد وفا جیتے جی — بیوفائی اسے کرنا ہے تو وہ خیر کرے
[illegible] بھلائی جو بھلائی کے عوض میں تو کیا — بات تو جب ہے کہ تو شر کے عوض خیر کرے
[illegible] یوں ہیں زمانہ کے مخالف جیسے — رہ کے دریا میں مگرمچھ سے کوئی بیر کرے
دل میں کس کے عقاید سے فرماتے ہیں — اے اثر تیرا خدا خاتمہ بالخیر کرے

حسرت موہانی

[illegible] فائدہ از راہ کرم ہو سمجھا تھا — تب عجب لطف کا سامان بہم پہنچا تھا
[illegible] بھی احباب کروں کیا حسرت — رنج ایسا دل مایوس کو کم پہنچا تھا

اُردوی معلّے

یعنی صحیح و فصیح اُردو کا ایک ماہوار اور قابل دید رسالہ جسکے سال بسال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئی دیوان بلاقیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں۔[1] حجم ۴۰ صفحے لکھائی چھپائی کاغذ نہایت پسندیدہ نمونے کا پرچہ ۲ کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے (۱) رسالہ و دواوین للعہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سے سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) عہ سالانہ (برائے طلبہ وغیرہ مستطیع حضرات) مقاصد ضروری منجملہ دیگر مقاصد [illegible] پالیٹکس درخواست خریداری بنام مینیجر اُردوی معلّے علیگڈھ آنا چاہیے

[1] چنانچہ ۱۹۰۸ء میں (۱) رپورٹ اُردو کمیٹی کانگریس (۸۔) دیوان میر سوز (۴ر) اور دیوان قائم چاندپوری شاگرد سودا (۸ر) شائع ہوئے اور ۱۹۰۹ء کی ششماہی آخریں دیوان حضرت اُستاد جرأت نذر کیا گیا

دیوان غالب طبع ثانی[2]

سفید کاغذ پر خوشنما چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا بیشتر حصہ خود مرزا غالب کی نظر سے گذرا تھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اُردوی معلّے علیگڈھ۔ تقطیع $\frac{26 \times 20}{8}$ حجم تقریبًا ۱۱ جز قیمت مع محصول و تسبیح دلپذیر عہ درخواست خریداری بنام۔ مینیجر اُردوی معلّے علیگڈھ آنا چاہیے۔ فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ۳ تا صفحہ ۲۴ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

[2] طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کردی گئی ہے اور اشعار کے مطالب میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ جابجا ترمیم بھی کردی گئی ہے اور صحت کا بھی خاص انتظام کیا گیا ہے۔

مینیجر اُردوی معلّے علی گڈھ

دی رئیس ٹریڈنگ کمپنی۔ بھاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و نیز خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ [illegible] کی ایک کمپنی قائم کی [illegible] ہرگز ضرورت نہیں کہ وہ حضرات [illegible] بھی اس سے مستفید ہوں [illegible] لئے تجارت [illegible] اس کمپنی کا خاص [illegible] مال [illegible] ایک نفیس [illegible] کپڑے از قسم لنگی چادرہ دھوتی [illegible] ریشمی و سوتی لنگیا وساڑھیاں ہر قسم ہر رنگ کے تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دھوپ چھاؤں وسادہ و بلکن و وو وغیرہ ہر قسم وغیرہ لائق تیاری شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون ہندوستان ہر جگہ باسانی بھیجے جاتے ہیں۔

نفاست و پائداری میں یہ کپڑے بھاگلپوری کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول کہ ہر خاص و عام ہوچکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔

فرمایشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کردیئے جاسکتے ہیں۔

حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاسکتے ہیں فرمایشیں ذیل کے پتے سے آنی چاہئیں۔ المشتہر ڈاکٹر شرافت حسین سکرٹری رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور محلہ تاتارپور

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اُردوی معلّے غزلوں کا انتخاب اس احتیاط و اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیکھکر مذکورہ بالا ضخیم دواوین کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کاغذ سفید تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$ حجم ۵ جزو قیمت صرف (۸ر) مع محصولڈاک المشتہر

مینیجر اُردوی معلّے علیگڈھ

شرح اُجرت اشتہار اُردوی معلّے

	ایک صفحہ یا ۲ کالم	نصف صفحہ یا ایک کالم	نصف کالم
سالانہ	للعہ	عہ	سے
ششماہی	عہ	سے	سے ر
سہ ماہی	سے ر	سے ر	۸ر
یکبار	عہ ر	عہ ر	فی سطر ۲ر

سچ ایسا دل مایوس کو لکھ بھیجا تھا !!

رجسٹرڈ نمبر ایل۔ ۲۵۱

اردوی معلّیٰ

جلد (۶)	بابت ماہ جون سنہ ۱۹۰۶ء	نمبر (۶)

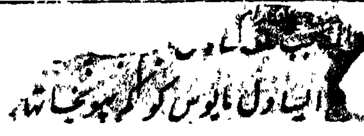
مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوی معلی علی گڑھ

احسن المطابع علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول — للعہ سالانہ
دوم — عہ سالانہ }



بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصحفی (سنہ ۱۱۶۴ھ تا ۱۲۴۰ھ)

نام وتخلص شیخ غلام ہمدانی نام مصحفی تخلص خلف شیخ ولی محمد امروہہ کے رہنے والے تھے۔ زمانہ طالب علمی دہلی میں بسر کیا اور کسب کمال کے بعد لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو کر وہیں کے ہو رہے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۲۴۰ھ میں ۷۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔

عادات ومشاغل خوش خلقی اور خوش مزاجی کے ساتھ ادب ولحاظ کی پابندی کے باعث سب جہاں رہتے تھے عزیز بنا ہوکر رہتے تھے۔ تباہی دہلی کے بعد بعہد نواب آصف الدولہ بہادر لکھنؤ آئے اور مرزا سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم بادشاہ دہلی کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ اور آخر وقت تک شغل شعر وشاعری میں مصروف رہے اور اس درجہ استعداد ومشق بہم پہونچائی کہ دنیائے اُستادی میں عدیم المثال قرار پائے۔

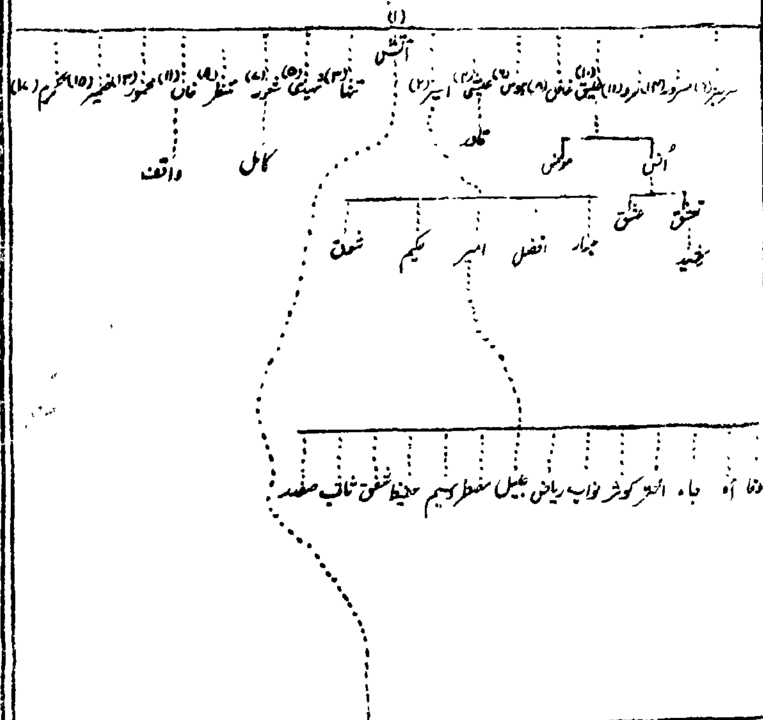
کہنہ مشقی وتصنیفات انکی کہنہ مشقی سے متعلق تذکروں میں اکثر روایتیں نظر سے گزرتی ہیں مثلاً مضمون نثر کو دیکھ دیکھ کر اسطرح بے تکلف نظم کرتے جاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو نقل کا گمان ہوتا تھا یا طرح مشاعرہ پر لاتعداد اشعار لکھتے چلے جاتے تھے جنمیں سے بعد کو مشاعرہ میں اپنے نام سے پڑھنے کے لئے لوگ غزلیں چھانٹ کر مول لیجاتے تھے۔ اسپر بھی اُردو کے آٹھ دیوان، ایک دیوان فارسی اور تذکرہ شعرائے اُردو وفارسی کے ان سے یادگار باقی ہیں جنکے مطالعے کے بعد انکی اُستادی اور مشاقی کے ثبوت کے لئے پھر کسی دوسری دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔

شاگرد ومعاصر اور اس سے بڑھکر ثبوت انکے کمال فن کا یہ ہے کہ جتنے اُستاد انکے شاگردوں اور عقیدتمندوں میں سے نکلے اتنے ولی سے لیکر اُسوقت تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے چنانچہ انکے معاصر اُستادوں میر حسن جرات وانشا کے شاگردوں کی تعداد انکے متوسلین کے دسویں بلکہ بیسویں حصہ کے برابر بھی نہیں ہے حتی کہ میر حسن کے صاحبزادے میر خلیق خود اپنے والد کے اشارے سے انہیں کے شاگرد ہوئے اور شاگردی پر قائم بھی رہے۔

ذیل میں ہم ایک نقشہ سلسلہ مصحفی کا درج کرتے ہیں جسکے ملاحظے سے معلوم ہوگا کہ مصحفی کے بعد لکھنؤ کے تمام مشہور اُستاد انہیں کے حلقہ بگوش تھے یہاں تک کہ بعض تذکرہ نویسوں کی تحقیق کے مطابق شیخ ناسخ کو بھی بواسطہ محمد عیسیٰ تنہا انہیں سے تلمذ تھا۔ چنانچہ دیباچہ دیوان ششم مصحفی کی عبارت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے جسمیں مصحفی لکھتے ہیں "کہ حصہ نعمت الوان ایں خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہاست بتقسیم رسوخے از تہ دل دارد مقسوم گشت"

نقشہ سلسلۂ مصحفی

مصحفی



شیدا اصغر فیض اعظم شناور سلیم شرف خلیل صبا رند شوق ماہ نسیم

قمر موہانی آغا حنا کیف ازل فروغ

نوٹ۔ اس نقشہ میں ہر استاد کے شاگرد رشید کا نام درمیان میں اور پھر سلسلہ وار داہنے بائیں یکے بعد دیگرے حسب مرتبہ دیگر شاگردوں کے نام درج ہیں جیسا کہ شاگردان مصحفی کی فہرست میں نمبر دیکر ظاہر کر دیا گیا ہے۔

مصحفی کی شاعری

مصحفی کی ہمہ گیر و ہمہ رنگ طبیعت نے کسی خاص رنگ سخن پر قناعت نہ کرکے مشاہیر شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے تقریبًا ہر ایک کے انداز سخن کا پسندیدہ نمونہ پیش کیا ہے چنانچہ انکی غزلوں میں کہیں میر کا درد ہے تو کہیں سودا کا دبدبہ۔ کسی مقام پر فغاں کی رنگینی ہے تو کسی جگہہ سوز کی سادگی۔ کہیں واقعات میں جرأت کی سلاست و حقیقت نویسی سے کام لیا گیا ہے تو کہیں ترکیب الفاظ اور انداز بیان میں انشا کا طنطنہ اور جبروت صرف ہوا ہے کہیں پر غزلوں کو قطعات مسلسل پر ختم کرنے میں جعفر علی حسرت کا رنگ کلام پیش نظر ہوتا ہے تو کہیں مشکل ردیف قافیوں کو بخوبی و صفائی نباہنے میں شاہ نصیر کا کمال سامنے آجاتا ہے اور پھر ان سب کے علاوہ جن غزلوں اور بیتوں میں ان تمام اساتذہ کی خوبیوں کو ان کی کہنہ مشقی اور استادی یکجا کردیتی ہے انکا شمار لاریب اردو شاعری کے بہترین نمونوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مصحفی کی زبان اگرچہ میر و سودا کی قدیم زبان سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے لیکن اسدرجہ شیریں اور سبک واقع ہوئی ہے کہ اکثر اسکی حلاوت اس زمانے میں بھی ناظرین کے دلوں میں اسکے متروک الاستعمال ہونیکا گمان نہ پیدا ہونے دیگی ملاحظہ ہو

جب واقف راہ و روش ناز ہوئے تم
عالم کے میاں خانہ براند از ہوئے تم

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا
شعلہ سمجھا تھا اسے میں یہ بھبھوکا نکلا

اس نازنین کی باتیں کیا پیاری پیاریاں ہیں
پلکیں ہیں جسکی چھریاں آنکھیں کٹاریاں ہیں

جاگا ہے رات پیارے تو کسکے گھر جو تیری
پلکیں اد نیندیاں ہیں آنکھیں خماریاں ہیں

ترسا نہ مجھکو کھینچ کے تلوار مار ڈال
گر مار ڈالتا ہے تو اکبار مار ڈال

صیاد تجھکو کسنے کہا تھا کہ فصل گل
مجھکو قفس میں کرکے گرفتار مار ڈال

"تجھسے کہا تھا" کی جگہ "تجھکو کہا تھا" قدیم زبان ہے اگرچہ بعض لوگ صلہ کے معنوں میں اب بھی اسکا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔

عارض نہ تیری زلف پریشاں میں دیکھا
یوسف کو زلیخا کے میں زنداں میں دیکھا

فارسی اضافت کے ساتھ اعلان نون بھی غالب کیوقت تک جائز تھا اب اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہی کا استعمال بحذف "نے" علامت فاعل بھی قدیم شیوہ سخن طرازی ہے۔

فارسی محاوروں کے ترجموں کا اردو الفاظ سے جوڑ ملانا بھی شعرائے متقدمین کا خاص جوہر ہے چنانچہ مصحفی نے بھی بعض محاوروں کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ اردو زبان میں آمیختہ کیا ہے کہ ارباب بینش ان کو دیکھینگے اور تعجب کرینگے۔

زلفوں کی برہمی نے برہم جہاں مارا	پلکوں کی کاوشوں نے سینوں کو چھان مارا
جب کوہ و بیاباں میں جا ہینے قدم ملرا	فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا
تنہا نہ دل اپنا ہی میں زیر و زبر دیکھا	اس جنبش مژگاں نے عالم کو بہم مارا
میں تیرے تغافل کا کشتہ ہوں کہ عاشق کو	معشوق کی آنکھوں نے اس لطف سے کم مارا
اے مصحفی جو میرے اشعار بیاضی تھے	میں صاد کیا ان پر اور سب کو قلم مارا
مجھ صید ناتواں سے مگر عار لیگیا	قاتل جو اپنی کھینچ کے تلوار لیگیا

اب ہم اپنے بیان کی تائید میں دواوین مصحفی سے ہر رنگ کا کلام پیش کرکے مختلف اساتذہ کے انداز سخن سے اسکا موازنہ کرینگے۔ اول چھوٹی بحر میں ان کی دو غزلیں ملاحظہ طلب ہیں

گرا بر گھرا ہوا اھڑا ہے	آنسو بھی تلا ہوا کھڑا ہے
حیران ہے کسکا جو سمندر	مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے
ہے موسم گل۔ چمن میں ہر نخل	پھولوں سے لدا ہوا کھڑا ہے
شمشاد پہرا بہا کے قد کے	دہشت سے بچا ہوا کھڑا ہے
خونین کفن شہید الفت	دولہا سا بنا ہوا کھڑا ہے
لے جان نکل کہ مصحفی کا	اسباب لدا ہوا کھڑا ہے
دیکھ اسکو اک آہ ہمنے کرلی	حسرت سے نگاہ ہمنے کرلی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے	اس شوخ سے راہ ہمنے کرلی
جب اسنے چلائی تیغ ہمپر	ہاتھوں کی پناہ ہمنے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا	کج اپنی کلاہ ہمنے کرلی

دی ضبط میں جبکہ مصحفی جان
شرم اسکی گواہ ہمنے کرلی

ان دونوں غزلوں کی سادگی اور صفائی خصوصًا دوسری غزل کا درد میر تقی میر کے کلام سے یاد دلاتا ہے اگرچہ بحیثیت مجموعی مصحفی کا کلام میر سے دوسرے درجے پر ہے۔ میر کی سادگی اور درد کے ساتھ ہی ساتھ سودا کا زور اور دبدبہ بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

منظور گر ہمیں بھی تماشائے خلق ہے
وابستہ اک نظر کی تمنائے خلق ہے

کسطرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن
دورِ سپہر درپئے ایذائے خلق ہے

کچھ شعر و شاعری سے نہیں مجھکو فائدہ
الّا حصول کاوشِ بیجائے خلق ہے

چل تو بھی مصحفی کہ وہ نکلا ہے بزم میں
ہے بارِ عام نوبتِ مجرائے خلق ہے

تم گرم ملے ہمسے نہ سرملکے دنوں میں
ہیں آئے بگرمی بھی تو گرما کے دنوں میں

نے غرفے سے جھانکے نہ کبھی بام پہ آئے
پنہاں رہے تم حسنِ دل آرا کے دنوں میں

جی ہی میں رکھی اپنے میاں جی کی جو اپنی
کچھ ہمنے کہا تمسے تمنا کے دنوں میں

بلبل خوش صفیر ہوں گلشن روزگار کا
کچھ میں نشید خواں نہیں زمزمۂ بہار کا

لالہ ہوا بروئے خاک رنگِ شفق پر آسمان
خون کہاں کہاں گرا زخمِ دلِ فگار کا

خاص عاشقانہ انداز میں سادگی بیان کے ساتھ واقعیت مضمون کا نباہنا جراءت کا حصہ ہے لیکن مصحفی نے بھی جا بجا اپنی غزلوں کو اس رنگ میں جراءت سے ملا دیا ہے مثلاً کہتے ہیں

چھپایا منہ ایسا کہ بس جی ہی جلا ڈالا
تغافل نے تمہارے خاک میں ہمکو ملا ڈالا

نہ اٹھا حشر میں بھی اسکی تیغِ ناز کا مارا
کیا ہوں اسنے اک عالم کا اور وہ ہی چپا ڈالا

مرض تھا مصحفی کو صعب تر یہ خوب سمجھا
کہ جوں توں آپ کو اسنے ترے کوچے میں لا ڈالا

شب گھر سے جو سیٹی کی وہ آواز پہ نکلا
نکلا تو ولیکن عجب انداز پہ نکلا

دل مجلسِ خوباں میں جو گم رات ہوا تھا
صد شکر اسی محرم ہمراز پہ نکلا

اے مصحفی حسن اسکا جو دیکھے ہیں ہمنے ہی
یہ طرفہ ستارا فلکِ ناز پہ نکلا

اس غزل کے دوسرے شعر میں "کے پاس" کی جگہ "پہ" استعمال کیا گیا ہے یہ محاورہ نواح بداؤں وغیرہ میں اب بھی مستعمل ہے۔

حسن اسکا اب سمان کچھ اور دکھلانے لگا — چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نکل آنے لگا

میں ہی کچھ بیصبر و طاقت عشق میں اسکے نہیں — دل بھی اب بیطاقتی کو کام فرمانے لگا

یا وہ عالم تھا کہ کوئی اُس سے واقف ہی نہ تھا — یا یہ عالم ہے کہ عالم اسپہ مرجانے لگا

کان میں قاصد نے کچھ ایسا ہی آ کر کہدیا — جسکو سُنکر سر میں دیواروں سے ٹکرانے لگا

مجھکو ساقی کی یہ محفل میں ادا بھائی بہت — مصحفی کو جام خالی سے جو ڈھکانے لگا

ہی ہے ٹک اس طرف کو ابھی پھر کے دیکھ لو — اک ناتواں کا جائے ہی جی پھر کے دیکھ لو

کیا مجھکو چھوڑ نزع میں جانا ضرور ہے — اور یونہی ہے خوشی تو ذری پھر کے دیکھ لو

مارا ہی جسکو تیغ نظر سے اُسے میاں — ابرو کی یوں کہے ہی کجی پھر کے دیکھ لو

تم مصحفی کو چھوڑ کے بسمل چلے گئے — رخصت حیا نے اتنی نہ دی پھر کے دیکھ لو

مصحفی کے کلام کی خوبی زیادہ تر شگفتہ و دراز قافیوں اور ردیف کی تلاش اور پھر ردیف کو مختلف طور پر نباہنے کی ترکیب پر منحصر ہے اور یہی مسلک تھا تقریباً تمام پرانے شاعروں کا جو لکھنؤ میں مصحفی کے بعد بھی ہوس و علیشی تک اور دہلی میں شاہ نصیر کے بعد ظفر تک قائم اور پسندیدہ اہل نظر رہا۔

مندرجہ ذیل منتخب غزلوں کو پڑھکر ارباب انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ مختلف ردیفوں کو اُستاد نے کن کن پہلوؤں سے نباہا ہے اور قادر الکلامی و مشاقی کی کیسی کیسی مثالیں بروے کار آئی ہیں۔

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا — پانی میں نگارین کف پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں مُنہ پہ ترے مینہ کی بوندیں — جوں لالہ تر حُسن ترا اور بھی چمکا

جینے کا نہیں کوئی اگر یونہیں عزیزو — یہ طفل پریزاد ذرا اور بھی چمکا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے اسکی — کمبخت یہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

اے مصحفی کیا بات کہوں درد جگر کی — جوں جوں کہ میں کی اُسکی دوا اور بھی چمکا

از بسکہ مرے دیدہ کا حیران میں کچھ ہے — اک آن میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہی

خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیر چمن سے — داماں میں کچھ ہے نہ گریباں میں کچھ ہے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ہوں اتنا
واللہ تری نرگس فتان میں کچھ ہے

اے مصحفی مرنے کی مرے سنکے وہ بولا
کیا لگتا ہے مرجانے کو انسان میں کچھ ہے

جس کشتے کا زخموں میں ہو چور بدن سارا
خوں میں نہ بھرے کیونکر پھر اسکا کفن سارا

گر شمع کے رونے میں ہو ایسی ہی رنگینی
بھر جائیگا لوہو سے تا صبح لگن سارا

ای مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کر اٹھ آیا
دیوانے تری خاطر کڑھتا ہے وطن سارا

جسدم کہ وہ کمر میں رکھکر کٹار نکلا
جس رہگزر سے نکلا عالم کو مار نکلا

آئی زباں جو اپنی جنبش میں نزع کے دم
تیرا ہی نام منہ سے بے اختیار نکلا

تہمت ہی مصحفی پر سیر چمن کی یارو
کب گھر سے اپنے باہر وہ سوگوار نکلا

اک تیغ کے لگتے ہی لگی جان ٹھکانے
اچھا تو ہے لگ جائے گر انسان ٹھکانے

نومید پھر اواں سی تو قاصد نے کہا یوں
یہ خط نہیں لگتا کسی عنوان ٹھکانے

اے دست جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی
اک جھٹکے میں لگتا ہے گریباں ٹھکانے

تھی تھوڑی سی کچھ رات یہ پروانہ کہی تھا
جو وقت لگی شمع شبستان ٹھکانے

گہہ دوش پہ پڑتی ہے تو گہہ دوش کمر پر
ڈھونڈھے ہے تری زلف پریشاں ٹھکانے

الجھا ہی تو کس سے جو ترے جامے کی پیاری
نے چین ٹھکانے ہے نہ دامان ٹھکانے

آویزہ بنا محمل لیلے کے جرس کا
صد شکر لگا اب دل نالاں ٹھکانے

پھر کھینچو تلوار میاں غصے میں آکر
عاشق کو لگاتی ہی یہی آن ٹھکانے

ای مصحفی اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا
لیکن نہ لگا اک یہ پریشاں ٹھکانے

یاران عدم رفتہ گئے دور بہت سے
ہمسار[۵۱] کے پیچھے رہے رنجور بہت سے

ٹپکی جو کہیں ہاتھ سے شب اسنے گلابی
مجلس میں ہوئے شیشۂ دل چور بہت سے

ای مصحفی جا نہیں نہ کبھی اسکی گلی لیک
ہاتھوں سی ہم اس دل کے ہیں مجبور بہت سے

دیکھ اسکی شب وصل ہیں اوسان ہماری
پھر پھر کے فلک ہووے ہی قربان ہمارے

جب ہو نسکا ضبط غم عشق تو آخر
کیا پھوٹ بہا دیدۂ گریان ہمارے

گل پان کا رنگ آئینے میں دیکھ وہ بولے
کیا لال ہوئے ہیں لب و دندان ہمارے

---

۵۱ "ہمسار کے" یعنی "ہم سے"۔ یہ محاورہ دکن میں ابتک مستعمل ہے۔

پھٹتے ہوئے دیکھا ہی اُسے شرح جو جامہ
اور اس سے مصحفی کیا ہو ویگی شہرت

ہی دجلۂ خون تا بگریبان ہمارے
جیتے ہی لکھے جاتے ہیں دیوان ہماری

ان غزلوں کو دیکھنے سے ثابت ہو گا کہ میر تقی کے رنگ میں مصحفی میر حسن کے ہم پلہ، سودا کے انداز میں انشا کے ہمپایہ اور جعفر علی حسرت کے طرز میں جرأت کے ہمنوا ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اپنے ان سب ہمعصروں سے باعتبار کمال سخندانی و مشاقی برتر ہیں اور یہی ہے کہ راقم کی نگاہ میں میر و مرزا کے بعد اور کوئی استاد انکے مقابلے میں نہیں جچتا۔ معلوم نہیں کہ صاحب آبحیات نے کس بنا پر سید انشا کو مصحفی پر ترجیح دینے کی جا بجا کوشش کی ہے۔ سید انشا کی طباعی اور قابلیت میں کسکو شبہ ہو سکتا ہے لیکن دربار لکھنؤ کی مجبوریوں نے ان کی ظرافت کو دائرہ اعتدال سے خارج کر کے انکے کلام کو بقول شیفتہ ساقط الاعتبار بنا دیا تھا، چنانچہ نظر بحالات موجودہ انہیں مصحفی کے مقابل لانا مصحفی کے کمال کی توہین کرنا ہے اور بس۔

اب ہم اپنی اس مختصر تحریر کو مصحفی کے چند متفرق مطلعوں پر ختم کرتے ہیں جنکی خوبی اور دلفریبی میر کے نشتروں اور سودا کے خنجروں سے کسی حال میں کم نہیں۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں اور مسرت اندوز ہوں۔

اک ذرا دیکھیو اس رشکِ پری کا سونا
میں تو دیکھا نہیں اس بیخبری کا سونا

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اُس سے بات کرنا

زلفوں سے اسکی میں نے جس دن کہ ہاتھ دھویا
ابر سیاہ اگر تربت پہ میری رویا

تھا سُرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر

دل لیگیا ہی میرا وہ سیمتن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر

شب ہجراں تھی میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا
غرض اس شب عجب اک بیسر و پائی کا عالم تھا

بن تیرے جسکے پل میں آنکھیں بھر آئیاں تھیں
کیا قہر ہے جو اس سے برسوں جدائیاں تھیں

میں وہ نہیں ہوں کہ اُس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں جو اس سے تو بہتر ہے مرا خدا پھر جائے

راہ میں کشتہ پڑے ہیں کئی ارمان بھرے
بچکے چلیو نہ ترا خون سے داماں بھرے

ہے غریبی میں خبر کسکو وطن والوں کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

فقط

"حسرت"

اقوامِ ہند کے درمیان باہم اتفاق

(۶ اپریل کو مسٹر تصدق احمد خاں نے سٹڈنس یونین کلب میں یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان اگر ہندوستان میں ایک ممتاز قوم کی حیثیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں دوسری قوموں کی کوششوں میں شریک ہونا چاہیئے۔ ۷ ر کو مباحثہ ختم نہ ہوسکا اسلیئے ۸ ر کو دوبارہ شروع ہوا اور اُدسر وز میں نے بھی تقریر کی جسکا خلاصہ یہاں لکھا جاتا ہے۔)

ہم صحیح طور پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ قومیت کس بنا پر قائم ہوتی ہے اور بنی نوع انسان میں جو نیشنلٹی کا فرق ہے اسکا کوئی ایک خاص سبب نہیں بتا سکتے۔ مختلف وجوہ سے قومیت قائم ہوتی ہے اور اسوقت میں یہی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جن اسباب کو لوگ ہندوستان میں مانع قومیت بتاتے ہیں، وہ کہاں تک درست ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ایک نسل ہونا قومیت کے لئے ضروری ہے اور ہندوستان میں ایسے نہ ہونے سے وہ قیام قومیت سے مایوس ہیں۔ ممکن ہے کہ ابتدائے زمانہ آفرینش میں ایک فرقہ کا دوسرے مابہ الامتیاز یہی باعث رہا ہو۔ کیونکہ جہانتک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ایام میں اتفاق کے ذریعے صرف خاندان اور قبیلے تھے مگر ہمارے زمانہ میں یہ حال نہیں ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف نسلوں کے لوگ ایک نیشن میں ہیں اور وہ سب اپنے کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ اور کسی ملک کو جانے دو انگلستان ہی کو لو اُس جزیرہ کے اصلی باشندوں کو برٹن نے فتح کیا انکے بعد رومی آئے رومیوں کے بعد سیکسن قومیں اس جزیرہ میں داخل ہوئیں اور وہیں آباد ہوگئیں سیکسن کے بعد نارمن آئے اور وہ بھی وہیں رہگئے (انگلستان میں نارمن کے داخل ہونے کا وہی زمانہ ہے جبکہ سلطان محمود کے فتوحات کے سبب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہونے لگے تھے۔) اسوقت مختلف خون اور مختلف نسلیں انگلستان میں خلط ملط ہیں اور سب

بڑھکر یہ کہ اسکاٹلینڈ والے انگلستان والوں سے بالکل مختلف ہیں مگر تمام جزیرہ
گریٹ برٹن کے نام سے پکارا جاتا ہے اور وہاں کا ہر باشندہ برٹش کہلاتا اور
اس پر فخر کرتا ہے۔ انگلستان کی مثال اگر پرانی سمجھی جائے تو کناڈا کی تازہ مثال
موجود ہے کہ فرانسیسیوں نے ابتدا میں وہاں نوآبادی قائم کی چنانچہ ملک میں فرانسیسیوں
کا بہت بڑا عنصر ابھی تک موجود ہے۔ مگر کناڈا کی تمام آبادی اپنے کو ایک نیشن سمجھتی
ہے اور نہ صرف زبانی اسکا اعتراف کرتی ہے بلکہ عملاً بھی ایسا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے
کہ اگر ہندوستان میں مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں تو وہ متحد و متفق نہ ہوسکیں۔ میرے
خیال میں یہ وجہ مانع ترقی اتحاد و اتفاق نہیں ہے۔

دوسری وجہ مانع قومیت جو پیش کیجاتی ہے وہ زبان ہے اور یہ کہا جاتا ہے
کہ جس ملک میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہوں اور ایک صوبے کا باشندہ دوسرے
صوبے کی زبان نہ سمجھ سکتا ہو وہاں ہم خیالی کیونکر پیدا ہوسکتی ہے اور قومیت کے
قائم ہونے کی کیا صورت ہوسکتی ہے۔ حقیقت میں یہ سوال بہت غور طلب ہے۔ بابل
میں جب لوگوں نے آسمان تک مینار بنانا چاہا تھا تو خدا کو بھی اس سے بہتر ترکیب نہ
سوجھی کہ ان کی زبانیں مختلف کردے اور بالآخر وہ منتشر ہوجائیں۔ مگر یہ سوال ایسا مشکل
نہیں ہے جیسا بظاہر معلوم ہوتا ہے سوئٹزرلینڈ ایک ایسا ملک ہے جہاں تین مختلف
زبانیں بولی جاتی ہیں مگر کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہاں قومیت میں اسکی وجہ سے
ذرہ برابر بھی کمی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندوستان کا اختلاف زبان اس کی
قومیت اور اتفاق میں مانع نہیں ہے۔ ہندوستان میں قدیم ایام سے دو زبانیں مروج
رہی ہیں ایک اعلیٰ طبقہ کی زبان اور دوسری ادنیٰ طبقہ کی۔ ہندوؤں کے زمانہ میں
سنسکرت اعلیٰ طبقہ کی زبان تھی اور مختلف اطراف میں وہاں کی مقامی زبانیں بولی
جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے وقت میں فارسی نے سنسکرت کی جگہہ اور اب انگریزی ہے

اس کی قائمقام ہے - ہندوستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ زبان
اسوقت پھیلی ہوئی ہے - ایک مرہٹہ یا مدراسی ایک بنگالی یا پنجابی سے اسی زبان
میں گفتگو کرتا ہے - ہندوستانیوں کے تمام با اثر اخبارات اسی زبان میں شائع ہوتے
ہیں - ہر ایک ایسے مجمع میں جسمیں مختلف صوبہ جات ہند کے لوگ شریک ہوتے ہیں
اسی زبان میں تقریریں ہوتی ہیں - اور جس طبقہ کے لیے ایک زبان ہونے کی
ضرورت ہے اُس نے انگریزی کو بہت کچھ حاصل کر لیا ہے اور حاصل کرتا جاتا ہے
رہگئے غیر تعلیم یافتہ لوگ تو انکو اسکی ضرورت نہیں ہے کہ تمام ہندوستان کی زبان ایک
ہو ان کی کل ضرورتیں اسی صوبے کی زبان میں انجام پا سکتی ہیں جسمیں وہ رہتے ہیں
اسلئے اس خیال ہی کو ایک سرے سے خارج کر دینا چاہیے کہ مختلف زبانوں کے رواج
سے بنا ر قومیت میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے کیونکہ ایک زبان کی جسقدر ضرورت
ہی وہ انگریزی سے پوری ہو رہی ہے اور روز بروز اسکا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے

تیسرا سبب مانع اتفاق مذہب خیال کیا جاتا ہے - ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ
مذہب نے دنیا پر حکومت کی اور انسان کے تمام افعال و حرکات کا محور مذہب رہا
ہے - مگر اس زمانہ میں مذہب کا اثر بہت کچھ دلوں سے زائل ہو گیا ہے (مگر میں
یہ نہیں کہتا کہ یہ اچھا ہے یا بُرا) اور خاص کر قومیت کے باب میں تو مذہب لاشے
محض ہے - یورپ کی سیاست میں مذہب داخل نہیں ہے سیاسی ضروریات
میں مذہب سے مدد لیجاتی ہے - مگر مذہب کے واسطے کوئی سیاسی فعل نہیں ہوتا - اس
خصوص میں مذہب اسلام پر غور کی زیادہ ضرورت ہے اسلام بیشک تمام دنیا
کے لئے آیا ہے مگر یہ کہنا کہ اسلام نے کسی زمانہ میں بھی قومی تفریق کو مٹا دیا تھا
درست نہیں ہو سکتا سر سید مرحوم اور مولانا شبلی کی تصانیف کا جن لوگوں نے
مطالعہ کیا ہے وہ مجھ سے اس امر میں اتفاق کرینگے کہ اسلام سے اور حکومت سے

کوئی تعلق نہیں ہے اور جنکو ہم اسلامی سلطنتیں کہتے ہیں وہ درحقیقت قومی سلطنتیں تھیں۔ بنو عباس کے آخر زمانہ تک اور اسپین میں عربوں کی سلطنت رہی اسکے بعد ترکوں اور مغلوں کا دور ہوا اور یہ سب سلطنتیں اسلامی کہلاتی ہیں نہ اس اعتبار سے کہ انکو مذہب سے کوئی تعلق تھا بلکہ صرف اس اعتبار سے کہ وہ مسلمان قوموں کی حکومتیں تھیں۔

اور کسی ملک کے نسبت خواہ کچھ ہی رائے کیوں نہو مگر ہندوستان کی بابت کوئی دو شخص اس امر میں مختلف الرائے نہیں ہو سکتے کہ یہاں مسلمان مذہبی حیثیت سے نہیں داخل ہوئے اور نہ یہاں اُنھوں نے مذہبی سلطنت کی۔

اُنھوں نے یہیں کا باشندہ ہو کر یہاں حکومت کی ہے اور ان کی حکومت اصحیح معنوں میں، ہندوستانی حکومت کہی جا سکتی ہے۔ سوائے اسکے کہ بادشاہ مسلمان تھے اور کوئی بات حکومت میں ایسی نہیں تھی جسمیں ہندو اور مسلمانوں کا فرق ہو۔ بعض مسلمان ہمیں یہ وعظ سناتے ہیں کہ ہم ہندوستان کو غیر ملک سمجھیں اور عرب۔ ایران و ترکستان کو اپنا اصلی وطن خیال کریں مگر کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ان خیالات کا عملی نتیجہ کیا ہے۔ آیا چھ کروڑ مسلمان ہندوستان سے ہجرت کرکے ان ممالک میں جا بسیں؟ بعضوں کا یہ بھی خیال ہے کہ مسلمانوں کو کسی خاص ملک کی قومیت کا پابند نہ ہونا چاہیے بلکہ "کل مؤمن اخوۃ" کے اعتبار سے تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک قومیت ہونی چاہیئے۔ وہ شاید اس حدیث کو بھول جاتے ہیں کہ "حب الوطن من الایمان"۔ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ 'وطن' اور قومیت سے مذہبی اخوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں مگر ساتھ ہی ہندوستانی بھی ہیں۔ عربی۔ عجمی۔ ترکی۔ چینی۔ مصری مسلمانوں کے ساتھ ہماری مذہبی اخوت ہو سکتی ہے۔ مگر ہمارا قومی اتفاق صرف ہندوؤں کے ساتھ ہو سکتا ہے اور بس۔

میرا خیال ہے کہ مذہب نہ قومیت کا قائم کرنے والا ہے اور نہ اسکے قیام میں مانع ہے یہی حال حکومت کا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نسل۔ زبان اور مذہب لازمی

طور پر نہ قومیت کے قائم کرنے والے ہیں اور نہ اسمیں ہارج ہی ہوتے ہیں تو ہمارا خیال طبعی طور پر حکومت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ شاید حکومت کا ایک ہونا قومیت قائم ہونے کا باعث ہو۔ مگر ادنیٰ غور سے یہ خیال ہی غلط ثابت ہوجاتا ہے۔ ٹرکی کی مثال اسکی بین دلیل ہے کہ باوجود اتنی طویل مدت حکومت کے وہاں قومیت نہ پیدا ہوسکی۔ روسی حکومت کو بھی آج کل یہی دشواریاں درپیش ہیں۔

اسکے بعد ہم قیاس کرتے ہیں کہ غالباً ملک قومیت کا باعث ہے۔ ملک دو طرح کے ہیں ایک وہ جن میں قدرت نے ایسی خصوصیتیں رکھی ہیں کہ وہ دوسرے اقطاع ارض سے ممیز ہیں اور ان کی حد بندی ہی نیچر نے کی ہے۔

دوسرے وہ جو انسان نے اپنی ضروریات کے اعتبار سے مقرر کرلئے ہیں۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بھی قومیت کے لازمی بواعث نہیں ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ ایک ملک میں ایک ہی قومیت ہے اور ایسا بھی ہے کہ ایک ملک میں مختلف قومیں ہیں۔

پس غور کرنا چاہئے کہ جب یہ سب چیزیں قومیت کی میزان کی کسی پلہ کو گراں یا ہلکا نہیں کرتیں تو آخر وہ کیا شئے ہے جسکی وجہ سے آج ایسے سخت قومیت یورپ میں پیدا ہوگئی ہے۔ وہ شئے اغراض کا متحد ہونا ہے۔

جس قوم کو چاہو جانچو اسکی قومیت آج اسی پر قائم ہے کہ اسکے افراد ایک خاص غرض پر متحد ہیں ورنہ نسل کا اختلاف انمیں موجود ہے، زبان کا اختلاف انمیں موجود ہے، مذہب کا اختلاف انمیں موجود ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کہاں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے اغراض متحد ہیں اور کون کون سی طاقتیں انہیں متحد بنانے میں کام دے رہی ہیں۔ سب سے اول زبان کو لیجئے جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے انگریزی زبان اس غرض کو با حسن وجوہ پورا کر رہی ہے کہ تمام تعلیم یافتہ فرقہ ایک ہی زبان میں باہم مکالمہ اور مراسلہ کرسکے بلکہ سچ پوچھو تو انگریزی زبان نہ صرف اتحاد قومی کا ذریعہ ہے بلکہ اسکا بہت بڑا سبب ہے۔ انگریزی لٹریچر قومیت کے خیال سے بھرا ہوا ہے اور اسی لٹریچر نے

ہندوستان میں بہت کچھ روح قومیت کی پیدا کی ہے۔ تعلیم ہی اتحاد کا بہت بڑا سبب ہو رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں منافرت بڑھ رہی ہے میں اس سے انکار نہیں کرتا، مگر میرا مقصد یہ ہے کہ یکساں تعلیم کے سبب سے یکساں فکر و تخیل ماغوں میں پیدا ہو رہا ہے اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس کا اثر اگرچہ نمایاں طور پر ابھی ظاہر نہیں ہوا ہے۔ مگر ہوگا اور ضرور ہوگا۔

نسلیں اگرچہ ہندوستان میں بہت ہیں مگر مدت اقامت اور اثر آب و ہوا نے سب کا خمیر ایک کر دیا ہے بہت باتیں یکساں ہیں اور مختلف رسوم و رواج نے باہم مل جلکر ایک خاص امتزاج حاصل کر لیا ہے اور اب نہ ہندوؤں اور نہ مسلمانوں کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی نسبت آریہ یا سامی قوموں سے کریں بلکہ اب سب ہندوستانی ہیں۔ ہندوستان ہی اُن دونوں کی زندگی ہے اور ہندوستان ہی ان کی موت ہے۔

ہندوستان کے مختلف اقطاع کی آب و ہوا اگرچہ ایک دوسرے سے بہت کچھ متباین ہے پھر بھی ہندوستان اپنے قدرتی حدود کے اندر ایک ملک ہے اور پشاور سے راس کماری تک جو لوگ آباد ہوتے ہیں سب ایک ملک کے باشندے سمجھے جاتے ہیں اور ایک ملک کا ہونا بھی اتحاد قومی کا بہت مدد و معاون ہے۔ ہندو اور مسلمان اس ملک میں اس طرح آباد ہیں کہ وہ اپنے ضروریات کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے۔ جو لوگ مسلمانوں اور ہندوؤں کو جدا جدا قوم بنانا چاہتے ہیں بہتر ہو کہ وہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرالیں ایک میں ہندو رہیں اور دوسرے میں مسلمان ورنہ موجودہ حالت میں اس خیال کو ترقی دینا کہ دو قومیتیں قائم ہوں مشکلات کا بڑھانا اور جو آسانی قدرت نے ہمیں ایک بننے کے لئے عطا کی ہے اسکا ضائع کرنا ہے۔

ان سب سے بڑھکر جو قوت اسوقت ہندوستان کے اتفاق کی باعث ہو رہی ہے

خواہ بالقصد ہو یا بلاقصد وہ حکومت ہے۔ گورنمنٹ کا غیر ہونا ہندوستان کے اتفاق کا بہت بڑا مددگار ہے۔ ہر ایک ہندوستانی انگریزوں سے اپنے کو غیر سمجھتا ہے اور اسکے مقابل میں دوسرے ہندوستانی کو وہ اپنا ہمجنس خیال کرتا ہے اور یہ ایک ایسی کشش اور کوشش ہے جو ہر جگہ خود بخود اپنا عمل کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں انگریزوں کا برتاؤ بھی ہندوستانیوں کے مابین خیال اتحاد پیدا کرنے میں کم کام نہیں دیتا۔ مسٹر سوئنی لکھتے ہیں کہ "ایک انگریز کی خفیف بدخلقی بھی انگریزوں کی طرف سے نفرت اور ہندوستانیوں میں اتحاد کے بڑھانے میں حصہ لیتی ہے۔" اجنبیت حکومت سے زیادہ ہندوستان کو قومیت کیطرف بلانے والا ہندوستان کا ایک قانون ہے۔ ہر قانون کا اثر تمام ہندوستان پر یکساں پڑتا ہے اور اس کی مضرت یا منفعت میں سب یکساں شریک ہوتے ہیں۔ ہر ایک ایسا قانون جسکو رعایا اپنے حق میں مضر خیال کرتی ہو ایک نئی اینٹ ان کی عمارت اتحاد میں بڑھاتا ہے چنانچہ یہ امر مسلم ہے کہ لارڈ کرزن کے (reactionary) ری ایکشنری انتظامات نے ہندوستان کو جسقدر متحد کیا ہے شاید بیس برس کی کانگرس آشنا نہ کرتی۔

یہ قوتیں ایسی ہیں جو ہندوستانیوں کو اتحاد کی طرف بلاتی ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ کیا ہندو اور مسلمانوں کے اغراض ایسے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوکر ملکی اور قومی ضروریات میں کوشش کریں۔ ہماری مراد یہاں اُن ضروریات سے ہے جن پر ملک کی ترقی اور تنزل کا انحصار ہے۔ ادنٰی[1] قسم کے اخبارات نے جن امور کو معرکۃ الآرا قومی مسائل بنا رکھا ہے۔ وہ حقیقت میں اس اہمیت کے قابل نہیں ہیں جو انہیں دیجاتی ہے

[1] ان اخبارات میں کچھ ہندوؤں اور مسلمانوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ دونوں قوموں میں اسطرح کے اخبارات شائع ہوتے ہیں اور ملک کی بدقسمتی سے ایسے اخبارات کی اشاعت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جو سمجھدار لوگ ہیں وہ اسطرح کے اخبارات کو نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ملک کی ضروریات میں اول اقتصادی یعنی (economic) ضروریات ہیں۔ اقتصادی ضروریات میں تجارت اور ملک کے محاصل اور مخارج داخل ہیں۔ اس زمانہ میں تمام قوموں کی جد وجہد صرف میدان تجارت میں ہو رہی ہے اور اسی پر قوموں کی ترقی اور تنزل کا انحصار ہے مگر ہندوستان کی ابتک کوئی خاص تجارتی پالیسی نہیں قائم ہوئی ہے۔ انگلستان میں فری ٹریڈ اور پروٹکشن کے مباحث اس شد و مد سے ہو رہے ہیں لیکن ہندوستان پر اسکا کوئی اثر نہیں ہے۔ جبتک ملک کی کوئی خاص تجارتی پالیسی نہ ہو اسکی تجارت کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہو سکے اگر ملک کی تجارت کو ترقی ہوگی تو اُسمیں مسلمانوں کا ایسا ہی فائدہ ہے جیسا ہندوؤں کا اور اگر تجارت کو تنزل ہوگا تو اسمیں مسلمانوں کا ویسا ہی نقصان ہے جیسا ہندوؤں کا بلکہ چونکہ مسلمان ہندوؤں سے نسبتاً مفلس ہیں دونوں حالتوں کا اثر ان پر زیادہ پڑیگا۔ آج کل بعض اطراف میں دیسی صنعت کو ترقی دینے کی جان توڑ کوشش ہو رہی ہے مگر مسلمانوں کے اخبار اُنہیں یہی سمجھائے جاتے ہیں کہ جہانتک ہو سکے اسکی مخالفت کرو، اور دوسرے کو ڈبونے کی کوشش میں خود ہی ڈوب جاؤ۔ ؎

ہمتو ڈوبے ہیں مگر یار کو لے ڈوبینگے

تجارت کا معاملہ ایسا ہے کہ اسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دوش بدوش چلنا چاہیے اور ملک کی مادی ترقی کے مسائل کو حل کرنے میں دونوں قوموں میں کوئی اختلاف نہونا چاہیے۔ تجارت کے بارے میں اگر ہندوؤں نے ایک پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں نے دوسری تو دونوں کا ستیاناس ہونے کے سوا کچھ نہوگا۔

دوسری اقتصادی ضرورت ملک کے محاصل اور مخارج پر قابو حاصل کرنا ہے اور یہ ایسی غرض ہے کہ اسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی کوئی وجہ موجود نہیں پائی جاتی۔ ٹیکس کا بار جسقدر ہندوؤں پر پڑتا ہے اُسیقدر مسلمانوں پر۔ اگر ٹیکس ہلکا ہوگا تو مسلمان بلا امتیاز اُس سے ویسے ہی متمتع ہونگے جیسے ہنود۔

اور جو پالیسی اس بارہ میں گورنمنٹ کی قرار پائیگی اسکا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر ایک ہی ہوگا۔ ٹیکس کا کم ہونا ہی رعایا کے درد کی دوا نہیں ہے بلکہ وصول شدہ ٹیکس کا مصرف ملک کی خوشحالی اور بدحالی پر بہت کچھ موثر ہے۔ آج کل جسطرح ٹیکس کا روپیہ صرف ہوتا ہے وہ مفاد ملک کے بہت منافی ہے۔ اسپر گورنمنٹ کو توجہ دلانا ہندوؤں اور مسلمانوں کا برابر کا فرض ہے۔ پھر کوئی سبب نہیں ہے کہ دونوں قومیں بالاتفاق اپنی آواز بلند نہ کریں تاکہ اسکا کچھ نتیجہ ہو ورنہ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ کچھ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔

اقتصادی ضروریات کے بعد پولیٹیکل ضرورتیں ہیں۔ جب تک کسی قوم کو پولیٹیکل حقوق نہ حاصل ہوں اسکا شمار زندہ قوموں میں نہیں ہوسکتا۔ ہندوستان کی حالت ایسی ہے کہ پولیٹیکل حقوق اسکو ایکدم سے نہیں ملسکتے رفتہ رفتہ حاصل ہوسکتے ہیں مگر اسکے لئے بھی ایک مدت درکار ہے اور وہ بھی اسحالت میں کہ کل ملک متفقہ کوشش کرے۔ مسلمانوں کا بیشک یہ فرض ہے کہ ہر حال میں اپنے تحفظ حقوق کی پوری کوشش کریں اور پورا اطمینان حاصل کرلیں۔ اگر کوئی انہیں یہ صلاح دے کہ وہ اپنے کو دوسری قوموں کے رحم پر چھوڑ دیں تو میرے خیال میں کوئی سمجھدار مسلمان اسکے ماننے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ مگر تحفظ حقوق کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حصول حقوق ہی سے چشم پوشی کیجائے۔ اونی اخبارات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی پالیٹیکس صرف یہ بنا رکھی ہے کہ چند قلیل تنخواہ کی سرکاری ملازمتیں ملجائیں۔ مگر جب تک ملک کے اندرونی نظم ونسق پر اہل ملک کو قدرت نہ حاصل ہو، اسوقت تک یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ تمام پولیٹیکل حقوق سے محروم ہیں۔ موجودہ وزیر اعظم نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ عمدہ انتظام کرلینا دوسری بات ہے مگر عمدہ گورنمنٹ ہرگز اس گورنمنٹ کی قائمقام نہیں ہوسکتی جو خود رعایا کی بنائی ہوئی ہو۔ اسلئے جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ہندوستانی انگریزوں سے بہتر انتظام نہیں کرسکتے انکو وزیر اعظم کا قول دیکھنا چاہیئے۔ کیا یہ غرض کل ہندوستانیوں کو اتحاد کی طرف بلانے والی نہیں ہے۔

ملک کی اندرونی پالیسی کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ اسوقت ان ہندوستانیوں کا درپیش ہے جو ملک سے باہر ہیں۔ ملک کی ترقی کا بہت کچھ انحصار اُن افراد اور سرمایہ پر بھی ہوتا ہے جو ملک سے باہر کام میں لگے ہوں۔ گورنمنٹ خود اُن ہندوستانیوں کی حالت درست کرنے کی حامی ہے جو ہندوستان سے باہر کام کر رہے ہیں۔ مگر تنہا گورنمنٹ کیا کر سکتی ہے اگر کل ملک اُسکے ساتھ نہو۔ اور اسمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تفرقہ کسی طرح روا نہیں رکھنا چاہیئے۔

غرضکہ ملک کی ترقی کا دارومدار اسی پر ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے ساتھ ہوں اور جب تک یہ نہیں ہے کچھ نہیں۔ سب سے اول اسی کی کوشش کرنی چاہیئے اسکے بعد آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔

معاشرتی اتحاد کی نسبت میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ چند روز ہوئے نواب محسن الملک بہادر نے اسکی ضرورت پر زور دیا تھا اور اُنسے بہتر کون بیان کر سکتا ہے۔

لیکن جہاں بعض سامان اتحاد کے پیدا ہو گئے ہیں اور دونوں قوموں کی ضرورتیں اسکی متقاضی ہیں کہ وہ باہم ملکر کام کریں وہاں عوایق اور موانع بھی درپیش ہیں اور اُن کا رفع کرنا اس شخص کا جسکے دلمیں کچھ بھی ملک کا درد ہو فرض ہے۔ سب سے اوّل مانع کمی تعلیم ہے۔ ابتک جو تعلیم ہندوستانیوں کو ملی ہے اُس نے قومیت کا ایک خیال ضرور انکے دلوں میں پیدا کر دیا ہے مگر وہ اس کا استعمال ایک محدود دائرہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تنگ خیالی کم ہو جائیگی۔ دوسری بڑی دقت جس کے سبب سے تمام کاموں میں ابتری پیدا ہو جاتی ہے سچے لیڈروں کا نہ ہونا ہے۔ اس سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ موجودہ لیڈروں کی صداقت یا حب الوطنی میں شک کرتا ہوں۔ نہیں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ وہ لیڈر ہیں اپنے ذاتی وقار اور عزت کے سبب سے۔ مگر وہ کسی حال میں اپنے کو قوم کا جواب دہ نہیں سمجھتے ہیں کیونکہ قوم نے ان کو لیڈر نہیں مقرر کیا ہے اور اسی وجہ سے جہاں بعضوں کے رسوخ ذاتی سے رعایا کو فائدہ پہونچتا ہے وہیں بعضوں کے رسوخ سے رعایا کو نقصان بھی پہونچتا

ہے اور کوئی اُسنے باز پُرس نہیں کر سکتا - جیسے کہ حال میں (Sir Edward Clarke)
سر اڈورڈ کلارک سے باز پُرس کی گئی ہے -

علاوہ ازیں قومیت کا اعلیٰ خیال جو اسوقت لوگوں میں پیدا ہو رہا ہے وہ ملک میں بالکل نیا خیال ہے اور ہر نئے رواج کے دور میں یہی ہوتا ہے کہ پہلے ایک عجیب ہماہمی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، اسکے بعد اصلی اور مستقل صورت نمایاں ہوتی ہے - اسی لئے اس خیال کے نفوذ میں بھی ہمیں تھوڑا انتظار کرنا چاہئے -
علاوہ بریں ایک اور طرح کی حُب الوطنی بھی پیدا ہوتی جاتی ہے یعنی ہر صوبہ بجائے خود اپنے خیالات کا مرکز ہو - اور گورنمنٹ بھی اسکی معاون ہے جیسا کہ لارڈ کرزن کے مراسلہ تقسیم بنگالہ سے ظاہر ہوتا ہے - ایک حد تک یہ بالکل صحیح اور بجا ہے کیونکہ مقامی خصوصیات سے کوئی شخص علیحدہ اور بری نہیں ہو سکتا - لیکن امید ہے کہ رفتہ رفتہ یہ حب الوطنی کل ملک اور گروہ کے لئے وسعت حاصل کریگی - ہمارے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں مگر ہمکو کسی حال میں بھی نا امید نہونا چاہئے - فقط

تلمذ حسین - مدرسۃ العلوم علیگڈہ

مکتوبات امیر مینائی

مرتبۂ ثاقب

قاضی عبدالجمیل صاحب مرحوم رئیس بریلی کے نام

(۱) (۲۸ ردسمبر ۱۸۹۹ء روز پنجشنبہ ریاست رامپور)

جناب قاضی صاحب مجمع مکارم فراواں سراپا لطف و امتنان دام بالمجد والکرم -
سلام نیاز انضمام کے بعد التماس ہے کہ بندہ زادہ کوچک محمد مسعود احمد انٹرنس میں امتحان دینے کی ضرورت سے کالج کے بورڈنگ ہوس میں ۳۱ ردسمبر سے ۱۰ ارجنوری تک مقیم رہیگا - میری خوشی تو یہ تھی کہ آپ ہی کے مکان براحت نشان پر قیام ہوتا مگر اُس کے

مصالح متعلق امتحان اُسکو بورڈنگ کے قیام پر مجبور کر رہے ہیں اور وہ ضعیف البیان اوراس زمانے میں محنت کی وجہ سے نہایت ناتواں ہو رہا ہے کوئی عنوان اُسکے راحت اکل وشرب کا اس سے بہتر نظر نہیں آتا کہ اگرچہ وہ بورڈنگ ہوس میں رہے مگر باعتبار اکل ومشارب کی آپہی کا مہمان ہو کسی طرح کا تکلف اُسکے لئے نفرمایا جائے۔ صرف سالن اور روٹی اور سحر کے واسطے کھیر یا دودہ میں نان پاؤ ہو۔

لہذا۔ جسطرح سے بنظر اخلاص ونیازمندی بے تکلفانہ آپ کو اس امر کی تکلیف دی ہے امید کرتا ہوں کہ اسیطرح آپ بہی تکلف نفرمائیں۔ اور اپنے ناتوان بچوں کے مثل تصور فرماکر پرہیزی کہانا اپنے آدمی کے ہاتہہ اوقات معینہ پر کالج میں بہجوادیا کریں۔ کالج میں محل اقامت سے وہ خود آپ کو آگاہ کرے گا۔ زیادہ سوا منت پذیری کے کیا عرض کیا جائے۔

آپ کے فرزند ارجمند قاضی خلیل الدین صاحب کو سلام مسنون دعا مشحون۔ اطفال عقیدت خصال تسلیم گزار ہیں۔

فقیر امیر احمد امیر مینائی

(۲)

مولوی حبیب الرحمن خانصاحب حسرت شروانی کے نام

مکرما۔ نہایت کم فرصت ہوں۔ سراسری غزل دیکہی ضروری تصرف کیا زیادہ حاجت ہی نہیں۔ امید ہے کہ مجہکو اپنا داعی خیر سمجہکر ہمیشہ خیریت سے مسرور کیا کیجئے۔

امیر فقیر - ۱۸ر جنوری ۱۸۹۹ء

(۳)

صاحب موصوف کے نام

میرے قدر دان میرے مہربان۔ سلام مسنون اخلاص ودعا مشحون لو۔ مدت کے بعد محبت نامہ آیا پیاری نظم ونثر نے مسرور کیا۔ سر کے پاؤں۔ بری زمین تہی آپنے غزل زور طبیعت سے بہت اچہی کہی۔ ایسے زمین میں تکلف اور بناوٹ کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ آخر باقی۔ مزے کی زمین تہی اُسمیں مزے کے شعر نکلے۔ میں نے دونوں غزلوں کو فوراً دیکہا اور بواپسی ڈاک بہیجتا ہوں۔ امید ہے کہ مجہکو ہمیشہ

اپنا خیر خواہ سمجھکر کبھی کبھی خط لکھا کیجئے اور ادہر سے جواب میں تاخیر ہو تو کم فرصتی کا عذر قبول کر لیا کیجئے۔ لغت اردو کی نسبت بہی توجہ چلی جائے۔ اس کی فکر کیجئے کہ یہ لغت محبوب ہو کر نکلے اب تک جو لغات اردو میں ہیں انشاء اللہ اُن سے تو مفید تر ہونیکی امید قوی ہے مگر افکار رسا ادہر متوجہ رہیں کہ جامعیت بڑہے اور نفع عام تر ہو تو کیا عجب ہے کہ ایسی باتیں بڑہتی جائیں۔ آپ گہڑی دو گہڑی روز ادہر بہی توجہ رکہیں تو آپ کی جوان فکر عمدہ باتیں پیدا کریگی۔ اصُول جو جو خیال میں آیا کریں اُنکو ضبط کرتے جائیے اور بہجے لکہتے جائیے وہ مثل اصُول لغت عربی ایک رسالہ اصُول لغت اردو کا ہو جائیگا۔ کلیات اور اکثر یات مضبوط جمع ہو جائینگی۔ اپنے کتب خانے کی فہرست بہیجئے تو شاید کوئی کتاب مفید مجھکو مستعار مطلوب ہو۔ سِمْر اللغات خان آرزو کا کوئی صحیح نسخہ ہو تو ضرورت ہے۔

امیر فقیر۔ ۱۹ اپریل ۸۹ء

حکیم عابد علی صاحب کوثر شیر آبادی کے نام

پیارے کوثر۔ مجہے بیماریاں و بیمارداریاں خصوصاً اور مکروہات دنیوی عموماً نہیں چہوڑتے کہ میں احباب سے سرخرو ہوں تم بہی میرا قصور معاف کر دو۔ افسوس کہ طرح گلچیں گزشتہ جسدن آئی اُس دن خیال ہوا کہ ضرور دیکہکر بہجوں گا پہر ایسی حالات رہے کہ آج تمہارے لکہنے پر غزل کا آنا یاد آیا۔ عذر خواہ ہوں اور اس غزل کو اُسیوقت دیکہکر بہیجتا ہوں۔ کتاب لغت کی بدولت زیر باری حد سے بڑہی ہوئی ہے خدا رحم فرمائے۔ پیشاب کا مرض سخت مکلف ہے چوکی پر جلتے جاتے پاؤں تہک جاتے ہیں اور ہر بار رُک کر ہوتا ہے۔ دیر ہوتی ہے تو عسر بول بڑہ جاتا ہے۔ آنکہوں کو جب سے روگ لگا ہے تب سے لکہنا اور کتاب دیکہنا گویا چہوٹ ہی گیا ہے دوسرے کی محتاجی اور زیادہ مکلف ہے اور اکثر ہرج بہی ہوتا ہے۔ اب یہ دو سطریں لکہیں اور آنکہیں ڈبڈبا آئیں۔ کڑوا سنے لگیں بصارت میں بہی کمی ہونے لگی۔ سب احباب سلام کہتے ہیں اور اطفال تسلیم رساں ہیں پیارے

کوثر۔ پچھلی غزلوں کے شعر کچھ بنے ہیں کچھ بغیر بنے ہیں۔ خدا کرے دیکھ لوں تو بھیجوں۔
تمہاری سچی محبت کا منت پذیر

امیر فقیر۔ ۶ راگست ۱۸۹۲ء

بنام ثاقب کے نام

گرامی گوہرا۔ نامۂ دلنواز آیا۔ فرمائش تقریظ رسالہ سبعۂ سیارہ نے دلنوازی کی داد دی مگر افسوس ہے کہ مجھ سے اس زمانے میں حکم کی تعمیل نہیں ہوسکتی اسلئے کہ خود بھی بیمار ہوں اور کئی مریضوں کا پرستار ہوں۔ سب پر طرّہ یہ کہ سرکار دولتمدار کے احکام کی تعمیل سے مطلق فرصت نہیں اگر باانہمہ صحیح بھی ہوتا تو ضرور کچھ لکھتا اگرچہ میری تقریظ اس قابل نہیں ممکن تھی کہ اُسی رسالہ کے آخر میں پیوند ہوتی۔ زربفت کے لباس میں ٹاٹ کا ٹکڑا کیونکر کھپ سکتا ہے مگر خیر آپ کی خوشی تو ہوجاتی۔ افسوس کہ اس دولت سے بھی محروم رہا اگر زندگی باقی ہے تو کبھی تلافی ہوگی امید ہے کہ عذر پذیری کو کام فرماکر عفو جرم سے سرفراز کیجئے۔ خدا کرے آپ امتحان میں پورے اُتریں اور خاطر خواہ کامیاب ہوکر روز افزوں ترقیاں پائیں۔

امیر احمد عفی عنہ۔ ۱۰ ر نومبر ۱۸۹۰ء

صداقت

سچ سے روح کو تقویت ہوتی ہے اور جھوٹ سے مردہ ہوجاتی ہے (حدیث شریف)

حق بات کے اظہار میں کسی بڑے آدمی اور کسی کی ملامت سے نہ ڈرنا چاہئے (حضرت عمرؓ)

راستی موجب رضائے خداست	کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

میرے خیال میں انسان کو جس بات کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہئے یا جسکی سب سے زیادہ عادت ڈالنی چاہئے وہ "راستی" ہے کیونکہ اُسکا اثر روزمرّہ کی زندگی پر بے انتہا پڑتا ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ "جھوٹ سے خداوند تعالی اور انسان

دونوں کو بالطبع نفرت ہے۔ اور صداقت انسان کا خلقی جوہر ہے مگر بہت سی اور بری اثر (مثل خوف و عجب وغیرہ) انسان کو اس سے باز رکھتے ہیں اور نیز بعض وہ معاملات جنکا تعلق انسان کی ذات سے ہو اُسے جھوٹ بولنے کا عادی کر دیتے ہیں۔"

انسان کو ابتدا ہی میں یہ بات دل پر اچھی طرح نقش کر لینی چاہیے کہ وہ ایک ایسی دُنیا میں سکونت پذیر ہے جہاں ہر ایک چیز کا وجود ہے اور کوئی ایسی چیز جو وجود نہ رکھتی ہو بیچارہ محض خیال کہلاتی ہے۔ اُسے سوسائٹی کے ایک ممبر ہونے کی حیثیت سے یہ بات کہ "اپنی ذات کو اصلی حالت سے کمتر کرکے دکھلانا اُس سے برتر کرکے دکھلانے سے بدرجہا بہتر ہے" اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے وہ شخص جو محض ظاہر داری کی غرض سے کسی بے اصل کام میں سرگرمی دکھاتا ہے درحقیقت جھوٹ بولتا ہے کیونکہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے برائے چندے [illegible] کسی مشکل سے جسمیں وہ اسوقت مبتلا ہو نجات ملجائے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں معاملہ کی اصلیت کھلجائیگی۔ کیونکہ سچ بات کا ظاہر کر دینا زمانہ کا خاصہ ہے۔ اور اس شخص کو سوائے شرم و ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جسطرح کہ کھوکھلی چیز ٹھوس چیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی اسی طرح وہ کام بھی جسکے کرنے سے مقصود بالذات تو کچھ اور ہو مگر ظاہر کچھ اور کیا جائے کبھی انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کا جھوٹ جسکا اوپر ذکر کیا گیا ہے انسان سے کیوں سرزد ہوتا ہے؟ اور اسکے وجوہات کیا ہیں؟ اسکا جواب نہایت آسان ہے۔ تجارت پیشہ اشخاص میں جو لوگ اس بُری خصلت کے عادی پائے جاتے ہیں اُن کا مقصود اس جھوٹ سے سوائے نفع اُٹھانیکے دوسرا نہیں ہوتا۔ مگر عام لوگ جو میرے مخاطب صحیح ہیں ذیل کی تین وجہوں میں سے کسی ایک کے سبب سے اس قسم کے جھوٹ کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کاہلی۔ عجب و خودستائی۔ بزدلی و اخلاقی کمزوری۔

انسان کو ہر وقت اور ہر حالت میں ان ہر سہ عیوب سے بچنے کی خاص طور سے کوشش کرنی چاہیئے۔ کاہل اور سست آدمی کام سے جی چرانے کی وجہ سے وقت و موقع پر مناسب اور ضروری کارروائی کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ بلکہ خود بخود ایسی ترکیب نکالتا ہے جس سے اُس کے اصل مرض کاہلی پر پردہ پڑا رہے۔

مثال کے طور پر ایک کاہل طالب علم (مگر ایسے شخص کو طالب علم کہنا ٹھیک نہ ہوگا۔ متعلم کا خطاب زیادہ مناسب ہوگا) کو لیجئے کہ اُسے باغ و بہار کا ایک صفحہ اُردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کو دیا جائے تو بجائے اسکے کہ وہ اپنے دماغ سے کام لیکر محنت سے خود اُسکا ترجمہ کرکے دکھلائے وہ اُسکو انگریزی ترجمہ سے نقل کرکے دکھا دیتا ہے اور دفع الوقتی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ کیا یہ جھوٹ نہیں ہے؟ اُستاد کا تو درحقیقت اس تمام جھگڑے سے یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ ترجمہ سے مترجم کی قابلیت کا حال معلوم کرے مگر وہ کاہل آدمی بجائے اس کے کہ خود ترجمہ کرکے دکھائے کتاب سے نقل کر دیتا ہے اور معلم کو پتہ ہی نہیں چلنے دیتا کہ اُسکی قابلیت کتنی ہے۔ میرے نزدیک ہر ناپائدار اوپری اور سطحی کام حقیقت میں ایک قسم کا جھوٹ ہے جس سے اُسکے فاعل کو شرمندہ ہونا چاہیئے۔

عُجب اس قسم کے جھوٹ کا دوسرا محرک ہے۔ بعض اوقات اکثر لوگ جو عام طور سے جاہل اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں لوگوں کی نظروں میں اپنے آپ کو زیادہ قابل اور باوقعت ثابت کرنے کی غرض سے ایسے کاموں کے کرنے کی طرف جن سے اُنکی معلومات اور قابلیت زیادہ معلوم ہو متوجہ ہو بیٹھتے ہیں اور اسطرح موقع و بے موقع وہ اپنی تعریف کرنے کی بُری عادت میں پھنس جاتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بایں شان و شکوہ ظاہری لوگوں کی نظروں میں بجائے قدر و منزلت پیدا کرنے کے اور بھی زیادہ ذلیل اور حقیر ہو جاتے ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی جہالت کا اعتراف کرنے میں جو اُس کی آیندہ زندگی کے لئے نہایت فائدہ بخش ثابت ہوگا نہایت تعجیل سے کام لے ورنہ بحالت دیگر وہ زیب

جس کے ذریعہ سے وہ اپنی معلومات کا سکہ بٹھاتا اور لاعلمی کو دوسروں سے چھپاتا ہو رفتہ رفتہ اُس کی طبیعت ثانی بنجائیگا اور اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بھی اپنی اصلی حالت دریافت کرنے سے قاصر ہوجائیگا اور اسطرح وہ اپنی تمام عمر مغالطہ دہ نمائش میں جسکی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے بسر کرنے پر مجبور ہوگا۔

ان دونوں سے زیادہ سخت مرحلہ تیسرا ہے جسمیں انسان کو بڑی بڑی قوتوں کا سامنا ہوتا ہے اور وہ بزدلی یا اخلاقی کمزوری ہے۔ آجکل خود بینی سے انسان کو مجبوراً کنارہ کش ہونا پڑتا ہے کیونکہ اس زمانہ کی مہذب سوسائٹی میں یہ بات اچھی طرح رواج پا گئی ہے کہ اُسکے افراد میں سے جب کوئی شخص اس مرض میں مبتلا دیکھا جاتا ہے تو اُسپر چاروں طرف سے ملامت کی بوچھار شروع ہوجاتی ہے جسکے سبب سے وہ اس بدخصلت سے مجبوراً محفوظ رہتا ہے۔ مگر بزدلی یا اخلاقی کمزوری اس قسم کے حملوں سے بالکل مامون رہتی ہے۔ اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ جو شخص شروع میں اپنی رائے لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے سے جھجکتا ہے خواہ کیسی ہی کیوں نہو۔ اُسکا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بات پر سرے سے کوئی معقول رائے قائم ہی نہیں کرسکتا اور اسطرح وہ ایک ایسی قوت سے جو انسان کو حیوان سے امتیاز بخشنے والی ہے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجاتا ہے۔ اخلاقی جرأت فی الحقیقت منجملہ اُن چند قابل قدر اعلیٰ اوصاف کے ہے جو انسان میں خدا تعالیٰ نے ودیعت کئے ہیں مگر افسوس ہے کہ بہت کم اشخاص اسکا مصرف جانتے ہیں۔

سوسائٹی کی سب سے زیادہ واجب التعظیم روایات قوانین اور محبت بعض اوقات اخلاقی جرأت کے استعمال کے خلاف ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں سچائی کو ہاتھ سے نہ دینے کے لئے فراست اور قوت فیصلہ کے اجتماع کی ضرورت ہوتی ہے جو شاذ و نادر اشخاص ہی میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ سچائی دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جسکا اظہار مناسب نہیں ہوتا۔ اسلئے کہ دنیا میں کوئی شے سچ سے زیادہ تلخ

نہیں ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ اُسکا اظہار سوشل انٹرسٹس کے خلاف ہو ایسی
صورت میں خاموش ہی رہنا بہتر ہے۔ دوسری وہ جسکو ہر حال میں ظاہر کرنا چاہئے
خواہ کتنی ہی بڑی مخالفت کا خوف ہو اور اگر ایسے موقع پر انسان حق کے
اظہار سے رُکے تو وہ یقیناً بزدل اور ڈرپوک ہے ہم اپنے اس مضمون کو سقراط
کی ایک نصیحت نقل کر کے ختم کرتے ہیں:۔ سچ بولنے والے کی عزت کرو اگرچہ وہ
تمہارے عیب کہتا ہو اور دروغگو کو حقیر سمجھو اگرچہ وہ تمہارا ثنا خواں اور مداح ہو"

(پروفیسر لیلکی) "شروانی بلونوی"

انتخاب بیاض

جناب منشی سید انور علی صاحب انور متوسل بھوپال

منشی مظفر علیخاں اسیر امیٹھوی

نبض بیمار جو لے رشک مسیحا دیکھی	آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

میرزا نوشہ غالب دھلوی

باید زِ تو هر آئینہ پرہیز گفتہ اند	آری دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

جامی

جان تن فرسودہ را با غم هجران گذاشت	طاقت مهمان نداشت خانہ بمہمان گذاشت

ملا محمد طاہر غنی کشمیری

مرا بخانہ سفالے ز بینوائے نیست	خوشم کہ در کف من کاسہ گدائی نیست

زین العابدین میرزا

اسیر بند غم خانمان نئے دانم	مجاور قفس ام آشیاں نئے دانم

شیخ محمد فاخر زائر الہ آبادی

برمیاں برزده داماں ز کجا می آئی	مرحبا گو لبکار دل ما مے آئی

محمود بیسالمہ

نمی گردید کوتہ رشتۂ مطلب رها کردم	حکایت بود بے پایان بخاموشی ادا کردم

دارالسلطنت فرانس کی سیر

(نمبر ۵) تابع ماقبل

پیرس کے عجائب و غرائب

پیرس میں اسقدر رسٹاران اور قہوہ خانے ہیں کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔ دن کے وقت ان قہوہ خانوں میں اک سکوت کا عالم رہتا ہے اور لوگوں کی آمدرفت بالکل نہیں ہوتی لیکن جیوں ہی کہ شام آتی ہے ہر طرف اک ہل چل شروع ہوجاتی ہے اور لوگوں کی تعداد میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ ۸ بجے رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور قہوہ خانے لیڈیز کے طرح طرح کے لباسوں سے گل۔ کسطرح شگفتہ معلوم ہوتے ہیں یہ اک ایسا دلچسپی اور مسرت کا سین ہوتا ہے کہ کہیں اور دیکھنا محال ہے۔

گرانڈ بولوارڈ (Grand Boulvard) جو پیرس کا ایک چوک ہے وہاں اوپیرا (Opera) (ناچ گھر) کے دائیں اور بائیں یہ مقامات بکثرت نظر آتے ہیں انکی وسیع اور روشنی سے جگمگاتے ہوئے کمرے دیکھکر خواہ مخواہ راہ چلتوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ یہاں تھوڑی دیر آکر بیٹھیں۔ گرمی کے زمانے میں ان کمروں کے سامنے باہر پگڈنڈی کے پاس کرسیاں پڑی رہتی ہیں اور سنگ مرمر کی گول میزیں پڑی ہوتی ہیں جن کے گرد لوگ چار پینے کے لئے بیٹھتے ہیں تاش یا کوئی کھیل جو مرغوب خاطر ہو کھیلتے ہیں اور ساتھ ہی اک نازک اور اعلیٰ درجہ کے مغنیہ کا گانا سنتے جاتے ہیں۔

پیرس کے بعض رسٹاران عمدہ کھانوں کے اعتبار سے مشہور ہیں جہاں یورپ میں سب سے زیادہ اچھا اور نفیس پکا ہوا کھانا ملسکتا ہے لیکن اخراجات اسقدر زیادہ ہیں کہ جس کسی کی جیب اشرفیوں سے لبالب نہ ہو اُسے وہاں جانے کا خیال ہی نہ کرنا چاہیئے۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہاں بلاکر ایک مرتبہ دعوت دی

تھی اور جب ہم کھا چکے تو کھانے کے عوض میں تین پاؤنڈ نکالکر دیئے اُنہیں ان کثیر
اخراجات کا علم تھا اور کچھ بیوقوف بناکر ٹھگے نہیں گئے۔ مسٹر پانٹی فیکس اُنگلستان
کے اعلیٰ اور شریف ترین خاندانوں میں سے ہیں اور اون آزاد۔ خودغرضی کے
عیب سے پاک۔ راستباز اور ایماندار لوگوں میں اُنکا شمار ہے جیسے انگلستان
کے طبقہ وسطیٰ میں اکثر نظر آتے ہیں۔ ہم میں اکثر مختلف مضامین پر نہایت طویل
گفتگو رہتی تھی اور گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی جی سیر نہ ہوتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ
عیسائیت کے بالکل قائل نہ تھے اور دین عیسوی پر (اس زمانے کے اکثر روشن
خیال لوگوں کے مانند) انکا بالکل ایمان نہ تھا اور اسلام کی عظمت بہت انکے
دلمیں تھی۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا صرف اس شخص کے ساتھ رہنے کی وجہ تھی
جو میں پیرس کے اسقدر عجیب وغریب مقامات دیکھ سکا جہاں بہت کم اجنبی آدمی گذر پاتے
ہیں اور یہ گذر بھی اُسوقت نصیب ہوتا ہے جبکہ ہزاروں پاؤنڈ خرچ ہو چکتے ہیں
اور اون رہنماؤں اور رہبروں کی جیبیں جنہیں درحقیقت راہزن کہنا چاہئے خوب
بھر چکتی ہیں مسٹر پانٹی فیکس پیرس سے بخوبی واقف تھے اور گذشتہ دس سال سے
برابر ہر سال پیرس جاتے اور خوب اسکے تلّے کرتے تھے۔ مجھپر اُن کی بہت عنایت
تھی اور مجھے بھی ان کی ذات پر پورا اعتماد تھا کیونکہ جس خاتون نے مجھے انسے
انٹروڈیوس کیا تھا وہ میری بہت بڑی دوست اور انگلستان کے اعلیٰ درجہ کی
لوگوں میں سے تھی۔

میں بطور معترضہ کے طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہاں ہرطرح کی خاروخاشاک
پر میرا گذر ہوا اور مسٹر پانٹی فیکس کے ہمراہ میں نے وہ وہ عجائب وغرائب دیکھے
کہ ایک طالب علم کے دائرہ امکان سے باہر ہیں مگر ہر جگہ عقل سلیم کی مشعل میرے
ہاتھ میں اور خدا کے فضل وکرم کا سایہ میرے سر پر تھا۔ میں یہ فخر کے ساتھ کہہ سکتا
ہوں کہ کسی جگہ میری طبیعت متزلزل نہیں ہوئی اور میری مضبوط طبیعت نے
کہیں حسن عزم واستقلال کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان غیر معمولی مقامات

کو دیکھکر جو یورپ کے بہترین عیش و عشرت کے مقامات ہیں اب میرے دلمیں اس مقام کو تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی ہوس باقی نہیں نہیں رہی۔

میں یہاں نکے رسٹاران کا ذکر کر رہا تہا۔ جہاں خود مجھے ایک جگہہ ڈنر میں جانے کی نوبت آئی۔ ہمارا کہانا نہایت خوبصورت دوشیزہ لڑکیوں نے میز پر چنا۔ جنکے جسم پر صرف برائے نام نہایت نازک ریشم کی ہلکی ہلکی گاؤن تہی۔ یہاں نہایت فیشن ایبل لوگ آیا کرتے ہیں اور اخراجات بہی بے حد و کثیر ہیں۔ خود یہ جگہہ نہایت عالیشان اور بے انتہا نفیس سجی ہوئی ہے اور صرف مردوں کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں بیٹھکر مجھے ایسی شرم آئی کہ ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں گیا۔ لیکن شانزی لیزی (Champs Elysées) کے رسٹارانوں میں اکثر ہم جایا کرتے جہاں ایسی بے حیائی نہ تہی اور تہذیب نظر آتی تہی۔ جہاں چننار کی درختوں کے نیچے۔ روز روشن کی طرح منور راتوں میں اکثر شام کے وقت ہم لوگ گانا سُنا کرتے اور جب رات ہوتی تو قہوہ خانہ کافز (Café de Paris) میں جاکر کافز (جنہیں میٹھے پاپڑ سمجہنا چاہئے) کہاتے۔ چاء پیتے اور خوب غپ شپ اڑاتے تہے گرانڈ بولوار (Grand Boulevard) پر سب زیادہ فیشنبل قہوہ خانہ کافی ڈی پی (Café de Paix) ہے جسمیں اکثر غیر ملک والے جایا کرتے ہیں۔ دولت ظاہری یعنی تمول۔ حسن صورت و تزک و احتشام کے جو سین یہاں نظر آتے ہیں کہیں اور اسکی مثال ملنا ممکن نہیں۔ یہاں ایک چاء کی پیالی ایک شلنگ (۱۲؍) میں آتی ہے اور کرسیوں پر بیٹھکر ہر قسم کے کہیل تماشے اور دیگر تفریح کی اشیاء آدمی دیکھہ سکتا ہے اب ایک رقاص آتا ہے اور ناچکر اور کچھہ لیکر چلا جاتا ہے۔ کوئی نٹ آجاتا ہے جو اپنے کرتب وغیرہ دکھاکر اور کچھہ پیسے لیکر چلا جاتا ہے۔ کبھی کوئی خوبصورت نازک چھوٹی سی لڑکی پہول بیچتی آتی ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ بیچارا نووارد بہت سی خوبصورت ظاہرا نہایت نفیس لباس پہنے نازک نازک عورتوں میں محصور ہوجاتا ہے

یہ عورتیں پیرس میں بکثرت ہیں اور اپنے تئیں لٹل ویمن (Little women) کہتی ہیں
انہیں اجنبیوں کو پھانسنے کے طرح طرح کے داؤں آتے ہیں مثلاً وہ آپکے پاس
آئینگی اور نہایت تہذیب اور شائستگی سے جسمیں ادائے تصنع کوٹ کوٹ کر ملی ہوتی
ہے آپ سے باتیں کرینگی اور آپکے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ جائینگی اور ملازم سے
کہینگی کہ اس گلفروش لڑکی سے پھول خرید لاؤ۔ پھول لینگی اور آپ کے سامنے
پھینگی اور دو تین میٹھی میٹھی باتیں کرکے آپکو یکایک چھوڑکر چلی جائینگی اور پھول والی
کا یہ بل آپ کو ادا کرنا پڑے گا۔ بہت سے ایسے ہی واقعات دیکھنے میں آئے ہیں
جہاں ان عورتوں نے بالکل اجنبی آدمیوں کے ساتھ بیٹھکر پورا کھانا کھایا ہے اور
بات بھی نہیں کی اور چلتی نظر آئی ہیں اور دعوت کا پورا خرچ اُسی غریب نووارد
کے سر پر پڑا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہ باتیں پہلے ہی سے معلوم ہو چکی تھیں
اور ہم انکے مقابلے کے لئے پوری طور سے تیار تھے۔ ان کی اس دلربایانہ عشوہ
و ادا اور بناوٹ کی تہذیب و شائستگی کے جال سے بچنے کے لئے ہم گونگے اور
بہرے بن گئے اُنکی سب کچھ سُنی مگر نہ اُن سے کچھ بات کی اور نہ اوس طرف کچھ التفات
کیا۔ ایک اور قسم کا جال یہ عورتیں بچھاتی ہیں یعنی کسی عورت یا مرد کو دوستانہ طور
پر مدعو کرتی ہیں اور اس سے بڑی پرانی ملاقات ظاہر کرتی ہیں۔ یہ بیچارا ہی
اگر بھولا بھالا اور یہاں کے مکر و فریب سے ناواقف ہوا تو بہت جلد اُن کا دوست
اور ہمدرد بنجاتا ہے۔ اسیطرح سے اُسے لبھا کر اور اسی طرح دعوت کھاکر چلتی پھرتی
نظر آتی ہیں اور کل اخراجات کا بار اس بیچارے کو اُٹھانا پڑتا ہے۔ حسن اتفاق
سے میرے ساتھ بھی اسیطرح کا معاملہ پیش آیا اور بجائے اسکے کہ اوسکا مجھپر اثر
کرے میرا ہی وار چلے چل گیا۔ یعنی ہم دونوں (میں اور میرے دوست مسٹر پانٹی
فیلکس) ایک دن شانزدان دی پیری (Champs de Paris) میں ٹہل رہے تھے
کہ ایک عورت نے ایک مرد کے ہاتھ یہ پیام میرے پاس بھیجا کہ ایک خاتون جو
آپ کی پرانی دوست ہیں آپ کو وہاں بلا رہی ہیں۔ میں فوراً اسی چال کو سمجھ گیا

اور قصداً اپنے دوست کو ٹھیرا کر اسطرف چلا وہاں پہونچکر ہمنے ایک عورت کو
دیکھا جس سے مجھ سے کبھی کی ملاقات نہ تھی۔ اوسنے نہایت تواضع و تکریم کے
ساتھہ بالکل بے تکلفانہ جیسے پُرانے دوست ہوتے ہیں مجھے کھانا کھانیکے
لئے دعوت دی۔ وہ تو کھانا منگلانے میں مصروف رہی اور میں خاموش کسیقدر
بے اعتنائی کے ساتھہ کھڑا رہا اور جب میں نے خوب دیکھہ لیا کہ کھانا میز پر چن دیا
گیا ہے تو آہستہ سے کھسک آیا۔ اس تمام کھانیکا جس میں بیش قیمت شرابیں
بھی تھیں کل بار اُس عورت کو اپنے جی پر تھپر رکھہ کر برداشت کرنا پڑا ہم دونوں
اوسکی پریشانی دیکھہ دیکھکر خوب ہنستے رہے۔ اور جب وہاں سے روانہ ہوئی
تو بڑی دور تک وہ عورت ہمارے پیچھے پیچھے آئی اور مسٹر پانٹی فیکس سے
میری اس بے اعتنائی کی بہت شکایت کرتی رہی۔

یہاں اک اور قہوہ خانہ ہے جسکا نام کافی ڈی میکسم (Cafe de Maxim)
ہے۔ یہاں اکثر دولتمند لوگ آیا کرتے ہیں۔ یہاں کی لٹل ومین (Little women)
ذرا بہتر درجہ کی معلوم ہوتی ہیں اور زرق برق پرشوکت لباس میں جسمیں جھوٹے
جواہر ٹکے ہوتے ہیں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ اعلیٰ طبقہ کی عورتوں میں اور انمیں
تمیز کرنا محال ہے۔ یہ عورتیں اسقدر زیادہ چھچھوری نہیں ہوتیں اور نہ اتنا تنگ
کرتی ہیں جتنا کہ ہم اوپر کسی قہوہ خانے کے ذکر میں بیان کر آئے ہیں۔

ایک اور بہت بڑا قہوہ خانہ ہے جسکا نام کافی امیریکاں (Cafe American
قہوہ خانہ امریکنس) ہے۔ یہ ساڑھے گیارہ بجے رات کو کھلتا ہے۔ فیشن ایبل
لٹل ومینین (Little women) اور اونکے یار آشناؤں کا اڈا ہے۔ صبح
کے پانچ بجے تک یہ کھلا رہتا ہے۔ جو لوگ یہاں آتے ہیں اکثر اس قسم کے
ہوتے ہیں جو رات گئے اوپیرا (Opera) سے لوٹتے ہیں اور اس قہوہ خانے
میں آکر کھانا کھاتے ہیں۔ لٹل ومینوں (Little women) کا ایک غول کا غول
اُن کا منتظر رہتا ہے اور جب یہ لوگ داخل ہوتے ہیں تو ہنسی اور قہقہوں

کے ساتھ انکا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور پانچ یا چھ بجے صبح تک اسیطرح ہنسنا ناچنا۔کودنا۔ ہاتھا پائی کرنا اور طرح طرح کی لہو ولعب برابر جوش وخروش کے ساتھ جاری رہتے ہیں۔یہ سب چیزیں اپنے ہی بہت کچھ تہذیب کا پیرایہ لئے ہوتی ہیں اور اگر کوئی چاہے کہ اس سے زیادہ کھلم کھلا فحش دیکھے تو اُسے چاہیے کہ منمیٹر (montmartre) کی عشرت گاہوں میں سے کسی جگہہ جائے۔

پیرس کا یہ حصہ بالکل فیشن ایبل نہیں ہے۔یہاں بعض قہوہ خانے ایسے ہیں جو رات دن کھلے رہتے ہیں مگر نشاط وطرب کا اصلی وقت ۱۲ بجے رات سے شروع ہوتا ہے جبکہ فیشن ایبل لوگ عمدہ عمدہ لباس میں گاڑیوں سے کودتے اور اور کافی ڈڈ ریٹ (Cafe Dead Rat) میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس مقام پر اسوقت ایسے حیرت انگیز اور عجیب وغریب عیش ونشاط کے سین نظر آتے ہیں کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔بڑے بڑے مہذب وشائستہ لوگ ہزاروں ناچتے۔کودتے۔بوسہ بازی کرتے اور طرح طرح کی لہو ولعب کرتے نظر آتے ہیں۔یہاں سے قریب ایک اور جگہہ ہے جسکا نام کافی تباران (Cafe Tabarin) ہے جو رات بھر کھلی رہتی ہے اور تمام دن ایک ہلڑ سا رہتا ہے۔ایک دن ہمنے دیکھا کہ دو حبشی لڑکے عجیب طرح سے جسے دیکھکر بیساختہ ہنسی آتی تھی ناچ رہے ہیں اور لوگ قہقہوں کے مارے مکان سر پر اُٹھائے ہوئے ہیں۔ہر شخص مجھے یہاں ہنستا یا گپ شپ لڑاتا اور عیش ونشاط کی ترنگ میں جھومتا نظر آتا تھا۔رات تاریک اور غضبناک تھی مگر اس ہال میں خوش وخرم نوجوان لوگ اپنی محبوباؤں کو گلے سے لگائے ناچتے اور اُچھلتے کودتے دکھائی دیتے تھے۔اس جگہہ سے ملا ہوا ایک ناچ کا کمرہ ہے جو ۲ بجے بند ہوجاتا ہے اور جہاں ہر رات بہت دھوم دہام سے نہایت عمدہ ناچ ہوا کرتا ہے۔ناچنے کی جگہہ نہایت وسیع ہے اور ناچنے والے بھی بکثرت ہیں۔کمرے کے اندرونی چھتوں پر جہاں اسقدر آئینے آراستہ ہیں کہ بالکل آئینہ خانہ معلوم ہوتا ہے۔اور جہاں ناچ

دیکھنے والے بیٹھکر ناچ کا تماشا دیکھتے ہیں ایک عجیب و غریب منظر ہوتا ہے اسجگہ کثرت
مُشتبہ چال چلن کی عورتیں ہر طرف منڈلاتی پھرتی ہیں اور نو وارد اگر کسی سے بات
کرنا چاہے تو اُسے نہایت ہوشیاری سے کام لینا چاہئے کہ ان عورتوں میں سے
کسی کے جال میں نہ پھنس جائے۔

منمیٹر (Monmatre) میں ایک اور نہایت دلچسپ جگہ ہے جسے مولان روز
(Molan rouge) یا رڈمِل (Red mill) کہتے ہیں۔ یہ مقام بہت بدنام
ہے اور لٹل ویمن (Little women) اکثر اسے اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز
فرمایا کرتی ہیں۔ یہاں ایک نفیس نغمہ خانہ ہے اور پشت پر ایک باغ ہے جہاں
ہر طرف کرسیاں پڑی ہیں اور گوشوں پر نشست کی جگہیں بنی ہیں جہاں دو آدمی
بیٹھکر نہایت مزے سے باتیں کرسکتے ہیں۔ باغ نہایت پُر رونق ہے اور ہر طرف
چہل پہل نظر آتی ہے مگر ہمنے دیکھا کہ اکثر دوسرے درجہ کے لوگ جمع ہیں اس لئے
فوراً باہر نکل آئے۔ اسی کے قریب دو نہایت نفیس اور عجیب عمارتیں ہیں جنہیں
دیکھکر میں بہت متحیر ہوا۔ ایک کا نام "جنت" دوسرے کا "دوزخ" باہر دروازوں پر
عجیب عجیب حیرت انگیز تصویریں بنی ہوئی ہیں "دوزخ" کے دروازے پر نہایت
بڑی بڑی ہیبت ناک تصویریں تھیں اور "جنت" کے دروازے پر نازک خوبصورت
پریوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پہلے ہملوگ اس دوزخ میں داخل ہوئے۔
دروازے پر ایک آدمی سے ملاقات ہوئی جو نہایت ہیبت ناک لباس پہنے ہوئے
تھا یہ مالک دوزخ تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی زور سے اس نے یہ آواز دی "فرشتو" ان
دو گنہگاروں کو لو جو بہت دور سے آئے ہیں اور خوب مدارات کرو" ہم ایک ہیولے
سے تاریک کمرے میں جاکر بیٹھ گئے جہاں دیواروں پر بہت خوفناک صورتیں نظر
آتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر گوشے سے اژدہے زبانیں نکالے حملہ کناں ہیں
اس اثنا میں ہمارے لئے قہوہ آیا اور کچھ آدمی بھی جمع ہوگئے۔ یہاں سے ہم سب
اُٹھکر ایک دوسرے چھوٹے سے کمرے میں گئے جہاں ہم نے عجیب عجیب منظر دیکھے

ایک لیڈی نے خود اسٹیج پر جانا پسند کیا۔ وہاں جاکر وہ کچھ دیر تک ساکت کھڑی رہی
ہم نے دیکھا کہ شعلوں نے ہر چہار طرف سے اُسے گھیر لیا ہے۔ لباس میں آگ لگی۔
وہ جل گیا۔ اب جسم میں آگ لگی اور سب گوشت پوست جلکر ہڈیوں کا ڈہانچا ہی ڈہانچا
باقی رہگیا۔ اسطرح یہ بہت ناک سین تہا کہ دوسری طرف سے ہم نے دیکھا کہ وہ
لیڈی چلی آرہی ہے اور کسی قسم کے صدمے کا نشان اوسپر نہیں ہے ہاں جو کچھ
اُسنے دیکھا ہے اُس سے گھبرائی ہوئی متوحش ضرور معلوم ہوتی ہے۔

اسکے بعد ہم جنت میں گئے۔ یہاں ایک موٹے سے ظریف صورت آدمی نے
جو داروغہ جنت تہا ہمارا استقبال کیا اور نہایت ظریفانہ ہماری دلگی کے نام رکہکر فرشتوں
کو آمد کی اطلاع دی۔ اندر جاکر ہم ایک گول میز کے گرد بیٹھ گئے جہاں کچھ کہانے پینے
کی چیزیں رکہی تہیں۔ اب جنت کے عہدہ دار بڑے بڑے لمبی لمبی عبائیں میں عجیب
غریب ٹوپیاں اور پگڑیاں سر پر رکہے یکے بعد دیگرے آنے لگے۔ انہیں ایک خاص
آدمی کو دیکھکر مجھے بہت ہنسی آئی جسکی عجیب مضحک صورت تہی۔ چہرے پر ایک
بہت بڑی لمبی ڈاڑہی تہی اور ایسی مقدس صورت بنائی تہی کہ گویا کوئی بہت بڑا
بزرگ فرشتہ ہی۔ اس صورت کو دیکھکر مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہوسکی۔ کمرے کے اندر
ایک چبوترے پر یہ شخص کھڑا ہوا اور ہلوگوں کو مخاطب کرکے کچھ کہنا شروع کیا اور اپنے ماتحت
فرشتوں سے کچھ سوال بہی کرتا جاتا تہا۔ لوگ اس تقریر کو سُنکر بہت ہنستے تہے اور
اور میں بہی اس ہنسی میں اُنکا ساتھ دیتا تہا مگر افسوس ہے کہ سمجھتا کچھ نہ تہا۔

اسکے بعد ہمیں پشت کی جانب ایک کمرے میں لیگئے جہاں ہم میں سے ایک
شخص ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا۔ اور چاروں طرف سے پریوں نے گھیر کر اوسکی
منتیں کرنی شروع کیں۔ کبھی اوسکے پیر چومتیں کبھی اوسکے گرد پہرتیں۔ مگر حیرت انگیز
بات یہ تہی کہ یہ شخص خود انہیں دیکھ سکتا تہا اور ہم سب تماشائی کل تماشہ کو دیکھ رہے
تہے اور قہقہہ لگارہے تہے۔ ان پریوں کے بدنوں پر نہایت نازک اور ہلکے کپڑے
کا لباس تہا جو بالکل جسم سے چپکا ہوا تہا۔ اور یہ بالکل عریاں معلوم ہوتی تہیں۔

ہم سب اس تماشہ کو بہت دیر تک دیکھتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔ اسکے علاوہ یہاں ایک اور مقام تھا جسے "کافن" (یعنی تابوت) کہتے ہیں وہاں بھی جا کر دیکھا کہ ایک عجیب تماشہ ہو رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے آیندہ زندگی کی حالت کو نہایت مزخرف پیرایہ میں تصور کیا ہے اور جو منشا سمجھا ہے وہ اسقدر مضحکہ خیز اور حیرت انگیز ہے کہ میں کبھی ہنستا تھا اور کبھی حیرت کرتا تھا کہ کسقدر دھوکے میں یہ لوگ ہیں۔

میں بیان کر رہا تھا کہ منمیٹر (Monmatre) نہایت ہی چہل پہل کا مقام ہے بیشک یہ ایسے ہی کہیں زیادہ ہے اور خاصکر چودھویں جولائی کی رات سے برابر ایک ہفتہ تک جو حالت رہی وہ بیان سے باہر ہے۔ ہر رات میلا رہا کرتا تھا اور لوگوں کو لہو لعب سے سیری نہیں ہوتی تھی۔ بیشمار (Merry go round) میری گو راونڈر (Merry go round) سوئش بیک ریلوی (Switch back railway) اور شوٹنگ مشنین" (Shooting machine) تھیں جنکے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔

کافی ڈڈ ریٹ (Cafe dead rat) سے جب ہم گاڑی پر سوار اپنے ہوٹل کو واپس جارہے تھے تو راستہ پر بھی طرح طرح کے لوگ اپنے نئے نئے رنگوں میں نظر آتے تھے سڑک پر چند بھکرے نشہ سرور میں مست گاتے جارہے تھے۔ جب ہم اُنکے قریب سے گذرے تو ہمیں دیکھکر زور سے وہ چلائے "منمیٹر کے لوگو جیو! جیو! تمہاری عمر دراز ہو"۔ اسوقت میں نے ان کی نشاط و مسرت کا اندازہ کیا کہ کیسے ہنسی خوشی یہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسے بے فکرے ہیں کہ شاید کہیں اور اُنکی مثال ملنا محال ہے۔ وہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم بھی جواب میں یہی فقرے دُہرائیں۔ زبان سے تو نہیں مگر دلمیں ہمنے بھی یہی فقرے دُہرائے اور اُنکی مسرت ہمیں بھی مسرت معلوم ہونے لگی۔

پیرس کے اعلیٰ درجہ کی اور فیشن ایبل عشرت گاہیں شانزی لیزی (Champs Elysees) میں بکثرت ہیں۔ اس خوبصورت سڑک پر جیسا میں نے بیان کیا ہے ہر دو جانب چھتنارے درختوں کے نیچے نغمہ و سرود کے لئے بکثرت مقامات بنے ہیں۔ یوں تو

پیرس ان نغمہ وسرود کے مقامات کے لئے مشہور رہی ہے۔ مگر سب سے زیادہ عمدہ مقامات ژارڈان (jardin)، ڈی پیری (de paris) ماری سنے (marigny) اور امبسڈیو (Ambassadeurs) ہیں ہیں۔ اول الذکر دو مقامات اعلیٰ درجے کے ہیں۔ ژارڈان جو اکثر پیری تفریح کا مقام رہا کرتا تھا، ایک بہت بڑا باغ ہے جو ہر قسم کے سامان آرائش سے آراستہ ہے۔ سایہ دار درختوں کے نیچے ہر طرف کرسیاں پڑی ہیں اور وسط میں ایک نہایت خوبصورت بینڈ اسٹینڈ (Band stand) ہے اور اسکے پر ایک چھوٹا مکان نغمہ وسرود کے لئے مخصوص ہے۔ اسکے علاوہ اور بہت سی چیزیں مثلاً شوٹنگ گیلیری (shooting gallery) پنچ بال (Punch ball) فوٹوسیلون (photo saloon) ہیں اور زیر زمین بھی ناچ کے واسطے مقامات بنے ہیں جو کسیقدر فحش سمجھے جاتے ہیں۔ گانے کے لئے بہت سے اعلیٰ درجے کے گویئے ہیں اور کھانے پینے کے واسطے بھی اسجگہ بکثرت چیزیں مہیا ہیں۔ میں ایک میز کے قریب بیٹھکر کچھ میوے کھاتا جاتا، قہوہ پیا کرتا اور خاموش بیٹھا تماشا کرتا تھا چونکہ میں فرانسیسی زبان بخوبی جانتا نہ تھا اسلئے ان گانوں کا لطف بہت کم آتا۔ مگر بعد میں میرے دوست نے بیان کیا کہ شگفتہ زبان میں یہ نہایت ناپاک مضمون گائے جاتے ہیں اور ایسے فحش ہیں کہ انگلستان میں کوئی علانیہ گا نہیں سکتا۔

گیارہ بجے کے قریب گانا ختم ہوتا ہے اور پلیٹ فارم پر ناچ شروع ہوجاتا ہے اور لٹل مین (Little men) اپنی کیک واک (Cake walk) اور طرح طرح کے ناچوں سے لوگوں کو محظوظ کیا کرتی تھیں۔

ژاردان (Jardin) فی الواقع پیرس کیا بلکہ یورپ کے بے انتہا دلچسپ مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ مسٹر پانٹی فیکس تو بے طرح اسکے گرویدہ ہیں اور کہتے ہیں کہ دنیا میں کہیں انھوں نے ایسا فرحت افزا مقام نہیں دیکھا۔ اسمیں شک نہیں کہ پیرس کی دوسری عشرت گاہوں کی طرح یہاں بھی لٹل وِمن" (Little women) بکثرت نظر آتی ہیں۔

مگر یہاں اونکے حرکات وسکنات میں تہذیب کی بیڑیاں پڑی رہتی ہیں۔ ان عورتوں کی گروہ پیرس میں ہر جگہہ نظر آتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ کسب کرنا (Prostitution) فرانس میں کوئی گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ کوئی جگہہ تمہیں ایسی نہ ملیگی جہاں ایسے مناظر دکھائی نہ دیں۔ لندن کی حالت اس سے بھی بدتر ہے مگر دوسری طرح پر۔ یعنی "قانون میں کسب کرنے کی سخت ممانعت ہے اگر کوئی آدمی کسی کے ساتھ کہیں دیکھہ لیا جائے تو قانوناً اوسکا چالان ہوسکتا ہے مگر یہ ممانعت مخالفت کا اثر نہیں رکھتی اور محض برائے نام ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہزاروں قسم کی بیماریاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں۔ صحت خراب اور جسم تباہ ہوگئے ہیں بخلاف اسکے پیرس میں ہر لنٹل ومین کے پاس ایک اجازت نامہ ہوتا ہے اور جب تک کہ وہ ہفتہ وار اسپتال میں جاکر اپنا معائنہ نہ کرا لے وہ کبھی پیشہ نہیں کرسکتی۔ رنڈی آوارہ بازاروں میں پھرنے والی ہو یا کوئی صاحب مکانوں میں بیٹھنے والی یا کسی کی داشتہ ہو ہر اک کے لئے ضرور ہے کہ اک اجازت نامہ اپنے پاس رکھے اور ہفتہ وار عہدہ داران کو معائنہ کرائے۔ یہ عہدہ دار خاص طور پر نہایت احتیاط کے ساتھ معائنہ کرتے ہیں کہ کہیں کوئی بیمار نظر انداز نہ ہوجائے۔

ژاردان (Jardin) کے بعد ماریجنی (Marigny) کا درجہ ہے۔ یہ بھی نہایت فیشن ایبل مقام ہے اور تہذیب وشائستگی کے لحاظ سے میری خیال میں ژاردان (Jardin) پر ترجیح رکھتا ہے۔ یہاں دو تین تماشے دیکھنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انگریزناچ گانوں میں بالکل پیرس والوں کی نقل کرتے ہیں مگر یہی لطافت وخوبی میں اُن کے قریب تک نہیں پہونچ سکتے۔

اُن دو مقامات کے علاوہ پیرس میں بکثرت تھیٹر۔ تماشہ گاہیں اور عشرت گاہیں ہیں اور انمیں سے اکثر ایسی ہیں جو صرف موسم سرما میں کھلتی ہیں انہیں میں سے ایک تھیٹر سارا برنارڈ ہے (Theatre Sarah Bernhardt) جو اس زمانے کی عجیب وغریب موجودہ ایکٹرس دی ڈوائن سارا (the divine Sarah) کے نام سے موسوم ہے

لیکن ان سب سے زیادہ عالیشان مقام گرانڈ اوپیرا (Grand opera) ہے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دنیا میں سب سے بہتر اوپیرا ہے اور درحقیقت یہاں کے ساز و سامان کو دیکھکر یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اسکا بیرونی حصہ نہایت نفیس شاندار ہے۔ راگ کی دیبی کا ایک بت سامنے نصب ہے اور ساتھ ہی ملک کے مشہور و معروف مغنیوں کے بت نصب ہیں جو اپنی انداز و وضع میں نہایت اعلیٰ درجہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ اندر کا حصہ بہت وسیع اور عالیشان ہے۔ اُس کی عظیم الشان دیواریں مرصع چھتیں نشست گاہیں جنپر نہایت عمدہ پچی کا کام کیا ہوا ہے۔ اور دمکتا ہوا سنگ مرمر کا زینہ یہ سب چیزیں ایسی خوبصورت اور نفیس بنی ہوئی ہیں کہ دیکھنے والا عالم تحیر میں بخود ہو جاتا ہے۔ اسٹیج اسقدر وسیع ہے کہ تین سو ایکٹر ایک ساتھ کھڑے ہوسکتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا ایک ہال ہے جسے "گرانڈ فوای" کہتے (Grand Foyer) ہیں یہاں اثنائے وقفہ لغمہ میں لوگ آکر ٹہلتے ہیں۔ یہ ہال ایسا نفیس ہے کہ دنیا میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اسکی دیواروں اور چھتوں پر ایسا خوبصورت اور دلفریب کام کیا ہوا ہے کہ دوسری جگہ نظر نہیں ملسکتی۔ میں یہ سب کچھ دیکھکر ایسا متحیر کھڑا کا کھڑا رہ گیا کہ گویا کسی نے جادو کیا ہو۔ اُن لیڈیز اور جنٹلمینوں کے لباس بھی جو اسوقت اس ہال میں آکر ٹہلتے ہیں ایسے زرق برق نظر آتے ہیں کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی درحقیقت یہ سب کچھ ایسا دلفریب نظارہ تھا کہ میں عمر بھر کبھی نہیں بھولونگا۔

"لافوای" (Grand Foyer) درحقیقت ایسا عالیشان اور نفیس و خوبصورت ہال ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ جی چاہتا ہے کہ دہلی کے دیوان عام سے مقابلہ کروں مگر حُب الوطنی کہتی ہے کہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ اسمیں شک نہیں کہ دیوان عام کی نظیر اپنی طرح میں تمام عالم میں ملنا دشوار ہے لیکن "لافوای" موجودہ زمانہ کی فن لطیف کا بہترین نمونہ ہے اور اپنے رنگ میں بے مثال۔ "لافوای" کے علاوہ یہاں اور بھی بڑے بڑے ہال ہیں جہاں خور و نوش کی چیزیں بکثرت رکھی رہتی ہیں۔ ان سب عمارتوں نے ملکر "دی گرانڈ اوپیرا" کو اگ نہایت عالیشان عمارت بنا دیا ہے۔

ان تمام عشرتگاہوں کو دیکھکر معلوم ہوا کہ یہاں عوام بھی ایسی عشرت گاہوں سے متمتع ہو سکتے ہیں جو ایک زمانہ میں صرف بادشاہوں کیلئے مخصوص ہوتی تہیں۔ یہ سلطنت جمہوری کی نعمتیں ہیں۔ میں نے یہاں ایک نئی بات دیکھی یعنی فرانس میں اکثر "اوپیرا" اور تہیٹر سرکاری ہیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں وہاں کے کارپوریشن (جماعت منتظمہ ـ Corporation) کے سپرد انکا انتظام ہوتا ہے۔ فرانس میں اور نیز جرمن میں گانا قومی تعلیم کا جزو اعظم سمجھا جاتا ہے اور سرکار کا فرض ہے کہ اسکی نگرانی کرے گانے بجانے والے سرکاری نوکر سمجھے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے "گرانڈ اوپیرا" کے جتنے ایکٹر ہیں وہ سب سرکاری ملازم ہیں یہ ایک ایسی بات ہے جو مجھے بہت عجیب معلوم ہوئی۔ اسیطرح گورنمنٹ کا یہ فرض ہے کہ ملک کے پرانے علوم و فنوں کی بھی حفاظت کرے خواہ وہ کیسے ہی بے مقدار ہوں اور اون سے کچھ بھی نفع نہ ملتا ہو۔ گورنمنٹ نے پیرس میں مشجر کا کام بنانے کے کارخانے کو ابتک قائم رکھا ہے۔ یہ چیز گو کہ اب رواج میں نہیں ہے اور بازار میں اسے کوئی نہیں پوچھتا تاہم گورنمنٹ اس فن کو باقی رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور صاحب فن کو بہ در غیں کے طور پر تنخواہیں دیتی ہے۔ اسی طرح قدیم چینی کے کام کا کارخانہ بھی پیرس میں ابتک باقی ہے۔ ہائے! ایک ہمارا ہندوستان ہے اور ایک یہ یورپ۔ ہمارے ہاں کے فنوں ضائع ہوتے چلے جاتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ پرانے زمانہ کے کتنے صاحب کمال صاحب فن موجود ہونگے مگر کوئی اونکا نام بھی نہیں جانتا یہاں بخلاف اسکے حالت ایسی ہے کہ خود گورنمنٹ اپنے ملک کے فنوں کی نگرانی کرتی ہے پیرس میں تمباکو کا ایک کارخانہ ہے جو سرکاری ہے جسمیں بہت خرچ ہوتا ہے مگر اس سے آمدنی بھی معقول ہوتی ہے۔

میں گرانڈ اوپیرا (Grand opera) کے سلسلہ میں یہ بیان کرنا بھول گیا کہ اوپیرا کیا چیز ہے اور اُسکا کیا مقصد ہے اوپیرا میں اسٹیج کے اوپر کوئی تاریخی یا محض جذباتی ڈراما نغمہ و سرود کے ساتھ دکھایا جاتا ہے۔ اسکا مقصد تماشا کرنا کم ہوتا ہے اور ناچنا گانا زیادہ۔ ڈراما جسکے ساتھ یہ ناچ گانا ہوتا ہے محض لباس ہی لباس ہوتا

ہے اور صرف لوگوں کے جذبات پر زیادہ اثر پیدا کرنے اور نفس تماشہ کو اور زیادہ مرغوب بنانے کے لئے مقصود ہوتا ہے۔ یورپ میں اوپیرا میں گانا بہت بڑا فن سمجھا جاتا ہے اس فن کے بعض ماہر ایسے ہیں جنہیں ہزار ہزار پاؤنڈ ایک ایک رات کے ملتے ہیں۔ پیرس کے اس گرانڈ اوپیرا (Grand Opera) میں عالم موسیقی کے آفتاب ماہتاب جمع ہوتے ہیں اور ایکدوسرے سے گوئے سبقت لیجانے میں مقابلہ کرتے ہیں کیونکہ یہی جگہ ہے جو تمام دنیا میں موسیقی کا دار العلوم کہی جا سکتی ہے۔

میں اس سفر نامہ کے خاتمہ پر یہ اور بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مسافروں کو عام طور پر جو واقفیت معمولی صورت میں حاصل ہوتی ہے وہ اُن ترجمانوں اور رہبروں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو ہر جگہ گدہ کی طرح منڈلاتی پھرتے ہیں۔ گرینڈ بولوار پر (Grand Boulevard) یا ٹامس کک کے دفتر کے سامنے اکثر ان حضرات کی ہمدرد صورتیں نظر آئینگی۔ انگریزی قصوں میں ایک قصہ مشہور ہے کہ جوقت مگر بچے دیتا ہے توانہیں دیکھکر پہلے خوب روتا ہے پھر ایک ایک کرکے کھانا شروع کرتا ہے اسی طرح ہر بچہ پر روتا جاتا ہے اور کھاتا جاتا ہے۔ یہ حضرات بھی نووارد مسافروں کے ساتھ اسی طور کی ہمدردی ظاہر کرتے ہیں۔ لوٹتے لوٹتے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ اور ہمدردی کے الفاظ اخیر تک بند نہیں ہوتے۔ انکا سب سے پہلا کلام یہ ہوتا ہے کہ "سرکار میرے ساتھ تشریف لیچلیں۔ ایسی ایسی چیزیں دکھاؤں کہ کبھی نہ دیکھی ہوں" اور دس آدمیوں میں سے نو لامحالہ اُنکے شکار بنتے ہیں اور خوب لٹتے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ جہاں یہ پہنچاتے ہیں وہ نہایت ذلیل تھرڈ کلاس جگہ ہوتی ہے۔ شروع ہی سے ان لوگوں کے خیال سے میرے بدن پر لرزہ چڑھتا تھا اور حتی المقدور ان کے سایہ تک سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔

مگر یہاں کے عجائب وغرائب مجھے دیکھنا نصیب تھے جو مسٹر پانٹی فیکس (Mr. Pontifex) سے ایسے شریف دولتمند اور پیرس کے چپہ چپہ سے واقف کار شخص سے ملاقات ہو گئی۔ جہاں گیا میں اُنہیں کے ہمراہ گیا اور جو کچھ دیکھا اُنہیں کے ساتھ دیکھا۔ تمام چیزیں اب تک سیٹوگراف کی تصویروں کی طرح میری نظر کے سامنے پھر رہی ہیں اور معلوم ہوتا ہے

کہ ایک خواب تہا جو دیکہا تہا جسمیں دلچسپی بہی تہی اور نفرت بہی۔ لطف بہی تہا اور بے لطفی بہی۔
پیرس درحقیقت حیرت انگیز مقام ہے مگر عیاشی اور بدکاری کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر آپ پیپ شو (peep show) کو دیکہیں کہ کیا شے ہے تو متحیر رہ جائینگے اور کہینگے کہ اس فحش اور بے حیائی کی کہیں حد نہیں۔ پیپ شو میں ایک برہنہ عورت آتی ہے جسکے پیچہے ایک برہنہ مرد پکڑنے کو دوڑتا ہے مگر پکڑ نہیں سکتا۔ یہ مرد اکثر کوئی بیوقوف نووارد شخص ہوتا ہے جسے گانٹہہ کرلاتے ہیں۔ اسکے حرکات کو سب لوگ تماشے کے طور پر دیکہتے ہیں اور یہ بیچارہ اپنی رسوائی سے ناواقف بالکل ادہر نہیں دیکہہ سکتا۔ اسکے علاوہ اکثر مقام یہاں ہیں جہاں جہنڈ کے جہنڈ برہنہ عورتوں کے ناچ کے لئے سامنے آتے ہیں اور طرح طرح کی حرکات کرکے اپنے بے شرم تماشائیوں کو محظوظ کرتے ہیں۔ لنڈن میں بہی بیحیائی اور فحش اس سے کم نہیں مگر پیرس کی طرح بالاعلان کچہہ نہیں ہوتا۔ یہانکے لوگ شاید ایسی بیحیائی کے عادی ہوگئے ہیں جو لحاظ نہیں آتا۔
ایک مقام میں نے یہاں دیکہا جہاں ہمارے ملک معظم اپنے شباب کے زمانہ میں مدعو کئے جاتے تہے۔ ایسی خوبصورت سجی ہوئی جگہہ میری نظر سے کہیں نہیں گذری۔ اندر داخل ہونے کے لئے چہوٹے چہوٹے تاڑ کے درختوں کی دورویہ صفیں بنائی گئی ہیں۔ چہوٹے چہوٹے باغات آراستہ کئے ہیں۔ اندر کی عمارتیں مختلف ممالک کی وضع پر بنی ہیں جنمیں نہایت موٹے قالین انہیں ممالک کی وضع پر فرش ہے۔ میں یہ سجاوٹ دیکہکر محو حیرت رہگیا سنتا ہوں کہ دس لاکہ فرانک (francs) سے زیادہ اس عشرت خانہ کی تعمیر میں صرف ہوئے ہیں۔
افسوس ہے کہ یہانکے بڑے بڑے مکانات مثلاً درفیل (Versailles) اور لاؤنٹر (Louvre) وغیرہ کا حال مجہسے بالکل چہوٹ گیا انہیں دیکہا نہیں کہنا غلطی ہے۔ یہ تو خوبصورت اشیاء کی چہوٹی موٹی دنیائیں ہیں جنمیں صرف سرسری طور سے دیکہنے کے لئے گہنٹوں چاہئیں۔ انکا ذکر مجملاً بہی بیان کرنا اسوقت طوالت سے خالی نہیں اسلئے معزز ناظرین سے عفو کا خواستگار ہوں۔ آخر میں اپنے ہموطنوں سے یہ کہے بغیر

نہیں رہ سکتا کہ اگر استطاعت ہو تو ضرور ایک دفعہ یہاں کی سیر کریں اور دیکھیں کہ دنیا میں کیا کیا موجود ہے۔ مجھے تو برس کے ایک مرتبہ دیکھنے سے تسکین نہیں ہوئی اور اگر خدا یاوری فرمائے گا تو کئی مرتبہ مکرر سکرر دیکھونگا صرف اسلئے کہ یہاں جہاں عیب ہیں وہیں سیکڑوں خوبیاں اور صفتیں بھی ہیں اور بکثرت ایسی قابل دید چیزیں ہیں کہ دنیا میں انکی مثال نہیں ملسکتی۔ انسان کو چاہئے کہ ہر چیز کو دیکھے اور خذ ما صفا ودع ما کدر پر اپنا عمل رکھے۔ فقط "ہادی"

ساقی نامہ درمیان فصول سہ گانہ و ایام بہار مسمٰے بہ ابر آذر معروف بہ نیرنگ جنون

ای کلک سیاہ مست و طناز	ساقی نامہ کر ایک آغاز	کر وصف شراب ناب تحریر	مضمون ہوں لاجواب تحریر
الفاظ ہوں ثقیل اور سست	معنی نازک ہوں بندشیں چست	شوخی ہر شعر میں بھری ہو	مضمون ہم صورت پری ہو
ہر دائرہ ہو جو آفتابی	قرطاس کا رنگ ہو گلابی	منہ میں واعظ کے پانی بھرآئے	سننے والا بھی مست ہو جائے
زہاد جو میکدہ میں آئیں	پی پی کے شراب گنگنائیں	صوفی کی طرح سے حال لائیں	ہو حق کے بلند ہوں صدائیں
کیفیت میکدہ نہ لوٹی	قسمت زاہد کی کیسی پھوٹی	ای ساقی گلبدن گل اندام	دے بھر کے مئے سرور کا جام
دے بادۂ خوشگوار ساقی	صدقے قربان نثار ساقی	دے جلد شراب ناب ساقی	ہوتا ہے جگر کباب ساقی
دے بادہ کہ روح کو ہو طاقت	اللہ رکھے بہ تجھے سلامت	پوری ہو جو دل کی آرزو ہو	ساقی دنیا ہو اور تو ہو
اے پیر مغاں تیرا بھلا ہو	تو روئے زمین کا بادشاہ ہو	ہاں پردے حجاب کے اٹھا دے	شکل بنت العنب دکھا دے
اب لوٹ اسی پری پہ جی ہے	جو شیشہ محل سے جھانکتی ہے	پہلو میں بٹھا دوں اسکو لاکر	بیٹھا ہوں لگائے تاک جسپر
خود سو نگہ رہا ہے جسکی بو مشک	جسکا ہے لقب نثار مسک	ہے حسن کی جسکے چار سو دھوم	کہتے ہیں جسے رحیق مختوم
آرام کرو ساجو میں محل میں	ہر شب ہو وہی پری بغل میں	ہر گام پہ دل کا کام ہو نہیں	مستانہ روش پہ جان دو نہیں
غارتگر ہوش ہے سراپا	عشوہ غمزہ ادا کرشما	ہے فرق سے تا قدم جو مستی	شوخی چنچل بلی ترنگ مستی
آواز ملی ہے کیا رسیلی	آنکھیں پائیں ہیں کیا نشیلی	منہ جام شراب سے لگا دوں	بوسے لب دختر رز کو پلا دوں
بو آئے شراب کی دہن سے	مستی ٹپکے سبھی سخن سے	کچھ ہو جو کمی تو بزم کرم میں	دے بادۂ عیش جام جم میں

آئی فصل بہار ساقی
گھنگھور گھٹا کا دیکھ جوبن
کیا ہے گھرا سیاہ بادل
آنے پائیں یہاں نہ زہد
ہر مست پڑا ہے پائے خم پر
ہیں بس کہ شباب کے یہ دن ہیں
کہتا ہے کہ دے شراب انگور
کچھ حال نہ دل آسمانی

اب ضبط ہے ناگوار ساقی
کیا مست اٹھا ہے ابر بہمن
برسا تو برس گو آج جل تھل
قاضی مفتی عسس کوئی ہو
بیٹھی ہے یہ میکشوں کا لشکر
ستوں پہ چڑھا ہی ساقیا جن
ہاں اور پلا دے مجھکو جو کچھ
لکھ پی کے شراب ارغوانی

اب طبع بہت ہے کند ساقی
کہتا ہے گرج کے رعد ہر پل
گرنے کو کہیں لپک رہی ہے
قفل در میکدہ کھلا ہے
اللہ رے میکشوں کی محفل
یہ رند یہاں تو وہ کہیں ہے
بس پی ہے بہت لگا نہ یک یک

دے بادہ تیز و تند ساقی
ہاں بادہ کشو اٹھا لو بوتل
بجلی کیسی چمک رہی ہے
اک بھیڑ ہے بند راستا ہے
سب لوٹ رہی ہیں شل شل
ہوش ایک کا ایک کو نہیں ہے
وصف فاد میکدہ کہاں تک

صفت سرما

جاڑے سے جو پڑ گیا ہے پالا
کہتے ہیں خضر بھی ایسی سردی
یہ بات نہیں ہے کچھ نئی بات
سردی کے سبب یہ سکوں ہے
گرمی جو ہوئی پڑا آگ کی کم
سردی نے بڑھا دی قدر ایسی
سردی کا جو شور چار سو ہے
مضمون سردی کا جم گیا ہے
ہوتی ہیں بشر خلق توام
ہوتا ہے سحر کو شکل دریا
سب روئی کے آگے طلبگار
باہر نہ دہن سے کچھ صدا آئے

افسردہ بہت ہے کہنے والا
اس سن میں کبھی نہ ہم نے دیکھی
منہ ہی نکلی کہ جم گئی بات
جنبش کرتی نہیں کوئی نبض
کافر کو بہشت ہے جہنم
ہے لعل جسے ہوں آگ بکتی
رنگ کشمیر لکھنؤ ہے
قلمی شورہ قلم بنا ہے
سردی کے سبب گئے ہیں جم جم
منہ جانب آفتاب سب کا
دونوں کا سجا ہے گرم بازار
منہ کھول کے آپ سو رہ جائے

بے شبہ کسی نے سچ کہا ہے
سکتے اسکے پڑے ہوئے ہیں
اسطرح ہیں دانت کڑکڑاتے
سردی کے سبب ٹھٹھر گیا ہے
سب سورت آب برف ٹھنڈا
کیا اوج پہ ہے وقار آتش
کیا لکھے کوئی دبیر ونشار
سردی کا جو ڈر سما گیا ہے
جس میں بشر یہ شکل تصویر
کیوں زخ نہ روئی کا گراں ہو
گر صور بھی ہونکدیں سرافیل

جاڑا یا لا بری بلا ہے
ہنڈیا کے گڑے ہوئے ہیں
بادل جیسے ہیں گڑگڑاتے
دوزخ ٹھنڈا پڑا ہوا ہے
ہر کس دوشالہ رہتا
آغوش میں ہے نگار آتش
شکل مفلوج ہاتھ بیکار
شعلہ کا بدن بھی کانپتا ہے
جسکو دیکھو وہ ہے زمیں گیر
جس جنس کا مشتری جہاں ہو
سردی یہ اثر کرے یہ تعجیل

صفت گرما

امسال پڑی غضب کی گرمی
پانی دریا کا ابل رہا ہے
ہر چشم جیسے آبلوں سے ابلتا

گویا ہے مجسم اب کی گرمی
سرطان ہاتھوں اچھلتا ہے
عالم اللہ کا ہے جلتا

کیا خاک چلینگے چلنے والے
آتش ہی کنارہ کشتی سمندر
گرمی میں بجستجو ہے دریا

ہیں پانی خیال میں بہا جاتے
ہر وقت ہے ڈھونڈھتا سمندر
خود ریگ رواں ہو سوئے دریا

کا موٹوں پہ بیر خود کباب سا ہی
مجبل ہی برنگ دیگ لہری

یہ آگ تو کس شمار میں ہے
خود حشر عذاب نار میں ہے

آتر باد سحر میں وصف لو کا
ایسی گرمی کے منہ کو لو کا

گرمی کا تعب جو سہ رہا ہے
اف اف دوزخ بھی کہہ رہا ہی

انگارہ بنا ہر اک ثمر ہے
جو نخل ہے آگ کا شجر ہے

ہے طوق گلو جو قمریوں کا
وہ گرم حدید سے زیادہ

ہر مرغ جو اس یا خستہ ہے
ڈالی پہ کباب فاختہ ہے

سر مرغ نظر بھی ڈھن رہا ہے
ہر سیخ مژہ پہ بھن رہا ہی

لک اک سرتے ہیں منہ کو کھولے
قلق کرتے ہیں منہ کو کھولے

سردی ایسی ہوئی ہے نایاب
کافور ہے ہم مزاج فلفل

گرمی جھیل کو یہ لگی ہے
چادر پانی کا پھینک دی ہے

جنگل میں برستی ہے غضب آگ
الکھو شیشم چنار سب آگ

جلنے کا جو خوف ہے سراپا
سایہ ہر چیز کا ہی عنقا

شاعر کے سخن میں شان آتش
گویا ہے زبان زبان آتش

ہر غرفہ عرض ہر ایک انداز
ہر ایک مکاں ہے درشک حمام

پلٹن کے ہوں لوگ یا رسالے
گورے ہی لندن کے سب ہیں کالے

گرمی کے سبب ہے چشم گرداب
ہے چاہ ذقن کی شکل پر آب

گرمی کے جو صدمہ تعب ہیں
جھیلیں تالاب خشک سب ہیں

گرمی کا تعب نہیں گوارا
اُرتا ہے برنگ برق پارا

صفت ایام برشکال و بیان وحشت زدگان آشفتہ حال

برسات کی فصل کیا پری ہے
جو چیز ہے وہ ہری ہری ہے

اک ملل علی عجب مزا ہے
سبزہ کو سون لہک رہا ہے

کرتی ہے جہاں فلک نظر کام
آتی ہے نظر زمیں خضر فام

بادل گردوں پہ چھا رہے ہیں
ستانہ روش سے آرہے ہیں

بجلی کی چمک جو متصل ہے
عشاق کا بیقرار دل ہے

چلتی ہیں ہوا کے ٹھنڈی جھونکی
اٹھتے ہیں مہاتم بادلوں کے

اس فصل میں ہے یہ فصل جنوں
ہر وقت فلک پہ ابر موجود

طوفان کا جہان میں ہے ساماں
بارش ہے کہ میری چشم گریاں

آتے ہیں نظر بری کچھ آثار
پانی پڑتا ہے موسلا دھار

لیتا نہیں ابر کھلنے کا نام
ہیں بند پڑی جہاں کی سب کام

عالم کو ہے جستجوئے خورشید
ہے ابر نقاب روئے خورشید

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جوبن اپنا دکھا رہی ہیں

ہوتا نہیں ایک دم اُجالا
ہے شب کی طرح سے دن بھی کالا

ساون بھادوں کی ہے اندھیری
کالی شب ہجر جیسے میری

دریا کیسے بڑھے ہوئے ہیں
ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں

ڈبرے لبریز بے سخن ہیں
جھیلیں تالاب موجزن ہیں

بجلی کی چمک سے دل ہے مضطر
ہر خوف صدائے رعد سنکر

پڑھتا ہے جہاں یسبح الرعد
ہے ورد زباں یسبح الرعد

ہے خشک زمیں جہاں نہ تالاب
عالم ہے تمام عالم آب

ہر سمت ادھر اُدھر ہے پانی
سڑکوں پہ کمر کمر ہے پانی

جب سے ہے شروع فیل بارا
ہیں اہل جہاں بہت ہراساں

کیا حسن شفق پہ دل ہے بسمل
ہے شام اودہ کا لطف حاصل

آتا ہے نظر دھنک میں ہر دم
ابروئے بت حسین کا خم

تاریکی ابر چار سو ہے
کجلی بن ہے کہ لکھنو ہے

پھرتی ہے چمن کی ہر روش پر | معشوق بہار بن سنور کر | جب ابر سیاہ گھر کے آیا | موروں نے ستم کا غل مچایا
اودی اودی گھٹا نے کر دی | مستی بھیگی بتوں کے لب کے | پھولوں کا بہار پر وہ جوبن | نرگس کے وہ ٹکٹکی کے چتون
انداز نسیم کے نرالے | مستانہ وہ بلبلوں کے نالے | میخوار ادھر ادھر پڑے ہیں | انگور کی تاک میں کھڑے ہیں
جو دیکھتا ہے چمن کی نزہت | آتی ہے نظر خدا کی قدرت | اب حال جنوں جو لکھ رہا ہے | دیوانہ مرا قلم بنا ہے
ساقی مے لالہ گوں پلا دے | دیوانہ مزاجوں کو جلا دے | بہکا بہکا ترا بیاں ہے | وحشت تری شکل سے عیاں ہے
جو بات تری ہے وہ نئی ہے | کیا کچے گھڑے کی چڑھ گئی ہے | دیتا نہیں جام عنبریں بو | دیوانہ ہوا ہے ساقیا تو
رندوں کا قدم یہاں جو آیا | انگور کا شوق کھینچ لایا | پوچھا ہے بہار کا جو مژدا | کچھ اور ہی رنگ ہے چمن کا
ہے اوج پہ کیا چمن کا اقبال | دیوانی ہے خود بہار امسال | مستوں کی روش پہ آتی جاتی | پھرتی ہے نسیم لڑکھڑاتی
پھولوں کی طرف نظر نہیں ہے | خود اپنی اسے خبر نہیں ہے | گلشن سے جو لائی ہیں ہوائیں | غنچوں کے چٹکنے کی صدائیں
گونجی ہیں فضائے آسماں میں | ہیں پنبہ بگوش سب جہاں میں | یوں نکہت گل ہے مست پھرتی | جس طرح چلے کوئی شرابی
صد برگ کی ہے قبا بسنتی | دامان نظر جسد البسنتی | لالے کی قبا وہ ارغوانی | چنپا کا لباس زعفرانی
سوسن کی وہ سوسنی قبا تنگ | ہر گل کے لباس کا جدا رنگ | نسرین کہیں یاسمن کہیں ہے | شبو کہیں نسترن کہیں ہے
کیا لکھے قلم گلاب کا حال | ہر وصف گلاب میں زباں لال | دیکھا جو کرے بشر اک دم | داؤدی دیکھنے کا عالم
جوہی ہے چنبیلی موگرا ہے | بیلا کیوڑہ مہک رہا ہے | سنبل کے وہ پیچ اور وہ خم | معشوق کی جیسے زلف برہم
جو زرد گلوں کو دیکھ پائے | سرسوں آنکھوں میں پھول جائے | آنکھیں کھنچی ہے زیر افلاک | سبزے کے بدن کی دھانی پوشاک
خوشے انگور کے وہ رنگین | جس طرح فلک پہ عقد پرویں | نرگس کو اشارہ ہو وہ کلو نسے | وہ ناز گلوں کے بلبلوں سے
گلچیں کا چمن میں ہے نشیمن | پھولوں سے ہرا بھرا ہے دامن | ہم کیا ہیں جو اندلوں سوں کی | سنتا نہیں باغباں صدا کی
نواری جو چھوٹتے ہیں دن رات | بے فصل کی ہو رہی ہے برسات | دیتی ہیں بہار روئے گل پر | بوندیں شبنم کی مثل گوہر
وہ تیز رواں ہیں آبشاریں | تیغوں کی ہیں کند جن سے دھاریں | لیتی ہیں دل و جگر میں چٹکی | دلکش وہ صدائیں قمریوں کی
موروں کا وہ رقص آفت جاں | بسمل جسے دیکھ کر ہو انساں | ہر سمت کو بادہ کش قدح نوش | بھٹی پہ پڑے ہوئے ہیں بیہوش
دنیا سے ظروف ہیں نرالے | کنٹر شیشے سبو پیالے | خم جام بھری ہیں ساقیوں نے | میخانے سجے ہیں ساقیوں نے
شیشے ہیں تمام بام و در پر | مینا کا ہے کام بام و در پر | اللہ ری میکدوں کا عالم | آئینے لگے ہیں قد آدم
طاقوں پہ چنے ہوئے برابر | ہر رنگ کے لاجواب کنٹر | ہر سمت سے رند آ رہے ہیں | زاہد کی نظر جلا رہے ہیں

کچھ مست بھری جو ہیں اندر — کیہ رند نکالتا لگا ہو بے
اس بھیڑ میں کون کسکو پائے — سو نکلے تو دس ہزار آئے

میخوار ہمسروں کو دین زیبا ہے — ہر حق کی صدائیں سن رہے ہیں
بیلیں انگور کی ہیں پھیلی — پیچیدہ بشکل زلف لیلی

سایہ انگور کا وہ ٹھنڈا — میخواروں کے جگھٹے اسی جا
کہنا متوالوں کا برابر — ساقی دینا ہمیں تپا کر

جنگل کا عروج پر ہے اقبال — دیوانوں کی بن پڑی ہے امسال
صحرا کی فضا غضب دلاویز — موسم یہ بلا کا ہے جنوں خیز

اشجار کا رقص میں وہ آنا — پتوں کا ہوا سے لہر لہرانا
اُڑ اُڑ کے بگولوں کا وہ گرنا — دیوانوں کی جستجو میں پھرنا

خودرو پھولوں سے دشت گلشن — وہ بوقلموں گلوں کا جوبن
ہر نخل کی پر ثمر وہ ڈالی — اشجار کی رنگتیں نرالی

اُٹھتے ہیں جو گرد باد ہاموں — کرتے ہیں طواف قبر مجنوں
کہتا ہے یہ اُٹھ کے ہر بگولا — بور آم میں آیا ڈھاک پھولا

بازیچہ آہو شکاری چیتے — صحرا مملو ہے وحشیوں سے
ساقی وہ ہوا چلی جنوں خیز — دے مجکو شراب وحشت انگیز

ہاں اپنا کرم مجھے دکھا تو — حاضر ہے یہ جام چشم آہو
اب رخصت ہوش کر یہ دن ہیں — دیوانوں کے جوش کے یہ دن ہیں

ابتر ہے بمدت قید خانہ — دیوانے ہیں دشت کو روانہ
دیوانوں کی شکل دیدنی ہے — جنگل جنگل کی رٹ لگی ہے

دن حشر ہیں تو بہار راتیں — مجذوب کی بڑ ہیں انکی باتیں
ٹکڑے ٹکڑے ہیں جیب و داماں — پرزے پرزے ہیں سب گریباں

ثابت نہیں جسم پر قبائیں — دیتے ہیں جنوں کو سب دعائیں
ہے زیب گلو جو طوق آہن — تسلیم کو جھک رہی ہے گردن

کی سب نے جو ہتکڑی سے بیعت — ہے سامنے دست بستہ وحشت
زنجیر یہ غل مچا رہی ہے — چلئے جنت بلا رہی ہے

ہے ساز صدائے نعرۂ ہو — سب مست ہیں بادۂ جنوں سو
ہیں سرخ وہ گال گورے گورے — آنکھوں میں ہیں لال لال ڈورے

پی ہے جو شراب جام وحشت — آہو ہیں اسیر دام وحشت
نشے سے چڑھی ہوئی ہیں آنکھیں — آہو سی بڑی ہوئی ہیں آنکھیں

کیا اوج پہ ہے دماغ سودا — سر پر ہے کلاہ داغ سودا
کچھ نام کا ننگ کا نہیں ہوش — سب کا ہے چراغ عقل خاموش

سب پھرتے ہیں بن میں بنکے ہر سو — ہاتھوں میں عصائے شاخ آہو
بے عیب لباس ہے بدن میں — عریاں بدنی کا رخت تن میں

بستر بھی زمانے سے نرالا — ایک ایک کے پاس برگ چھالا
ہے نام سے آدمی کے نفرت — ہر وقت ہے وحشیوں سے صحبت

مٹی کی تمام تن میں پوشاک — بالوں پہ ہزار من پڑی خاک
آنکھوں میں لگی ہے سرمہ آسا — گرد رم آہوان صحرا

جنگل آباد انکے دم سے — آزاد ہیں شادی و الم سے
پائیں مزار کوئی بیٹھا — مجنوں کی لحد کسی کا تکیا

زنجیروں کی ہر طرف کو جھنکار — ہے شور فتور کا نمودار
آفت دیوانے ڈھا رہے ہیں — ہر سمت سے غول آرہے ہیں

آگے آگے وہ خستہ احوال — پیچھے پیچھے ہجوم اطفال
دیوانوں کو سب ستا رہے ہیں — پتھر لڑکے لگا رہے ہیں

ہے جوش پہ یکہ جنون سودا — فصد اپنی لیتے ہیں خار صحرا
پھرتے ہیں جدھر بھی ہیں وہ پیدل — ہمراہ ہے آبلوں کی چھاگل

دیوانوں میں شاخ کیا لگی ہے	دیوانہ ہے کون آدمی ہے	اپنوں کی نہ غیر کی محبت	سب کچھ ہے یہ عشق کی بدولت
جسپر ہوئی اسکی مہربانی	کی اوسکی اجل نے میہمانی	کیا جانئے عشق کیا بلا ہے	اس نوش میں نیش کا مزا ہے
کی جسنے کہ اس سے آشنائی	یہ جان لو اوسکی موت آئی	عاشق جو ہوا بشر کسیکا	دیکھا اُسکو ذلیل و رسوا
گر تجھکو خدا نے عقل بھی دی	غافل عقبیٰ سنوار اپنی	تا چند یہ عشق و صحبت عیش	سن مرد خدا نصیحت عیش

تمت

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ عطیہ حضرت ثاقب

چلا تھا کوئی جاناں کو جنونِ عشق رہبر تھا
فدای رونقِ آشفتہ دستاری سراسر تھا

بہارِ دلکشا کرتی تھی کیا کیا گلشن آرائی
تصور میں مرے دن رات خطِ سبز دلبر تھا

ہمارے صبر سے پیدا تھا اک عنوانِ بیتابی
کبھی سر کی بھی لیتا تھا خبر جو ہاتھ دل پر تھا

ہمیں بیتاب رکھتی تھی ہوای آستاں بوسی
ہماری وحشتِ خاطر کا مقصد کوئے دلبر تھا

تری مستانہ رفتاری سے ظاہر موج دریا تھی
تری ہنگامہ آرائی سے پیدا شورِ محشر تھا

نہیں آئینِ استغنا حریفِ عجزِ مشتاقی
دلِ آئینہ محوِ بیقراری تھا سے جوہر تھا

ستم اغیار کا سہنا مجھے چنداں نہ تھا مشکل
اُٹھایا جس نے محفل سے مجھے وہ تیرا تیور تھا

شہیدِ انتظارِ جلوۂ دیدارِ ساقی کو
حریفِ چشمِ واگر دیدۂ مشتاق ساغر تھا

مصیبت بیکسی‌ہای شبِ ہجراں کی کیا کہئے
ہمارے حال پر رونے کو بس اک دیدۂ تر تھا

تصور اُس مہِ کامل کا تھا کتنا نشاط افزا
مرے سینے کے خمخانے میں اک لبریز ساغر تھا

مزے پائے ہیں کیا کیا رات میں نے خواب راحت کے
مرے آغوش میں ای دوست گویا تیرا خنجر تھا

ابد تک دل رہا وحشت خراب بادۂ الفت
ازل سے میں گرفتار شفیع روز محشر تھا

غزل جناب منشی سید خبیر حسین صاحب نسیم بھرت پوری

گھر مرے جبکہ وہ مہمان چلے آتے ہیں
دل میں رہ رہ کے ہو کئی ارمان چلے آتے ہیں

دیکھکر آئے ہیں کیا عارض و گیسو اُن کے
لوگ حیران پریشان چلے آتے ہیں

اُنکے آتے ہی نکل جاتے ہیں دل سے فوراً
اُن کے جاتے ہی پھر ارمان چلے آتے ہیں

مڑکے دیکھو تو سہی اپنے خریداروں کو
تم یہ ہوتے ہوئے قربان چلے آتے ہیں

چار انگل کا وہ پرچہ نہیں سے لکھتے مجھکو
پاس اغیار کے فرمان چلے آتے ہیں

بزم اغیار میں کس شخص نے گستاخی کی
کہ وہ خاموش پشیمان چلے آتے ہیں

کیا بتائیں کہ نسیم آتے ہیں کیوں آپکے گھر
مفت ہونیکو پشیمان چلے آتے ہیں

غزلیات جناب مولانا شاد خان بہادر

نالۂ فرقت میں بے ہراس کیا
کچھ فلک کا نہ دل نے پاس کیا

دست وحشت کا ہو بھلا یارب
پرزے پرزے مرا لباس کیا

زلیست کو اپنی موت سمجھے ہم
موت پر زلیست کا قیاس کیا

عقل سے بڑھ گیا جنون اپنا
ہوش نے اور بے حواس کیا

لقد الفت ہے اب نہ درہم داغ
سب کچھ اے شاد تو نے ناس کیا

(دل)

مقدر کس شے میں ہے جب خاک رہی میں بھی آفت ہے
ہنسے برق غضب پر کیوں نہ خوشہ میری خرمن کا

بڑا سے نازو ونسی ناحق دلکو پالا میں نے سینے میں
نہ پیر وشیخ کا نکلا نہ یہ کافر برہمن کا

نوہے جسم ظاہر کو یہاں۔ واں جسم باطن کو
اگر سمجھو تو پیری میں بھی ہے عالم لڑکپن کا

نکالے بیٹھ کر کانٹے نہ اپنے پائے زخمی کے
کبھی بھولے سے دل توڑا نہ ہم نے اپنے دشمن کا

خزاں کے ہاتھ سے آسودگی دلکو نہیں ہوتی
ہمیشہ لالہ گوں رہتا ہے گوشہ اپنے دامن کا

تیرے در سے ہمیں دیر وحرم میں کھینچتے کیوں ہیں
نہ لوٹا شیخ کو ہم نے نہ گھر چھینا برہمن کا

کبھو بلبل سی جاتی ہے بہار اب تو سنبل بیٹھے
قریب آیا زمانہ نالہ وفریاد کشیوں کا

اسیر عشق بن کر بولنا قمری کا ناحق ہے
مزا جب تھا کہ جب گردن میں ہوتا طوق آہن کا

نظر بازی کا پیر آسماں کی حزن رہتا ہے
لئے رہتا ہوں ساغر پر ہمیشہ سایہ دامن کا

غزل حسرت موہانی

ہم جو ملتے ہیں ترک الفت کے
یہ نئے ڈھنگ ہیں شرارت کے

گریۂ بیقرار محروم ہی
ہم تو قائل ہیں تیری قدرت کے

یاد شوق گزشتہ کافی ہے
اب نہیں حوصلے محبت کے

گو رہے لطف یار تھے جب ہم
وہ بھی ایام تھے قیامت کے

ظلم کہکے مری وفا سے کیوں
ہو رہے ہیں گلے شکایت کے

جان ناکامی محبت ہے
مرتبے یہ اشک حسرت کے

شیخ محمد عبد الرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک نمبر ۱۵

چار روپیہ میں ناوی گھڑی اور پینتیس چیزیں مفت

نادر موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ انگلش ناوی فیشن کی بہترین گھڑی کی قیمت میں درست سوداگر جات گراں رکھتے تھے لیکن جب ہم نے دنیا درست حالات خود دیکھا پایا اور یہ قیمت ہم نے کم دی ہے اور سوداگر حضرات جو کرتے تھے مگر ہم نے اب اس گھڑی کے ہمراہ پینتیس چیزیں مفت دینا شروع کر دیں یہ گھڑی ۴۴ گھنٹے کی کوک کی افضل ڈائل مع سکنڈ اور ڈاک خانہ ریلوی آفس اور ہر گھر کے لئے موزوں ہے۔

گھڑی اسکو پیاسہ ڈائل کی بازار [illegible]	بیسٹ واچ چاندی کی کلائی میں [illegible]
چاندی کی انگشتری کمپ گنگی [illegible]	جوڑی کی گھڑی سنہری چاندی [illegible]
سنہری ڈبل کیس منقش کارنی سال [illegible]	کلاک روز جاگی [illegible]

کانپور کے ہر قسم کے بوٹ جوتے

چیدان رہڑدار روارنش [illegible]		بوٹ جوتے زیر لیدر روارنش	
فی جوڑہ	[illegible]	ولایتی	[illegible]
ایضاً کرشین لیدر	[illegible]	ایضاً بوٹ نہایت پائیدار	[illegible]
ایضاً کانپوری چمڑہ	[illegible]	گرگابی وارنش مردانہ و زنانہ	[illegible]
ڈربی نہایت خوشنما رنگ	[illegible]	سلیپر اونی بیل دار جوڑہ	[illegible]
پمپ ولایتی وارنش	[illegible]	گھنس پی دار چرمی فی جوڑہ	[illegible]
کرک تھ لنڈن [illegible]	[illegible]	ایضاً اصلی وارنش ولایتی	[illegible]

کانپور کے ہر قسم کے زین

زین پاٹس مع تمام سامان	[illegible]	ولایتی زین مع جملہ سامان	[illegible]
زین چابل ...	[illegible]	لوہے کی کاٹھی کا زین سوار کے	
زین نپولو	[illegible]	لئے مع جملہ سامان	[illegible]
زین گھوڑ دوڑ	[illegible]	لکڑی کی کاٹھی کا زین مع سامان	[illegible]
زین چکر ... کے لئے	[illegible]	کرسی دار زین عورتوں کے لئے	[illegible]

کانپور کے ہر قسم کے ساز

ساز فٹن چمڑا کانپوری پرزہ بگی		ساز تانگہ چمڑا کانپوری پرزہ
نہایت عمدہ قیمت	[illegible]	برنجی نہایت عمدہ خوبصورت [illegible]
ساز فٹن وارنش پرزہ نقرئی	[illegible]	ساز ٹمٹم چمڑا کانپوری پرزہ
ساز جوڑی کی چمڑہ کانپوری پرزہ		برنجی ... [illegible]
برنجی	[illegible]	ساز کرنچی چمڑا کانپوری پرزہ
ساز فٹن وارنش پرزہ نقرئی [illegible]		برنجی [illegible]

سوا اس کے ہر قسم کی اشیاء دیسی و ولایتی روانہ ہو سکتی ہیں

المشتہر

شیخ محمد عبد الرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور

چوک نمبر ۱۵

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامنر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں میڈیکل کالج کے پروفیسر نامور ڈاکٹر ولایتی ریاست اور ولایت کے یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹر نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت و تاریکی چشم دھند جالا پڑوال غبار سبل لاسیل سرخی ابتدائی موتیا ناخنہ پانی جاتا خارش وغیرہ چند روز کے استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی بچے سے لیکر بوڑھے تک یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ ممیرہ کا سفید اعلیٰ قسم فی تولہ تین روپیہ خالص ممیرہ فی ماشہ ... روپیہ مصری کا سرمہ فی تولہ ... محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

المشتہر

پروفیسر ... سنگھ الموالیہ مقام ... ضلع گوجرانوالہ پنجاب

اس سے بڑھکر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

(۱) میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار ... سنگھ صاحب نے خود بنایا ہے آپ خود اور بہت سے مریضوں پر استعمال کر کے دیکھا ہے اور میں اس امر کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ نادر ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھوں کی بیماریوں کے واسطے اکسیر کا حکم رکھتا ہے میں نے اپنی عمر بھر میں آج تک کوئی سرمہ اس سے زیادہ فائدہ بخش نہیں دیکھا میں انکو خشکی آنکھوں میں نہ ہونے پائی کسی قسم کی شکایت نہیں ہوئی زور سے استعمال کرنے کی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح پر مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا پانی آنا دھند خارش سرخی چشم کے واسطے انگریزی دوا اور آنکھ سے زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا اور سچ تو یہ ہے کہ استعداد رکھتے ہوئے یہ سرمہ ایجاد کر کے ملک اور قوم پر بڑا احسان کیا ہے اسکا شکر الفاظ میں ادا ہونا محال ہے ضرور ہے کہ ملک کے تمام لوگ اپنے سرمہ سے مستفید ہو کر فائدہ اٹھائیں اور ہر طرح آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں

راقم پنڈت ... رام صاحب ڈاکٹر ... نواب ... بہادر ...

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اردوئے معلّیٰ

علی گڑھ

جلد ۴ | بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۶ء | نمبر ۱

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

(فہرست مضامین)

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلی علیگڈھ

احسن المطابع علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ { قسم اول - للعہ سالانہ
دوم ۔۔ سالانہ }

اُردوی معلّٰی

یعنی صحیح و فصیح اُردو کا ماہوار اور قابلِ دید رسالہ جس کے ساتھ ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے کئی دیوان[1] بلاقیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں۔ حجم ۴۲ صفحے لکھائی چھپائی کاغذ بغایت پسندیدہ۔ نمونے کا پرچہ ۲ کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے (۱) رسالہ دواوین للعہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سے سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ معمولی سفید کاغذ پر) عہ سالانہ (برائے طلبا و غیر مستطیع حضرات) مقاصد ضروری منجملہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالٹکس درخواست خریداری بنام مینجر اُردوی معلّٰی علیگڈھ آنا چاہیے

[1] چنانچہ سنہ ۱۹۰۵ء میں (۱) رپورٹ اُردو بمبئی کانگرس (۸ر) دیوان میر سوز (۲ر) اور دیوان قایم چاندپوری شاگرد سودا (۴ر) شائع ہوئے اور سنہ ۱۹۰۴ء کی ششماہی کے آخر میں دیوان حسرت استاد جرات نذر کیا گیا۔

اردوی معلّٰی جلد پنجم

از جولائی سنہ ۱۹۰۵ء تا دسمبر سنہ ۱۹۰۵ء مع رپورٹ بمبئی کانگرس

قیمت عا ر مع محصول۔ دفتر اردوی معلّٰی علی گڈھ سے طلب کرو

اُردوی معلّٰے جلد ششم مکمل

از جنوری سنہ ۱۹۰۶ء تا جون سنہ ۱۹۰۶ء

(قسم دوم قیمت صرف عہ ر مع محصول)

المشتہر۔ مینجر اُردوی معلّٰے علی گڈھ۔

شرح اُجرت اشتہار اُردوی معلّٰے

	پورا صفحہ	نصف صفحہ یا ایک کالم	نصف کالم
سالانہ	للعہ	عہ ر	سے ر
ششماہی	عہ	سے ر	سے ر
سہ ماہی	سے ر	سے ر	عہ ر
ایک بار	عا ر	عہ ر	فی سطر ۲ ر

شملہ

اور اس سلسلۂ کوہستان کے مفصل حالات کتاب لطفِ کہسار میں نہایت قابلیت سے بکمال محنت و تحقیق لکھے گئے ہیں۔ انگریزی و اُردو وغیرہ زبانوں میں ایسی کوئی کتاب نہیں چھپی۔ خط پاکیزہ۔ کاغذ اعلیٰ چھپائی مطبع رفاہ عام سٹیم پریس لاہور۔
عبارت دلفریب۔ طرز بیان طلسم خیز۔ انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

مختصر فہرست مضامین

(۱) مصنف کی پہاڑ پر تعیناتی
(۲) اس سلسلہ کوہ کی زرچالی کیفیت
(۳) کوہستان اور اسکے حقیقی لطف
(۴) شملہ کالکا کارٹ روڈ اور ریلوی
(۵) پہاڑی جیندا اور بیلے
(۶) پہاڑی عورات اور اُنکے حالات کا انکشاف
(۷) جنگل اور جانور
(۸) بارش اور برف کے نظارے
(۹) پہاڑی جانوروں کے حالات
(۱۰) شملہ کی سیر

اور دیگر بیسیوں مضامین اور اعلیٰ سے اعلیٰ سینریوں کے فوٹو کھینچے گئے ہیں قیمت مع محصول ڈاک محض ۱۴ر
اُردو بہرگوسنکتا (یعنی مراۃ الغیب) ایکسٹرا عابد تمین سے پچاس جلدیں باقی ہیں قیمت مع محصول ڈاک عہ ر ملنے کا پتہ ڈاک خانہ اکالگڈھ ریاست پٹیالہ۔ منشی رائے بھگونت رائے اڈیشنل نائب ناظم۔

دیوان غالب طبع ثانی[2]

سفید کاغذ پر خوشخط چھپا ہوا صحیح یعنی اس دیوان کے مطابق جسکا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گزرا تھا مع شرح دیوان غالب قابل دید از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔ اے اڈیٹر اُردوی معلّٰی علی گڈھ تقطیع $\frac{20\times26}{8}$ حجم تقریباً ۱۶ جزو قیمت مع محصول و خرچ ویلو صرف عہ ر
درخواست خریداری بنام۔ مینجر اُردوی معلّٰی علی گڈھ آنا چاہیے فہرست مضامین (۱) دیباچہ از صفحہ ۱ تا صفحہ ۳ (۲) غالب کے حالات (۳) غالب کی شاعری از صفحہ ۳ تا صفحہ ۲۲ (۴) دیوان مع شرح از صفحہ ۱ تا صفحہ ۲۲۰ (۵) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

[2] طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کر دی گئی ہے اور اشعار کے مطالب میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ جا بجا ترمیم بھی کر دی گئی ہے اور صحت کا بھی خاص انتظام کیا گیا ہے

المشتہر

(مینجر اُردوئے معلّٰے علی گڈھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد عیسیٰ تنہاؔ

(سنہ ۱۱۷۰ھ تا سنہ ۱۲۳۰ھ)

نام و تخلص | محمد عیسیٰ نام تنہاؔ تخلص اصل انکی شرفائے دہلی سے تھی۔ اپنے عہد کے دیگر ارباب کمال کے مانند انھوں نے بھی دہلی کو خیرباد کہکے لکھنؤ کی مستقل سکونت اختیار کی اور مصحفیؔ کے اوّلین شاگردوں میں درجہ امتیاز حاصل کیا۔ یہانتک کہ بعض تذکرہ نویسوں کی تحقیق کے مطابق امام الشعرا شیخ ناسخؔ نے بھی کچھ دن ان سے اصلاح لی۔ اس روایت کی صحت میں ہمکو بہت کچھ شبہ ہی لیکن غلط ہونے پر بھی اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اپنے زمانے میں تنہاؔ کا پایہ استادی معمول سے زیادہ بلند تھا یعنی اسقدر کہ لوگ استادی ناسخؔ تک کو انکی ذات کے ساتھ منسوب کرسکتے تھے اور کیا بھی۔

اخلاق و عادات | خوش خلقی خوش وضعی سلیم الطبعی اور رنگین مزاجی کے اوصاف کے علاوہ قدامت پرستی بھی تنہاؔ کی طبیعت کا خاص رنگ تھا چنانچہ تمام عمر لکھنؤ میں بسر کرنے پر بھی دہلی کی زبان اور قدیم رنگ شاعری پر قائم رہے اور غالباً یہی وجہ ہولی شاگردان مصحفیؔ میں سے آتشؔ و اسیرؔ و شہیدی کے برخلاف اہل لکھنؤ نے تنہاؔ کے بعد انکا نام عیشیؔ و شعور و مخمور کے ناموں کی طرح بالکل فراموش کردیا۔

تصنیفات | لیکن دلدادگان انداز ناسخؔ و اسیرؔ کی ناپسندیدگی سے انکی مشاقی اور استادی میں کوئی نقص نہیں عائد ہوسکتا۔ لاریب جن لوگوں نے کلیات تنہاؔ کا بنگاہ انصاف مطالعہ کیا ہے وہ آتشؔ و اسیرؔ کے بعد تنہاؔ کو تمام شاگردان مصحفیؔ سے افضل سمجھنے میں ضرور ہمزبان ہونگے۔ بعہد نواب غازی الدین حیدر سنہ ۱۲۳۲ھ کے لکھے ہوئے کلیات میں ۵۰۰ صفحوں کے ایک دیوان اردو کے علاوہ حسب دستور شعرائے قدیم ایک مختصر دیوان فارسی بھی ہے جسکے بعد کچھ مرثیے اور سلام، ۲۵۰ سے زیادہ رباعیات چند مخمس ایک مسدس اور ایک مختصر سی مثنوی ہے قصیدہ

البتہ کوئی نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں یہ امر زیادہ تر تنہا کی بلند حوصلگی پر دلالت کرتا ہو اور ہم اسپر کہ انہیں قصیدہ گوئی کی قابلیت نہ تھی۔

شاگرد و معاصر تنہا کی قدامت پسندی کے سبب سے لکھنؤ میں انکے بہت کم شاگرد ہوئے جسکی وجہ ایک اور بھی ہے یعنی یہ کہ انکا انتقال مصحفی سے دس برس پہلے یعنی ۱۲۳۰ھ ہی میں ہوگیا تھا اور اسطرح جیر آتش و اسیر کی طرح انہیں مصحفی کے بعد تشنگان سخن کو سیراب کرنیکا وہ موقع نہ ملسکا تھا جو مصحفی کی موجودگی میں آتش و اسیر کو بھی نہ ملسکا ہوگا۔

تنہا کے سلسلۂ شاعری کا نقشہ

مصحفی

(۱) آتش

سرشار سوز فرد خلیق غافل ہوس عیشی اسیر تنہا شہیدی شہور منتظر غالب مخمور ضمیر گرم

کامل واقف

قادر مولوی الہی

برار افضل امیر حکیم شوق عشق تعشق رشید

وفا آہ ماہ اختر کوثر نواب رونق جلیل مضطر وسیم حنیفا شفق ثاقب صفدر

شیدا اصغر فیض اعظم شناور سلیم شرف خلیل صبا رند شوق نشتی ماہ نسیم قدسی خمس شاہی

قمر وانی آغا حنا فوق کیف ازل فروغ حضور وحید سرہانی

علامہ اس نقشے میں ہر استاد کے شاگرد رشید کا نام درمیان میں، اور پھر سلسلہ وار داہنے بائیں یکے بعد دیگرے حسب رتبہ دیگر شاگردوں کے نام درج ہیں۔

۲ جن شاگردوں کے نام اس شجرے میں آئے ہیں انکا مختصر حال بغرض اطلاع ناظرین اسکے بعد کے صفحوں میں درج کردیا گیا ہے۔

شاگردان مصحفی

تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	معلوم یا نامعلوم
مصحفی	شیخ غلام ہمدانی اُستاد مشہور امروہوی۔	۷ - دیوان اُردو ایک دیوان فارسی دو تذکرے	غیر مطبوعہ	معلوم وہم دیوان جز
آتش	خواجہ حیدر علی لکھنوی استاد مشہور۔	۲ دیوان اُردو مشہور	م	معلوم و موجود
اسیر	تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی مظفر علیخاں لکھنوی۔	۳ دیوان اُردو مختلف کتب عروض وغیرہ	م	معلوم و موجود
تنہا	محمد عیسیٰ تنہا دہلوی مقیم لکھنو۔	کلیات مشتمل دیوان اُردو و فارسی	غ	معلوم و موجود
عیشی	طالب علیخاں۔ فارسی میں مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔	″ ″ ″	غ	″ ″
شہیدی	کرامت علیخاں۔ شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی تھی۔	دیوان اُردو مشہور	م	″ ″
ہوس	نواب مرزا محمد تقی خاں صاحب مثنوی لیلیٰ مجنوں مشہور	کلیات اُردو	غ	معلوم
شعور	شیخ عبد الرحمٰن بلگرامی اُستاد علی میاں کامل مرحوم لکھنوی	دیوان اُردو	غ	معلوم
غافل	منور خاں غافل	″ ″	م	معلوم و موجود
منتظر	نور الاسلام۔ انشا و مصحفی کے جھگڑے میں نمایاں حصہ لیا تھا	″ ″	غ	نامعلوم بجز چند غزلیات
خلیق	میر مستحسن برادر میر حسن صاحب مثنوی مشہور	″ ″	غ	″ ″ ″
خان	محمد اشرف خاں دہلوی اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے	″ ″	غ	″ ″ ″
فرد	محمد وحید الدین خاں کانپوری	″ ″	م	معلوم و موجود
مخمور	محمد جعفر لکھنوی	″ ″	غ	نامعلوم بجز چند غزلیات
سرور	شیخ پیر بخش کاکوروی	″ ″	غ	″ ″ ″
ضمیر	میر مظفر حسین لکھنوی مرثیہ گوئے معروف	مجموعہ مراثی و دیوان اُردو	غ	دیوان نامعلوم
سرسبز	مرزا زین العابدین خاں خلف نواب سالار جنگ۔	دیوان اُردو	غ	نامعلوم
گرم	میر حیدر علی دہلوی مصحفی و انشا کے جھگڑوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے	″ ″	غ	نامعلوم
انس	میر مہر علی خلف و شاگرد خلیق۔	مجموعہ مراثی و غزلیات	غ	معلوم
مونس	میر نواب خلف و شاگرد خلیق مرثیہ گوئے معروف	کلیات مراثی و دیوان اُردو	م	دیوان غیر مطبوعہ معلوم
تعشق	سید مرزا دلہ و شاگرد میر انس	دیوان اُردو	غ	معلوم
عشق	سید حسین مرزا ″ ″ ″	″ ″	غ	″

جن شاعرون کی تخلص پر نشان (ــــ) لگا دیا گیا ہو اُنکا مفصل حال علحدہ لکھا جائیگا۔

تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	[illegible]	معلوم یا نامعلوم
رشید	پیارے صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ شاگرد تشوق	مجموعہ مراثی و دیوان اردو	غ	معلوم
امیر	منشی امیر احمد مرحوم مینائی استاد مشہور	دو دیوان اُردو ایک دیوان فارسی تذکرہ شعرائے رامپور امیر اللغات وغیرہ	م	معلوم و موجود
افضل	خلف و شاگرد اسیر	دیوان اُردو	غ	معلوم
حکیم	″ ″	″ ″	غ	″
جرار	مرزا حسین بیگ	″ ″	م	معلوم و موجود
شوق	احمد علی شوق سلمہ اللہ تعالیٰ مصنف مثنوی ترانۂ شوق	ترانۂ شوق و دیگر مثنویات	م	″ ″ ″
جلیل	حافظ جلیل حسن مانکپوری سلمہ اللہ تعالیٰ جانشین امیر مینائی	دیوان اُردو	غ	معلوم
ریاض	منشی ریاض احمد خیرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ صاحب اخبار ریاض	″ ″	غ	″
مضطر	افتخار حسین مضطر سلمہ اللہ تعالیٰ استاد نواب صاحب ٹونک	″ ″	غ	″
نواب	نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم والی رامپور	۲ دیوان اُردو ۱ دیوان فارسی	م	″
وسیم	محمد عسکری خیرآبادی سلمہ اللہ مہتمم نگین لکھنؤ	دیوان اُردو و زیر ترتیب	غ	″
کوثر	حکیم عابد علی خیرآبادی سلمہ اللہ تعالیٰ	″ ″ ″ ″	غ	″
حفیظ	حضرت حفیظ جونپوری سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان اُردو	م	معلوم و موجود
اختر	منشی لطیف احمد خلف و شاگرد امیر سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان اُردو و زیر ترتیب	غ	معلوم
شفق	حسن مرتضیٰ عمادپوری سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان اُردو	غ	عنقریب طبع ہوگا
جاہ	نواب ضیاء الدین کانپوری سلمہ اللہ تعالیٰ	″ ″	م	معلوم
ثاقب	مولوی محمد احسن اللہ خاں مدیر رسالہ قند پارسی علیگڈھ نظم و نثر فارسی میں یادگار ارباب کمال ہیں۔	مجموعہ اُردو و کلیات فارسی	غ	عنقریب طبع ہوگا
آہ	منشی ممتاز علی سلمہ اللہ تعالیٰ	دیوان زیر ترتیب	غ	نامعلوم
صفدر	نواب صفدر علی خاں مرحوم رامپوری	دیوان اُردو	م	معلوم
وفا[1]	مولوی حکیم عبد الهادی خاں رامپوری صاحب انداز خاص	دیوان اُردو و مجموعہ فارسی	غ	معلوم

شاگردان اسیر

شاگردان امیر

[1] ان تلامذہ کے علاوہ امیر مرحوم کے اور بھی بہت سے قابل ذکر شاگرد ہیں مثلاً حسرت شروانی۔ محمد احمد قمر مینائی۔ حکیم برہم۔ شمیم۔ گستاخ رامپوری۔ ابر رامپوری۔ فضا و جگر وغیرہم۔

تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	مشہور یا غیر مشہور	معلوم یا نامعلوم	
صبا	میر وزیر علی استاد مشہور۔	کلیات اردو	م	معلوم وموجود	
خلیل	میر دوست علی بڈولوی شاگرد رشید آتش	دیوان اردو	م	" "	
رند	نواب سید محمد خان لکھنوی استاد مشہور	دو دیوان اردو	م	" "	
شرف	میر سادات حسین عرف آغا حجو لکھنوی شاگرد رشید آتش	دیوان اردو	م	" "	
شوق	حکیم تصدق حسین عرف نواب مرزا لکھنوی	مجموعۂ غزلیات ومثنوی زہر عشق وغیرہ	م	" "	
سلیم	میر عباس سلیم لکھنوی۔	دیوان اردو	غ	معلوم	شاگردان آتش
منتہی	مرزا مستیا بیگ لکھنوی	دیوان اردو	م	معلوم وموجود	
شناور	صاحب مرزا فیض آبادی	" "	غ	معلوم	
ماہ	مرزا عنایت علی ماہ اکبرآبادی برادر مرزا حاتم علی مہر	" "	غ	"	
اعظم	سید اعظم علی الہ آبادی	" "	غ	"	
نسیم	پنڈت دیاشنکر کشمیری صاحب مثنوی گلزار نسیم	مثنوی و دیوان مختصر	م	معلوم وموجود	
فیض	میر احسان علیخان بہادر لکھنوی۔	دیوان اردو	غ	معلوم	
قدسی	سید محمد اکبر دختر زادہ حضرت شاہ اجمل الہ آبادی	دیوان اردو	غ	نامعلوم	
اصغر	نواب اصغر علیخان وزیر بہادر شاہ مرحوم ظفر	دیوان اردو ومثنوی	غ	معلوم	
شمس	مرزا اکبر علی شمس لکھنوی۔	×	×	نامعلوم	
شیدا	نواب محمد حسین خاں لکھنوی	دیوان اردو	غ	"	
شاہی	مرزا نور الدین لکھنوی	" "	غ	معلوم	
کیف	شیخ فضل احمد لکھنوی شاگرد رشید صبا	دیوان اردو	م	معلوم وموجود	شاگردان صبا
ذوق	میر دلدار حسن فرخ آبادی۔	" "	م	معلوم	
ازل	مرزا آغا حسن لکھنوی استاد سید نذر الرحمن حفیظ عظیم آبادی صاحب دیوان	" "	غ	نامعلوم	
حنا	عبد الکریم خان لکھنوی	دو دیوان اردو	غ	معلوم وموجود	

تخلص	نام مع مختصر حال	فہرست تصانیف	مطبوعہ یا غیر مطبوعہ	معلوم یا نامعلوم
فروغ	حضرت فروغ لکھنوی شاگرد صبا۔	دیوان اردو	م	معلوم
آغا	آغا حسن لکھنوی	〃 〃	غ	نامعلوم
حضور	محمد عبدالبصیر بلگرامی	〃 〃	غ	معلوم
قمر	قمرالدین حسین خان موہانی	〃 〃	غ	معلوم و موجود
وحید	منشی سرفراز علیخاں موہانی	〃	غ	معلوم

تنہا کی شاعری

تنہا کی شاعری کو بعینہ مصحفی کی شاعری سمجھنا چاہیے۔ مصحفی کے کلام کی طرح انکے ہاں بھی ہر رنگ سخن کے نمونے موجود ہیں، اور مصحفی کے مانند انکے دیوان میں بھی جابجا قدیم الفاظ اور فارسی ترکیبوں کا لاجواب ترجمہ نظر افروز ناظرین ہوتا ہے۔ مصحفی کی طرح یہ بھی غلط العوام کو صحیح تسلیم کرکے بے تکلف نظم کرجاتے ہیں۔ غرضکہ ہر صورت شاگرد کی سخن سنجی استاد کی شاعری کا پرتو ثابت ہوتی ہے چنانچہ اسی خیال سے ہم بھی تذکرۂ مصحفی کے بعد انکی مختلف غزلوں اور بیتوں کو مع چند الفاظ مختصر نقل کردینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حاشیہ	مصرع اول		مصرع ثانی
الفاظ قدیم	ناحق کی رنجشیں اب ہمسے نکالیاں ہیں		اس دل نے تیری وضعیں ساری اڑالیاں ہیں
	بدنام تا ہو تو لے ہمنے تیری خاطر		بدنامیاں سبھوں کی سر پر اٹھالیاں ہیں
	ہوویگا کوئی لطف و عنایت کا دوانا		تنہا ہے فقط آپ کی صورت کا دوانا
	مجمع میں پریزادوں کے کیا کام ہے میرا		ہوں میں تو گل اندامونکے جمگھٹ کا دوانا
ترکیب فارسی	مذکور لیچلا تھا شب ہمنشیں کسیکا		جی میں خیال گزرا میرے وہیں کسیکا
	لے ہاتھ میں ٹک دامن کو اٹھا۔ ہے یہ بھی کوئی چلنے کی ادا		خاک اسکی تو یوں برباد نہ دے جو راہ میں تیری خاک ہوا
غلط العوام	سونگھی ہو جسنے بو تیرے جعد سیاہ کی		ہرگز کبھی نہ بو وہ گل یاسمن کرے
	سو پرزے میں نے اسدم اپنا کیا گریباں		دامن جب اسکا تھا بنے اغیار گھر سے نکلا
	ہے دور یواجوں کا غنیمت ہی سمجھیے	[1]	نبھ جائے جو اس دور میں حرمت کسیکی

[1] یاجی کی جمع یواج کے بجائے حاشیۂ دیوان پر لفظ را کا لفظ بھی موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہا کو انگریزوں سے اتنی ہی بیزاری تھی جتنی مصحفی کو جبکا یہ شعر مشہور ہے [illegible]

سادگی و درد (میر تقی کا انداز)

تمتو فرماتے ہوکہ گہر جا دیں
ہے گند ہے رہنے ہی میں چین انکی
خانہ آباد چہوڑ تیری گلی
روٹھ کر گر وہ آملے تنہا

ہمکو کہدو کہ ہم کدہر جاویں
بال بکھریں تو جی بکھر جاویں
ہم کس اجڑے ہوئے نگر جاویں
کام بگڑے ہوئے سنور جاویں

اتنی حجت اسے کیا کہتے ہیں
چشم تر گور غریباں پہ نہ کی
تو جو یوں خانہ نشیں ہے تنہا

بیمروت اسے کیا کہتے ہیں
ابر رحمت اسے کیا کہتے ہیں
ننگ وحشت اسے کیا کہتے ہیں

مصحفی کا رنگ

اگر شعلہ نما ہے یہ دل بیتاب آتش کا
وہ میرا شعلہ خو آتش کا پرکالا ہبوکا ہے
لباس سرخ میں یوں ہے صباحت اسکی بنڈیکی
لگا دی آگ ساقی نے لنڈہا کر شیشہ مے کو
پسینا اسکے روئے آتشیں پہ آنکر دیکھے

مہیا ہے ہمارے پاس ہی اسباب آتش کا
کہ جسکو دیکھکر ہوتا ہے دل بیتاب آتش کا
بین نکلا ہی گویا پیرہن مہتاب آتش کا
بہایا اسنے خب محفل میں کیا سیلاب آتش کا
نہ دیکھا ہوگا کبھی جسنے کہ تنہا آب آتش کا

عجب طرح کی بہار اندنوں کسی پہ ہے
جو رفتہ رفتہ میں اس بت سے لگ چلا تو کہا
نہ غافل اب ہو بہ ارشاد مصحفی تنہا

نہ حور میں وہ لطافت ہے نے پری پہ ہے
مزاج آپکا شاید کہ رفتگی پر ہے
بہوش باش کہ عالم رواروی پر ہے

غزل بر غزل جرأت

یاد آتے ہیں پہر ہمکو ایام گرفتاری
ساقی نے دیا تہا جو معلوم نہیں مجہکو
کیوں دام و قفس لاوے صیاد اگر سمجھے
بے رنج قفس دیکھا نے دام کا غم سہنے
جو ہیں ترے زنداقی بہتر وہ سمجھتے ہیں
زلفوں سے تری جوں توں باندہا ہی اسی آخر
جاتا ہے زیارت کو یہ کعبۂ زندان کی
گہبراؤں تو ای تنہا تقدیر یہ کہتی ہے

پہر جوش جنوں لایا پیغام گرفتاری
جام مے گلگوں تہا یا جام گرفتاری
صیاد کی الفت سے خود دام گرفتاری
کہنے کو تو ہیں کہنے ناکام گرفتاری
آرام رہائی سے آلام گرفتاری
ہر چند یہ دل تڑپا ہنگام گرفتاری
دل نے مرے باندہا ہے احرام گرفتاری
بیصبر ہوا تنا اے خام گرفتاری

ایدہر بھی کبھی دیکھ تو اے جان تغافل
گھٹ جائیگی اسمیں نہ تری شان تغافل

یہ محفلِ عشاق ہے چل بچکے ادہر یاں سے
بھر جائے نہ خوں میں ترہ دامانِ تغافل

اک جھٹکے میں ہو جائیے دامن تلک اسکو
ہاتھ آئے اگر اپنے گریبانِ تغافل

کیا اس سے کہے خاک کوئی حال دل اپنا
رہتا ہو جو نت سر بگریبانِ تغافل

کر اپنے کرم پر تو نگہ اے ہمہ الطاف
ہر چند گنہگار ہے شایانِ تغافل

ہوا خالی جو مستوں کا مو گلرنگ سے شیشہ
تو جھنجھلا کر انہوں نے توڑ ڈالا سنگ سے شیشہ

کل اس مطرب پسر نے بزم میں کی زور بدمستی
اڑا مرزنگ کو شیشے سے اور مرزنگ سے شیشہ

ہوا جاتا ہے ٹکڑے ٹکڑے دل مجلس نشینوں کا
سنا تا ہے صدائے قلقل اس آہنگ سے شیشہ

سفر سے جب کیا عزمِ وطن ہمکو نظر آیا
کئی منزل سے پیمانہ کئی فرسنگ سے شیشہ

خدا کے واسطے مطرب نہ ہرگز چھیڑنا اسکو
کہ مجھکو یاد آتا ہے صدائے چنگ سے شیشہ

بایں رندی جو تنہا ہم میں بو تقوی کی آتی ہے
ہماری بزم میں آتا نہیں اک ننگ سے شیشہ

رنگوں گر خونِ دل سے اس گلِ شاداب کا جوڑا
نہ نکلے باغِ امکاں میں اس آب و تاب کا جوڑا

کیا تھا آپکا اقرار تم نے نام کو رات
دکھا ہی راہ غرض خوب اس غلام کو رات

غرفے سے دکھا منہ کو چھپا لیتے جو لوگ
قربان میں ان لوگوں کے کیا لوگ ہیں وہ لوگ

نہ طاقتیں دلِ حیرانِ شعار میں آئیں
نقاہتیں یہ مرے جسمِ زار میں آئیں

میں اس میں ہوں متحیر کہ رنجشیں تنہا
کہاں سے خاطرِ بے رنجِ یار میں آئیں

رباعی

ہر برگِ گلِ باغِ جہاں نازک ہے
شاخِ شجرِ سرو رواں نازک ہے

اس باغ سے آشیاں اٹھائے بلبل
گل سے بھی دماغِ باغباں نازک ہے

زنالہ گرچہ مرا شب زباں بکام نشد
ولے چہ سود کہ کارم من انصرام نشد

ہزار بار شبِ وصل درمیاں آمد
ہنوز قصۂ مہجوریم تمام نشد

فدای روی تو ہرگز بسوی ماہ ندید
اسیرِ زلفِ تو ہرگز اسیرِ دام نشد

دریغ عمر دریں حسرتم بسر آمد
میانہ من و او نامہ و پیام نشد

ترحمی بکن ای بیوفا کہ چوں تنہا
کسی بعشقِ تو رسوای خاص و عام نشد

فقط

مقولات اور قائل

ہم اپنے ارد گرد جو کچھ بولتے اور جو کچھ کرتے کراتے اور دیکھتے سُنتے ہیں وہ جذب و انجذاب اور فعل و انفعال سے خالی نہیں جو کچھ ہوتا ہوا تا ہے خواہ وہ کسی غرض سے کیا جاوے دوسروں پر اُسکا اچھا بُرا اثر ضرور پڑتا ہے یا یہ کہ دوسرا اُس سے کسی نہ کسی طریق سے متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ ہمارے اقوال، افعال و خیالات بہتی لہریں ہیں جن کا اثر کنارہ اور کنارہ کی چیزوں اور قوتوں پر لزوماً پڑتا ہے عام اس سے کہ ایسے تاثر اور جذب کا اثر یا نتیجہ فوراً منصۂ ظہور میں آئے یا ایک خاص وقفہ کے بعد ہم ایک کام کرتے ہیں ایک بات کہتے ہیں خواہ اوس کی کچھ ہی غرض ہو اور خواہ اوسکا محل کچھ ہی ہو اُسمیں ایک متعدی تموج اور تضارب ہوتا ہے جسکے زور سے وہ دوسروں پر فوراً یا کسیقدر وقفہ کے بعد موثر ہوتا ہے۔ ہوا کے ذریعہ سے صرف ایک آواز ہی دوسرے تک نہیں پہنچتی بلکہ اوس کا اثر بھی ساتھ ہی جاتا ہے خوشبو یا بدبو دور ہی سے دماغ اور قوت شامہ پر فوری اثر کرتی ہے فونوگراف اور گراموفون میں آوازوں اور صداؤں کا بند یا ملتصق ہوجانا اور ایک عرصہ کے بعد ہی اُن کا بہ ادنی تغیر معرض سماعت میں آنا اس امر کی زندہ دلیل ہے کہ آوازیں انسانی قلوب اور صفحۂ سماعت پر بھی جا کر اسی طرح ملتصق ہوجاتی ہیں اور انسان اُن سے متاثر ہوتا ہے۔

جب ایک آواز نکلتی ہے خواہ وہ کسی جسم سے نکلے تو اُسمیں ایک اثر اور جذب ہوتا ہے اور وہ دوسری ذات پر بذریعہ قوت التصاقی قائم اور منجذب ہوکر ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ ایسے التصاق اور انجذاب کے واسطے یہ شرط اور یہ قید نہیں کہ آواز کسی خاص طاقت یا وجود سے سرزد ہو۔ انسان، حیوان، جمادات، نباتات، پتھر اور کنکر وغیرہ وغیرہ ہر وجود کی ضرب اور صدا اپنی ذات میں ایک اثر اور ایک صدمہ رکھتی ہے۔ ایک اینٹ پر اینٹ مارو تو اُس سے بھی ایک صدا نکلیگی اور اوسکا

اثر دوسرے دل پر ہوگا ایک ٹھوکر کی آواز سے بھی وہی اثر ہوتا ہے جو ایک جاندار کی صدا سے عموماً ہوا کرتا ہے - یہ دوسری بحث ہے کہ بعض صدائیں اور بعض آوازیں مطلب خیز ہوتی ہیں اور بعض کا مطلب کچھ نہیں ہوتا -

جب ایک آواز نکلتی اور سنائی دیتی ہے تو سننے والا یا سننے والے سب سے پہلے اُس آواز پر کان دھرتے ہیں اور صرف وہ آواز ہی اُن تک پہنچتی اور اُن پر اثر کرتی ہے - آواز دینے والے کی شکل کا ارتسام نہیں ہوتا بلکہ آواز نازلہ صفحہ سماعت پر مرتسم ہوکر کسی نہ کسی نتیجہ یا خیال کی باعث ہوتی ہے - اگر پس دیوار سے ایک صدا آئے اور ہمارے کان اُس سے آشنا ہوں تو ہم سب سے پہلے اسکی کچھ ضرورت نہیں دیکھتے کہ اوسکے قایل کی تخصیص کریں بلکہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسکا سبب کیا ہے اور وہ کیا کچھ مفہوم رکھتی ہے - مطلب اور مفہوم کی بحث کے بعد ہم آواز دینے والے کیطرف جاتے ہیں گویا یہ دوسرا درجہ ہوتا ہے -

ریلوے، دفاتر اور سکولوں میں جب کبھی وقت مقررہ پر کوئی گھنٹی بجاتا ہے تو ہم کبھی یہ نہیں بحث کرتے کہ کس نے بجائی بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ کیوں بجی یا کیوں بجائی گئی -

جب ہم ایک خوش آئند آواز سنتے ہیں تو سب سے پہلے آواز دینے والے یا گانے والے کی خوش گلوئی یا خوش الحانی اثر کرتی ہے نہ کہ آواز دینے والا یا گانے والا - بہت سے خوش گلو جانور اور مُغنّی بدصورت اور بدسیر ہوتے ہیں لیکن اُن کی آواز میں ایک فوری اور کشش کرنے والی لَے ہوتی ہے - اوسکی شکل و شباہت سامعین کی توجہ اور رجوع کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اوسکی خوش گلوئی اور خوش آوازی - فونوگراف اور گراموفون، پیتل تانبے لوہے اور ٹین کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن اُنمیں سے جو صدائیں اور جو آوازیں نکلتی ہیں وہ گو اصل صداؤں کا پرتو ہی ہوتی ہیں مگر اُن میں بھی ایک فوری اثر ہوتا ہے -

سننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ فونوگراف یا گراموفون سے ایک آواز نکل رہی ہے بلکہ یہ کہ وہ آواز کیسی سُریلی اور کیسی پیاری یا عجیب ہے -

ان واقعات اور طریق اثر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب سے پہلے۔

"مقولات ہی موثر ہوتے ہیں"

"مقولات ہی پر نظر ہوتی ہے۔"

"مقولات ہی صفحہ سماعت پر مرتسم ہوتے ہیں"

"مقولات ہی سے غرض ہوتی ہے"

"مقولات ہی سے نتائج پیدا ہوتے ہیں"

مقولات کے بعد قایلین پر نظر پڑتی ہے اور اسمیں ایک مقولہ یا مقولہ کا مفہوم مقدم رکھکر قایل کی تعظیم یا توقیر کی جاتی ہے۔ قایل کی تعظیم اور وقعت اپنے مقولات کے اعتبار سے کی جاتی ہے کہ مقولات کی وقعت قایل کی وقعت سے۔ گھنٹے اور گھڑی کی صدا یا ٹنک ٹنک اس لحاظ سے باوقعت نہیں ہوتی کہ اوسکا بجانے یا بنانے والا ایک انسان ہی بلکہ اس جہت سے کہ اُس صدا یا ٹنک ٹنک سے ایک ضرورت یا وقت کا استدلال ہوتا ہی اور ایک خاص موقت آرزو پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر ایک اچھا قایل بُرا قول کہے اور اوسکے مُنہ سے ایک بُری آواز نکلے تو یہی کہا جائیگا کہ بہت بُری اور بہت منحوس آواز نکلی ہے۔ اگر ایک بُرا قایل ایک اچھا قول اور اچھی بات کرے تو یہی کہا جائیگا کہ ایک اچھی اور ایک سودمند بات کہی گئی ہے۔

ایک اچھا فعل بُرے اور بدنام فاعل کی بھی تعظیم کراتا ہے لیکن ایک بُرا فعل ایک اچھے فاعل کی بھی مذمت اور توہین کراتا ہے اگر ایک بزرگ منش جھوٹ بولے یا بہوٹ کہے تو یہ کبھی نہ کہا جائیگا کہ اوسکا جھوٹ بولنا اسکی بزرگ منشی کے۔ جھوٹ نہیں ہے۔ ایک چور ڈاکو اگر دان کو دن کہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بوجہ اوسکے چور اور ڈاکو ہونیکے اُس سے انکار کیا جاوے۔

اگر ایک گلی ظرف یا مٹی کے صندوق میں سے سونا اور چاندی نکلتی ہے تو باوجود اسکے کہ وہ ایک گلی ظرف یا ایک مٹی کے صندوق میں سے نکلی ہے چاندی اور سونا ہی ہوگا اور ایک چاندی یا سونے کے بکس میں مٹی نکلتی ہے تو وہ مٹی ہی ہوگی۔ سونا

یا چاندی کے نلکے میں سے دریا اور کنوئیں کا پانی اپنی اپنی حیثیت اور کیفیت ہی میں نکلیگا۔ یہ نہیں کہا جائیگا کہ دریا کا پانی کنوئیں کا ہو جائیگا اور کنوئیں کا دریائی - آواز دینے والا ایک قالب ہے۔ قالب میں جو کچھ ڈالا جاوےگا وہی نکلیگا۔ خواہ قالب مٹی کا ہو اور خواہ کسی دہات کا۔ جن لفظوں میں گفتگو کی جاتی ہے وہی لفظ آواز کی صورت میں مرتسم ہوتے ہیں اُن کے بدل میں اور الفاظ نہ آتے ہیں نہ آسکتے ہیں۔

لوگ ان تمام قاعدوں کے پابند ہیں اور اُسکی پابندی ضروری سمجھتے ہیں لیکن بعض اوقات باوجود سمجھنے کے بھی اس پابندی سے باہر ہوجاتے ہیں۔ مقولات کی تعظیم یا اُن کا اخذ قائلین کے اعتبار پر کرتے ہیں خواہ کوئی مقولہ کیسا ہی منور اور سورسند ہو صرف اس وجہ سے اوس سے انحراف کیا جاتا ہے کہ۔

"اُس کا قایل یا مظہر فلاں ہے"

"وہ فلاں کے مُنہ سے نکلا ہے"

"اُسکی فلاں شخص تصدیق یا تائید کرتا ہے"

"اوسکی فلاں تائید یا تصدیق نہیں کرتا"

"وہ فلاں کے مقولات میں سے ہے"

یہ طریق عمل یا طریق اخذ بحث حقیقت کے منافی ہے گو اس سے ایک ضد یا ایک پیچ تو پوری ہوجاتی ہے لیکن حقائق الامور پر ایک حجاب آجاتا ہے اور اس اصُول کا معترف ہونا پڑتا ہے کہ۔

"حقایق بذاتہ کچھ قیمت نہیں رکھتے ہیں"

"بذاتہ اُنکی کوئی وقعت نہیں ہے"

"بذاتہ اُن کی کوئی حقیقت نہیں"

"مٹی ایک طلائی ظرف میں طلا بن سکتی ہے اور طلا ایک گلی ظرف میں گل ہوجاتا ہے لوہا پانی میں پانی ہوجاتا ہے اور پانی لوہے کے برتن میں لوہا ہوجاتا ہے"

اگر یہ اصُول اور یہ قلب ماہیت درست ہے تو بے شک یہ کہا جاوےگا کہ:-

"قول یا فعل کا اعتبار قایل یا فاعل کے اعتبار[1] پر موقوف ہے اور اگر یہ قیاس درست نہیں تو یہ نہیں کہا جا سکتا۔

جب انسان ایک جائز طریقہ اور جائز معیار سے دور جا پڑتا ہے تو ہمیشہ ایک انقلاب اور خرابی پیدا ہونے لگتی ہے۔ حقائق کا انکشاف اسی صورت میں بروقت اور معتبر ہوتا ہے جب وہ اپنے اصلی محور پر رکھے جائیں۔ اور حقیقتیں اصلی محور پر اسی صورت میں رہ سکتی ہیں جب اون کا اخذ محض اُنکی ذاتی خوبی کی وجہ سے ہو نہ کہ نسبتی معیار سے۔ بے شک دنیا اور خیالات میں تضاد اور اختلاف ہے اور کلیتاً دور بھی نہیں ہونیکا لیکن اگر نسبتی معیار عموماً ملحوظ نہ رکھا جائے تو اس میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے۔

دنیا کی اکثر احمقانہ لڑائیوں اور اختلافوں کا موجب یہی نسبتی معیار ہوتا ہے اور اسی سے اکثر برائیوں کی بنیاد پڑتی ہے۔ لوگ اپنی دُھن میں لگے جاتے ہیں اور حقائق کا خون ہوتا رہتا ہے۔

دراصل یہاں بہت سے لوگ چونہ گچ مزاروں یا مقبروں کی پوجا کرتے ہیں اور اُن راستوں سے گزرتے ہیں جو بظاہر صاف اور سیدھے ہوتے ہیں اگرچہ اُن میں بڑے سے بڑے مُردے ہی کیوں نہ مدفون ہوں اور وہ راہیں کسی صحرا اور لق و دق جنگل ہی میں کیوں نہ جا نکلتی ہوں۔ بعض لوگ ہمیشہ اسکے خواہاں رہتے ہیں کہ کسی بڑے آدمی یا موقر شخص کی باتوں کی خواہ مخواہ تعریف اور مدح و ثنا کریں خواہ اُن باتوں میں کوئی بھی حقیقت نہ ہو۔ بعض لوگ اسی واسطے بعض صحیح اور سودمند مقولوں سے پرہیز اور نفرت کرتے ہیں کہ اُن کا قایل یا گوینده کوئی مشہور شخص نہیں ہے۔ بعض لوگ بعض باتوں اور بعض مقولات کی اسیواسطے تردید اور تکذیب کرتے ہیں کہ اُن

---

[1] بے شک ایک اچھا قول اور ایک فعل اچھے قایل اور اچھے فاعل کی وجہ سے زیادہ تر دلکش اور زیادہ تر موقر ہو جاتا ہے اور اوسکی وقعت اور بھی وزنی ہو جاتی ہے لیکن اس زاید روشنی سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی۔

"تمام اقوال یا افعال اچھے قایل یا اچھے فاعل کی وجہ سے اچھا اور سودمند ہو سکتا ہے۔" ۱۲

ماخذ اُن کا غیر ہے یا یہ کہ وہ اُن کی جماعت میں سے نہیں ہے۔ بعض لوگ ایک قول اور فعل کی اول تصدیق کرتے ہیں اور اوسکی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں لیکن جب اوسکے قایل کو معلوم کرتے ہیں تو پھر اُنہیں اُسی قول یا اُسی فعل سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اُنکی پہلی تعریف اور تصدیق صرف اسی وجہ سے اُڑجاتی ہے کہ اُسکا گوئندہ اُنکی جماعت کے خلاف نکلا ہے۔

ایک شخص ایک معقولہ یا ایک حقیقت کی برابر تصدیق کرتا گیا اور بڑے زور شور سے اُسکی تائید دلائل سے کرتا رہا لیکن جب اُسے اوسکے گوینده کا نام معلوم ہوا تو اوس نے جلد بازی شرم کے ساتھ فوراً ہی تقریر کا رُخ پلٹ دیا گیا اور زور سے کہنے لگا کہ باوجود ان دلائل کے بھی اسی میں نقص ہیں چیف کورٹ پنجاب میں ایک دفعہ ایک مشہور وکیل برائے مدعی، اپنے موکل کی غلطی یا جلد بازی سے مدعا علیہ کے حق میں تقریر کرتا رہا یہاں تک کہ ججان چیف کورٹ پر بھی اوسکی استدلال اور دلائل قانونی یا واقعاتی کا اثر ہوا۔ لیکن یاد دلائے جانے پر وکیل صاحب چوکنے ہوئے اور اس خوبی سے یہ کہکر رُخ بدلا کہ یہ سب دلائل اور وجوہ جو مدعا علیہ اور اُسکا وکیل اپنے حق میں کہنے کو تھے میں خود ہی بیان کرکے اُن کی یوں تردید کرتا ہوں۔

یہ ہیں نسبتی معیار کی غلطیاں اور جلد بازیاں اگر وکیل خبردار نکیا جاتا تو تمام مواد مدعا علیہ ہی کے حق میں پیش کیا گیا تھا۔

چونکہ براہین اور دلائل کی حکومت ہر واقعہ اور ہر کیفیت پر مسلم ہے خواہ وہ واقعہ اور کیفیت بذاتہ کسی ہی کیوں نہو، اسیواسطے دلائل کی آڑ میں ہر قول اور ہر فعل پر نسبتی معیا کے اعتبار بحث کی جاسکتی ہے۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ:-

"دُنیا کی حقیقتیں ہمپر صحت سے منکشف ہوں"

"اُن میں کوئی مزاحمت نہ ہو"

"اُن میں کوئی التباس نہ رہے"

تو ہمارا فرض ہے کہ۔
"ہم سب سے پہلے کسی قول اور فعل پر بحث کریں"
"قول اور فعل کو دیکھیں"
"قول اور فعل کا موازنہ کریں"
یہ نہ دیکھیں کہ اوسکا قایل یا فاعل کون ہے یا کس حیثیت کا۔ آپ نے دیکھا ہوگا بعض اوقات ایک جاہل بھی صحیح معنوں میں گفتگو کرتا ہے۔ بہ مصداق۔ ۵

گاہ باشد کہ کودکے ناداں	بہ غلط بر ہدف زند تیرے

اُسکے استدلال کا ماخذ موجہ اور مسلم ہوتا ہے۔ خلاف اسکے بعض وقت ایک حکیم سے بھی صریح غلطی ہو جاتی ہے۔ ایک حکیم کے غلط استدلال کا صرف اسوجہ سے تسلیم کر لینا کہ وہ ایک حکیم کی طبیعت سے نکلا ہے حق پرستی کے خلاف ہے۔
کیا کوئی حکیم اور کوئی ہمارا غیر یا دشمن کبھی کوئی غلطی نہیں کرسکتا یا اوسکا کوئی قول اور کوئی تحقیق صحیح معیار کے مطابق نہیں آسکتی۔ غیریت، عداوت، مناقشت، دوستی، دشمنی کچھ اور ہے اور اقوال یا افعال سلیمہ یا قبیحہ کا صدور کچھ اور۔ اختلاف خیالات یا اختلاف ماخذ سے حقائق اور صداقت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ آفتاب کی کرنیں خشکی اور دریا پر یکساں پڑتی اور یکساں ہی نکلتی ہیں۔ دو دشمن اور دو دوست باوجود اس رشتہ دوستی اور دشمنی کے تحقیق کے مشاق اور عادل رہتے ہیں اور اُن دونوں پر فیضان حقائق اور واقعات کا برابر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی عداوت اور کوئی اختلاف اس فیضان کا مزاحم اور مانع نہیں ہوتا اور نہ کوئی دشمنی اور کوئی دوستی ہی خلل انداز ہوتی ہے۔ زید اور بکر کی شخصیت ہمیشہ بطور خود کام کرتی رہتی ہے اگرچہ زید کے بشرہ اور چہرہ میں کوئی فرق یا کوئی نقص ہو لیکن اوسکی صداقتوں اور تحقیقتوں میں کوئی نقص یا کوئی خوبی خواہ مخواہ باعتبار جسمانی خوبیوں اور نقصوں کے حائل نہیں ہوسکتی۔ زید مومن ہے، زید کافر ہے، زید بدمعاش ہے، زید نیک معاش ہے۔ زید داڑھی رکھتا ہے، زید داڑھی منڈواتا ہے، زید ولیسی لباس رکھتا ہے

زید انگریزی فیشن میں ہے، زید انگریزی خواں ہے۔ زید سنسکرت اور عربی داں ہے۔ زید ایشیا یا ہندوستان میں رہتا ہے، زید لنڈن اور برلن یا پیرس میں سکونت پذیر ہے۔ باوجود ان سب اختلافات کے زید کی چھوٹی بات چھوٹی اور اچھی بات بات اچھی ہے۔ نیکی نیکی ہوگی اور بدی بدی۔

زید چور اور ڈاکو ہوکر اگر کسی کو روٹی اور دودھ دے تو وہ روٹی اور دودھ ہی ہوگا۔ یہ نہیں کہ زید کی چوری اور ڈاکا روٹی اور دودھ کو زہر یا آب حنظل بنا دیگا اسی طرح ایک عابد نماز گزار آب حنظل اور زہر دیکر روٹی اور دودھ کا ثواب حاصل نہیں کرسکتا۔ ہاں اتنا ضرور فرق ہوگا کہ۔

"چور ڈاکو ہونے کی حالت میں یہ کہا جائیگا کہ بکر نے زید چور یا ڈاکو سے روٹی اور دودھ لیا یا ایک عابد اور نیک بخت سے"

بے شک یہ ایک تمیز ہوگی مگر اس سے یہ کیونکر لازم آگیا کہ روٹی روٹی نہ رہی یا دودھ دودھ نہ رہا۔

خذ ما صفا ودع ما کدر کا پرانا مقولہ جس میں ایک قیمتی فلسفہ مودع ہے اسپر ایک پوری روشنی ڈالتا ہے کہ قبول یا اخذ حقائق میں کس اصول پر چلنا چاہئے اور وہ کون طریقہ ہے جس سے دنیا کی حقیقتیں بے غل وغش ملتی ہیں اور جس سے دنیا کا انتظام خوبی اور عمدگی سے چلنے کی امید کی جاسکتی ہے۔

خذ ما صفا ودع ما کدر پر ہمیشہ عمل رکھو۔

ہمیشہ مقولات پر نظر رکھو قائل کی تخصیص سے اخذ حقائق میں ابتری نہ ڈالو بات اچھی ہو۔ نہیں اس سے کیا کہ اسکا قائل کون اور کیسا ہے۔ جو چیز اور جو خیال اچھا ہے وہ لے لو۔ موتی کیچڑ میں ہوکر بھی موتی ہی رہتا ہے۔ فقط

(سلطان احمد۔ میاں والی پنجاب)

بعض اقسامِ شاعری

از مولوی سید امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی

جاننا چاہئے کہ شاعریوں سے ایک قسم شاعری کی ہے جسکو لیرکس (Lyrics) کہتے ہیں اس قسم کو فارسی اور اردو کی غزل سرائی سے ایک گونہ مناسبت ہے بلکہ درحقیقت جو تقاضا اہل یورپ کے لیرکس کا ہے وہی ہملوگوں کی غزل سرائی اور تمام دنیا کی اُس شاعری کا ہے جسکے لگاؤ میں سرائیدن کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال جاننا چاہئے کہ لیرکس کا تقاضا یہ ہے کہ اسمیں ایسے مضامین داخل رہیں کہ جو داخلی یعنی سبجکٹو (Subjective) انداز رکھتے ہیں اور اگر خارجی (Objective) رنگ رکھتے بھی ہوں تو داخلی انداز سے آمیزش پائے ہوں اگر لیرکس میں شاعر اس آمیزش کیساتھ خارجی مضامین کو حوالہ قلم نکرے گا تو اوسکا کلام بے مزہ ہوگا یہی سبب ہے کہ بعض فارسی اور اردو شعرا کی غزل سرائی مطبوع نہیں معلوم ہوتی ہے ایسے غزل سراؤں نے برخلاف تقاضائے غزل سرای مضامین خارجی کو بلا آمیزش رنگ داخلی اپنے کلام میں جگہہ دی ہے جسکے سبب سے اُن کی اکثر غزلیں روکھی سوکھی درد سے خالی بے اثر اور محض بے کیف معلوم ہوتی ہیں۔ لیرکس اور غزل سرائی کے لئے ضرور ہے کہ واردات قلبیہ اور پُرتاثیر امور ذہنیہ حوالہ قلم کئے جائیں اسطرح کی شاعری کے لئے شاعر کو اپنا عالم درونی کافی ہوتا ہے اُسے کوئی حاجت نہیں ہے کہ اپنے احاطۂ ذہنیہ سے باہر جائے۔ اسکا ذہن ہی اوسکی دنیا ہوتا ہے اُسیکے اندر وہ سب کچھہ دیکھتا ہے اور جو کچھہ دل کی آنکھہ سے دیکھتا ہے اُسے حوالہ قلم کرتا ہے جتنے اوسکے کلام ہوتے ہیں اُسکے واسطے کلیات کا حکم رکھتے ہیں گو اُسکے وہ کلام کلیات کے طور پر دیگر افراد انسانی کے امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ پر بھی صادق آئیں بالمختصر لیرکس یا غزل سرائی کو عالم خارج سے بہت کم تعلق ہے اسکی شاعری شخصی انداز رکھتی ہے یعنی جو کچھہ شاعر پر گزرتی ہے یا جو کچھہ اوسکی واردات قلبیہ ہوتی ہیں اُنہیں کو قلمبند کرتا ہے

اور شروع سے آخر تک انکا کام یہ ہے کہ خود سرائی کو ہمیشہ پیش نظر رکھے اور جو کچھ موزوں
کرے اسمیں اپنے کو نہ بھولے اپنے تشخص یا پرغیر تشخص کو قایم نکرے ورنہ اسکا کلام بے تاثیر
ہوگا اسی صلاحیت کی بدولت حافظ خواجہ میر درد میر تقی مومن اور غالب کے کلام
اسقدر پرتاثیر دیکھے جاتے ہیں۔ ان شعرا نے اپنی ذاتی واردات قلبیہ کو تحریر نکیا ہوتا تو
انکے کلام کو کبھی اسقدر مقبولیت نہ ہوتی۔ ان شعرا کا ایک ایک مصرع یوں اٹھتا ہے کہ میں حافظ
ہوں۔ میں درد ہوں۔ میں میر ہوں۔ میں مومن ہوں۔ میں غالب ہوں۔ فطرت نے
ان کو وہ رتبے ایسے شعرا کو غزل گوئی بنانے کے وقت انکے کانوں میں غزل گوئی کا گراں
انظول میں سکھلا دیا تھا کہ غزل سرائی کا دوسرا نام خودسرائی ہے بر خلاف اسکے رزمی
شاعری یعنی ایپک (Epic) سے کہ جسمیں شاعری کو اپنی ذاتی حیثیت سے بہت
کنارے ہونا پڑتا ہے اور کلیات سے جزئیات کیطرف رجوع لانا پڑتا ہے۔ جو لوگ
ایشیائی اہل اسلام میں یہ شاعری بیشتر مثنوی کی شکل میں دیکھی جاتی ہے جیسے شاہنامہ
فردوسی سکندرنامہ نظامی حملہ حیدری وغیرہ یا جزئیات کیصورت میں جیسے بیانات
مراثی میر انیس و مرزا دبیر علی الخصوص مثنویاں انکی۔ بہرحال ایک شاعر جس شاعر کو چند
مضامین عالم خارج سے لینا ہوتے ہیں اسیقدر کسی عالم درونی سے بھی اختیار کرنا
پڑتا ہے پھر دو نوں کی آمیزش بھی اسے کرنا ہوتی ہے مختلف افراد انسانی کے جو شخصی
تقاضے ہوتے ہیں انہیں نمودار کرنا رزمی شاعر کا کام ہے۔ رزمی شاعری اسی کی متقاضی
ہوتی ہے کہ شاعر خودی کو جہاں تک ممکن ہو بھول جائے اور اپنے تشخص پر غیر اشخاص
کو قایم کرے جیسا کہ ہومیر نے ایلیڈ میں تمام تر اپنے کو اپنی ذاتی حیثیت سے
کنارے کیا ہے اور جتنے اشخاص کا ذکر کیا ہے انکے جزئی اور مختص حالات درونی و
برونی کو قلمبند کیا ہے یعنی ہر شخص کی تصویر جیسی درکار تھی کھینچی ہے مثلاً اگر اکلیز کو بیان
کیا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اکلیز ایک شخص محض علیحدہ انداز کا یولیسس وغیرہ
سے ہے۔ اور جہاں ہلن کو بیان کیا ہے تو وہ اینڈرومیکی سے بالکل ایک جدا انداز کی
عورت معلوم ہوتی ہے۔ اسی طور پر ہر خاص شخص کے خاص معاملات کو اس طور پر

رزمی شاعری

دکھلایا ہے کہ وہ معاملات خواہ درونی اور خواہ بیرونی ہوں سوا ایک شخص خاص کے دوسرے
شخص پر صادق نہیں آتے ہیں اس طرز بیان کو کیرکٹر نگاری کہتے ہیں کیرکٹر
زبان انگریزی میں ایسے طور اطوار کو کہتے ہیں جو ایک شخص کو دوسرے شخص سے ممیز
کرا دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں یہی کیرکٹر نگاری ہے جسنے میر انیس کی شاعری کو بیحد
ممتاز بنا رکھا ہے یہی کیرکٹر نگاری ہے کہ جسنے بالمکی اور بیاس کو مشہور عالم کیا ہے اور
یہی کیرکٹر نگاری ہے کہ جسکی عدم موجودگی سے فردوسی کی شاعری ہومیروس ورجل ملٹن
بیاس بالمکی اور میر انیس کی شاعری کو نہیں پہونچتی ہے۔

واضح ہو کہ ہومیروس کی کیرکٹر نگاری اس درجہ کی نظر آتی ہے جو نہایت اعلیٰ درجہ کی
ڈراما نگاری کے لئے درکار ہے ڈراما (ـــــ) بزبان انگریزی ناٹک کو
کہتے ہیں یہ ایک نہایت اعلیٰ قسم کی شاعری ہے رزمی شاعری اور ڈرامے کی شاعری
میں فرق یہی ہے کہ رزمی شاعری سے زیادہ ڈرامہ کی شاعری میں جزئیات معاملات
انسانی کا لحاظ رکھنا درکار ہوتا ہے اور افراد انسانی جو کسی ڈرامے سے متعلق
ہوتے ہیں انکے پورے کیرکٹر کو انکے ہر جزوی افعال و اقوال کے مطابقت
کیساتھ حوالہ قلم کرنا ہوتا ہے علاوہ اسکے رزمی شاعری میں شاعر کسی قصہ کو بسبیل نقل
حکایت بیان کرتا ہے اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اُس قصہ کے افراد انسانی کے
کیرکٹروں کو ملحوظ رکھکر اپنے بیان کو جلوہ دیتا ہے۔ ڈرامے میں وہی قصہ بسبیل نقل
حکایت نہیں بیان ہوتا ہے بلکہ وہی افراد انسانی جو اُس قصہ سے متعلق رہتے
ہیں تا وسعت تعلق ذاتی اپنے اقوال و افعال سے اُس قصہ کو خود بیان کرتے ہیں
قوت تخیل سے شاعر اپنے کو ہر فرد کا قائم مقام بناتا ہے اور جیسے وہ افراد ہوتے ہیں
ویسا ہی اپنے کو قولاً و فعلاً دکھلاتا ہے۔

غرض ڈراما یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم نصیب ہو وعظ و موعظت سے بھی
وہ کام نہیں نکل سکتا ہے جو اس شاعری سے ظہور میں آسکتا ہے۔ شاعر ڈراما نگار کا
یہ کام ہے کہ کسی ممتاز قصہ حکایت یا واقعہ کو اس طرح بیان کرے جیسا کہ فطرتاً اُسکے

بیان کی متقاضی ہی تاکہ اُسکے بیان سے معاملات عالم کا فطری انداز ہویدا ہوسکے۔
ڈراما منتہاے شاعری ہے اور کوئی شخص ڈراما نگار نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ جزئیات
معاملات دنیا سے فطری اصُول کے ساتھ باخبر ہو ڈرامے کے لئے قصہ یا حکایت
یا واقعہ کا اسقدر اہم ہونا ضرور ہے کہ وہ معمولی حیثیت کے معاملات سے ارفع ہو اور
خاتمہ اُسکا کوئی نتیجہ معقول جو خواہ مسرت خیز اور خواہ الم انگیز ہویدا کرسکے۔ جو ڈراما مسرت
خیز نتیجہ پیدا کرتا ہے اُسے بزبان انگریزی کامیڈی (Comedy) کہتے ہیں اسکی مثال
شیکسپیر کا وہ پلے (Play) ہے جسکا نام کامیڈی آف ایررس (Comedy of
Errors) ہے پلے بزبان انگریزی ایک ایسے پورے قصہ کو کہتے ہیں جو بشکل
ڈراما لکھا گیا ہو۔ اس خاص پلے کا خاتمہ مسرت وانبساط پر ہوا ہے لیکن وہ ڈراما جسکا نتیجہ
الم انگیز ہو اُسے بزبان انگریزی ٹریجیڈی (Tragedy) کہتے ہیں اسکی مثال شیکسپیر
کا وہ پلے ہے جسکا نام ہیملٹ ہے چونکہ زبان عربی و فارسی میں ڈراما نگاری نہیں دیکھی جاتی
ہے اسواسطے کوئی مثال کسی پلے کی پیش نہیں کیجاسکتی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ صنف شاعری
ایشیائی مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی ہے علاوہ افسوس کے بہت جاے تعجب ہے
کہ اہل اسلام نے یونان کے تمام علوم و فنون کو اختیار کیا مگر اُن کی شاعری کیطرف توجہ
نہیں کی اگر کرتے تو ضرور یونانی ڈراما نگاروں کے طریقہ شاعری کو اختیار کرتے۔ اس عدم توجہ
کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب اپنے کو معاملہ شاعری میں کسی قوم سے کم نہیں سمجھتے
تھے اسواسطے غیر قوم سے اکتساب شاعری کو بیکار جانا یا یہ کہ چونکہ اہل اسلام اہل یونان کے
مذاق بت پرستی سے بہت دور تھے اور اہل یونان کی شاعریاں اس مذاق سے مملو تھیں
انہوں نے یونانی شاعری کی طرف توجہ کرنا خلاف مصالح مذہبی سمجھا۔ خیر جو سبب ہو،
جب اہل عرب نے معاملۂ شاعری میں کسیطرح کی اعانت بیرونی کو روا نہ رکھا تو اہل
فارس نے بھی اپنے ملکی انداز شاعری پر قناعت کی پھر بیچاری اُردو جو فارسی کی محض
متتبع ہی بھلا کیا انحراف و رزی اختیار کرتی۔ اہل اسلام کا ڈراما نگاری کو اختیار نہ کرنا
افسوس انگیز امر ہے بلاشبہ اُنہیں اس صنف شاعری کے اختیار کرنیکا موقع برابر ملتا گیا

اسپر بھی وہ اسکی طرف مائل نہوئے - اول تو اُنہیں علوم یونان سی سابقہ پڑا - دوم یہ کہ اہل اسلام
ہندوستان میں آئے اور حکمران ہندوستان ہوکر ہندؤں سے شیر وشکر ہوئے اور اون کے
محصل اور ممتاز اشخاص جیسے فیضی اور عبدالرحیم خانخانان اور علامہ بدایونی وغیرہ علوم سنسکرت
سی بہرہ مند ہوتے گئے اسپر بھی اُنمیں سے کسی نے ڈرامانگاری کیطرف توجہ نہیں کی - حالانکہ
سنسکرت کی ڈرامانگاری اُس درجۂ کمال کو پہونچی ہوئی تہی کہ اہل یونان کی ڈرامانگاری کا
جواب ہورہی تہی بلکہ اُس سے بہی شیئًا زاید بڑہی ہوئی تہی اور اسلیئے بلا گفتگو بہت قابل
توجہ متصور تہی - لاریب اہل اسلام اس صنف شاعری کو رواج دینے کے مواقع برابر
پاتے گئے مگر افسوس ہی کہ عہد ماضی میں اسکی طرف مائل نہوئے اگر کاش اسکی طرف اُنہوں نے
توجہ کی ہوتی تو اسوقت اسلامی شاعری اہل یونان اہل روم یا اہل ہند کی شاعری سے
بلند پائگی میں کم نہوتی - بہرحال جائے مسرت یہ ہے کہ اب ملک ایران میں ڈرامانگاری
کی ابتدا ہوئی ہے خوب ہوا گر شعرای حال کے اس صنف شاعری کی طرف متوجہ ہونے
سے فارسی کی شاعری کا تکملہ ظہور میں آئے - واضح ہو کہ ڈرامانگاری کے بغیر کسی زبان
کی شاعری درجۂ کمال کو نہیں پہونچ سکتی ہے - اگر اہل فارس کو ڈرامانگاری کا مذاق
پیدا ہوا تو امید قوی ہے کہ شعرای فارسی کی نامطبوع مبالغہ پردازیاں بہی رخصت ہوجائنگی
کسواسطے کہ ڈرامانگاری میں تبعیت فطرت کی بڑی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ تبعیت
فطرت منافی مبالغہ پردازی ہے فارسی کی شاعری جو مبالغہ پردازیوں کے باعث معیوب
ہورہی ہی نہایت اصلاح کی حاجت رکہتی ہے - اسکی اصلاح ڈرامانگاری کے بغیر غیر ممکن
الوقوع ہے - خیر اگر اب بہی اہل اسلام ڈرامانگاری کی طرف میل فرمائیں تو بہت غنیمت
ہی - اسوقت تک کی اُنکی ناتوجہی بہت حیرت خیز امر ہے - جاننا چاہیئے کہ ڈرامانگاری شاعری
کا خاتمہ ہی - زبان سنسکرت میں ڈرامانگاری ایسے اعلی درجہ کی دیکہی جاتی ہے کہ بہت محققوں
کی یہ رای ہے کہ اب تک کسی قوم نے چہ ماضی وچہ حال اس صنف شاعری میں اُسکے برابر ترقی
نہیں کی ہی - یورپ میں بلکہ تمامی دنیا میں شیکسپیئر شاعر انگلستان بہترین ڈرامانگار سمجہا جاتا ہی
اور واقعی اوسکی ڈرامانگاری کچہہ ایسے الہامی درجہ کی معلوم ہوتی ہے کہ اوسکے کمالات

کو دیکھکر عقل انسانی مبتلائے حیرت ہوتی ہو مگر اب بعد تحقیق ایسا معلوم ہونے لگا ہو کہ زبان سنسکرت کا ڈراما نگار شاعر کالی داس یا شیکسپیئر ہیوسی یا شیکسپیئر ہی بلند تر رتبہ رکھتا ہے۔ اسی سے سنسکرت کی شاعری کے رتبہ کو قیاس کرنا چاہئے کہ اس زبان میں کالی داس سا ڈراما نگار دیکھا جاتا ہو اور بیاس مصنف مہابھارت اور بالمیکی مصنف رامائن سے رزمی شاعر پائے جاتے ہیں بخیال راقم کسی زبان میں سنسکرت سی بہتر شاعری نہیں دیکھی جاتی ہے خاصکر ڈراما نگاری کہ کہیں جواب نہیں رکھتی ہے۔ اسکی رزمی شاعری کا بھی جواب کمتر نظر آتا ہے۔ ہومر اور ملٹن بیاس اور بالمیکی کے پورے جواب نہیں ہیں ہاں اگر کوئی شاعر جواب میں پیش کیا جاسکتا ہو تو میر انیس ہیں کاش اگر کوئی ڈراما نگار اردو کا شاعر اسی درجہ کا جس درجہ کے میر انیس رزمی شاعر گزرے ہیں زبان اردو میں گزرا ہوتا تو لاریب دنیا میں سنسکرت کی شاعری کے بعد اردو ہی کی شاعری کا درجہ ہوتا۔ اس صنف شاعری کی معدومی سے عربی فارسی اور اردو کی شاعریاں نامکمل حیثیت رکھتی ہیں۔ بالخصوص معدومی ڈراما نگاری سے کامیڈی اور ٹریجیڈی کی مثالیں ڈراموں کی صورت پر عربی فارسی اور اردو کی شاعریوں سے پیش نہیں کیجا سکتی ہیں لیکن کامیڈی اور ٹریجیڈی کے انداز کو سمجھانے کیواسطے بعض مثنویوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے جو اگر بوضع ڈراما لکھی جاتیں تو کامیڈی اور ٹریجیڈی کی شکلیں پیدا کرتیں مثلاً مثنوی یوسف زلیخا کہ جسمیں ایک ایسے قصہ کا بیان ہو کہ جسکا نتیجہ مضامین مسرت انگیز پر مل ہو یعنی وہ قصہ پہلے حضرت یوسف کی پریشانیوں کو اور حضرت یعقوب کے مبتلائے رنج و آلام ہونے کو بیان کرتا ہے اور آخرکار حضرت یوسف کے ثروت کو پہونچنے اور حضرت یعقوب کے ملنے سے خبر دیتا ہے ایسا قصہ کہ جسکا خاتمہ یہ ہو کہ پیری بود پسرے داشت گم کردہ بود باز یافت سوائے مسرت انگیز ہونیکے اور کیا ہو سکتا ہو اسی پر مثنوی میر حسن کے قصہ کو بھی قیاس کرنا چاہئے کہ وہ بھی ایک پیرایہ خاص میں حضرت یوسف اور حضرت یعقوب کا قصہ ہے اور اسی لئے اس قصہ کا خاتمہ بھی خوشی اور مسرت پر ہوتا ہو بخلاف اسکے قصہ شیرین و فرہاد ہی جو پوری شکل ٹریجیڈی کی رکھتا ہے اور جس سے حزن و ملال کے سوا کوئی دوسری کیفیت منتج نہیں ہو سکتی ہے لیلیٰ مجنوں کے قصہ کا

دایی انداز ہی اور راسخ کی وہ مثنوی بھی جسکا نام راز و نیاز ہے یہی پیرایہ رکھتی ہے۔

لیرک (Lyric) ایپک (Epic) اور ڈراما (Drama) کے علاوہ شاعری کی ایک قسم ہے جو بشکل مثنوی ہوتی ہے اور اس سے مراد اخلاق آموزی ہے اس شاعری کو بزبان انگریزی ڈائی ڈیکٹک (Didactic) کہتے ہیں اس شاعری سے نصایح پند وغیرہ متعلق ہوتے ہیں اسکی مثالیں سعدی، سنائی، مولوی رومی علیہم الرحمۃ کے کلاموں میں افراط کے ساتھ موجود ہیں امیر المومنین علی علیہ السلام کے اشعار بھی بیشتر یہی رنگ رکھتے ہیں۔ انگریزی شعرا میں ورڈزورتھ (Wordsworth) ڈرائیڈن (Dryden) اڈیسن و پوپ (Pope) وغیرہ بھی ڈائی ڈیکٹک یعنی اخلاق آموز مذاق رکھتے ہیں۔ یہاں پر قابل ذکر شاعری کی وہ قسم بھی ہے جسے بزبان انگریزی پیسٹورل (Pastoral) کہتے ہیں اس شاعری کا تقاضا یہ ہے کہ وہی طریقہ زندگانی کا بیان عمل میں آئے یعنی کسان و چوپان کسطور پر زندگی کرتے ہیں انکے مشاغل کسطرح کے ہوتے ہیں اور انکے ارادات و خواہشات کیا انداز رکھتے ہیں۔ یہ باتیں اس صنف شاعری میں حوالہ قلم ہوتی ہیں شاعر اپنے معاملات کو کسان و چوپان کے پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے۔ اس قسم کی شاعری کی مثالیں یورپ کے شاعروں کے کلام میں بہت ہیں۔ انگریزی شاعروں میں پوپ (Pope) نے اس رنگ میں بہت شعر کہے ہیں یہ مذاق قبل بعثت آنحضرت صلعم کے شعرای عرب میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ اہل عرب میں اس مذاق کا موجود ہونا کوئی جائے تعجب نہیں ہے کیواسطے کہ بیشتر اہل عرب تقاضاے ملکی چوپان پیشہ تھے اور اب بھی ہیں۔ اس صنف شاعری سے ایک گونہ مناسبت وہ شاعری بھی رکھتی ہے جو زراعتی اور باغبانہ مذاق رکھتی ہے یونانیوں میں اس مذاق کا شاعر ہیسیڈ (Hesiod) تھا اور اس صوبہ بہار میں وہ طبیعت دار زراعت پیشہ شخص تھے جو گھاگ اور ڈاک کے نام سے مشہور رہے ہیں۔

منجملہ اقسام شاعری کے ایک قسم شاعری کی مدح اور دوسری قدح ہے ان دونوں اصناف شاعری کی مثالیں ہر زبان میں بکثرت موجود ہیں اردو میں ان دونوں قسموں کی شاعریاں مرزا رفیع سودا سے بڑھکر کسی نے نہیں کی ہیں۔ اس جگہ یہ عرض کردینا ضرور ہے کہ شاعر مدح میں

اخلاقی شاعری

پیسٹورل شاعری

زراعتی شاعری

مدح و قدح

ایسی مبالغہ پردازی کو راہ نہ دے کہ اسکا کلام احاطہ فطرت سے باہر معلوم ہو اور نہ قدح میں اسقدر جانب تہذیب
پیرایہ اختیار کرے کہ طبیعت کو تنفر پیدا ہو اگر مرزا سودا ان دونوں باتوں کو مدح و قدح میں
مدنظر رکھتے تو انکی مدح گوئی اور ہجوگوئی کا جواب کہیں دنیا میں نہ ملتا۔ شعرای یورپ بھی طریقہ
مدح و قدح کو اختیار کرتے گئے ہیں مگر فحش سے انکی تحریریں کمتر آلودہ نظر آتی ہیں۔
اصناف شاعری سے مرثیہ نگاری ایک نہایت عمدہ صنف ہے مرثیہ نگاری سے یہاں مراد صرف وہ
مرثیہ گوئی نہیں ہے کہ دوستداران خاندان پیغمبر مصایب اہلبیت علیہم السلام کو شاعرانہ پیرایہ میں
بیان کرتے ہیں بلکہ تمام دیگر ایسے منظوم و غیر منظوم بیانات جو سرمایہ رنج و الم ہونیکے باعث اظہار غم و
حسرت کیساتھ احاطہ تحریر میں درلاتے ہیں۔ مثلاً شاعر اپنے کسی دوست کے مرنیکا اور کسی شخص کے مبتلاء
آفات ہونیکا مرثیہ لکھ سکتا ہے یا کسی غم انگیز معاملہ کہ جیسے جہاز کا ڈوبنا مکان میں آگ کا لگنا
وغیرہ ہے قلمبند کر سکتا ہے۔ اسطرحکے مرثیے شعرای یورپ و ایشیا اکثر لکھتے گئے ہیں گرے (Gray)
شاعر انگریزی نے ایک مرثیہ ایک دہات کے گورغریباں کے بیان میں لکھا ہے یہ مرثیہ دیدنی ہے اسطرح
حکیم قاآنی نے ایک مرثیہ ایک امیرزادی نا کتخدا کی وفات میں نہایت سوز و درد کے ساتھ موزوں
کیا ہے دو شعر اس مرثیہ کے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں انکی پرتاثیری محتاج بیان نہیں ؎

بہر بہار گل از زیر گل بر آرد سر		گلے برفت کہ ناید بعد بہار دگر
گلے برفت کز امروز تا بدامن حشر		گلاب اوست کہ جاری بود ز دیدہ تر

واضح ہو کہ یوں تو مرثیہ نگاری ہر زبان میں دیکھی جاتی ہے اور مذہبی مرثیہ نگاری بھی ہر قوم میں کم و بیش
طور پر مروج رہی ہے لیکن مذہبی مرثیہ نگاری جیسی اسوقت اردو میں موجود ہے کسی زبان میں نہیں
پائی جاتی ہے۔ ہرچند اردو فارسی کی خوشہ چین کہی جاتی ہے مگر اس صنف شاعری میں فارسی
سے بہت زیادہ ترقی کر گئی ہے۔ ترقی کی یہ حالت ہے کہ فارسی کی شاعری کا تو کیا ذکر اس
مرثیہ نگاری کی بدولت اردو کی شاعری اہل یونان اہل روم اہل ہند اہل انگلستان
کی شاعریوں کا سامنا کرنے کو مستعد نظر آتی ہے۔ اس ترقی عظیم کے باعث میر انیس
ہوئے ہیں کہ جنکی بدولت زمین شاعری آسمان سے بھی بلند تر دکھائی دیتی ہے۔ فقط
(ماخوذ از بیاض حسرت)

ہر ایک دل و جاں کے مرغوب نظر آئے | میر حسن | میں خوب تمہیں دیکھا تم خوب نظر آئے

حضرت طاہر فرخ آبادی کے نام

شفیق یادآور مخلصان سلامت۔

سلام مسنون۔ غدر میں اموال ہی تلف ہو گئے جانیں ہی سینکڑوں ضائع گئیں یہ تو ادنے کیفیات تھی مگر تجربے سے معلوم ہوا کہ غارتگروں نے ہمتیں ہی لوٹ لیں صفات قدیمہ بھی خیرباد کہکر سدھار گئے محبت کا نشان بھی باقی رہا ہمدردی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی قوتیں سلب ہو گئیں حافظے کام کے نہیں باقی رہے میرا بھی یہی حال ہوا حافظہ میں مطلق قوت نہیں رہی اسی زمانے سے ریاست رام پور کو چلا جانا ہوا وہاں جاکر دنیا ہی نئی دیکھی اور رئیس کی التفات نے شب و روز میں کسی ساعت کو خالی نہ چھوڑا معہذا سبب تاہل کے اپنے انکار نے بھی کچھ حصہ وقت کا دبا لیا اسوجہ سے فرصت نہ ملی کہ یاران قدیم و مخلصان صمیم کو یاد کرتا اور یہی باعث ہوا کہ آپ کو بھی کبھی کچھ لکھہ نہ سکا۔ اب مخدومی محترمی جناب حکیم محتشم علی صاحب کے ذریعے مدت دراز کے بعد آئینہ رابطۂ قدیم کا زنگ چھوٹا اور نئی جلا دیکھی یعنی آپکا عنایت نامہ جسمیں کچھ فقیر کا ذکر ہو ملا۔ سنے سو چکر آپ کی تصویر خیالی ذہن میں کھنچی اور محبت دیرینہ کا مزا اٹھایا ؎

اے وقت تو خوش کہ وقتا خوش کردی

رہنما انبار بندہ زادۂ کلاں نے بے شغلی سے تنگ آکر جاری کرنیکا قصد کیا ہے دو اشتہار اسکے بھی بھیجتا ہوں اور گلدستہ بعض احباب نے شائع کرنیکا ارادہ کیا ہے یہ بھی بتقاضائے ؎

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

انکی خاطر سے حتی الوسع اعانت کرنیکا وعدہ کر لیا ہے۔ فقیر زادہ یعنی منشی محمد احمد میرے حکم کے موافق اسکے انصرام کا کفیل ہوا ہے اسکے بھی چند قطع اشتہار بھیجتا ہوں۔ کساد بازار ان چیزوں کی قدردانی کا بیشک آپ کی تحریر سے بھی زیادہ ہے مگر تاہم ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست　　خم و خمخانہ با مہر و نشاں ست

تلاش و کوشش ہو گی تو بہت نہ سہی تھوڑے ہی سہی قدرشناس پیدا ہو جاینگے یہ تحریر فرمانا آپ کا کہ میرا کلام اساتذہ کے اشعار کے سامنے کیا وقعت پیدا کرے گا دلیل کمال ہے

اس لیے کہ کمال آدمی کو ضرور ہی منکسر کر دیتا ہے امید ہے کہ اس گلدستے کو اپنا ذاتی گلدستہ تصور فرماکر ہمیشہ اسکی حسن افزائی ملحوظ رہے اور کلام تازہ انتخاب کے بعد عنایت ہوا کرے۔

ثم التسلیم۔ آثم امیر احمد عفی عنہ۔ محمد احمد تسلیم گزار ہے۔

لکھنؤ۔ کرلہ ابو تراب خاں

مصاحبت ادبیہ
(Literary gossip)

(۱) اُردوی معلیٰ کہاں ہے؟

اس سلسلہ میں علم ادب کے ایک ادنے شیدائی کے پُر ان خیالات و ملاحظات کو کبھی کبھی قید کرنے کی کوشش کیجائیگی۔ گاہ بیگاہ کے مصاحبوں میں مجھے بھی شمار کیجئے۔

میں ادب کا ادنی اور گمنام شیدائی ہوں، اور اُسپر ستم یہ ہے کہ مجبور اور وطن سے دور! تاہم، زبان اور ملک کی محبت جو دلمیں جاگزیں ہے، وہ اسبات پر مجبور کرتی ہے کہ بیابان عرب میں بیٹھکر دل کی بہڑاس نکال لیا کروں: ؎

عالم ہو میں کچھ آواز سے آجاتی ہے		چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دلکا

کبھی آپ کو یہ تمنا بھی ہوئی ہے کہ آپ کو میرؔ، دردؔ، انشاؔ و مصحفیؔ کی صحبتیں نصیب ہوئی ہوتیں؟ میرے دلمیں ایسے خیالات اکثر گذرے ہیں۔

وہ صحبتیں تو ناممکن ہیں، مگر اب بھی کبھی کبھی، ایسے لوگ ملجاتے ہیں جنپر نہ نئے زمانہ کا رنگ چڑھا ہے اور نہ اُن کی زبان پر نئے زمانہ کے الفاظ۔

فرخ آباد میں ایک صاحب رہتے تھے جو لکھنؤ کے آخری رنگیلے دور کی یادگار تھے وہ سال

ان کی آنکھوں میں کچھ ایسا بسا ہوا تھا کہ نئی چمک انہیں نہ لبھا سکتی تھی وہ اُس زمانہ کو حسرت سے یاد کیا کرتے تھے، اور اُسکے حالات دل تھام تھام کے بیان کیا کرتے تھے۔

اور کس زبان میں؟ ہماری کج مج ژولیدہ زبان میں نہیں کہ مطلب ادا کرنا چاہتے ہیں اور نہیں ہوتا، بلکہ اُس پیاری چٹپٹی دار زبان میں جو پچھلی نسل کے ساتھ زمین کے دو گز نیچے دب گئی اور سطح زمین پر ایک جانشیں چھوڑ گئی، جسے اُس سے اتنی ہی مغائرت ہے جیسی نئی نسل کو پرانے وقت کے لوگوں سے۔

یہ زبان، اور یہ لوگ اب ہندوستان میں کمیاب ہیں۔ مگر لکھنؤ کے عہد شباب کی زبان سُننا منظور ہے تو ہندوستان سے باہر سفر کیجئے، اور عربستان میں آیئے۔ اُردو سے معلّے، کربلائے معلّے میں ہے!

غدر میں، یا غدر سے پہلے، کچھ معزز خاندان ہجرت کرکے کربلا میں آ بسے تھے۔ ان لوگوں کی زبان سنئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کیں اور طے زمان و مکان کرکے، سودا و آتش کی محفلوں میں پہونچ گئے۔ ان لوگوں کی زبان پر نئے اصطلاحات، نئے محاورے نہیں چڑھے ہے۔ ریل، تار، جج، کلکٹر، کانگرس، کانفرنس سے ناآشنائی ہے۔ وہی آتیاں، اور وہی جاتیاں ہیں، وہی کتو، نپتو ہے۔ غرضکہ کچھ عجب پُر لطف عالم ہے۔

حضرت حسرت موہانی کہاں ہیں؟ وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں، (کیونکہ اُردو کی پاکیزگی کے دلدادوں کے لئے یہ بہشت ہی ہے) وہ اپنے موجودہ مباحث کو جسمیں اُردوئے معلّے نے اسقدر ہاتھ پاؤں نکالے ہیں، چھوڑ کر آئیں اور دیکھیں اور سُنیں۔

مگر افسوس کہ یہاں بھی یہ یادگار رفتگان جماعت چراغ سحری ہے۔ موت کا فرشتہ

انہیں ہندوستان سے ڈھونڈھتا ہوا، یہاں آپہنچا ہے، اور یہ لوگ یہاں سے بھی ہجرت کر کے، اُس ملک کو جارہے جہاں غالب، وذوق، آتش و مصحفی، میر و سودا، اور اب داغ بھی محفل سخن جمائے بیٹھے ہونگے۔ فقط۔ (یلدرم)

دار السلطنت فرانس کی مختصر تاریخ

پیرس دنیا کا عجیب و غریب شہر ہے لوگوں نے "ملکہ جادو نگار و عروس شیریں ادار۔ نفاست مجسم و ہمہ تن شوکت و شان" کے پاکیزہ القاب سے یاد کیا ہے اسی جگہہ واقع ہے جہاں ایک زمانہ میں دلدل ہی دلدل تھا۔ ہپاپوٹمس (Hippopotamus) ہاتی اور دیگر خوفناک درندوں کا یہاں ملجا و ماوا تھا۔ گرد و نواح کے پہاڑ۔ خاصکر منمیٹر (Montmartre) میں بکثرت قدرتی و مصنوعی غار تھے جہاں وحشی آدمی۔ شیر اور ریچھ وغیرہ اپنا مسکن سمجھتے تھے اب تک کہیں کہیں غاروں میں ان آدمیوں اور جانوروں کی ہڈیاں ملی جلی پائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں ملک گیری کے لئے بہت کچھ جنگ و جدال ہوئی ہوگی۔ یہ شہر اتنا قدیم ہے کہ صحیح طور پر نہیں معلوم کہ کس نے اسکی بنیاد ڈالی سنہ عسوی سے پچاس برس قبل جب روما کے شہنشاہ جولیس سیزر نے ممالک غرب پر حملہ کیا تو اُسوقت بھی یہ ایک خاصی حیثیت کا شہر تھا۔ اسکا قدیم نام لوٹیشیا ہی (Lutetia) اور شصت و چہار اقوام گیلیا میں (Gaulia) سے قوم پیریسی آئی (Parisii) کا جو جزیرہ دریائے سین (Seine) میں آباد تھی یہ شہر دار السلطنت تھا۔

سیزر (Caesar) نے جب اسے فتح کیا تو اہل روما کے زیر حکومت اسنے دن دونی رات چوگنی ترقی شروع کی اور ابھی پچاس برس بھی نہ گذرنے پائے تھے کہ ایک دوسرا قریب کا جزیرہ بھی اسمیں شامل ہوگیا اور سو برس کے اندر ہی اندر اسکی آبادی ایک لاکھ تک پہونچ گئی۔ قوم پیریسی آئی (Parisii) کی آبادی یہاں زیادہ تھی اور یہ لوگ اسقدر مضبوط اور ضدی طبیعت کے تھے کہ فتوحات روما سے دو سو برس تک بھی ان کے دل سے عناد و مخالفت کی

مکتوبات امیر مینائی

مرتبہ ثاقب

حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی کے نام

پیارے کوثر کئے روز ہوئے ایک کارڈ لکھ چکا ہوں اسکے جواب کا انتظار ہے مجھکو اتنی فرصت اور اطمینان نہیں کہ آپ کے خطوط کے جملہ مطالب پر نظر کروں اور ہر ایک بات کا جواب لکھوں اول غزل آج دیکھ لی بھیجتا ہوں آپ صاف کر کے گلچیں میں بھیجئے۔ زیادہ کیا لکھوں۔ پریشانیاں بڑھی ہوئی ہیں اللہ تعالی رحم فرمائے۔ تجلیل آہ تسلیم رساں ہیں۔

امیر فقیر۔ ۲۴ر اگست ۱۸۹۲ء

حکیم برہم صاحب اڈیٹر ریاض الاخبار کے نام

رام پور۔ ۵ر ستمبر ۱۸۹۱ء

پیارے برہم۔ سلام و دعا۔ ۳۰ر اگست کا لکھا ہوا خط آیا غزلوں کا پلندہ بھی پہنچا آپ کی بہن کے یہاں چوری ہو جانا اور آپ کے کمرے سے سامان مہمانی احباب اٹھ جانا باعث افسردگی دل ہوا خداوند تعالی حسن نیت کے اثر سے نعم البدل عطا فرمائے۔ وزیر صاحب بہادر کو ایک خط اسیدن روانہ کر چکا تھا جس دن آپکا خط آیا انکا وعدہ تو اس میں یاد دلایا گیا ہے اور اجازت چاہی گئی ہے کہ لطیف میاں وہاں حاضر ہو کر امیدواری کریں اور سلام سے مشرف ہوا کریں۔ انسپکٹری کی تخصیص کر کے لکھنا قبل اسکے کہ اس خط کا جواب آئے مناسب معلوم ہوا اگر وہ خط یاد دہی کا نہ لکھا ہوتا تو آپ کے رائے کے موافق انسپکٹری سلسلے میں جگہ ملنے کی درخواست کرتا۔ برابر برابر دو خط بھیجنے پر خیال آتا ہے کہ مبادا جناب وزیر صاحب کی طبیعت پر گراں گزرے۔ نور عین لیاقت حسین کے واسطے بھی بہت خیال ہے اسواسطے کہ انکا تکفل کثیر اور وہ بہت پریشان ہیں جناب قاضی صاحب کے

مژدۂ صحت سے آپ نے سامعہ نوازی کی میں بہت خوش ہوا میری طرف سے تہنیت صحت کسی موقع پر ادا کیجائے۔ (ج) سے آپکا کچھ بس نہیں چلتا اور وہ جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ ہے۔ اپنی فکر رسا سے کوئی اچھا اور معقول کام لو تو جی خوش ہو۔ یوں میرے بہلا دینے کی تو تمکو ہزار راہیں آتی ہیں جب قلم اٹھاؤ گے بہلاؤ گے دیکھو غزلیں تمہاری دیکھیں۔ قدر کرو ایک ایک اصلاح بہت قدر کے قابل ہے۔ سرسری مت دیکھنا بہت غور کرنا۔ شعر تمنے کئی غزلوں میں بہت اچھے اچھے کہے ہیں وجوہ تصرف اکثر جگہہ تمہارے ذہن سلیم پر اعتماد کر کے نہیں لکھی۔ میں جس حال میں ہوں وہ مشغلۂ شعر و سخن کے بالکل مخالف ہے محض تمہاری خاطر سے تمہاری غزلیں دیکھی ہیں بہتیرے شاگردوں کے کلام سے بھرے پڑے ہیں۔ تم پہلے مجھکو مطمئن کر دو پھر جتنا کلام چاہو بھیجو۔ حکیم صاحب حکمت کی باتیں تمکو بہت آتی ہیں کام کی بات ایک نہیں آتی۔ سچی بات لکھی ہے برہم نہو جانا۔

امیر فقیر

مولوی حبیب الرحمن خانصاحب حسرت شروانی کے نام

سخنور گرامی گہر۔ سلام مسنون اخلاص و سپاس مشحون۔ کرمت نامہ آیا ممنون التفات فرمایا۔ سب سے مقدم آپ کی تحریر جواب سوالات میں آئی جسکو دیکھکر بیحد اں نہایت مسرور ہوا اور واجب ہوا کہ تہ دل سے شکر گذاری کروں۔ اہل الرائے کی رائیں کمیٹی میں پیش ہوکر رد و قبول کا فیصلہ ہوگا ابھی دفتر امیر اللغات میں سکرتری ان کو جمع کرتا جائیگا۔ کمیٹی جب فیصلہ کریگی تو امر منفصل مختار مولف ہوگا۔ میں آخر میں پھر آپ کے عمدہ توجہ کی سپاس گزاری کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ اپنی عمر اور عنوان معاشرت اور جملہ کیفیات سے مجھکو آگاہ فرمائیں اسلئے کہ ممنون اپنی محسن کے حالات سے بیخبر رہے اور رنج کے حالات سے بھی واقف ہوجائے۔

والسلام بالاکرام۔

سراپا تقصیر امیر فقیر۔ ۹ ردسمبر ۱۸۹۸ء

صاحب موصوف کے نام

گرامی گوہرا۔ سلام مسنون اخلاص و دعا مشحون۔ سواد تحریر سراپا تنویر سرمہ کش دیدہ

منتظر ہوں گا ۔کم فرصتی سے جواب نہ دیسکا - کیفیت آپ کی معلوم ہونے سے بہت مسرور ہوا کہ تھوڑی عمر میں بہت کچھ آپنے سیکھا ہے اللہم زد- اگرچہ مجھکو کثرت کار سے فرصت نہتی مگر یہ غزل اور سہرا اپنے دیکھہ دیا اور کچھہ محو و اثبات کیا کہ پہلی بار آپ نے بہیجا ہے اگر عذر کروں تو شاید خاطر نازک پر گراں گزرے - امید ہے کہ مجھہ پیرانہ سال خستہ حال کو آپ اپنی عمر اپنے اقبال اپنے کمال کا ترقی خواہ تصور کریں اور کبھی کبھی یاد فرمایا کریں اور اپنی اب و عم زاد مجد ہما کے خدمت میں میرا سلام کہیں - والدعا -

امیر فقیر مینائی - ۱۹ دسمبر ۱۸۹۸ء -

رسید ضرور لطف ہو تاکہ اطمینان ہو۔

بنام ثاقب کے نام

احسن الاحبا - مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب سلمہم اللہ الواہب -

بعد سلام مسنون اخلاص مشحون کے واضح ہو کہ رافت نامہ مدت کے بعد آیا اور نور و سرور دیدہ و دل بڑھایا - میں آپ کی کس کس عنایت کا شکر کروں کہ مجھہ سے ناچیز کو بایں خوبی و اخلاق یاد فرماتے ہیں اور کوتہ قلمی کا گلہ کرتے ہیں اس شکایت کا شکر بہی ادا نہیں ہو سکتا خداوند تعالیٰ مکارہ سے محفوظ اور لذائذ سے محظوظ رکھے - آمین -

اب میں بصد انفعال عذر کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں خود بہی بیمار رہا اور عزیزوں کا بہی بیمار دار رہا ایک عزیز کا انتقال ہو گیا اسکا ماتمدار رہا انکے علاوہ اور بہت سے مکروہات رہے جنکا بیان نہیں ہو سکتا امید ہے کہ آپ قصور عفو فرمائیں - تذکرۂ انتخاب یادگار حسب فرمائش سرکار مرتب ہوا اور چہپکر سرکار میں داخل ہوا میں اپنی تالیفات کو اس قابل نہیں جانتا کہ ہدیۂ احباب کروں علی الخصوص یہ تذکرہ جسمیں مجھکو حالات تاریخی اور انتخاب اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسے قلم کو دست کاتب میں مگر اب جو آپنے یاد فرمایا تو ضرور ہوا کہ ایک نسخہ بہیجوں تاجر سے کہا ہے عنقریب پہنچیگا اور دونوں تذکرے تہوہالی میرے پاس ہیں آپ انکے بہیجنے کی تکلیف نفرمایئے - اپنے انگلستان جانے کی آپ نے بری سنائی یہ بار عظیم مہاجرت کا مجھہ ناتواں سے کیونکر اٹھیگا خیر خداوند عالم ایسا کرے کہ آپ کو یہ سفر وسیلہ ظفر ہو اور آپ فائز المرام

وہاں سے آکر ہندوستان میں وہ مرتبہ پائیں کہ آپکے خیر طلب امیر فخر کریں زیادہ کیا لکھوں۔

امیر فقیر عفی عنہ - ۲۹ نومبر ۱۸۸۱ء

نور چشم محمد احمد قمر تسلیم رساں ہے۔

بنام ایضاً

کرم گسترا معنی پرورا۔ تسلیم۔ اب کی سال مجھکو محرم کا تمام مہینا محرم کی دسویں کی طرح غم میں گذرا پوچھئے کیوں تو عرض کروں کہ عشرہ ثانیہ میں جو عنایت نامہ آیا اس سے معلوم ہوا کہ میرا وہ نیازنامہ جو مینے بجیر وصد در صحیفہ اولین جواب میں لکھا اور بدیہۃً صبح سیارہ کے تاریخ لکھی اور اسمیں لکھی آپکو نہ پہنچا کاش اسی زمانے میں وہ خط پہنچ جاتا تو تقریظ نہ لکھ سکنے کی شرمندگی مٹتی۔ افسوس ہزار افسوس کہ میری طرف سے تو یہ تعمیل حکم میں جلدی اور آپ کو یہ گمان ہوگا کہ یہ تاریخ لکھنے کو بھی اڑا گیا۔ طرفہ یہ کہ ۱۵ محرم کو جو عنایت نامہ آپ نے لکھا اسمیں یہ لکھا کہ میں یہاں سے وہاں اور وہاں سے کہیں اور جاؤنگا تو جنوری میں مجھے خط لکھنا پس محرم کے مہینے بھر مجھکو یہی رونا رہا کہ الٰہی جلدی یہ غم کے دن گذریں اور آپ سہارنپور پہنچیں۔ اور میں عذر واقعی لکھوں اور پھر تاریخ بھیجوں اور وہ پہنچے تو کچھ آنسو پچھیں۔ الٰہی میری نارسائی بخت آپ کی قوت اقبال پر غالب نہ آسکے اور یہ خط تلف ہونے پائے۔ خیر یہ مطلب تو تمام ہوا۔ سردی کی شدت جو آپنے لکھی ہے سب واقعی ہے ادہر بھی اب کی سال بہت شدت ہے اور میں چونکہ ضعیف البنیان ہوں اس موسم میں اکثر مریض رہتا ہوں سردی ہو خواہ گرمی تری ہو یا خشکی جو کیفیت غالب ہوتی ہے طبیعت اس سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ میر ضامن علی صاحب جلال آئے اور پچاس روپیہ مشاہرے پر نوکر ہوئے مع الخیر مین زیادہ کیا عرض کروں۔ فرصت نہیں ملتی اور لکھتے وقت دل کی دل ہی میں رہجاتی ہے۔ قطعہ تاریخ جو سراسری عرض کیا تہا وہ پھر بھیجتا ہوں پسند کے قابل تو نہیں مگر بپاس خاطر جبراً قبول فرمائے چھاپنے نہ چھاپنے میں اختیار ہے مگر یہ خفگی تو جاسے کہ نہ تقریظ لکھی نہ تاریخ فقط۔ امیر فقیر عفی عنہ ۳ جنوری ۱۸۸۱ء بندہ پرور ابکی بیرنگ خط بھیجنے کا قصور معاف ہو ٹکٹ لگاکر بھیجا تہا وہ نہ پہنچا ابکی علکر بیرنگ لکھا ہے۔ خدانخواستہ یہ بھی نہ پہنچا تو رجسٹری کی نوبت آئیگی فقط

ہو نہ گئی اور آخر کار خود اہل روما کے آپس میں اُنہوں نے پھوٹ ڈال دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۸۶ء میں
رعایا نے بغاوت کی اور غدر کے دو سرغنوں نے، جنمیں ایک پیریسی آئی تھا ([illegible])
اور دوسرا رومن ([illegible]) اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔ یہ بغاوت ایک سال بعد
فرو ہوئی اور اس استحکام کے ساتھ کہ ان دونوں بادشاہوں کے نام صفحات تاریخ تک سے
مٹ گئے۔

شہنشاہ جولین کے زمانہ (۳۳۱ - ۳۶۳ء) تک اس شہر کا نام لوٹیشیا ([illegible])
رہا۔ اب اس بادشاہ نے چاہا کہ موسم سرما کے لئے یہاں ایک محل بنائے اور اہل روما کو لاکر
بسائے اور یہاں کے باشندوں کو اپنے طریقے سکھائے۔ جب اس کوشش میں کامیابی
مشکل معلوم ہوئی تو اس نے لوگوں کو بڑے بڑے حقوق دینے شروع کئے اور اصلی باشندوں
کی تالیف قلوب کے لئے اس شہر کا نام بجائے "لوٹیشیا" کے "پیریسی آئی" رکھا۔ اور در
حقیقت اس طریقے سے اسے کامیابی ہوئی۔ لوگ نہایت خوشی سے جوق جوق آنے
لگے اور بستے گئے اور اب آپس میں ایسا میل جول بڑھا کہ دیسیوں نے پردیسیوں (یعنی رومن)
کا مذہب تک اختیار کرلیا۔ ان تعلقات کی وجہ سے خود شہر نے ایسی ترقی کی کہ رومن ہی کے
زمانہ میں تجارت کی ایک بہت بڑی منڈی بن گیا۔

"پیریسی آئی" کو لوگ اب شہنشاہ جولین کے اصطلاحات کے بعد صرف "پیرس" کہنے
لگے اور جولین کے جانشینوں نے یہاں کئی ایک محل بنائے اور سرما میں یہیں رہنا اختیار
کیا۔ اب بھی ان محلوں کے ٹوٹے پھوٹے نشانات اور مسمار شدہ حماموں کی اینٹ اپنے
بانیوں کی عظمت و جبروت کے یادگار باقی ہیں۔ شمالی اقوام کو پیرس کی یہ ترقی دیکھ کر رشک
ہوا اور سرگردہ اٹیلا (Attila) ۴۵۱ء میں اُنہوں نے اس شہر پر حملہ کیا۔ مشہور ہے
کہ سینٹ جنی ویو (Genevieve) نے جو اپنے زمانہ میں ولی اللہ مشہور تھے ۴۴۹ء
میں قوم ہنس ([illegible]) کے اس حملہ کی خبر دی تھی اور اب جب یہ لوگ اٹیلا
کے ہمراہ شہر کے باہر نظر آئے تو اپنی پیشین گوئی کو پورا ہوتا دیکھکر دعا مانگنے کے لئے
سجدہ میں گر پڑے۔ یہ دعا قبول ہوئی اور ہنس (Huns) بلا حملہ کئے واپس ہو گئے

۴۶۴ء میں شیلڈرک اول (Childeric I) بادشاہ قوم فرنکس (Franks) نے پیرس کا محاصرہ کیا۔ سینٹ جنی ویو (St. Genevieve) ابھی زندہ تھی۔ انہوں نے لوگوں کو ہمت دلائی اور سپاہیوں کو ابھارا لیکن محاصرہ کرنے والوں نے اس سختی کے ساتھ آب و دانہ بند کیا کہ بالآخر اطاعت کرنی پڑی۔ اس زمانہ میں یورپ میں رسم تھی کہ فاتح اقوام مفتوح قوم کا قتل عام کرنے میں زن و بچہ تک کی پرواہ نہیں کرتے تھے مگر اس موقعہ پر سینٹ جنی ویو کی الحاح و منت ایسی کام آئی کہ رعایا قتل عام سے بچ گئی اسطرح شیلڈرک ( ) اول نے پیرس سے رومن اقتدارات کی جڑ اُکھیڑ کر پھینک دی اور جب اُسکا بیٹا کلووی (Clovis) تخت نشین ہوا تو اوسنے مذہب عیسوی اختیار کیا اور پیرس کو رومنس (Romans) کے اثرات سے پاک کرکے خالص فرانسیسی اثر کو بڑھایا۔ جہاں اب ناٹرڈیم ہے (Notre Dame) وہاں اوس زمانہ میں جیوپیٹر (Jupiter) کے نام کا ایک مندر تھا۔ اُسے ڈھاکر پہلا گرجا تعمیر کیا گیا۔ بعد میں شارلیمین نے (Charlemagne) پیرس یونیورسٹی کا پتھر رکھا۔

فرنکس کے زمانہ حکومت پیرس میں رومنس (Romans) نے کئی مرتبہ بہت سخت سخت حملے کئے ایک مرتبہ ایسا سخت حملہ ہوا کہ اگر اوٹو (Otto) المعروف بہ کاؤنٹ آف پیرس (Count of Paris) ایک بہت دولتمند اور صاحب قوت امیر اپنی فوج لیکر مدد کے لئے نہ آجاتا تو پیرس پھر رومنس کے ہاتھ میں چلا گیا ہوتا۔ اوسنے حملہ آوروں کو پسپا کرکے ملک سے باہر نکالدیا اور اس کے صلے میں ۸۸۵ء میں شاہ پیرس بنایا گیا۔ ایک صدی بعد ہوکیپی (Hugh Capet) کو جو اوٹو ( ) کی نسل میں تھا فرانس کا تخت ملا یہ گویا فرانس کا پہلا بادشاہ تھا جسکی اولاد میں لوئی شانزدہم تک تمام بادشاہ ہوئے ہیں۔

سین ۱۰۰۰ء۔ ۸۸۵ء میں پیرس نے نئی صورت اختیار کی اور قوم کا دارالحکومت سمجھا جانے لگا اور کیا بلحاظ دولت و آبادی اور کیا بلحاظ علوم وفنون دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔

۱۱۸۰ء۔ ۱۲۲۳ء میں جب فلپ آگسٹس (Philip Augustus) سریر آرائے تخت

فرانس تہا تو اس عروس پیرس کے بناؤ سنگار میں اُسنے بہت کوشش کی۔ فلپ کو پیرس سے عشق تہا اسلئے اپنی محبوبہ کو غنیم کے دستبرد سے بچانیکے لئے اُسکے گرد ۲۵۲ ایکڑ زمین احاطہ کرکے نہایت مضبوط پتہر کی فصیل تعمیر کی۔ اور اندرون شہر اسپتال اور بازار بنوائے۔ دارالعلوموں کے حقوق میں توسیع کی اور تمام سڑکوں پر پتہر کا فرش کرایا۔

اسکے بعد لوئی نہم (Louis IX) (۱۲۱۵ - ۱۲۷۰ء) کا زمانہ بہی پیرس کی ترقی کا زمانہ تہا۔ یہ بادشاہ علوم وفنون کا بہت شائق تہا۔ اسلئے پیرس نے امور ملکی، تجارت اور علوم وفنون میں بہت ترقی کی اور رابرٹ ڈی ساربون (Robert de Sarbon) شاہی چیپلین نے بادشاہ کی مدد سے ۱۲۵۰ء میں ایک مذہبی دارالعلوم کی بنیاد ڈالی جسے اب تک ساربونی (Sarbonne) کہتے ہیں۔

مگر پیرس کے باشندے روز ازل سے عجب بیچین طبیعت لائے ہیں اُنہیں کسیطرح قرار نصیب نہ تہا۔ اکثر بلوے کرتے، سلطنت کے خلاف جماعتیں قائم کرتے اور بادشاہ کی مخالفت کا علم بلند کیا کرتے تہے۔ فیوڈل سسٹم (Feudal system) جو اس زمانہ میں مروج تہا اوسنے نوابوں اور امرائے دولت کو اور زیادہ سرکش بنا دیا تہا اور عوام کی انقلاب پسند طبیعتیں ان کی آغوش تمرد میں پرورش پاتی تہیں۔ اسلئے اس باغیانہ جوش وخروش کو دوسری طرف متوجہ کرنیکے لئے فلپ چہارم (Philip IV) نے (۱۲۶۸ - ۱۳۱۴ء) میں میلوں اور کہیل تماشوں کو ترقی دی اور پیرس کو عیش ونشاط کی اشیا سے بہر دیا۔ پہلا ڈراما جو پیرس میں کیا گیا وہ اسی بادشاہ کی سرپرستی میں ہوا تہا۔

چارلس پنجم (Charles V) نے (۱۳۳۷ - ۱۳۸۰ء) اس عروس کو زیور عمارات سے آراستہ کیا اور خود اپنے لئے ہوٹل ڈی سینٹ پول (Hotel de St. Paul) کا عالیشان محل تعمیر کیا۔ فلپ آگسٹس کی حدود فصیل سے باہر پیرس کی آبادی بہت پہیل گئی تہی اسلئے اسنے ۱۰۸۴ ایکڑ زمین احاطہ کرکے دوسری فصیل تعمیر کی۔

اس بادشاہ کے زمانہ میں کتب خانہ شاہی کی جسے اب ببلیا تہیک نیشنیل (Bibliothèque nationale) کہتے ہیں اور جو دنیا میں سب سے بڑا کتب خانہ سمجھا جاتا ہے بُنیاد پڑی - اور علوم و فنون کو بہت بڑی ترقی ہوئی -

اسکے بعد چارلس ششم (۱۴۲۲ - ۱۳۶۸ء) تخت نشین ہوا - اسکا زمانہ پیرس کے لئے بہت پرآشوب تہا - خانہ جنگی قحط و وبا سبھی کچہہ بلائیں نازل ہوئیں - سب پر طرہ یہ ہوا کہ انگلستان کے ہنری پنجم نے فرنچ کو ایجنکورٹ (Agincourt) میں شکست دیکر اپنے تئیں انگلستان و فرانس کا بادشاہ مشہور کیا - مگر زمانہ نے پہر پلٹا کہایا اور فرانس کو خدا نے فرانسیسیوں ہی کے لئے قائم رکہا - ۱۴۳۶ء میں انگریز نکال دیے گئے اور تخت چارلس ہفتم کو ملا - انگریزوں نے ہنری ششم کے زمانہ میں ایک اور کوشش کی اور اگر جوان ڈارک (Joan d'Arc) کی ہمت مردانہ آڑے نہ آتی تو فرانس نکل گیا ہوتا - ان لڑائیوں نے شہر کو اسقدر تباہ و ویران کر دیا تہا کہ بہیڑیے (wolves) سڑکوں پر پہرتے تہے - قحط و وبا اسپر اور طرہ ہوئے شہر کی آبادی جو ایک زمانہ میں تین لاکہہ تک پہونچ گئی تہی ۱۴۶۶ء میں اسقدر کم ہو گئی کہ باہر سے لوگ بسنے کے لئے بلائے گئے اس تباہ حالت میں لوئی یازدہم (Louis XI) تخت پر بیٹہا اتفاق سے یہ بہت دانشمند بادشاہ تہا جسکے سایہ عاطفت میں پیرس نے پہر سنبہلنا شروع کیا - اسنے پہر تجارت و علوم و فنون کو ترقی دی رعایا کو حقوق عطا کئے - شفا خانے بنوائے - سڑکیں درست کرائیں اور ڈاک خانے قائم کئے -

لوئی دوازدہم (Louis XII) نے (۱۵۱۵ - ۱۴۹۸ء) جو اپنی مستعدی اور دانشمندی کی وجہ سے "رعایا کا مائی باپ" کہا جاتا تہا فتوحات بہت کیں مگر پیرس کو ترقی کم دی لیکن اسکا بیٹا فرانسیس اول (Francis I) (۱۵۴۷ - ۱۵۱۵) شہر کا دلدادہ تہا - علاوہ دیگر ترقیوں کے جو اسکے زمانہ میں پیرس کو نصیب ہوئیں یہ شہر علوم کا مرکز بن گیا - اسنے لوور (Louvre) کی پرانی عمارت کو منہدم کرکے موجودہ عمارت تعمیر کی اور عالیشان ہوٹل ڈ دل (Hôtel de Ville) کی تعمیر شروع کی نئی سڑکیں بنوائیں ویران اضلاع کو آباد کیا اور ایک شاہی فری (Collège de France) کالج قائم کیا - لیکن یہ سب ترقی ہنری دوم (Henri II) کی تخت نشینی کی ساتہہ ہی خاک میں

ملگئی یہ ایک نہایت متعصب کیتھولک بادشاہ تھا جس نے علانیہ پروٹسٹنٹ مذہب والوں کو گرفتار کر کے جلایا اسکے بیٹے فرانسیس دوم (میری ملکہ اسکاٹ کے شوہر) نے بھی پیرس کے لئے کچھ نہیں کیا بلکہ اپنے ۱۷ ماہ ایام حکومت میں کیتھولک اور پروٹسٹینٹ مذہب والوں میں بہت کچھ کشت و خون کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کو اوسکی ماں کیتھرائن ڈی میڈیسیز (Catherine de Medicis) نے زہر دیدیا اور اسکے بعد چارلس نہم دس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

اسکے دادا ہنری دوم نے پروٹسٹنٹوں کے خلاف قانون بنائے تھے وہ گویا ایک آگ تھی جسکے شعلے فرانسیس دوم کے زمانہ میں بلند ہوئی اور چارلس کے ایام حکومت میں ہر چہار طرف پھیل گئے۔ ہیوجی ناٹ پراٹسٹینٹ (Huguenots) جان پر کھیلے بیٹھے اُنہوں نے بغاوت کردی۔ ڈیوک آف گائیز (Duke of Guise) مشیر شاہ و سردار فرقہ کیتھولک نے اس آگ کو فرو کرنیکا بیڑا اُٹھایا مگر چند وجوہات سے کچھ نرمی کا برتاؤ کرنا پڑا جس سے کیتھولک مذہب والوں کو شبہ ہوا کہ دربار سے پراٹسٹنٹوں کی مدد ہوتی ہی اس شبہ نے یہ ستم ڈہایا کہ اگست ۱۵۷۲ء کی چوبیسویں تاریخ کو جبکہ سینٹ بارتھولومیو کے دن سینٹ جرمیں لاکزی رائی (St. Germain l'Auxerrois) کے گرجے میں لور (Louvre) کے قریب عبادت کا گھنٹہ بج رہا تھا اُسوقت پروٹسٹنٹوں کا ایک قتل عام شروع ہوا۔ کہاجاتا ہے کہ چارلس نے خود سبقت کی اور ایک کھڑکی میں سے خود پہلی گولی ماری۔ اوسروز صرف پیرس میں دس ہزار ہیوجو ناٹ قتل ہوئے۔ شہر کی اس تباہی کے بعد چارلس بھی کچھ زیادہ زندہ نہیں رہا۔ اور خود اسکی ماں نے زہر دیکر مار ڈالا۔ اسکے بعد ہنری سوم تخت نشین ہوا۔ اس نے کبھی پروٹسٹینٹ کی طرفداری کی اور کبھی کیتھولک کی۔ اسلئے کبھی اس فرقہ نے بغاوت کی کبھی اوس نے اس کشت و خون میں پیرس کے سڑکوں پر خون کی ندیاں بہہ گئیں پیرس کی تباہی میں چارلس نے جو کچھ کسر باقی رکھی تھی اُسے اسنے پورا کر دیا بالآخر ایک ڈامی نیکن (Dominican) راہب نے قامد کے بھیس میں قریب ہوکر پیٹ میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ خاندان ویلائی (Valois) کا یہ اخیر فرمانروا تھا جسکے قتل کے بعد ہنری چہارم

(۱۶۱۰ - ۱۵۵۳ء) بوربن (Bourbon) کا خاندان کا پہلا بادشاہ تخت نشین ہوا۔ اسنے بھی فرقہ کیتھولک سے بہت کچھ جنگ و جدل کی مگر پیرس کی حالت کسیقدر درست کی اسکا بیٹا لوئی سیزدہم (XIII Louis) گوکہ محلات لاور میں نہیں رہتا تھا مگر زیادہ تر اپنا وقت شہر میں صرف کرتا تھا۔ محلات لاور (Louvre) کے گرد و پیش کے مکانات کی اسنے تکمیل کی اور اُس بازو کو جواب تولیریز (Tuileries) سے ملحق ہے تہوڑا آگے بڑھایا۔ اسی کے زمانہ میں مشہور کارڈنل رکلو (Cardinal Richelieu) وزیر اعظم نے پیلے رائل (Palais Royal) محلات شاہی کی تعمیر کی۔ اور مطبع شاہی۔ ژاردان ڈی پلانٹ (Jardin-de-plantes) اور فرنچ اکیڈیمی (Academie Française) کی بنیاد ڈالی۔

لوئی چہاردہم (XIV Louis) کے زمانہ میں بھی (۱۷۱۵ - ۱۶۳۸) جو فرانس کا سب سے بڑا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ بہت کچھ کشت و خون ہوا پھر بھی شہر پیرس کو اسکی ذات سے بے اندازہ فائدے پہونچے۔ اس نے محلات ورسائی (Versailles) میں رہنا شروع کیا مگر پیرس کے زیب و زینت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی اور ایسے ایسے مکان تعمیر کئے اور ایسی ایسی چیزوں کی بنیاد ڈالی کہ پیرس دنیا کا سب سے زیادہ عالیشان شہر کہلایا جانے لگا۔

ایٹنی مارسیل (Etienne Marcel) کی پرانی عمارات کے برابر برابر اسنے بازاروں کا ایک سلسلہ بیسٹائل (Bastille) اور میڈیلین (Madeleine) تک قائم کیا اور درختوں کی دورویہ عظیم صفیں آراستہ کیں جو اب بھی پیرس کے اعلیٰ ترین مناظر میں شمار کی جاتی ہیں۔ ورسائی (Versailles) کا عالیشان محل بھی جو تمام عالم میں بہترین محل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بادشاہ کا بنوایا ہوا ہے۔

لوئی پانزدہم (XV Louis) نے اپنا دارالقرار تولیریز (Tuileries) کو بنایا اور اپنے باپ کی طرح پیرس کو بہت کچھ فائدہ پہونچایا۔ پیلس رائل (Palais Royal) کی اسنے دوبارہ تعمیر کی اور ڈی لا کانکارڈ (Place de la Concorde) کی بنیاد ڈالی۔ فوجی مدرسے قائم کئے ایلیسی (Elysée) کا عالیشان محل جہاں پریزیڈنٹ رہتا ہے اور محل بوربن جہاں اب چیمبر آف ڈپیوٹیز ہے تعمیر کئے۔ دارالضرب شاہی اور کئی گرجے بنوائے۔

لوئی شانزدہم (Louis XVI) نے اپنے باپ اور دادا کی طرح سلسلہ تعمیر جاری رکہا۔ بہت سی عمارتوں کی ابتدا کی اور بہت سی تمام کیں استپال سالپٹریری (Salpêtrière) اور ہوٹل ڈزنولی (Hôtel des Invalides) کا بے مثال گنبد جہاں اب نپولین کے قبر ہے اسی بادشاہ کے تعمیر کی ہوئی عمارتیں ہیں۔ فرانس کا انقلاب عظیم اسی زمانہ میں شروع ہوا یعنی ۱۷ جون ۱۷۸۹ء کو ورسائی (Versailles) سے ایک آگ کا شعلہ بلند ہوا اور طرفۃ العین میں تمام فرانس مشتعل ہوگیا باغیوں نے بادشاہ کو صرف معزول ہی نہیں کیا بلکہ ۱۵ جون ۱۷۹۳ء کو نیشنل کنونشن نے متعدد الزامات لگاکر چند روز بعد پلیس ڈی لاریوولیوشیاں میں جواب پلیس ڈی لاکانکارڈ کے نام سے موسوم ہے سولی پر چڑہا دیا اسکی ملکہ میری (Marie Antoinette) کو بھی یہی روز بد اکتوبر میں دیکھنا نصیب ہوا۔ جمہوریوں اور بادشاہ والوں کی لڑائی ابھی جاری تھی کہ نپولین اعظم کا ظہور ہوا جس نے اکتوبر ۱۷۹۴ء میں سلطنت کے حمائیتوں پر پوری فتح حاصل کی۔ پیرس کی تاریخ اب گویا نپولین کے زمانہ کی تاریخ ہے جو پرشیا۔ اسٹریا اور مصر کو شکست دیکر ۱۳ دسمبر ۱۷۹۹ء کو کونسل اول منتخب کیا گیا اور ۲ دسمبر ۱۸۰۴ء کو نائٹرڈم کے گرجے میں بادشاہ بنایا گیا۔ اسکے زمانہ میں پیرس نے وہ عروج حاصل کیا جو کبھی اوسے نصیب نہیں ہوا تہا۔ اسنے محلات بنوائے۔ محرابیں اور یادگاریں تعمیر کیں۔ مدرسے قائم کئے۔ اور پیرس کو تجارت کا مرکز بنایا۔ مگر یہ سب عروج حباب آسا تہا اور واٹرلو (Waterloo) کی شکست کے بعد جب ۳۰ مارچ ۱۸۱۴ء کو پیرس پر افواج متحدہ کا قبضہ ہوا تو تباہی کی کوئی انتہا باقی نہ رہی۔ آخرالامر کانگرس ایلاشیپل (Aix-la-Chapelle) (۱۸۱۸ء) کے بموجب لوئی ہیجدہم (Louis XVIII) کو تخت ملا مگر خود یہ بادشاہ ایسا ضعیف الطبع اور زمانہ ایسا پرآشوب تہا کہ پیرس کی طرف یہ بہت کم توجہ مبذول کرسکا۔

چارلس دہم (Charles X) خاندان بوربن کا اخیر بادشاہ اسکے بعد تخت نشین ہوا اسکے سخت احکام نے بغاوت کی آگ کو جو ابہی سلگ رہی تہی پہر بہڑکایا اور جولائی ۱۸۳۰ء سے پیرس میں پہر بغاوت شروع ہوئی اور چارلس معزول کرکے جلاوطن کردیا گیا۔

نویں اگست ۱۸۳۰ء کو لوئی فلپ (Louis Philippe) تخت نشین کیا گیا۔ اسکے زمانہ میں تالیرانڈ

(Ambassador) لندن میں سفیر بناکر بھیجا گیا۔ اسنے دربائی (Academy) میں نیشنل میوزیم کی بنیاد ڈالی۔ اور پیرس کو علوم وفنون کا مرکز بنانے میں بہت کوشش کی گو کہ اس زمانہ میں بھی بادشاہ کو مارنے کی کئی مرتبہ کوشش کی گئی تاہم ۱۸۴۶ء تک کسیقدر ملک میں امن رہا۔ ۱۸۴۷ء میں پھر منحوس ستارہ طلوع ہوا اور پیرس میں ایسا قحط پڑا کہ پہلے کنگلوں نے بغاوت کی پھر عام رعایا نے بدامنی کے آثار ظاہر کرنے شروع کئے جنکا انسداد لوی فلپ کی دست قدرت سے باہر تھا حتی کہ ۸ ر فروری ۱۸۴۸ء میں فرانس پر ایک عام بغاوت کا ابر چھا گیا لوی نے یہ شہر آشوب دیکھکر اپنا تخت وتاج پوستے کے حوالے کیا گر چیمبر آف ڈپوٹیز (Chamber of deputies) نے شخصی حکومت کو بالکل جڑ سے اکھاڑ ڈالنے کی تجویز کی اور پھر دوسری مرتبہ جمہوری طرز حکومت فرانس میں اپنا جلوہ دکھانے لگی۔ لوی کے زمانہ میں پلیس ڈی لاکنکارڈ (de la Concorde) میں بہت سی عمدہ عمدہ ترمیمیں ہوئیں اور فرانس کے آٹھ بڑے بڑے شہروں کے ہمنام آٹھ نہایت عالیشان بت یہاں نصب کیے گئے۔ نوٹرڈام (Notre Dame) کے گرجے کی دوبارہ تعمیر ختم ہوئی اور محلات لوزمبور (Luxembourg) اور ہوٹل ڈی ولی (Hotel de Ville) میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا۔

دسویں دسمبر ۱۸۴۸ء کو پریزیڈنٹ حکومت جمہوری کا انتخاب ہوا اور چار سال کے لئے لوی نپولین بوناپارٹ (Napoleon Bonaparte) منتخب کیا گیا جسکے بعد پھر دس سال کے لئے اُسکا انتخاب ہوا۔ اسکی طبیعت میں نپولین اعظم کی سی جودت تھی۔ اپنی حکمت عملی سے انتظام ملک داری پر اسنے ایسی قدرت ظاہر کی کہ شاہی اختیارات حاصل کر لئے۔ ۱۸۵۲ء میں لوگوں کی طبیعتوں میں پرانے خیالات شخصی حکومت کے عود کرنے لگے اور طرز حکومت میں انقلاب آیا۔ عام رعایا نے لوی نپولین کو اپنا بادشاہ مقرر کیا۔

اسکا زمانہ گو کہ کم پر آشوب نہ تھا تاہم جو جو ترقیاں پیرس کو نصیب ہوئیں وہ کبھی پہلے حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ گرانڈ اوپیرا (Grand Opera) کی عالیشان اور بے نظیر عمارت۔ نیا ہوٹل ڈیو (Hotel Dieu) آٹیل کا وایاڈکٹ (Viaduct) متعدد اعلیٰ درجہ کے گرجے۔ پیرس کی پہلی نمائش۔ پیلیس آف انڈسٹری (Palace of Industry) انٹرنیشنل لائبریری

کا اضافہ۔ فرانسیسی قدیم اشیاء کا عجائب خانہ۔ متعدد قلعہ جات۔ یہ سب اسکے زمانہ کی یادگار ہیں۔ شہر کا رقبہ اٹھارہ ہزار چار سو دس (۱۸۴۱۰) ایکڑ یعنی دو گنے سے زیادہ ہو گیا۔ بہت سی سڑکیں وسیع کی گئیں اور نئے نئے راستے بنائے گئے مگر افسوس یہ سب ترقیاں جو پیرس نے اس زمانہ میں کیں محض چند روزہ تھیں۔ اسپر ایسی بلائیں یکے بعد دیگرے نازل ہونا شروع ہوئیں کہ جو کچھ نپولین سوم کے زمانہ کی ترقیاں تھیں وہ اور جو کچھ اُس سے پہلے ہوئی تھیں وہ سب ان بلاؤں کی بھینٹ چڑھیں۔ ۱۸۷۰ء میں جرمنی سے لڑائی ہوئی۔ فرانس کو شکست ہوئی اور فتحیاب جرمن بڑھتے بڑھتے پیرس تک آپہونچے اور شہر کا محاصرہ شروع کیا۔ سخت خونخوار لڑائی ہوئی۔ انچہ انچہ پر سینکڑوں کٹ گئے اور قلعہ جات یکے بعد دیگرے فتح ہونا شروع ہوئے۔ ۲۷ر دسمبر ۱۸۷۰ء سے شہر پر گولہ باری شروع ہوئی اور سوائے توپوں کی آواز عمارات کے گرنے کی آواز اور لوگوں کی چیخ پکار کی آواز کی اور کچھ نہیں سنائی دیتا تھا۔ فرانسیسیوں نے بہت کچھ جد و جہد کی مگر آخر شہر فتح ہو گیا اور یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو فتحیاب فوج شہر میں داخل ہوئی۔ شرائط صلح بہت جلد طے ہو گئے اور جرمنس واپس ہوئے۔

پیرس کے تقدیر میں صرف اسیقدر مصیبت نہ تھی۔ جرمنس کی جاتے ہی کمیون (Communes) نے جنہیں زیادہ تر نیشنل گارڈ (national guards) کے سپاہی تھے، شہر کا محاصرہ کرنا شروع کیا۔ یہ لڑائی گویا فوج باقاعدہ اور نیشنل گارڈ (ے) کے درمیان تھی جس میں ایسا عظیم کشت و خون ہوا کہ پیرس کی سڑکوں پر خون کی ندیاں بہنے لگیں اور شہر سے متجاوز ہو کر گرد و نواح کے قصبات تک قتل عام جا پہونچا۔ فرقہ کمیون (Communists) نے پادریوں بسٹریٹوں اور شہر کے معزز معزز لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا اور بطور یرغمال کے قید کر رکھا تھا مگر خون ایسا سوار ہوا کہ ان کو بھی قتل کر ڈالا۔ انکے غصہ کی آگ یہیں تک مشتعل نہیں ہوئی بلکہ مٹی کے تیل کے پیپے منگا کر تمام سڑکوں اور مکانات پر چھڑکنا شروع کئے اور شہر کو آگ لگا دی۔ بہت سی بڑی بڑی عمارتیں مثلاً پیلیس آف جسٹس (palace of justice) ہوٹیل ڈی ویلی (Hotel de Ville)

تولیاریز (Tuileries) منسٹری آف فینانس (Ministry of Finance) کونسل آف اسٹیٹ (Conseil d'Etat) پلیس آف دی لیجیان آف آنر (Legion of Honour) روڈی یو دلی (Rue-de-Rivoli) وغیرہ جل گئیں۔ پنتیین (Pantheon) اور گرجہ ناٹرڈام کے (Notre Dame) بہی جلا دینے کا ارادہ تہا مگر ۲۸ مئی کی لڑائی میں شکست کہانے سے ان باغیوں کی ہمت ٹوٹ گئی اور فرانس کے سر پر پہر سلطنت جمہوری کا پرچم نظر آنے لگا یہ سب صدمات ایسے تھے کہ اگر کوئی دوسرا شہر ہوتا تو پہر کبھی مدت دراز تک نہ پنپتا مگر پیرس کے قسمت میں جسقدر جلد جلد تباہ و برباد ہونا لکھا تہا اُسیقدر جلد جلد سنبہلنا اور آباد ہونا بہی لکھا تہا اُسنے اس طوفان کے بعد بہت سرعت کے ساتہ اپنی اصلی حالت پر عود کرنا شروع کیا اور ایسی ترقی کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے ۱۸۷۸ء میں پیرس میں دوسری بڑی نمائش ہوئی جسنے ظاہر کردیا کہ جوکچہ اس شہر نے ان عظیم فتنوں کے زمانہ میں کہویا تہا صرف وہی نہیں بلکہ اور بہت کچہ حاصل کرلیا ہے اور ترقی کے میدان میں اسکا قدم پہر تمام شہروں سے آگے ہوگیا ہے۔ اس نمائش کی وجہ سے پیرس کو عمارت ٹراکیڈرو (Trocadero) نصیب ہوئی۔ ایک اور نمائش ۱۸۸۴ء میں ہوئی جس نے پیرس کی زینت و شان کو اور بڑہا دیا۔ اسپر مزید یہ ہوا کہ ۱۸۸۹ء میں یہاں ایک میلا لگا جسے تمام دنیا کا میلا کہنا چاہیے اسکی یادگار میں مینار ایفل (Eiffel Tower) ابتک کہڑا قوم کی عظمت و شان کو یاد دلا رہا ہے۔ سن ۱۹۰۰ء میں پیرس میں ایک اور عظیم الشان نمائش ہوئی جسنے تمام عالم کی نمائشوں کو ماند کردیا اور ظاہر کردیا کہ پیرس پہر وہی "ملکہ جادونگار اور عروس شیریں ادا" ہی جو ایک زمانہ سے مشہور چلی آتی ہے۔ آج اس شہر کی یہ حالت ہے کہ زمین پر اپنا جواب نہیں رکہتا۔ علوم کا مرکز۔ علم ادب کا سرچشمہ عمارات کا گلدستہ اور دنیا کی تمام تہذیب کا مجموعہ ہے ؎

اگر فردوس بر روے زمین است
ہمیں است و ہمیں ست و ہمیں ست

محمد لطافت حسین خاں (علیگ) سنٹ بارتہولومیو کالج - لندن

برسات کی بہار

برسات آئی آگ بدن میں لگا چلی
منہ برسے برق ابر کا گھونگٹ اٹھا چلی
مژدہ دیا بہار نے ٹھنڈی ہوا چلی
میخانے پر برسنے کو اودی گھٹا چلی

دھانی لباس پہنے ہوئے ہر شجر ہے آج
خم کی ہو خیر ساقیٔ مہوش کدھر ہے آج

رم جھم برس رہی ہے سرِ شام سے جھڑی
رل مل کے اک زمانے میں برسات کی پڑی
جل تھل ہے جس طرف نگہِ شوق جا لڑی
پہونچوں تک آستین ہے گنگا کی بھی چڑھی

زوروں پہ آج رحمتِ پروردگار ہے
شاداب و بارور چمن روزگار ہے

آئی بہار۔ رشکِ جناں بوستاں ہوئے
پودوں کی تازگی سے ہری باغباں ہوئے
دہقان رُت بدلتے ہی کیا شادماں ہوئے
ہل بیل لیکے کھیت کی جانب رواں ہوئے

آغوشِ نو عروسِ چمن ہے بھری ہوئی
اے نخلِ آرزو تری کھیتی ہری ہوئی

جوبن برس رہا ہے عروسِ بہار پر
گل بوٹے پتے پتے ہیں اپنے نکھار پر
نزہت غضب کی چھائی ہے ہر برگ و بار پر
جلوہ ہے شمعِ طور کا ہر نوکِ خار پر

بڑھ بڑھ کے پتے ہواؤں سے منہ چومنے لگے
مستی میں آکے نخلِ چمن جھومنے لگے

پھولا پھلا ہے نخلِ گلستانِ روزگار
ہے عطر بیز غنچۂ خندانِ روزگار
صحرا سے سبزہ زار ہے دامانِ روزگار
حسرت کا ہے اک آئینہ سامانِ روزگار

رنگینیٔ بہار بہشتِ نگاہ ہے
گلشن نہیں ہے مظہرِ شانِ الٰہ ہے

کوئل کی کوکو اور پپیہوں کی پی کہاں
حق سرہ میں مست وہ اک سمت قمریاں

وہ عندلیب زار کی جادو بیانیاں
طاؤس و کبک مست کی وہ خوش خرامیاں

جلوے جو برق حسن کے تاباں نظر میں ہیں
اُجاندار سارے محو بہار سحر میں ہیں"

دلچسپ کیا ہی سبزۂ خودرو کی ہے بہار
گلہائے باغ پر ہے عجب تازہ تر نکھار

دولہا بنا ہوا ہے ہر اک کوہ و سبزہ زار
ہر برگ پر ہے قدرت صناع آشکار

اے ابر برشکال سحاب کرم ہے تو
سر چشمۂ حیات خدا کی قسم ہے تو

محمد فخر الدین خاں عاجز۔ بہاگلپوری

صبح پیری

از مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

گئی شام جوانی ہے زمانہ صبح پیری کا
کہاں تک سوئیگا کیوں لے رہا ہے نیند کے جھونکے
افق سے سر کے کافور سحر کی نکہت آئی ہے
ذرا کھول اب تو آنکھیں باندھ کالائے سفر غافل
یہ کیا غفلت ہے منہ دھو اٹھکو اب شاندا سے
ترے کردار پر ہے خندۂ صبح کفن غافل
بصارت کم ہوئی کٹ دیدہ بے نور کی تیری
قد خم گشتہ کہتا ہے کہ اب تو جھک اطاعت میں
فروغ اب دے نشاں سجدہ کو پیری میں اے غافل
نکرنا عہد پیری میں بھروسہ دم کا اک لمحہ

بس اب اٹھ سونیوالے ہو گیا ہے نور کا تڑکا
ابھی تو کنج مرقد میں تجھے تا حشر ہے سونا
مہیا کرلے سامان حنوط و توشۂ عقبیٰ
جرس بجنے ہی کو ہے قافلہ تیار ہے سارا
صدا دیتا ہے میر کارواں لے ہوش میں آجا
ترے انجام پر ہے گریۂ شمع لحد گویا
ستارے صبح کے اب جھلملاتے ہیں وہ وقت آیا
گئے دن سرکشی کے دعوی نخوت ہے نازیبا
سحر ہوتے ہی پیشانی پہ چمکے صبح کا تارا
فنا کر دیگا اک دن یہ نسیم صبح کا جھونکا

دم لغزش خبر دی رعشۂ اندام نے غافل | لب بام آگیا ہے آفتاب زندگی تیرا
چھپائیگا بیاض صبح کب تک پردۂ شب میں | محاسن میں لگائیگا خضاب اب تا بکی تبلا
شکن اعضا میں آئی دور کر جمعیت خاطر | پریشاں ہو چلے تیری کتاب عمر کے اجزا
فنا کا وقت آیا جنبش سر خود موید ہی | کیا قد دوتا نے تیری ہستی کو بشکل لا
حدوث عالم امکانکا مثبت خود تغیر ہے | نظر کر اپنی حالت پر کہ کیا تھا تو ہوا اب کیا
یہ خط نسخ فرد زندگی پر تیرے کھینچی تھی | جسے پیری میں اپنے جسم پر تو جھریاں سمجھا
یہ صیقل کی ہے پیری نے کہ تو دیکھ اپنی ہستی کو | نہیں یہ جھریاں ہیں جوہر آئینۂ اعضا
وجود نیستی کا وہم اسے مغرور بیجا ہے | انانیت کا مرجع نفس انساں ہو نہیں سکتا
کہا یہ جھریوں نے زندگی کی منزلیں طے کیں | زہی ہمت رہا اس کام کا پیری کے سر سہرا
خیال زندگانی دلمیں کیوں ہر وقت رکھتا ہی | حقیقت دیکھ تو اپنی کہ تو ہے خاک کا پتلا
کہاں وہ بزم آرائی وفور شوق کی غافل | کہاں وہ ساز و ساماں جب طلسم زندگی ٹوٹا
اسے آب بقا ہی پہلی دہولے سطین پہر ہو | لگا ہی دامن دنیا یہ داغ اک بے ثباتی کا
اگر ہے عاقبت اندیش دیکھہ آئینۂ عبرت | کہ جسمیں عکس ہستی ڈہونڈہنے سے بھی نہیں ملتا
مثال نیستی خود ہی ترے جسم مثالی میں | فنا ہی جسم ثابت کر رہے ہیں خود تیرے اعضا
سکھا دی ہیئت فطرت نے تجھے رفتار عدمی | بنا لی اس سے پرکار قدم تیری بشکل لا
حیات جاودانی کی اگر خواہش ہی اے غافل | اجل آنی سے پہلے چاہیے تجھکو فنا ہونا
خدا کو ڈہونڈہتا ہے گرچہ ترک ماسوا اللہ کر | متی ما تلق من تہوی دع الدنیا و اہملہا
نہیں زائد ہی مشت خاک سے تیرا تن نازک | تجھے لازم ہی قلب ماہیت کی بھی خبر رکھنا
ہوئی ہی استطاعت تجھیں اب پیری آنے سے | اری اے بیخبر واجب ہے حج آخرت کرنا
مناسک کو ادا کر باندہ احرام کفن غافل | صدا لبیک کی دے اب حضور دوست ہی جانا
مٹا نے دلمیں کر اب خواہش دنیا کی قربانی | قدم سے سعی کر سوی صفا و مروۂ عقبیٰ
یہ لازم ہی کہ نذر نقد جاں اس حج میں دی پہلے | تمتع کی جو خواہش ہی تجھے اے بندۂ دنیا
اگر خواہش ہی ہو مقبول حج کر ترک آرائش | نہ دیکھ آئینہ تک مغرور خود بینی نہیں زیبا

یہ مانا ہمنے تو تھی بادشاہ ہفت کشور ہے
نظام عالم امکان مسیر دموت ہو غافل
تیرے تیغ میں مانا مملکت ہو ربع مسکونکی
خیال ہی کیا کیچہ کچہ دیا ہے تجکو
لباس تاقم و خزکیا سمجھکے تو پہنتا ہے
پہن لے کسوت الفقر فخری جسم خاکی پر
بھلا دے سرگزشت عہد طفلی و جوانی کو
نجاں اسکو ذریعہ امتداد زندگی کا تو
اندھیرا یا کہ ہے پھر چاندنی ہی جارہی نکی
اری او شوکت عہد جوانی دیکھنے والے
سواد شب سے لکھا عمر بھر غمنامہ ہجراں
گذاری رات ساری کروٹیں لے کر فرقت میں
ہوا وقت ولادت گریۂ اطفال سے ظاہر
جفا بردار دلبر کچھ تجھے خوف خدا بھی ہے
کہاںتک واعظ و ناصح سے یہ ہرزہ سنیں اب
سن اے غافل یہ سب نقش و نگار بے ثباتی ہیں
اگر تیا ہان تصدیق خیال بے ثباتی ہو
دکھا لائیں تمہیں وہ منظر شہر خموشاں ہم
اُٹھو بہر خدا ان دوستوں کا حال تو پوچھیں
الٰہی کسطرح ان سب لبوں کو ہیں آتا ہے
نگاہیں لے رہی ہیں درس عبرت ذرہ ذرہ سے
نکما ہیبت وہی اس خاک کے پردے میں نہاں ہیں
بہت ڈرتا ہو گر تو سورہ الحمد دم کر لے

حضور دوست کام آئیگا کیا یہ تیرا استغنا
نکر نظم و نسق میں مملکت کی کوشش بیجا
متاع آخرت کیا کی مہیا تو نے یہ بتلا
یہ قصر دلکشا بنوا کے کیا آرام پائیگا
کیا ہے کس لئے زیب بدن یہ خلعت دیبا
ارے او محو آرائش بھی ہو زینت عقبیٰ
صدای الرحیل اب آگئی ہی ہو قفس میں آ جا
پیام موت پیہم دی رہا ہی ہر نفس تیرا
عبث شام جوانی ہے تجھے یہ حسن پر غرا
رہیگا محو زینت تا بکی اب رکھدو آئینا
سیاہ اپنے اعمالوں کا بھی تو نے کبھی دیکھا
مگر تکلیف سمجھا تو نماز شب ادا کرنا
سکھایا ہی تجھے فطرت نے آتی ہے یہاں رونا
کسی صورت طواف بتکدہ سے جی نہیں بھرتا
کریگا ورد لب کب تک حدیث عاشقی تنہا
ہوا اس شوق سے تو محو لعبت خانۂ دنیا
عزیزا آؤ ذرا دیکھ آئیں گورستان عبرت کا
جہاں رہتے ہیں بزم آرائے گیتی ابتک تنہا
کبھی حاصل تھی جنکی لذت دنیا و ما فیہا
مصیبت خیز ہے اس وادی غربت کا سناٹا
صدا اک سوسنا گہ آئی کیوں تجکو ہوا سکتا
کہ جنکی ہمنشینی کا تجھے ارمان رہتا تھا
یہی صورت سہی تو ڈرا خواب اب دستک سے ہیجا

تری یہ بیرخی اُسنے خلاف شرط الفت ہے	سر بالیں تربت جا کے آنا تو ذرا پوچھ آ
نہیں تھمتے کسی صورت جو آنسو شمع تربت کے	بتا اے بیکسی گور غریباں پر یہ کیا دیکھا
بتا اے شمع کیا گذری ہے تیرے سرہنے والی پر	تجھے بے اختیار آتا ہے کیوں یہ شام سے رونا
نکلتے ہیں ترے سینہ سے پیہم کسلیئے شعلے	نجکل آہ ہے کسواسطے تیرا قد رعنا
غنیمت جان کمدی حال تھوڑی رات باقی ہے	کہ آنے ہی کو ہے دیکھ اب نسیم صبح کا جھونکا
زباں شمع لحد کی ہو گئی خاموش یہ کہکر	میں تیرے حال پر رو لی ہوں سن اے دل کے شیدا
میں تیرے غم میں گھلتی ہوں کہ تو اسد رضا غافل ہے	متاع خانہ تربت یہی ہے اسد رجب بے پردا
جلالے اب چراغ معرفت کو کعبہ دل میں	قیامت سے کا ہوگا گوشۂ تربت میں اندھیارا

غزل

ولہٗ

دل نازک کی قدر ہی کب کی	بات غصہ سے اوسنے کی جب کی
تہا کرامات عشق کا منکر	معتقد ہوں جو بچ گیا اب کی
موت میری کھڑی ہے بالیں پر	منتظر ترے جنبش لب کی
سامنے اوسکے لاکھ کوشش کی	بات نکلی نہ مُنہ سے مطلب کی
میں تہا اور نا امیدیوں کا ہجوم	کیا کہوں تمسے کیفیت شب کی
کچھ فراغت سی جسمیں دم لیں	کاش اکدن نصیب ہو اب کی
وقت نظارہ اف رہی حیرانی	میرے جانب نگاہ ہے سب کی
دل کبھی تہا ہمارے پہلو میں	یہ خدا جانے بات ہے کب کی

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

غزل جناب ضامن کنتوری

فروغ ماہ تمہاری جبیں سے ہے گلہ مند	چراغ صبح کا مہر مبیں سے ہے گلہ مند
کہاں کٹائے ہیں پر تیغ ناز کے ہوسنے	کہ ذوالفقار ہی روح الامیں سی ہے گلہ مند

غمِ فراق کی ایسی ہوئی ہے لذت گیر
کہ روح رابطۂ یار وطین سے ہے گلہ مند

زبسکہ جرعہ کش جام نامرادی ہوں
مذاق تلخ مرا انگبیں سے ہے گلہ مند

رقیب قدر ستمہا سے ناز کیا جانے
خدا کی شان وہ تجھسے جبیں سے ہے گلہ مند

زمیں پہ آنکھ سے ٹپکے نہ خون دل کیونکر
یہ مے شکستگی ساتگیں سے ہے گلہ مند

گھِن جو مہر کو لگ جائے کیوں نہ ہو انہ میر
شاہ وا ہتہ جبیں آستیں سے ہے گلہ مند

جھڑا و آئے کشاکش سے نزع کی ناشاد
کہ شوق دیدم واپسیں سے ہے گلہ مند

نہ کہا او ٹھوکر سے ضامن تلاش مضموں نہیں
سمند فکر بہت اس زمیں سے ہے گلہ مند

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ عطیہ جناب محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر قند پارسی

قدم اُٹھتے ہی نہوں جب تو سفر کیا ہوگا
اور جو گھر میں نہیں دلدار تو گھر کیا ہوگا

گر مے داغ سے اپنا تو جگر سو کہہ گیا
اس طراوت سے تری دیدۂ تر کیا ہوگا

تیری دیوار مگر اسکی خبر کو ہوسکے
تیرے در کا نہوا سنگ تو سر کیا ہوگا

چشم طوفاں زدہ! اشکونکی رواں کب تک
جگر خون شدہ! نالوں کا اثر کیا ہوگا

ہے ترے وصل کو درکار فنا کی تعلیم
قطرہ دریا سے گریزاں ہو گہر کیا ہوگا

حالِ حسرت زدگانِ اثرِ کم نظری
امی زیارت گہہ اربابِ نظر کیا ہوگا

پاس منظور ہے اُس پردہ نشیں کا ہمکو
تیری امداد سے امی روزن در کیا ہوگا

وسعتِ فہم سے یاروں کے ہو وحشت آگاہ
اس سخن دیدہ سے اظہار ہنر کیا ہوگا

غزل حسرت موہانی

عشق کی روح پاک کو تحفۂ غم سے شاد کر
اپنی جفا کو یاد کر میری وفا کو یاد کر

جان کو محو غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطعِ رہِ مراد کر

غمزۂ دلفریب کو اور بھی جانفزا بنا
پیکرِ نازِ حسن پر رنگِ حیا زیاد کر

خرمی دور روزہ کو عشرت جاوداں جان
فکرِ معاش سے گزر حوصلہ معاد کر

قطعہ

ایکہ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے جاسے سوا اہم نہ جان
روشنئ ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بعذر مصلحت وقت پہ جو کرے گریز
اسکو نہ پیشوا سمجھ اسپہ نہ اعتماد کر

مذہب و رنگ قوم کا دل سے مٹا کے اختلاف
ہموطنان ملک میں کوشش اتحاد کر

کسب علوم کے سوا کسب فنون کر شعار
اہلِ خرد کی رائے پر از سر صدق صاد کر

دولتِ قوم کو بڑھا دیس کی چیز کر خرید
غیر کے مال کے خلاف فیصلہ جہاد کر

خدمت اہلِ جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

....

غیر کی جد و جہد پہ تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذاتِ خاص پہ ناز کر اعتماد کر

نوٹ

مسئلہ ہائیکورٹ باشندگان الہ آباد نے ایک میموریل وائسرائے کی خدمت میں اس مضمون کا روانہ کیا ہے کہ مقام ہائیکورٹ کی تبدیلی سے باشندگان شہر الہ آباد کو نقصان عظیم برداشت کرنا پڑیگا اسلئے ہائیکورٹ بدستور الہ آباد ہی میں قائم رہے۔ اگر یہ امید ہوتی کہ اہل الہ آباد کی درخواست کے منظور ہونے پر لکھنؤ کی جوڈیشلی پر کوئی اثر نہ پڑے گا تو ہمکو بھی الہ آباد سے ہمدردی ہوسکتی تھی لیکن جب صورت حال یہ ہے کہ اگر الہ آباد میں ہائیکورٹ قائم رہی تو لکھنؤ کی عدالت عالیہ کا خاتمہ یقینی ہے تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ الہ آباد میموریل کے وجوہات کیونکر زور دار تسلیم کئے جاسکتے ہیں۔ کیا معنی کہ شہر کے تنزل اور باشندوں کے نقصان کا جیسا خوف اہل الہ آباد ہے ویسا ہی قدرتًا اہل لکھنؤ کو بھی ہے اور اسلئے اس قسم کی دلیل پر کسی شہر کو ترجیح دینا درست نہیں ہوسکتا۔

اب رہیں دوسری دلیلیں انکے متعلق ہمارے خیال میں تائید الہ آباد کی تقریباً تمام باتیں مصنوعی اور خیالی ہیں درانحالیکہ لکھنؤ کی حمایت میں میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اصلیت اور حقیقت کا زور رکھتا ہے۔

پس ہمارے نزدیک یا تو انتظام موجودہ کو برقرار رہنا چاہیے جسکی الہ آباد میموریل بھی تائید کرتا ہے اور سندھ میں ہائیکورٹ بمبئی اور صدر عدالت سندھ کی مثال پیش کرتا ہے۔ لیکن اگر جوڈیشلی اور ہائیکورٹ کا قیام علیحدہ علیحدہ نہیں رہسکتا تو بلاشبہ لکھنؤ کا حق مرجح ہے جسمیں صوبے کے اکثر اضلاع سے قریب ہونیکے علاوہ ترقی اور اہمیت کے ایسے قدرتی اسباب موجود ہیں جو اس صوبے کے مصنوعی دارالحکومت یعنی الہ آباد کو کسیطرح نہیں نصیب ہو سکتے۔

اتحاد مسلمانان وہنود ہفتہ گزشتہ میں آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی نے علیگڈھ پبلک لائبریری کے لان میں کثیر جماعت حاضرین کے سامنے قابل تعریف بلکہ لائق رشک فصاحت اور روانی کے ساتھ مضمون مندرجہ عنوان پر ایک پسندیدہ تقریر کی۔ ہمکو آپکے اس خیال سے کلیتاً اتفاق ہے کہ ہنود و اہل اسلام کی کشیدگی باہم کا افسانہ مبالغۂ بعید کے ساتھ بیان اور تعیین کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ تمام ہندوستان میں دو ایک مقاموں پر جہلا کے جھگڑوں کی مثال کو پیش نظر رکھکر کل ہندوستان کے ہندوں اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت رائے قائم کرنا شیوہ احتیاط وانصاف سے بعید ہے۔

قابل مقرر کا وہ حصہ تقریر بھی خصوصیت کیساتھ لائق ستائش تھا جسمیں اُنہوں نے یہ بیان کیا تھا "کہ مسلمانوں اور ہندوں کو تاریخ گزشتہ کے قابل اعتراض واقعات بُھلا دینا چاہیے کیونکہ دونوں کی بادشاہوں اور راجاؤں سے قابل گرفت افعال سرزد ہو چکے ہیں اور اب انکی یاد تازہ کرنے سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ متصور نہیں ہے"

لاریب بعض مولفان فتنہ پرداز محقق نما کی مولفہ تاریخوں سے طالبعلمان اسکول کو جتنا نقصان ہو پہنچتا ہے اُسکا اندازہ مشکل ہے۔ امتحان مقابلہ کے بارے میں مالوی جی سے بغایت فراخ دلی سے شاہد فرمایا کہ اگر مسلمانوں کو اپنی قلت تعداد کے باعث سے اس طریق امتحان پر اعتراض ہے تو اسکا علاج یوں ہو سکتا ہے کہ مقابلہ تو قائم رہے لیکن مسلمانوں کے لئے ایک نسبتی تعداد معین کر دیجاوے کہ اگر اس سے کم مسلمان مقابلہ میں کامیاب ہوں تو بقیہ تعداد دیگر پاس شدہ مسلمانوں سے پوری کیجاوے البتہ اردو ہندی کے باب میں جو کچھ کہا گیا ہمکو اس سے قطعی اختلاف ہے جسپر ہم آئندہ اپنا خیال ظاہر کرینگے۔ فقط

البیان

ایک علمی تاریخی رسالہ

قیمت سالانہ پیشگی .. .. (للعہ)

مقام اشاعت .. .. دفتر البیان لکھنو

زبان .. .. عربی ترجمہ اردو

(نوٹ) یہ رسالہ پہلے ماہوار شائع ہوتا تھا اور ہے قیمت تھی سال جدید سے اب پندرہ روزہ شائع ہوتا ہے اور قیمت صرف للعہ ہے۔ ہر نمبر کی ضخامت عموماً دو جز ہوتی ہے صفحہ میں عموماً دو کالم ہوتے ہیں۔ ایک میں فصیح عربی اور دوسرے میں بامحاورہ اردو ترجمہ۔ مضامین تحقیق سے لکھے جاتے ہیں اور اسلامی خبریں بکثرت ہوتی ہیں (درخواستیں باجازت وی پی ویلو آنا چاہئیں)

عصر جدید

یہ ایک ماہانہ رسالہ تین جز کا ہر مہینے کی تین تاریخ کو شائع ہوتا ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ مسلمان بیکار اور فضول باتوں بحثوں میں پڑنے کی جگہ کام کی باتوں پر متوجہ ہوں۔ فضول خرچی۔ کاہلی۔ بیکاری کو ترک کر دیں پیشہ ور کاریگری کو رواج دیں۔ محنت اور کام اور جائز ذرائع معاش کی طرف آمادہ ہوں۔ تعلیم معزز ملازمت بجائے مقصود قرار دینے کے اہل فرنگ کے اتفاق و محنت کا سبق لیں مذہب کا صحیح خیال اور خوف خدا لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو شادی و غمی کی فضولیات اور قرض لینے کا مرض دور ہو۔

اسکے آنریری اڈیٹر خواجہ غلام الثقلین بی۔ اے ایل ایل۔ بی وکیل ہائیکورٹ سکرٹری انجمن اصلاح تمدن (سابق چیف جج ریاست مالیرکوٹلہ) ہیں اور اس رسالہ نے مسلمانوں کو ایک حد تک بیدار کیا ہے۔ قیمت نمونہ ۲ر جواب طلب امور کے واسطے جوابی کارڈ۔

المشتہر
منیجر عصر جدید گولہ گنج لکھنو

دی رئیس ٹریڈنگ کمپنی۔ بھاگلپور

حضرت تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال بھاگلپور کے چند زمیندار و رؤسا نے مندرجہ بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہرگز یہ نیت نہیں کہ وہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ منشا اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے پائدار نفیس ریشمی کپڑے از قسم لنگی چادرہ دھوتی و صافہ و رومال دستی و سوتی لنگا و ساڑھیاں ہر قسم ہر رنگ کے تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دھوپ چھاؤں و سادہ و چک و دوڑیا و بافتہ وغیرہ لائق تیاری شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ۔ انگریزی مندرجہ ذیل وغیرہ اندرون و بیرون ہندوستان ہر جگہ با سانی بھیجا جاتا ہیں۔ نفاست و پائداری میں یہ خاص بھاگلپور کی پیداوار آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اس قدر مقبول کہ ہر خاص عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔ فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دیے جاتے ہیں۔ حضرات تجارت پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت رکھی گئی ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں خطوط ذیل کے پتہ سے آنی چاہئیں۔ المشتہر ڈائرکٹر رئیس ٹریڈنگ کمپنی بھاگلپور (بنگال) تار پتہ۔

دیوان مصحفی

حصہ اول۔ ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم مصحفی مع دیباچہ مرتبہ اڈیٹر اردوئے معلیٰ لکھنؤ کا انتخاب اس احتیاط اور خوبی سے ساتھ کیا گیا ہے کہ اس دیوان کو دیکھکر مذکورہ بالا ضخیم دواوین کے دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کاغذ سفید تقطیع $\frac{22 \times 18}{8}$ حجم ۷ جزو قیمت صرف (۸ر) مع ڈاک المشتہر منیجر اردوئے معلیٰ علیگڑھ

انوار العیون فی اسرار المکنون

یعنی

ملفوظات و حالات حضرت شیخ العالم مخدوم عبد الحق ردولوی قدس اللہ سرہ

جمع کردہ حضرت قطب العالم شیخ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ قیمت ۸ر

اردوئے معلیٰ

علیگڑھ

نمبر [illegible] بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۰۶ء جلد [illegible]

مرتبہ فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلیٰ علیگڑھ

احسن المطابع علیگڑھ میں طبع ہوا

قیمت سالانہ [illegible]

اُردوی معلّیٰ

یعنی ہم [illegible] اُردو کا پیارا اور قابل دید رسالہ جس کے بارہ مہینے ہو چکے ہیں اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین سے [illegible] دیوان جا [illegible] قیمت [illegible] ناظرین ہوتے ہیں حجم ۵۲ صفحے [illegible] کی [illegible] بابت [illegible] نمونہ کا پرچہ ۲ کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے (۱) رسالہ و دواوین للعہ سالانہ مع محصول (۲) صرف رسالہ سے سالانہ مع محصول (۳) صرف رسالہ (معمولی سفید کاغذ پر) سالانہ (برائے طلبا [illegible] حضرات) مقاصد ضروری مجلد دیگر مقاصد [illegible] درخواست خریداری بنام مینجر اُردوی معلّیٰ علیگڈھ آنا چاہئے

سنہ ۱۹۰۵ء میں (۱) رپورٹ اردو بمبئی کانگرس (۲) دیوان میر سوز (۳) اور دیوان قائم چاندپوری ختم ہو کر شائع ہوئے اور سنہ ۱۹۰۵ء کی ششماہی کے آخر میں دیوان حسرت استادجرات نذر کیا گیا۔

اُردوی معلّیٰ جلد پنجم

از جولائی سنہ ۱۹۰۵ء تا دسمبر سنہ ۱۹۰۵ء مع رپورٹ بمبئی کانگرس قیمت عہ مع محصول۔ دفتر اُردوی معلّیٰ علیگڈھ سے طلب کرو

اُردوی معلّیٰ جلد ششم مکمل

از جنوری سنہ ۱۹۰۶ء تا جون سنہ ۱۹۰۶ء

(قسم دوم قیمت صرف ۸ مع محصول)

المشتہر

مینجر اُردوی معلّیٰ علی گڈھ

شرح اجرت اشتہار اُردوی معلّیٰ

	صفحہ کامل	نصف صفحہ	[illegible] کالم
سالانہ	للعہ	ہے	[illegible]
ششماہی	عہ	ہے	ہے
سہ ماہی	ہے	ہے	عمر
ایک بار	عا	عمر	فی سطر [illegible]

رسالہ اجماع

مصنفہ جناب [illegible] صاحب [illegible]

ناظرین یہ وہ رسالہ ہے جس کے مطالعہ کرنے [illegible] آپ کو ایک [illegible] اور [illegible] آئندہ کے [illegible] اب آپ [illegible] [illegible] کتاب آپ کے مطالعہ سے گذرے گی

نوٹ ۔ راجاؤں امیروں کیری عالموں فاضلوں اور علما کو اطلاع کیجاتی ہے کہ اس اشتہار کے پڑھنے کے بعد اگر کوئی اس کو اور اس سود دریافت کرسکے کہ اتنے آدمیوں کو کتنے رسالے [illegible] معزز اجاب جنرل مینجر صاحب انڈین [illegible] (انبالہ) کو بذریعہ کارڈ اطلاع دو۔ آپ کی تحریر کے بموجب اتنی ہی رسالہ آپ کی خدمت میں بلا قیمت بلا ٹکٹ [illegible] ہیں۔ مفت چھاپ کر کے [illegible] روانہ کر دئے جائینگے۔ تاکہ آپ ان سب لوگوں کو تقسیم کردیں لیکن اطلاع آنے سے [illegible] چار ہزار کی تعداد [illegible] تقسیم ہو چکی ہے

از سکرٹری کارخانجات رائل [illegible] ہال [illegible] [illegible] ضلع انبالہ

دیوان غالب [illegible]

معمولی سفید کاغذ پر چھپا ہوا مجموعہ اسی دیوان کے [illegible] جس کا پروف خود مرزا غالب کی نظر سے گزرا تھا مع شرح دیوان غالب ۔ از سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے [illegible] اُردوی معلّیٰ علی گڈھ تقطیع [illegible] حجم تقریباً ۱۲ جز قیمت مع [illegible] دیوان صرف [illegible]

درخواست خریداری بنام مینجر اُردوی معلّیٰ علی گڈھ آنا چاہئے

فہرست مضامین (۱) دیباچہ از مصنف (۲) [illegible] حالات (۳) [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] بالکل ناممکن ہے

المشتہر

(مینجر اُردوی معلّیٰ علی گڈھ)

بسم اللہ

"منتظر"

نام و تخلص | نور الاسلام نام منتظر تخلص خلف شاہ فیض علی عرف پیر غلام برادر بزرگ شاہ بدیع علی ابن شاہ محمد علی جو بقول مصحفی شاہ عاقل سبز پوش "خدا یاد و خود فراموش" کے چھوٹے بھائی تھے۔

لیاقت علمی | درسی کتب صرف و نحو عربی کے علاوہ نثر و نظم فارسی پر کافی عبور رکھتے تھے جیسا کہ انکے غزلوں کے انداز سے مترشح ہوتا ہے اور تذکرہ مصحفی سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

سیرت | منتظر کی طبیعت ابتدا ہی سے شاعرانہ واقع ہوئی تھی چنانچہ ۱۲ ہی سال کی عمر سے شعر و شاعری کے شوق نے انہیں اپنے ہم سنوں میں ممتاز بنا دیا تھا۔ اسپر طرّہ یہ ہوا کہ آغازِ شباب ہی میں کسی جگہ تعلق خاطر پیدا ہو گیا جسنے انکی قدرتی شوریدہ سری اور وارستہ مزاجی کو اور بھی چمکا دیا اور ساتھ ہی انکی شاعری کو اثر اور درد کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ وضعداری اور وفاداری منتظر کے شریفانہ مزاج کا خاص جوہر تھا...... ایسا ذہن ہے بیشک استاد مصحفی کو بہت کچھ اعتبار اور ناز تھا۔ [illegible] "باوجود کم ملاقاتی و فصل سال و ماہ منتظر ہیچ بار رجوع بطرف دیگر نکرد۔ اگرچہ بعض اشخاص معنوی ذہانت طبعش را دیدہ بسیار خواستند کہ اورا بطریقے بہ حلقہ تلمیذ خویش کشند ہرگز التفات بگفتن ایشاں نکرد تا آنکہ بہر کیف [illegible] راسخ الاعتقاد خویش بمقام والائے شاعری رسیدہ حالا براے گلشن آنہا برابر جو داست"

اور اعتبار اسقدر کہ سید انشا کے ساتھ معرکہ آرائی ہجو کے آخر میں مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے نام قصیدہ معذرت کا ایک شعر یہ بھی ہے کیا ہیں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا ہو جاؤں گا جیسے کوئی گرم و منتظر کا ضمیر۔ یعنی یہ کہ میں انشا سے درگزر بھی کروں تو گرم و منتظر کیونکر معاف کرینگے۔

منتظر کا پایۂ شاعری | مصحفی نے جب اپنا تذکرہ شعرا کی پہلی جلد ۱۲۰۹ھ میں ختم کی تھی اس وقت تک انکے صرف تین دیوان مرتب ہوئے تھے اور اسی نسبت سے انکے شاگردوں کا حلقہ بھی بہت زیادہ وسیع نہیں ہوا تھا مثلاً آتش اسیر علیشی ہوس شہیدی و شعور وغیرہ کسیکا ذکر اس تذکرے میں نہیں ہے۔ البتہ خلیق۔ تنہا [illegible] گرم منتظر میں سے منتظر کا پایہ سب سے بلند قرار دیکر مصحفی نے انکو اپنا شاگرد رشید کہا ہے اور انکے کلام کی نسبت ایسی رائے [illegible]

معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ کلاش بہ لطف و صفا ہیچ از کلام مولف (یعنی خود مصحفی اڈیٹر) در پایہ کمی نیست۔ بہرحال منتظر کی استادی کا ثبوت مصحفی کی اس تحریر سے بڑھکر اور کیا ہوسکتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ یہ سند اُسوقت عطا کی گئی تھی جبکہ اُنکی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہتی۔ تمنا کے کلام کی طرح منتظر کی شاعری بھی بعینہٖ مصحفی کی شاعری کا نمونہ ہے اسلئے اس موقع پر بھی ہم منتظر کے چند اشعار اور غزلونکی نقل پر اکتفا کرتے ہیں۔

چاہت مرے دل کی آزما دیکھ	ظالم کہیں تو بھی دل لگا دیکھ
آئے ہیں تیری گلی میں اک زمانہ چھوڑ کر	جاویں اب پیاری کہاں ہم یہ ٹھکانا چھوڑ کر
صدمہ جو شب ہجر کا یاد آئے ہے مجھکو پیدا ہوئی کچھ ایک نئی طرح کی وحشت	اک وہ ہیں پہر ری سی کچھ آجا ہی مجھکو نے شہر نہ صحرا نہ چمن بھائے ہے مجھکو
تم پیار کرو گر نہ صنم اور کسیکو اغیار تو جھوٹے ہیں میں کب تمکو کہا کچھ	سوگند لو پھر چاہیں جو ہم اور کسیکو پوچھو تو بھلا دیکے قسم اور کسیکو
گہ پردہ فاش نالے نے گہ آہ نے کیا	رسوائے خلق ہمکو تری چاہ نے کیا
کبھی گر ابعد ماہ و سال کل اس ماہ دکھلائی بروز وصل شادی مرگ ہوجانا ہی بہتر تھا	تو پہ برسوں ہی ستا تو تمکو تو نے راہ دکھلائی فلک نے یہ شب ہجراں ہمیں کیوں آہ دکھلائی
غصے میں اس جبیں پہ پڑیں جب شکن[1] کئی آنکھیں کبھو لڑائیں کبھو دیکھکر تنا	دریائے قہر آن سی ہوئے موجزن کئی سیکھے میں ہمسے اُسنے کئی بانکپن کئی
امید ہے کہ مجھکو خدا آدمی کرے بھائیں نہیں کچھ اسکے نکلتی ہی نہیں جان مارا ہی کوہکن نے سر اپنا بہ تیشہ آہ گر کچھ کہا بگڑکے میں اُس نے ہنس دیا گزرا ہیں ایسی چاہ سی تا چند ہمنشیں ہے عشق بد مرض کوئی جاتا ہے منتظر	پر آدمی کرے تو بھلا آدمی کرے کیا ایسے بیوفا سے وفا آدمی کرے دلکو لگی ہو چوٹ تو کیا آدمی کرے کیا ایسے آدمی سے گلا آدمی کرے بیٹھا کسیکے مُنہ کو تکا آدمی کرے کیا خاک اس مرض کی دوا آدمی کرے

[1] "شکنیں" کی جگہ صرف "شکن" لکھا ہے اور یہ پرانی زبان ہے۔ ۱۲

سیرت حسین

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جب معرکۂ کربلا کی دردناک خبر پہلی بار حجاز میں پہونچی تو وہ کچھ ایسی ناگہانی۔ غیر متوقع حسرت انگیز۔ اور عبرت خیز تھی کہ جس نے سُنا ہوش و حواس جاتے رہے۔ دل ہلگیا۔ نیرنگیٔ عالم اور بے ثباتی دنیا کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی اور جس شخص کے دل میں ذرّہ برابر بھی جوہر انسانیت موجود تھا اُس نے شہید کربلا کے ساتھ ہمدردی اور اُنکے قاتلین سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا۔ حجاز دین اسلام کا سرچشمہ تھا وہاں سے جو درد و غم کی صدا بلند ہوئی تمام دنیائے اسلام نے لبیک کہا اور آئندہ نسلیں بھی برابر اسی خیال کی تائید کرتی رہیں حتیٰ کہ کربلا کے بہادر ہیرو کو بیحد مظلوم سمجھکر مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پولٹیکل جھگڑے کو جزو مذہب بنا لیا۔

وہ چند نفوس تو قابل ذکر نہیں جنہوں نے اس شرمناک واقعہ پر اظہار مسرت کی جرات کی ہو لیکن جماعت مسلمین میں سے چند ایسے نکتہ چیں غالباً ہر قرن اور ہر صدی میں موجود رہے ہیں جو اس واقعہ پر رنج و ملال ظاہر کرنے کے بعد یہ پُرمعنی فقرہ اضافہ کر دیتے تھے کہ "حسین اپنے نانا کی شریعت پر قتل کئے گئے"

یہ تو اپنے نبی کی قرابت اور مذہبی عظمت و اقتدار کا پاس کرکے صرف ایک مبہم جملہ پر قناعت کرتے تھے لیکن غیر قوموں کو اس رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی اُنکے بعض متعصب[1] مورخوں نے صاف الفاظ میں تحریر کرنا شروع کیا کہ دیندار مسلمان شہادت حسین پر رنج و الم ظاہر کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ حسین نے تخت و سلطنت کے خلاف ایک

---

[1] مثلاً سر ولیم میور۔ دیکھو اُن کی کتاب "اینلس آف دی ارلی خلافت"

فضول اور لاحاصل کوشش کرکے ایسے سخت جرم کا ارتکاب کیا تھا جس سے سوسائٹی کے تمدن میں خلل پڑنیکا اندیشہ تھا اور ایسی سرکشی اور بغاوت کا فوراً فرو کردینا لازمی تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک و قوم کی نئی تعلیم یافتہ نسل کا ایک معتد بہ حصہ انگریزی تعلیم اور مغربی اصول سیاست سے بہرہ اندوز ہوکر زبان سے نہیں تو دل سے ضرور اسی قول کی تصدیق کرتا ہے۔

مندرجہ بالا قول سے جناب شہید کے کیریکٹر پر تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں اوّل تو یہ کہ اُنھوں نے تخت و سلطنت کے لئے خروج کیا۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے اپنی شوکت کا اندازہ غلط کیا اور اسوجہ سے اون کا خروج فضول ثابت ہوا۔ اور تیسرے یہ کہ وہ جرم بغاوت کے مرتکب ہوئے۔

ہم ان شکوک پر غور کرنے سے پہلے جناب حسین کی متبرک زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنا۔ اسلام کی مذہبی اور نزاعی کتابوں کو بالائی طاق رکھکر صرف تاریخ کی مدد سے واقعہ کربلا کی تحقیق کرنا اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایک غیر مذہب کا انصاف پسند مورخ جسکو تاریخ عرب سے پوری واقفیت حاصل ہو اگر شہید اکبر کی لائف پر ریویو کرے تو وہ کیا تنقید کریگا اور اس تنقید سے شکوک مذکور کی صحت و خطا کس حد تک ثابت ہوگی۔

جناب حسین بقول مشہور شعبان سنہ ۴ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور اپنی زندگی کے چھ ابتدائی سال اُس محترم بزرگ کے سایۂ عاطفت میں بسر کئے جسکی قامت میں سایہ ہی نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جناب نبی کریم انسے بہت مانوس تھے اور ایک حاضر الوقت[۱] کی شہادت ہے کہ اُسنے جناب حسنین کو ایک بار حبیب خدا کے گود میں بیٹھے دیکھا اور جناب رسالت مآب کو یہ فرماتے سُنا کہ "یہ دونوں (یعنی حسن اور حسین) میرے بیٹے اور میرے نواسے ہیں۔ الٰہی میں انسے محبت رکھتا ہوں تو بھی انسے محبت رکھہ اور نیز اُنسے محبت رکھہ جو انکو دوست رکھیں"

یہ اور اسی قسم کی بے شمار متواتر روایتیں جو آجتک کتب سیر و احادیث میں محفوظ

۱۔ اسامہ بن زید۔ دیکھو تاریخ الخلفا سیوطی۔

ہیں ان دونوں بھائیونکے فضایل اُس پاک گروہ کے دلپر نقش کرنیکے لئے کافی تھیں جنکا سب
اعتقاد تھا کہ ہمارے نبی کا ہر قول و فعل منجانب اللہ ہے۔ ما ینطق عن الھویٰ ان ہو الا وحی یوحیٰ
اور غالبًا یہی وجوہ تھے کہ جب مسلمانوں کے آفتاب اقبال کے سامنے قیصر و کسریٰ کو سر جھکانا
پڑا اور جمشید و کیخسرو کی دولت مدینہ کی گلیوں میں تقسیم ہونے کو آئی تو خلیفۂ وقت نے
مال غنیمت میں سب سے بڑا حصہ ان دونوں بھائیونکو دیا اور جب اُس جلیل القدر فرمانروا
کے عزیز فرزند نے دبی زبان سے اسکا شکوہ کیا تو امیر المومنین کو مجمع عام میں کہنا
پڑا کہ "اے میرے بیٹے انصاف کی راہ چل۔ میں تجھسے کہتا ہوں کہ اگر تیرا نانا
مثل انکے جد امجد کے ہوتا۔ یا تیری ماں مثل ان کی والدہ کی ہوتی۔ یا تیرا باپ ان کے
والد ماجد کے برابر ہوتا تو میں تجھکو راضی کر دیتا۔ اے میرے بیٹے یاد رکھہ کہ قیامت
کے دن تمام نسب مضمحل ہو جاینگے سوائے نسب بنت رسول اللہ کے"

جناب رسول کی وفات کے چھہ مہینے بعد آپ کی صاحبزادی بھی دنیا سے رخصت
ہوگئیں اور اسطرح تخمیناً سات سال کی عمر میں جناب حسین یتیم ہو گئے۔ آپ کی تعلیم و تربیت
کیونکر ہوئی۔ کسی تاریخ سے مفصل پتہ نہیں چلتا لیکن قیاس ہے کہ انکے والد بزرگوار نے
جو مصلحت خداوندی ہنوز بار خلافت سے سبکدوش تھے ان کو ادب و اخلاق۔ معانی
و بلاغت۔ اور فنون سپاہگری اور شہسواری کی ضرور تعلیم دی ہوگی اور نیز وہ نکات و
رموز و دقایق جو حضرت بوتراب نے اپنے عالی منزلت بھائی کے برسوں ساتھہ رہکر حاصل
کئے تھے سینہ بسینہ جناب حسین تک ضرور پہونچے ہونگے۔ لیکن یہ عجیب حیرت کا مقام
ہے کہ وہ شخص جس سے زیادہ آج دنیاے اسلام میں کسی ہیرو کی شہرت نہیں ہے۔ تیس
چالیس سال کی عمر تک ایسی گمنامی میں رہا کہ سواے دو یا تین موقعوں پر ضمناً اونکا تذکرہ
آجانیکے کسی معتبر اور صحیح تاریخ میں اُنکے اُس حصۂ عمر کے حالات بالکل معلوم نہیں ہوسکتے۔
اس گمنامی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا نہیں چاہئے کہ آپ میں کوئی غیر معمولی ذہانت و طباعی
نہ تھی کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ شعر و سخن میں مذاق سلیم رکھتے تھے اور آپ کے بعض لطیف
اشعار آجتک اہل مذاق کی زبانو نپر ہیں اور اس خیال کو تو ہرگز دل میں جگہ نہ دینا چاہئے

لہ طبقات واقدی - دفتر سوم - فتح مصر و عراق

کہ آپ شجاعت و دلیری میں اپنے ہمعصروں سے ممتاز نہ تھے کیونکہ تاریخ سے ثابت ہے کہ ۲۵ھ میں فتح افریقہ کے لئے جو جرار لشکر مدینہ سے بھیجا گیا تھا اُسمیں ارباب حل وعقد نے آپ کو بھی منتخب کیا تھا اور نیز محاصرۂ عثمان و جنگ صفین میں آپنے شجاعت و مردانگی کے خوب جوہر دکھلائے تھے۔ بلکہ اس عدم شہرت کی وجہ یہی کافی ہے کہ کہ جسوقت تک آپ کے والد بزرگ جناب اسد اللہ الغالب اور بڑے بھائی جناب حسن جو بمنزلہ آفتاب تھے زندہ رہے نور مہتاب زیادہ نمایاں نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ بڑوں کے ہوتے چھوٹے کا ذکر کیوں کیا جاتا۔

المختصر حضرت علی کی شہادت کے بعد آپنے معاملات میں دخل دینا شروع کیا اور ۵۰ھ یعنی اپنے بڑے بھائی کی وفات کے بعد تو آپ ہی بنی ہاشم کے سردار ہوگئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ امیر شام اپنے بیٹے یزید کے لئے بیعت ولیعہدی لے رہے تھے اور تمام شام و عراق و حجاز نے باستثناء چار بزرگوں اور اُنکے توابع کے بزور حکومت یا رفع فساد کے لئے بیعت قبول کر لی تھی۔ ان چار بزرگوں میں سب سے زیادہ محترم جناب حسین تھے اور اُسیوقت سے گویا پالیٹکس میں اُنھوں نے علی الاعلان دخل دیا۔

۴

اگرچہ جناب حسن علیہ السلام نے جنکی صلح پسند پالسی کی دنیائے اسلام ہمیشہ ممنون رہیگی اپنے آخری وقت میں نصیحت کی تھی کہ "نبوت و خلافت ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہ سکتی اسلئے سفہائے کوفہ کی ابلہ فریبیوں سے بچنا اور امور مملکت سے الگ رہنا بہتر ہے" لیکن جناب حسین اسلام کے پولٹیکل عقاید میں یہ رخنہ اندازی کسطرح جائز نہ رکھ سکتے کہ مسلمانوں میں بھی روم و ایران کی طرح سلطنت موروثی ہو جائے اور (بقول اونکے ایک ہمزبان کے) سرتاجوں کی جگہ ہرقل تخت نشین ہونے لگے۔ الغرض جناب حسین نے جو یزید کے فسق و فجور سے بھی آگاہ تھے اپنے نفس پر مصائب و تکالیف برداشت کرنا ایک فاسق کی بیعت کرنے اور مسلمانوں میں ایک بری رسم کی ابتدا کرنے سے افضل سمجھا اور باوجود سخت اصرار کے اُنھوں نے یزید کی بیعت نہ حضرت معاویہ کی زندگی میں کی اور نہ اونکے بعد۔

کہتے ہیں کہ امیر معاویہ کے انتقال کے بعد جب اہل شام نے یزید کی بیعت کرلی اور اُنہنے حجاز سے بھی اُس وعدہ کا ایفا چاہا جو اُنکے والد کی حیات میں کیا گیا تھا تو اوسنے حاکم مدینہ کو جناب حسین ابن علی سے بالجبر بیعت لینے کے لئے خاص طور پر تاکید کی دیکھو آپکا سب سے بڑا دشمن آپکی صداقت و راستبازی پر اسقدر اعتماد رکھتا تھا کہ اگر انہوں نے ایکبار برضا یا بالجبر کسی طرح بھی بیعت قبول کرلی تو ہرگز ہرگز دوبارہ سر نہ اُٹھائینگے۔ اور وہ آپ کو ایسا ذی اثر بھی سمجھتا تھا کہ اگر اُنہوں نے اطاعت نہ کی تو سلطنت اسلام سے فتنہ و فساد دور نہیں ہو سکتا۔

یزید کی یہ پالیسی غلط تھی یا صحیح اُسکا آج تیرہ سو برس کے بعد کوئی ایسا تصفیہ نہیں کیا جا سکتا جسمیں شک و شبہ کی گنجائش ہو۔ اصول سلطنت و آئین جہانداری کو پیش نظر رکھکر ہر شخص یہ رائے دیگا کہ ایسی حالت میں یزید کو جناب حسین سے جبریہ بیعت لینا چاہئے تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اگر یزید اپنے باپ کی سنت پر عمل کرتا اور خود مدینہ میں حاضر ہوکر استمالت اور تملق سے کام لیتا اور بجائے ناجائز دباؤ ڈالنے اور شجاعت ہاشمی کو جوش دلانیکے وہ انسے عاجزانہ التماس کرتا کہ آپکو اپنے جد امجد کی امت میں فتنہ و فساد ڈالنا مناسب نہیں ہے، تو ممکن تھا کہ جناب سید وہی سکوت اختیار کرتے جو اُنہوں نے امیر معاویہ کے عہد میں کیا تھا یا اپنے دانشمند برادر بزرگ کی طرح تمام حقوق سے دستکش ہو جاتے اور آج اسلام کی تاریخ میں کچھ اور ہی حروف نظر آتے۔ افسوس ہے کہ یزید نے سلطنت کے زعم اور فوج کے گھمنڈ پر پولیٹیکل چالیں چلنے کی ضرورت نہ سمجھی اور بقول سر ولیم میور کے علویوں کے ہاتھ... ایک تھا... تیز اور... ڈالا... خنجر دیدیا جسنے صرف بنی امیہ کی جڑ نہیں کاٹی بلکہ اسلام میں ہمیشہ کے لئے ایک عظیم الشان تفرقہ پیدا کر دیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ ؎

خاکساری پیشہ کردن ہیچ میدانی کہ چیست
مشت ناشاکے بچشم دشمناں افگندن است

سلہ (صفحہ ۲) عبدالرحمٰن بن ابی بکر۔ دیکھو کامل ابن اثیر جلد سوم

خیر۔ امور مملکت خویش خسرواں دانند۔ مختصر یہ ہے کہ حاکم مدینہ نے دمشق کی ہدایت کے
موافق جناب حسین سے بالجبر بیعت لینا چاہی اور آپ اُسکو بطائف الحیل ٹالکر شبا شب
مدینہ سے فرار ہوگئے اور سخت پریشانی کی حالت میں جبکہ ہر ہر قدم پر گرفتاری کا اندیشہ
تھا۔ مکہ معظمہ پہونچے اور وہاں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

کوئی قطعی شہادت اس امر کی نہیں ملتی کہ یزید نے حرم مقدس میں جگر گوشۂ رسول
کے ستانیکی کوشش کی ہو اسلئے قیاس ہوتا ہے کہ شاید یزید کی اُس پہلی غلطی کا وہ
دردناک انجام ہوتا جو ہوا اگر اُسوقت اہل عراق جنکے یہاں بغاوت کی آگ ہمیشہ
سلگتی رہتی تھی جناب حسین کو علم بغاوت بلند کرنیکے لئے اپنا سردار بنانا چاہتے اور بیشمار
خطوط و مکاتیب بھیجکر آپ کو اپنا دارالہجرۃ چھوڑنے اور کوفہ کی طرف آنے پر مجبور نکرتے
جب سرداران عراق نے آپکے طلب کرنے میں اصرار کیا۔ خطوط کا تار باندہ دیا۔ یزید
کے فسق و فجور کا اظہار کرکے صاف الفاظ میں تحریر کیا کہ اُنہوں نے یزید کی بیعت نہیں
کی ہے اور وہ اُسکے قائم مقام کے ساتھ نماز جمعہ اور عید میں شریک نہیں ہوتے ہیں
اور قرۃ العین رسول کو اُن دو چیزوں کا واسطہ دیکر جنسے زیادہ کوئی چیز اوسکو محبوب
نہیں ہوسکتی تھی "یعنی دین و رسول" اس غرض سے کوفہ بلایا کہ وہ امت نبی امی کو اُس
گمراہی و کجروی سے بچائیں جو بادشاہ اسلام کے علی الاعلان معاصی سے عالمگیر ہوا
چاہتی ہے تو آپنے مجبوراً عزلت و گوشہ نشینی ترک کرکے خالصتہً لوجہ اللہ کوفہ کا قصد
کیا اور اسطرح لفظ ہیرو کے اُس قدیم مفہوم کے مصداق بنے کہ اپنے ملک و قوم کے فائدہ
کے لئے بے خوف و خطر ایک امر خطیر کا بیڑہ اُٹھایا اور اپنے ابنائے جنس کے نفع کے لئے خود
مصیبت و تکلیف اُٹھانا قبول کیا۔

اس مقام پر چند باتیں قابل غور ہیں اول تو یہ کہ اُسوقت مکہ میں بڑے بڑے جلیل القدر
اصحاب رسول اللہ اور ہزاروں تابعین جنکے اقوال و افعال سے آج تمام دنیا کے مسلمان
استناد کرتے ہیں موجود تھے اُنہوں نے اپنے نبی کے عزیز نواسہ کا ساتھ کیوں نہ دیا۔ دوسرے
یہ کہ سید مظلوم اس سفر مصیبت میں جسکا انجام ابتدا ہی سے پُرخطر معلوم ہوسکتا تھا اپنے

اہل و عیال کو کیوں ساتھ لے گئے۔ اور تیسرے یہ کہ جناب شہید نے صرف ستراسی آدمیوں کی مختصر جماعت ساتھ لیکر یزید کی باقاعدہ اور بے شمار فوج سے مقابلہ کے لئے نکلنے کی کیونکر جرأت کی۔

ان تینوں شبہوں کے متعلق کتب سیر و تواریخ میں کوئی صاف جواب موجود نہیں ہے۔ لیکن قیاس ہوتا ہے کہ شاید جناب حسین نے مصالح ملکی پر نظر کرکے اپنے قصد سفر کو مخفی رکھا اور روانگی کی صحیح تاریخ بھی کسیکو نہیں بتائی ورنہ ممکن نہ تھا کہ آپکے شور اغتنی پر ایک عالم امنڈ نہ آتا اور تمام عرب میں تہلکہ نہ مچ جاتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ آپ کی روانگی از مکہ کی تاریخ میں مورخین کو اختلاف ہے اور اختلاف بھی ایسا عظیم کہ قریب قریب کل علماء و مجتہدین متفق ہیں اس دعویٰ پر کہ آپ قبل حج کے مکہ سے رخصت[1] ہو گئے اور بعض مورخ بھی یہ کہکر کہ آپ مکہ سے اُسیدن روانہ ہوئے جسدن حضرت مسلم بن عقیل (جناب حسین کے چچا زاد بھائی جو بطور سفیر کے پیشتر سے کوفہ روانہ کئے گئے تھے اور جنہوں نے وہاں سے رپورٹ کی تھی کہ دس بارہ ہزار مسلمان آپکا ساتھ دینے کو تیار ہیں آپ یہاں تشریف لائیے) کوفیوں کی بیوفائی اور بدعہدی سے شہید ہوئے (اور جسکی تاریخ بقول مشہور ۲ر ذالحجہ ۶۰ھ ہے) آپ کی تاریخ روانگی قبل حج کے بتاتے ہیں لیکن محقق اور عالم مورخ مثل ابن الاثیر اور جلال الدین سیوطی وغیرہ کے آپ کی تاریخ روانگی ۱۰ر ذالحجہ یعنی حج کے دوسرے دن قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حج کے موقعہ پر جبکہ مکہ میں ہزاروں مسلمان دور دور سے آکر اکٹھا ہوئے ہونگے اور اُنمیں سے بیشتر زیارت جمال باکمال فرزند رسول اللہ کے ضرور مشتاق ہونگے اگر آپ گوشہ نشین اور عزلت گزیں ہوتے اور آپ کا قصد سفر بغرض دفع تسلط یزید بالکل مخفی ہوتا یا آپ بغیر اس خبر کو عام کئے دفعتہً بلا اطلاع عراق کی طرف راہی ہو چکے ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ آپ کی روانگی

[1] ہمارا ہیرو پوئیٹ کہتا ہے۔

اعدا نے گزرنے نہ دئے حج کے بھی ایام	کھولا پسر فاطمہ نے باندھکے احرام
عازم طرف راہ الٰہی ہوئے حضرت	تھی ہشتم ذیحجہ کہ راہی ہوئے حضرت

کی صحیح[1] تاریخ تمام مسلمانوں کو معلوم ہو جاتی اور اسمیں کچھ بھی اختلاف پڑتا بلکہ گمان غالب ہے
کہ اس رائے کے افشا ہو جانے سے بہت سے بندگان خدا اور حلقہ بگوشان نبی اکرم کو جوش
آجاتا اور وہ بھی انکی مدد کے لئے وہی راہ اختیار کرتے جو انہوں نے کی تھی اور
اسطرح تاریخ کربلا کا ورق الٹ جاتا۔

البتہ یہ مسلم ہے کہ آپ نے سفر کا قصد اپنے عزیزوں اور احباب سے ضرور ظاہر کیا تھا
اور وہ سب بالاتفاق اس رائے کے خلاف تھے بلکہ حضرت ابن عباس اور (اقول بعض) محمد
ابن حنفیہ نے تو آپکے روکنے میں بیحد اصرار کیا اور عبد اللہ ابن عمر نے تو یہانتک کہا کہ خدا نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا و آخرت کے اختیار کرنے میں مختار کیا تھا آپ نے آخرت
کو پسند فرمایا۔ آپ چونکہ رسول اللہ کے لخت جگر ہیں اسلئے آخرت ہی کو اختیار فرمائی مگر جناب
حسین کے دل پر کوفہ والوں کی تحریر کا ایسا اثر تھا کہ انہوں نے کسیکی بات نہ مانی اور اس قول پر
عمل نہ کیا کہ

---

[1] ممکن ہے کہ جناب حسین نے مکہ سے اسیدن سفر کیا ہو جسدن کہ مسلم بن عقیل کوفہ میں شہید ہوئے لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ہم
اس واقعہ پر غور کرتے ہیں تو ہمکو یہ روایت ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ بمقدر زیادہ اس حکایت کی تحقیق کرتے ہیں
اتنا ہی زیادہ شکوک اور اوہام میں گرفتار ہوتے ہیں۔ عجب تماشہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے سے محقق جنکو فلسفۂ تاریخ کی ایجاد کا
فخر حاصل ہے حضرت مسلم کے کوفہ میں داخل ہونیکی تاریخ پہلی ذالحجہ ۶۰ھ بتاتے ہیں اور بعض مورخ اسسے بھی ایک نمبر اور بڑھا کر
اپکی روانگی ازمکہ جانب کوفہ کی تاریخ آٹھویں یا نویں ذیحجہ بتاتے ہیں اور اسطرح آپکے کوفہ پہونچنے کی تاریخ گویا کہ آخر ذالحجہ
میں قرار دیتے ہیں۔ بہرحال یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلم نے کوفہ پہونچکر ہزاروں مسلمانوں سے بیعت لی اور جناب حسین کی
خدمت میں مفصل رپورٹ بھیجی اور جسکو پڑھکر سید شہید قبل حج کے یا حج کے دوسرے دن (!!) مکہ سے روانہ ہو گئے
اور اسی عرصہ میں یہ واقعہ بھی گزر گیا کہ کوفہ سے یزید کے پاس مسلم کے آنے اور ایک گروہ کثیر کی ان کے ہاتھ پر بیعت
کرنے کی خبر پہونچی اور اوس نے حاکم کوفہ کو تبدیل کیا اور جدید حاکم نے مسلم کو اسیدن شہید کیا جسدن کہ جناب
حسین مکہ سے روانہ ہوئے تھے (!!)

طرہ یہ ہے کہ باوجود ان مختلف یا توں کے حضرت مسلم کی تاریخ شہادت بقول مشہور ۹ ذالحجہ بتائی جاتی
ہے۔ اور ہم آج یہ دریافت نہیں کر سکتے کہ ان تمام تاریخوں میں کون سی صحیح ہے اور کوئی بھی صحیح ہے یا نہیں ۱۲

(امیر احمد)

حضرت ابن عمر کے اس قول سے خیال ہوتا ہے کہ شاید بعض بزرگ اُسوقت بھی خروج فرزند رسول اللہ کو بشوق طلب مملکت و امارت خیال کرتے تھے اور اسکی تائید یوں ہوتی ہے کہ تاریخ طبری کا فارسی مترجم جو نشۂ الفت آل نبی سے خوب سرشار ہے (اور اسی ذوق شوق میں چند ایسے واقعات بھی داخل کتاب کر گیا ہے جنکو ابو جعفر طبری کے ہم مذہب آج تسلیم نہیں کرتے) اس موقع پر لکھتا ہے کہ "عبد اللہ ابن عباس سوی او آمد گفت یا ابن رسول اللہ از مکہ مرو و حرم خدائے عزوجل رارہا کن - پدرت مکہ و مدینہ رارہا کرد و کوفہ را برہمہ را جا یہا گزید و ایشاں را دیدی کہ با او چہ کردند و آخر او را بکشتند - و برادرت حسن را زہر دادند و پیش از زہر او را خواستند کہ بکشند و غارت کنند - اکنون تو بر ایشاں ایمن مباش نہ بنامہ و نہ بہ بیعت و نہ بو گنند - حسین گفت اے پسر عم کار خیر آنست کہ تو دانی و نامۂ مسلم بن عقیل آمدہ است کہ دو از دہ ہزار مرد بیعت کردند و دہ رسول پیش آمدند و از کوفیان دویست نامہ بیش آمدہ است - عبد اللہ گفت باری بپائی تا ماہ ذالحجہ بگزرد و سال نو اندر آید کہ اکنوں وقت حج است و ہمہ جہاں بمکہ آئند و تو ہمی از مکہ بروی بطلب ایں جہاں و بطلب مملکت مردمان زشت گویند تا حج بکنی و حجاج باز گردند آنگاہ بروی نیکو ست - حسین گفت ایں کار تاخیر ندارد"

اگر یہ خیال صحیح ہے تو اُس پہلی بات کا کافی جواب ہو گیا کہ مکہ سے نکلتے وقت جناب حسین کے ساتھ زیادہ جمعیت اسوجہ سے نہ تھی کہ اول تو وہ حج کا زمانہ تھا اور دوسرے یہ کہ بعض بزرگان دین جناب حسین کے اس خروج میں طلب امارت کا جزو شامل سمجھتے تھے - ان بزرگوں کا یہ گمان صحیح تھا یا نہیں اسکا جواب میرے پاس ابھی کچھ نہیں ہے - جناب حسین کی آئندہ زندگی خود اس دعوی کو غلط یا صحیح بتا دیگی -

رہی وہ دوسری بات کہ جناب حسین اپنے اہل و عیال کو کیوں ساتھ لے گئے اسکا جواب ناواقفوں کے لئے تو یہی کافی ہے کہ جناب حسین کو اندیشہ تھا کہ میرے غیبت میں یزید کے تابعین اہل و عیال کو ایذا پہونچائینگے جسکا انجام ممکن ہے کہ جدال و

قتال پر ہو اور اُس سے حرم مکہ کی بے حرمتی ہو لیکن جنہوں نے کہ مسلمانوں کی تاریخ تمدن کو غور سے پڑھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اُسوقت تک عرب میں وہ حضریت پیدا نہیں ہوئی تھی جو آخر عہد بنی اُمیہ سے شروع ہوئی اور ہارون - مامون - اور معتصم کے زمانہ میں کمال کو پہونچی بلکہ سنہ ۶۰ھ تک مسلمانوں میں عموماً اور خاندان نبوت میں خصوصاً وہی بدویت کی سادگی باقی تھی جو تمام سچی ترقیوں کا اصلی ذریعہ ہوا کرتی ہے اور جسکا تقاضا ہے کہ انسان ہر حالت میں اپنے اہل وعیال کو ساتھ رکھے اور میدان جنگ میں تو ضرور ہی ساتھ لیجائے تاکہ اُنکی مصیبت وتکلیف کا خیال کرکے رگ شجاعت کو حرکت ہو اور میدان جنگ سے قدم نہ ہٹے - دیکھو وہ بے سروسامان عرب جو یرموک اور قادسیہ کی لڑائیوں میں شجاعت کے جوہر دکہا رہے تھے اُنکے ساتھ بہی بیویوں اور بچوں کا بار موجود تھا اور اگر واقدی کا بیان صحیح ہے تو بعض موقعوں پر صرف انہی بے زبان عورتوں کی مدد سے لڑائی کا پانسہ پلٹا تھا اور فتح کا سہرا عرب کی نیم مہذب مخلوق کے سر رہا تھا - الغرض ماہرین فن سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اُسوقت تک عورتوں کا میدان رزم اور سفر مصیبت میں ساتھ ہونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی بلکہ جب تک مسلمانوں پر حضریت کا پورا غلبہ نہیں ہو گیا اور اُنہوں نے اپنی قدیم پاکیزہ بدویت کو عراق وشام کے سبزہ زار دیکھکر بالکل فراموش نہیں کردیا وہ ہمیشہ مال عرب پیش عرب کے قیمتی اصُول پر کاربند رہے -

وہ تیسرا وسوسہ کہ جناب حسین نے اسقدر قلیل جماعت ساتھ لیکر خروج کی کیونکر جرأت کی بالکل بے بنیاد معلوم ہوتا ہے جب ہم اس امر کو پیش نظر رکھیں کہ جناب حسین کو یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ اہل عراق فوراً منحرف ہو جائینگے اور اسطرح راستہ ہی میں جنگ وجدل کی نوبت آئیگی بلکہ وہ تو کوفہ کی نیت سے چلی تھی جہاں سے اُنکے مخبر نے رپورٹ کی تھی کہ بارہ ہزار مسلمان آپکے لئے سر کٹانیکو تیار ہیں اور اسمیں کچھ شک نہیں کہ اگر کوفی اپنے قول وقرار پر قائم رہتے تو عراق کا فتح ہو جانا کچھ دشوار نہ تھا اور اُسکے بعد حجاز میں بھی بغاوت کی وہی آگ ضرور مشتعل ہو جاتی جسکو عبداللہ بن

زبیر نے کچھ دنوں کے بعد اپنی ضرورت کے لئے بھڑکایا اور اسطرح یزید کا تسلط دفع ہو جاتا جو خروج حسین کا اصلی مقصد تھا۔

القصہ جناب حسین ذی الحجہ سنہ ٦٠ھ میں مکہ سے مع اہل و عیال بقصد کوفہ روانہ ہوئے اور ادھر یزید کے یہاں یہ خبر گزری کہ سید نے حرم مقدس کو چھوڑ کر عراق کا قصد کیا ہے اور اس نے فوراً اپنے عامل عراق کو حکم دیا کہ فوج لیکر جنگل ہی میں انکا راستہ روکے اور انکو اطاعت پر مجبور کرے۔

حاکم عراق عبید اللہ ابن زیاد جو حضرت مسلم بن عقیل کو جنہوں نے ایک بہت بڑی جماعت اپنی تابعین کی کوفہ میں اکٹھا کر لی تھی پہلے ہی شہید کر چکا تھا اب شہادت حسین کے درپے ہوا اور اس نے صوبہ رے کے گورنر عمر ابن سعد کو تعینات کیا کہ فوج کے چار ہزار لیکر بادیہ عراق میں حسینی گروہ سے مقابلہ کرے۔

کہتے ہیں کہ جناب حسین قادسیہ تک جو کوفہ سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر ہے پہونچنے تھے کہ انکو کوفیوں کے منحرف ہو جانے اور حضرت مسلم کی شہادت کا حال معلوم ہوا۔ ساتھ ہی یہ بھی خبر ملی کہ عمر بن سعد چار ہزار فوج لئے انکی تلاش میں چلا آتا ہے مجبوراً آپنے کوفہ کا قصد ترک کیا اور شاہراہ کو چھوڑ کر ٢ محرم کو مقام کربلا میں پہونچے جہاں دوسرے روز ابن سعد بھی مع لشکر کے پہونچ گیا اور اب یہاں سے رہائی دشوار ہو گئی۔

اسوقت حضرت حسین کو معلوم ہوا کہ انہوں نے کوفیوں کے قول و قرار پر اعتماد کرنے میں غلطی کی اور انکو یقین ہو گیا کہ اس مختصر جمعیت کے بھروسے پر (جسکی تعداد ایکسو چالیس سوار و پیادہ سے زیادہ کسی روایت کے موافق نہیں ہے) کوفہ کی مدد کے بغیر یزید کی فوج سے مقابلہ کرنے میں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی۔ لہذا آپنے بقول مورخین تین شرطیں پیش کیں کہ یا تو تم مجھے چھوڑ دو تاکہ میں اپنے وطن کو واپس جاؤں اور بقیہ عمر عبادت خدای عز و جل میں بسر کروں یا مجھے اجازت دو کہ میں سرحدی ممالک میں جا کر کفار سے جہاد کروں اور وہیں درجہ شہادت پاؤں یا میرا راستہ نہ روکو تاکہ میں خود یزید کے

پاس چلا جاؤں اور وہ میرے ساتھ جو معاملہ چاہے کرے۔ ابن سعد نے ان شرائط کو بھجا سمجھا اور حاکم عراق سے نامہ و پیام شروع کیا لیکن عبید اللہ ابن زیاد نے جسکو ہم اس عبرت ناک ٹریجڈی کا اصلی مجرم سمجھتے ہیں۔ انہیں سے ایک شرط بھی قبول نکی اور حکم دیا کہ اگر حسین بیعت کریں تو خیر ورنہ انکو قتل کرو۔ اور چونکہ اسکو ابن سعد کی وفاداری پر شک تھا اسلیئے ایک اور جنرل بھی روانہ کیا جسکو حکم تھا کہ اگر ابن سعد جنگ میں اب بھی پس و پیش کرے تو وہ لشکر کی کمانڈ اپنے ہاتھ میں لیلے۔

جناب حسین کے لئے یہ بڑے سخت امتحان کا وقت تھا اور یہیں سے انکا اصلی کریکٹر نمایاں ہوتا ہے جو ہمارے اس مضمون کا موضوع ہے۔

دیکھو اگر سید طلب مملکت کے شوق میں مکہ سے نکلے تھے تو آج اونکی کیا آس باقی ہے وہ بارہ ہزار کوفی جنکے فریب میں آکر خدا کا گھر چھوڑا تھا آج اپنی تلواریں یزید ہی کیطرف سے نکالے ہوئے ہیں۔ وہ ہزاروں صحابہ اور بزرگان دین جو انکے اشارہ پر اپنا خون بہانے کو تیار ہوجاتے آج سیکڑوں کوس کے فاصلہ پر مکہ مدینہ میں پڑے ہوئے ہیں اور انکے درمیان ایک عظیم الشان ریگستان حایل ہے اور وہ شہر جسکو اپنا مستقر بنانے اور وہاں سے جنگ یزید کے لئے باہر نکلنے کا قصد تھا آج یہاں سے کئی منزل دور اپنے پھاٹک انکے لئے بند اور دشمنوں کے لئے کھولے ہوئے ہے۔ ایک مختصر جمعیت انکے ساتھ ہے جنمیں سے بیشتر تو اپنے ہی بھائی بھتیجے اور بیٹے ہیں جنمیں سے ہر ایک کی زندگی اُس محترم بزرگ کو اپنی جان سے بدرجہا زیادہ عزیز ہے۔ اور علاوہ اسکے عورتوں اور بچوں کا بوجھ بھی ساتھ ہے جسکو کسی امن و عافیت کی جگہ پہونچانیکا اب کوئی بندوبست نہیں ہوسکتا۔ دشمن کا ایک عظیم الشان لشکر انکے سامنے پڑا ہوا ہے اور ہر وقت اوسکی تعداد میں اضافہ ہوجانا ممکن ہے اور وہ لشکر اس جمعیت مختصر کو ضرور پامال کرڈالیگا اگر جناب حسین یزید کی بیعت نہ کریں۔

بیسویں صدی کا کوئی اسٹیٹسمین وہاں موجود ہوتا تو ضرور صلاح دیتا کہ جناب اسوقت بیعت قبول کیجئے اور اپنی جان بچایئے۔ پھر جب موقع ہوگا دیکھا جائیگا۔ یہ تو ہیں اسٹیٹسمانوں کا

جبریہ عہد نامہ یا زار روس کا اضطراری مینیفیسٹو ہے۔ مدبرین عالم کی نظر میں اسکی وقعت ہی کیا ہو سکتی ہے اور ہم بھی کہتے ہیں کہ اگر حسین کی غرض خروج سے حصول ملکت تھی تو انکو بیشک اطاعت قبول کر لینا چاہئے تھا کیونکہ اسوقت جنگ کرنا اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنا تھا۔ چنانچہ خود سید مظلوم کو بھی فتح سے مایوسی اور موت کا یقین ہے دیکھو اس موقع پر وہ اپنے سب ہمراہیوں۔ نوکروں اور غلاموں کو بیعت سے آزاد کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "جو تمہارا حق تھا وہ تم نے کیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ایسی حالت میں مجھکو جنگ پیش آئیگی ہم تھوڑے ہیں اور وہ بہت میں اپنی طرف سے ناامید ہوں لیکن یہ لوگ تم سے کچھ تعرض نکرینگے۔ جہاں تم چاہو چلے جاؤ میں تمکو بخوشی اجازت دیتا ہوں"۔ مگر وہ سب بالاتفاق جواب دیتے ہیں کہ "ہم فرزندزادگان رسول خدا اور بہترین خلق کو کسطرح نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر آج ہم اپنی جان بچالیں تو کل قیامت کے دن سیدالانبیاء سے کسطرح کہینگے کہ ہم آپکے لڑکوں کو لائے اور دشمنوں کے درمیان چھوڑ کر خود چلے آئے۔ معاذاللہ یہ ہم سے ہرگز نہوگا۔"

۱۲

اب غور کرو کہ ایسی مایوسی کے عالم میں جبکہ ہرطرف سوائے موت کے کچھ نظر نہیں آتا تھا اگر سید کی نظر میں حیات و ممات کا مرتبہ بالکل یکساں نہوتا اور انکو اسبات کا یقین کلی نہوتا کہ میں خالصتہً للہ ایک کار خیر کے لئے نکلا ہوں اور اگر اس کوشش میں میرا سر جائے تو وہ لاکھ زندگیوں سے افضل ہے تو ممکن نہ تھا کہ انکا قدم ڈگمگا نہ جاتا اور وہ اطاعت نہ قبول کر لیتے۔ لیکن جناب حسین نے اسوقت اپنی سچی شجاعت اور یگانہ آفاق دلیری ابدالآباد کے لئے تاریخ عالم میں یادگار بنادی اور صبر و تحمل کی سخت آزمائش میں مستقل رہکر ایسی جبریہ بیعت سے صاف انکار کردیا جسکو انکا کانشنس قبول نہیں کرتا تھا اور جسکو وہ اپنے ملک قوم اور مذہب کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ سچ ہے ؎

عطر کی مٹی میں بھی ملکر مہک جاتی نہیں

ترجیح اسی روایت کو ہے کہ محرم کی نویں تاریخ اور جمعرات کا دن تھا جب انھوں نے یہ شجاعانہ جواب دیا۔ اب جنگ سے کیا چارہ تھا۔ صرف ایک شب کی اماں کسی مصلحت سے جناب مظلوم

سے طلب کی تھی، اور دوسرے روز موت یونہیں یقینی تھی کہ شام کو ابن سعد کے پاس عبید اللہ ابن زیاد کا قاصد یہ پیام لیکر آیا کہ اگر حسین سے جنگ کرنا ہے تو اُنکے دریائے فرات تک پہونچنے کا راستہ بند کر دو تاکہ گرمی اور پیاس کی سخت تکلیف سے مضطرب ہو کر ہماری اطاعت کرلے یا اوسکی ہلاکت سہل ہو جائے۔

میدان جنگ میں دشمن کا دانہ پانی بند کرنا آج کے اصول جنگ کو دیکھتے کوئی غیر معمولی بزدلانہ یا وحشیانہ حرکت نہیں ہے۔ اور تاریخ اسلام میں بھی اسکی بیسیوں نظیریں موجود ہیں بلکہ واقعہ کربلا سے پیشتر خود جناب حسین کے والد ماجد پر اسی فرات کا پانی بند کیا جا چکا تھا لیکن غالبًا جناب سید الشہدا کی جمعیت کو پیشتر سے خیال نہ تھا کہ آب فرات جس سے چرند پرند سب سیراب ہوتے ہیں "باعث خلقت کون و مکان" کے فرزند پر بند کر دیا جائیگا لہذا اُنھوں نے پہلے سے پانی کا کافی ذخیرہ اپنے پاس فراہم نہیں کر لیا ورنہ اسقدر مختصر جمعیت کے لئے کافی پانی رکھ چھوڑنا کچھ دشوار نہ تھا۔ غرض رات ہی سے پانی کی طلب شروع ہوئی اور صبح ہوتے ہوتے تو سارے لشکر میں ایک قطرہ پانی بھی نہ تھا جس سے کوئی بچہ بہلا دیا جاتا مگر وہ جانباز اور مستقل مزاج بہادر جو راہ خدا میں اپنا سر کٹانیکے خود ہی مشتاق ہو رہے تھے ایسے شداید اور مصائب کی کیا پروا کرسکتے تھے۔ اُنکے رضا و تسلیم میں ذرہ برابر بھی تنزل نہیں آیا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہر چہ از دوست میرسد نیکوست۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر ست

اگلے وقتوں کے مورخ ملکی معاملات کی تحقیق و تفتیش میں اسقدر محو رہتے تھے کہ اُنکی کتابوں سے کسی ہیرو کی پرائیوٹ لائف دریافت کرنا مشکل ہے لیکن کربلا کی یہ رات کچھ ایسی درد انگیز تھی کہ عرب کا ایک مورخ اپنے اُصول کے خلاف اس موقع پر جناب حسین کی پرائیوٹ زندگی کی ایک نہایت ہلکی جھلک دکھاتا ہے۔ آؤ اسکی حکایت بھی سُن لیں۔

"شام کے وقت آپ خیمہ میں تشریف لے گئے۔ طبیعت پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ دردناک

---

۱ دیکھو تاریخ ابن خلدون۔ کتاب ثانی۔ واقعہ صفین۔

اشعار پڑہنے لگے۔ آپ کی بہن نے ان اشعار کو سُنا تو ضبط نہو سکا۔ گبہرا کر یہ کہتی ہوئی دوڑ پڑیں کہ "ہائے افسوس! کاش آج میں زندہ نہوتی۔ میری ماں مرگئیں۔ میرے باپ مجہہ سے جُدا ہوگئے۔ میرا بہائی جاتا رہا۔ اے خلیفۂ ماضی و ای سرپرست باقی یہ کیا فرما رہے ہو" آپ نے ہمشیر کو ایسی بے صبری کے کلمات سے منع فرمایا اور کہنے لگے کہ "اللہ تعالیٰ سے ڈرو اوسکے حکم پر صابر و شاکر رہو اور یہ جان لو کہ زمین و آسمان سبکو فنا ہے اور بیشک سوائے اللہ تعالیٰ کے کل شے فنا ہونیوالی ہے۔ میرا باپ مجہسے بہتر تہا۔ میری ماں مجہسے افضل تہیں۔ میرا بہائی مجہسے زیادہ نیکو کار تہا۔ رسُول اللہ جنکے ہم سب پیروی کرتے ہیں۔ وہ بہی دُنیا سے اُٹھ گئے تو ہم کس شمار میں ہیں۔ اے میری بہن میں تمکو قسم دلاتا ہوں کہ کل اگر میں مارا جاؤں تو جامہ دری نکرنا۔ رونا۔ پیٹنا نہیں۔ بین نکرنا۔ نوحہ نہ پڑہنا۔ اے بہن یہی دن سب کو پیش آنے والا ہے۔ صبر کرنا صبر۔ صبر کا اجر اللہ دیگا"

القصہ دسویں محرم سنہ ٦١ھ ہے اور جمعہ کا دن۔ بادیۂ عراق کی ایک ہولناک وادی میں دریائے فرات کے کنارے ابن سعد کا لشکر مسلح ہوکر صف آرا اور مستعد جنگ ہوا ہی اور اوسکے مقابلے کے لئے ایک خستہ حال سید اپنے چند بچوں اور خادموں کو ساتہ لیکر جو سفر کی صعوبتوں اور تشنگی کی شدائد سے سراسیمہ ہو رہے ہیں خیمہ سے نکلا ہے لیکن اس مختصر گروہ کی زبان سے نہ کوئی کلمہ شکوہ و شکایت کا نکلتا ہے اور نہ اپنی غریب الوطنی اور بیکسی کی موت پر انکو کچہ تاسف ہے بلکہ انکے چہروں سے صداقت خلوص۔ استقلال۔ اور ایمان کا نور تاباں ہے اور گویا کہ میر انیس کا یہ بند صادق الحال ہے

خیمہ تہا فلک آپ قمر دوست ستارے	تارے بہی وہ تارے تہے فلک جنپر اُتارے
خم ہو گیا تہا پیر فلک شرم کے مارے	کہتی تہی زمیں اوج ہے طالع کو ہمارے

خورشید ہے یا روشنی نیر دیں ہے
خود عرش کو دہوکا تہا یہ میں ہوں کہ زمیں ہے

اس جنگ کے دردناک حالات مورخوں نے تفصیل کیساتہ بیان کئے ہیں لیکن میں اونکا

اعادہ کرنا نہیں جاتا۔ مختصر یہ ہے کہ دشمن کو مستعد بجنگ دیکھکر جناب حسین نے قطع محبت کے لئے پہلے ایک دردناک خطبہ دیا جسمیں اپنے فضایل و حقوق بیان کئے اور آخر میں یہ درخواست پیش کی کہ "تم مجھے چھوڑ دو تاکہ میں کسی محفوظ سرزمین کی طرف چلا جاؤں" لیکن جب فریق مخالف سوائے بیعت کے کسی شرط پر راضی نہوا تو آپ نے فرمایا کہ "خدا کی قسم میں ذلیل وخوار ہوکر تمہارا مطیع نہونگا اور نہ میں غلاموں کی طرح مجبور ہوکر یزید کی امارت کا اقرار کرونگا اے اللہ کے بندو! میں اپنے اور تمہارے رب سے امن کا خواستگار ہوتا ہوں اور ہر متکبر اور اُس شخص سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکہتا۔ اللہ تعالی سے پناہ مانگتا ہوں" یہ کہکر آپنے گفتگو ختم کی اور اسکے تہوڑی ہی عرصہ کے بعد تیر باری شروع ہوگئی جسکا انجام یہ ہوا کہ پہلے تو حسینی جمعیت کے قریب قریب کل مرد یکے بعد دیگرے شہید ہوے اور اسطرح سرنوشت کا وہ لکہا پورا ہوا کہ۔

"پہونچینگے یہ حسین سے پہلے بہشت میں"

اور بعد ازاں خود جناب حسین نے جام شہادت نوش فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہے عالم فانی کی عجب صبح عجب شام — گہہ غم کبھی شادی کبھی ایذا کبھی آرام
گودی ہے کبھی ماں کی کبھی قبر کا آغوش — گہہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بسر دوش
اک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مُسن کو — شب کو جو چھپر کہٹ پہ تو تابوت میں دنکو

کس باغ پہ آسیب خزاں آ نہیں جاتا
گل کونسا کہلتا ہے کہ مرجہا نہیں جاتا

جناب حسین کے بعد اُنکے وارثوں پر کیا گزری اور کارواں کربلا سے کوفہ اور دمشق میں کیا سلوک کیا گیا ہمکو اُس سے کچہ واسطہ نہیں۔ ہمارا مقصود تو جناب شہید کے کیرکٹر پر ریویو کرنا تہا اور وہ اُنکی زندگی کے ساتھ تمام ہوگیا۔

ہمنے تحقیق کر لیا کہ جناب حسین جرم بغاوت کے مرتکب نہیں ہوئے کیونکہ مسلمانوں میں اُسوقت تک ہر قل کے جگہ ہر قل کے تخت نشین ہونیکا قاعدہ جسکو آج کل لا آف پریما

مذہبی یا قانون وراثت حاف اکبر سے تعبیر کرتے ہیں جاری نہیں ہو چکا تھا اور اسلئے یزید کو ہرگز حق
نہیں حاصل تھا کہ وہ امیر معاویہ کے بعد مکہ اور مدینہ سے اجازت حاصل کئے بغیر زمام حکومت اپنے
ہاتھ میں لیلے۔ اگر امیر معاویہ کی وصیت اور اُس بیعت کا لحاظ کیا جائے جو اُنہوں نے اپنی زندگی میں یزید کیلئے
حاصل کی تھی تب بھی جن بزرگوں نے کہ اُسوقت بیعت سے انحراف کیا تھا بیشک اختیار رکھتے تھے کہ اب بھی اطاعت سے
انکار کریں اور اس امر پر مُصر ہوں کہ جو لوگ یزید سے زیادہ حکومت کے مستحق ہیں اُنہیں سے کوئی خلیفہ
بنایا جائے۔ چونکہ جناب حسین نے امیر معاویہ کی حیات میں بیعت نہیں کی تھی اسلئے وہ
ہرگز پابند نہ تھے کہ یزید کو حاکم جایز تصور کریں اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اُنکا خروج
عرب کی تاریخ تمدن کو پیش نظر رکھکر بغاوت نہیں قرار دیا جا سکتا۔

علاوہ اسکے جناب حسین نے اگرچہ خود یزید کی بیعت سے گریز کیا اُنہوں نے کسی دوسرے
کو اپنا ہمخیال بنانیکی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ بے شک بیعت یزید کی ذلت سے بچنے کے
لئے مکہ چلے گئے لیکن وہاں وہ نہ تو اپنے تابعین کی کوئی جماعت اکھٹا کر رہے تھے اور نہ
باغیانہ خیالات کی اشاعت میں اپنا وقت عزیز صرف کرتے تھے بلکہ اُنہوں نے عراق
کا قصد بھی اُسوقت تک نہیں کیا جب تک کہ کوفہ کے معزز لوگوں نے یہ صاف صاف
تحریر نہیں کیا کہ وہ یزید کی بیعت سے دستکش ہیں اور اُسکے نائب کے ساتھ نماز جمعہ اور
عید میں شریک نہیں ہوتے ہیں جو اس بات کا کافی ثبوت تھا کہ اُنہوں نے خود ہی
یزید سے سرکشی کی ہے اور اب اپنا جتھا مضبوط کرنیکے لئے خاندان رسالت کی ایک
معزز ممبر کو اپنا لیڈر بنانا چاہتے ہیں۔ یعنی بجائے اسکے کہ جناب حسین پر بغاوت کا الزام
لگایا جائے ہمکو تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اُنکو مسلمانوں کے ایک گروہ نے بہکا کر اپنا سردار
بنانا چاہا اور وہ اُنکے فریب میں آکر کوفہ کی طرف راہی ہوئے تھے کہ اُن بزدل اور کم ہمت
باغیوں نے وعدہ خلافی کی۔ خود الگ ہو گئے اور سارا الزام سید مظلوم کے سر تھوپ دیا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب جناب حسین نے کوفیوں کی اغوا سے خروج کیا تو اُنہوں نے
اپنی شوکت کا اندازہ غلط نہیں کیا تھا اور اگر اُن کی خروج سے کوئی مفید نتیجہ حاصل نہیں
ہوا تو اسکی وجہ کوفیوں کی بدعہدی تھی جسکی مثال ایک حد تک یہ ہو سکتی ہے کہ بارہویں

صدی عیسوی میں شہنشاہ انگلستان اس نیت سے ایشیا آیا کر یورپ کے چند مقتدر تاجداروں کی مدد سے اپنا مقدس مذہبی شہر دشمنوں کے پنجہ سے چھڑا سے لیکن یہاں ایک ارمن کرد کی شجاعت دیکھکر کے بعد دیگرے کل تاجدار ہمت ہار گئے اور مجبوراً انگلستان کے شیر دل بادشاہ کو قید کے مصائب برداشت کرنیکے لئے ناکام واپس جانا پڑا۔

ہمنے یہ بھی دریافت کرلیا ہے کہ جناب حسین کی نیت عروج سے حصول سلطنت نہ تھی بلکہ وہ ایک ظالم کا شر دور کرنا اور اپنے ملک کو مطلق العنان حاکموں کے ظلم و جور سے بچانا چاہتے تھے اور اسلئے انکا عروج ایک غیر مذہب کے مورخ کی نظر میں کم سے کم ویسا شریفانہ تو ضرور تھا جیسا کہ بروس یا کرامول کا۔

المختصر انگریزی مورخ کا وہ دلخراش فقرہ جو اس طویل مضمون کی تحریر کا باعث ہوا کسی طرح بھی صحیح ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور جناب حسین کے مذہبی عظمت و اقتدار اور انکی ذاتی محاسن و کمالات سے قطع نظر کرکے صرف وہی روایتیں جو واقعہ کربلا کے متعلق کتب تواریخ میں مندرج ہیں اس دعوے کے ثابت کرنیکے لئے کافی ہیں کہ جناب حسین کا مرتبہ اس سے بدرجہا اعلیٰ تھا کہ سر ولیم میور یا انکے معتقد ونکا وہم و خیال بھی وہانتک پہونچ سکے اور انکے اقوال افعال اسقدر بلند پایہ رکھتے تھے کہ آج دنیا جنکی آنکھوں پر مادی ترقیات نے غفلت کا تاریک پردہ ڈالدیا ہے ہرگز انکی کنہ و علت دریافت نہیں کرسکتی۔

جو انکی نظر میں حسن تھا اُسے آج نقص بتاتے ہیں اور جسکو وہ داخل عیب سمجھتے تھے وہ آج سرمایۂ تہذیب ہے!! تم کہوگے کہ انہوں نے مفت میں جان دی اور وہ کہتے تھے کہ

ہر کس کہ جان نداد بجانان نمیرسد!!!

بہر حال اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جناب حسین نے جو کچھ کیا وہ سچے دل اور پاک نیت سے تھا۔ انکا پاک دل صدق و خلوص سے لبریز تھا اور وہ اسقدر جرأت و ہمت رکھتے تھے کہ جو دل میں تھا اسے زبان پر لائے۔ جو انکا اعتقاد تھا اس سے جب تک دم میں دم رہا منحرف نہیں ہوئے۔ اور "الرایٹ" کانشنس (نفس مطمئنہ) کے خلاف عمل نکرنے کی جرم میں وہ قتل کئے گئے تو ایسی معزز موت بے شک لاکھ زندگیوں سے افضل تھی۔

سر گشتہ بر نیزہ سبز و نفس	قطعہ	کہ معراج مرداں ہمیں است و بس

طالبعلم اور پالیٹکس

مندرجہ بالا عنوان کے دیکھنے سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ آیا طالبعلموں کو پولٹکل معاملات میں حصّہ لینا چاہیئے کہ نہیں اور اگر حصہ لینا چاہیئے تو کس حد تک۔ ان سوالات کا صحیح جواب لفظ پالیٹکس کی تشریح پر منحصر ہے۔

پالیٹکس کا لفظ بہت وسیع ہے۔ لیکن اس خاص موقع پر ہم اسکا عام مفہوم ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ پالیٹکس وہ فن ہے جسے فرمانروا۔ وقت اور رعایا کے تعلقات کی تفسیر سمجھنا چاہیئے یا حاکم و محکوم کے باہمی حقوق و فرائض کی تشریح۔ مثل دیگر فنوں کے پالیٹکس کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک شاخ کا تعلق محض پولیٹکل حقوق و فرائض اور مسائل ملکی کے مطالعہ سے ہے۔ دوسری شاخ سے عملی پالیٹکس مراد ہے۔ یعنی پولیٹکل بحث و تحریک میں عملی طور پر حصہ لینا۔

اس تشریح کے بعد یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ آیا طالب علموں کے لئے محض پولیٹکل حقوق و فرائض و مسائل ملکی کا مطالعہ ضروری ہے۔ یا پولیٹکل بحث و تحریک [illegible] میں انہیں عملی طور پر شریک ہونا چاہئے۔ یا دونوں صورتوں سے قطعًا پرہیز کرنا چاہیئے۔

جہانتک عمل بحث و تحریک کا تعلق ہے یہ کہنا نامناسب نہیں کہ عمومًا طالبعلموں کو ان ہنگامہ آرائیوں سے کنارہ کش رہنا چاہیئے کیونکہ پولیٹکل ہنگاموں میں شریک ہونے سے انکی تعلیم کو نقصان پہونچیگا۔ اور سوسائٹی کی معمولی حالت میں وہ نقصان اس فائدہ سے زیادہ ہوگا جو کہ وہ اپنے ملک کو پولیٹکل بحث و تحریک میں شریک ہوکر پہونچا سکینگے۔ مگر قوموں کی زندگی میں اکثر ایسے موقع پیش آتے ہیں جسوقت کہ محض پولیٹکل فرائض کا ادا کرنا تمام فرائض سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔ اس حالت سے تعلیمی فرائض ہی مستثنےٰ نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ تحصیل علم بجائے خود کوئی اخلاقی فرض نہیں ہے۔ یہ ان اخلاقی فرائض کے ادا کرنے کا ایک ذریعہ ہے جن پر سوسائٹی یا قوم کی مجموعی قوت و صحت کا دار و مدار ہے۔ پس واقعات کی رفتار میں اگر کوئی خاص انقلاب پیدا ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کی معمولی حالت کسی ایسی غیر معمولی حالت سے

بدل جائے جبکہ اسکی مجموعی صحت وقوت قائم رکھنے کا محض یہی ذریعہ ہے کہ اسکا ہر ایک فرد اپنی حیثیت وقابلیت کے مطابق عملی طور پر اسکی کچھ مدد کرے تو ایسے وقت میں طالبعلموں کو بھی عملی پالیٹکس میں شریک ہونے سے ہرگز نہ گریز کرنا چاہئے۔ مثلاً روس میں جو کچھ پولیٹکل بحث و تحریک کا ذکر سنا جاتا ہے اسمیں ہمیشہ سے طالبعلموں کا بہت کچھ حصہ رہا ہے۔ سیکڑوں طالبعلم قید کرکے سائبیریا کے ویرانوں میں بھیجدیئے گئے ہیں۔ سیکڑوں کو پھانسی دیدی گئی ہے۔ اور آج یہ انہیں شہیدان وفا کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ روس میں ایک جمہوری جماعت یا پارلیمنٹ ڈوما کے نام سے قائم ہوئی ہے یا جنگ ٹرانسوال کے زمانہ میں بوروں کے چودہ پندرہ برس کے لڑکے بھی میدان کارزار میں آکر اپنی جانیں قومی عظمت پر نثار کرگئے۔ یا آجکل ایک حد تک بنگال میں وہ انقلابی حالت پیدا ہوگئی ہے جبکہ بالضرور بحث و تحریک میں طالب علم بھی عملی طور پر شریک ہیں۔ اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ سرندرناتھ بنرجی کے جھنڈے کے تلے اپنی قومی یگانگت قائم رکھنے کے لئے پولیٹکل معرکے سر کررہے ہیں۔ یا پنجاب میں سودیشی تحریک کو فروغ دینے کے لئے اسکول اور کالج کے طالبعلم لالہ لاجپت رائے کے زیر فرمان کام کررہے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ غیر معمولی حالتیں ہیں۔ معمولی حالت میں طالبعلموں کو پولیٹکل بحث و تحریک میں عملاً شریک نہ ہونا چاہئے۔

اب رہا اس بحث کا دوسرا پہلو کہ طالب علموں کے لئے محض پولیٹکل حقوق و فرائض و مسائل ملکی کا مطالعہ کس حد تک جائز ہے؟ اسکی نسبت ہماری یہ رائے ہے کہ اوسط درجہ کی ذہانت کا ہر طالبعلم اپنے کورس کے کافی مطالعہ کے بعد دو چار گھنٹے کی فرصت بھی پیدا کرلیتا ہے۔ اس وقت کا کچھ حصہ اسکو پولیٹکل لٹریچر کے مطالعہ میں صرف کرنا چاہئے۔ پولیٹکل لٹریچر کی نوعیت طالبعلم کی قابلیت و لیاقت پر منحصر ہے۔ مثلاً مڈل اور انٹرنس کلاس کے طالبعلموں کے لئے عموماً ان اخباروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ جنکا تعلق کہ زیادہ تر انکے صوبے کی پالیٹکس سے ہو۔ کالج کے طالبعلموں کے لئے علاوہ ان اخبار اور رسالوں کے انگلستان کے پولیٹکل اخبار اور رسالوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ نیز اس قسم کی کتابوں کا پڑھنا بھی ضروری ہے جو ہندوستان کی پولیٹکل حالت کے متعلق ہمدردان ملک نے لکھی ہیں۔ مثلاً سرہنری کاٹن کی تصنیف موسوم بہ

نیو انڈیا (سنہ ۱۹۱۳ء) اس لاجواب تصنیف میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں
کے پولیٹیکل ارادوں اور ولولوں کا خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پولیٹیکل مذاق
کا چراغ انکے دلمیں روشن رہیگا اور جب وہ تحصیل علم سے فارغ ہونگے تو عملی پالیٹکس میں
شریک ہوکر اپنی قوم کی خدمت کرینگے۔ مگر کیا افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے صوبہ کے طالبعلم
عموماً اس پولیٹیکل تربیت سے بیخبر ہیں جو پولیٹکل اخبار اور رسالوں کے پڑھنے سے حاصل
ہوتی ہے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے علاوہ اگر کوئی کتاب انکے نظر سے گزرتی ہے تو وہ
ادنیٰ درجے کے ناولوں کی قسم سے ہوتی ہے اور اگر کسی اخبار یا رسالے کی طرف توجہ
دوئی تو کبھی اسٹیشن پر کوئی ادنیٰ درجہ کا ولایتی میگزین خرید لیا جسمیں طفلانہ مذاق کی
غیر مسلسل حکایتیں درج ہوتی ہیں کہ فلاں شخص کی عمر اسوقت ایکسو بیس برس کی ہے
فرانس کے فلاں صوبے میں ایک عورت کی تین بچے ہوئے۔ جاپان کا بادشاہ ایک سو
بیس تاجداروں کا وارث ہے۔
افریقہ میں ایک جانور ہوتا ہے جسکا انڈا تین پاؤ کا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ جو اعلےٰ
درجے کے میگزین یا رسالے ہیں اور جو کہ محققین فن اور مستند حضرات کے زیر اہتمام
شائع ہوتے ہیں اُنسے اس لئے تنفر ظاہر کیا جاتا ہے کہ اُن میں پالیٹکس بہت ہوتی ہے۔
طالبعلموں پر کیا منحصر اکثر سن رسیدہ حضرات کا یہ خیال ہے کہ زمانہ تعلیم میں مسائل ملکی
اور پولیٹیکل حقوق و فرائض کا محض مطالعہ بھی خلاف مصلحت ہے۔ اس خیال کے حضرات
کے دو طبقے ہیں ایک طبقہ تو اُن بزرگوں کا ہے جنکا عام قول یہ ہے کہ پولیٹیکل جدوجہد
ہی اخلاقی گناہ ہے۔ جو ان میں مسلمان ہیں انکا تو شیخ سعدی کے مقولے پر عمل ہے کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں

اور جو ہندو ہیں ان کی تلقین یہ ہے کہ فرمانروائے وقت خود اپنے کرموں کے لئے
ذمہ دار ہے بس رعایا کا فرض ہے کہ وہ دنیا کے ان جھگڑوں سے اپنا دامن بچا کر عقبیٰ
کی سلطنت کا انتظام کرے۔ ایسے حضرات کا جب عام اصول یہ ہے تو طالبعلم بھی اس سے

سے منتے نہیں ہو سکتے۔ اس خیال کے بزرگوں کی شان میں صرف اسقدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انکا جواب دینا زیادہ ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں انکے خیالات کی طرح ان کی تعداد بھی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے اور جو کچھ پاک روحیں اس خیال کی باقی رہگئی ہیں انکے رُخ بھی عقبیٰ کی طرف پھر گئے ہیں۔

دوسرا طبقہ اُن بزرگوں کا ہے جو پولٹیکل جدوجہد کے خلاف تو نہیں ہیں مگر طالبعلموں کے حق میں پولٹیکل سائل کا مطالعہ مُضر خیال کرتے ہیں۔ ان حضرات کی دلائل کی تردید اس مضمون کا خاص منشا ہے۔ عام دلیل ان کی یہ ہے کہ پولٹیکل مسائل میں جو وقت صرف ہوتا ہے وہ رائگاں جاتا ہے۔ اگر وہی وقت طالبعلم اپنے کورس کے مطالعہ میں صرف کرے تو اسے زیادہ فائدہ پہونچیگا۔ فارغ التحصیل ہونیکے بعد ان پولٹیکل مسائل پر غور کرسکتا ہے۔ بادی النظر میں یہ بزرگانہ صلاح واجب معلوم ہوتی ہے۔ مگر اصل میں یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ پیشتر ہی عرض کر دیا گیا ہے کہ ہر طالب علم اپنے کورس کے مطالعہ کے علاوہ تھوڑا سا وقت فرصت کا نکال لیتا ہے۔ اس فرصت کے وقت کا ایک حصہ پولٹیکل لٹریچر کے مطالعہ کے لئے بھی آسانی سے وقف ہو سکتا ہے۔ اس حالت میں کورس کے مطالعہ کو مطلق نقصان پہونچنے کا اندیشہ نہیں۔ نیز یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جس منطق سے طالبعلمی کے زمانہ میں پولٹیکل مضامین کے مطالعہ سے باز رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے اسی منطق کے ذریعہ سے زیادہ زور کے ساتھ یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ انسان فارغ التحصیل ہونیکے بعد بھی پولٹیکل مسائل کے مطالعہ سے یکقلم پرہیز کرے۔ یونیورسٹی کی تعلیم ختم ہونے کے بعد عموماً دو ہی پیشے ہندوستانیوں کے لئے کھلے نظر آتے ہیں یعنی سرکاری نوکری یا وکالت۔ اگر سرکاری نوکری کرلی تو پھر کار منصبی سے فرصت کہاں کہ پالیٹکس پر بھی نظر عنایت رکھی جاسکے۔ نیز موجودہ قوانین بھی سرکاری نوکروں کو مجبور کئے رہتے ہیں کہ وہ پالیٹکس سے دلچسپی نہ ظاہر کریں۔

دوسرا راستہ قانون کا ہے۔ اگر کالج کی تعلیم کے بعد قانون کا مطالعہ شروع کیا تو پھر اسی منطق سے سامنا ہوتا ہے کہ جو وقت اخبار بینی میں صرف کیا جاتا ہے وہی مطالعہ

قانون میں کیوں نہ صرف کیا جائے اسکے بعد اگر قانون کے امتحان کا مرحلہ طے کر لیا تو پھر وکالت کو ترقی دینے کے لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ انسان قانون کا اعلیٰ لٹریچر پڑھنے میں ہمہ تن محو ہو جائے۔ نیز جسقدر وکالت ترقی کرتی جائیگی اسیقدر دیگر مشاغل کے لئے وقت کم ہوتا جائیگا۔ پس پولٹیکل لٹریچر کا مطالعہ ہمیشہ کے لئے ترک ہی کرنا مناسب معلوم ہوگا۔ اس تشریح کے بعد یہ واضح ہو جائیگا کہ جو نیک نفس حضرات اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ پاس کرنے کے بعد پولیٹکل مسائل کا مطالعہ شروع کرنا چاہئے وہ اس امر پر نہیں غور کرتے کہ انکے منطق کا سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔ اور جو اس سلسلہ میں اسیر ہوا وہ عمر بھر پالٹیکس کی طرف رخ نہیں کر سکتا۔ اس خیال کے حضرات کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر علم و فن کا مذاق رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہے۔ اگر طالبعلمی کے زمانہ میں پولیٹکل مسائل کے مطالعہ کا چسکا پڑ گیا ہے تو انسان فارغ التحصیل ہونے کے بعد بھی اس مذاق کو قائم رکھ سکتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ کوئی ایسا وقت آئے گا جسوقت دنیا کے تمام بکھیڑوں سے فرصت ہوگی اور اسوقت پالیٹکس پر توجہ کیجائیگی محض بچپن ہے۔

یہ بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ اخباروں کے مباحثے بہت دلچسپ ہوتے ہیں لہذا یہ اندیشہ ہے کہ طالبعلم انہیں میں الجھکر نہ رہجائے اور بجائے گھنٹہ یا آدھ گھنٹے کے جو کہ اسنے مطالعہ اخبار کے لئے مقرر کر لیا ہو اپنا زیادہ ضروری وقت اسی خاص مد میں ضائع کردے لہذا مناسب یہ ہے کہ فرصت کے وقت وہ اعلےٰ درجے کے انگریزی مصنفین کی ایسی کتابیں پڑھے جن سے کہ اسکی انگریزی زبان سے واقفیت بڑھے۔ یہ اعتراض بھی بالکل بیمحل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ طالب علم فرصت کیوقت اسی قسم کا لٹریچر پڑھتے ہیں جسمیں زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں ہوتی ہے[1] اس قسم کے لٹریچر میں یا ناول شامل ہیں یا اخبار اور رسالے وغیرہ۔ ناولوں کی دلچسپی اخباروں کی دلچسپی سے بہت بڑھی ہوتی ہے۔ اور انکے مطالعہ میں محو ہو کر رہجانے کا زیادہ اندیشہ ہے۔ نیز اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ بوقت فرصت بھی طالب علم برک مکالے اور مل کی تصنیفات پڑھے۔ تب بھی وہی اندیشہ قائم

[1] یعنی (Light Literature)

رہتا ہے۔ کیونکہ ان زبردست انشا پردازوں کی تصانیف میں متعدد مقام ایسے موجود ہیں جو سخن فہم طالبعلم کے لبھانے کیلئے جادو کا حکم رکھتے ہیں اور اسکو دو چار گھنٹے تک کسی دوسرے قسم کے مطالعہ سے باز رکھ سکتے ہیں پس خاص پولیٹکل اخباروں اور رسالوں کے خلاف یہ اعتراض نہیں عاید ہو سکتا کہ انکے دلچسپ مباحثے پابندی وقت کا شیرازہ درہم برہم کر دینگے۔ فرصت کے وقت طالبعلم جو کتاب پڑھیگا وہ دلچسپی کے لحاظ سے پڑھیگا۔ پھر اخباروں نے کیا گناہ کیا ہے کہ وہ خاص طور سے پابندی وقت کے دشمن خیال کئے جائیں۔

ہمارے معترض اکثر یہ بھی فرماتے ہیں کہ چونکہ پولیٹکل مسائل نہایت پیچیدہ اور بحث طلب ہوتے ہیں لہذا جب تک کہ انکے ہر پہلو پر غور کرنے کی قابلیت نہ پیدا ہو جائے اسوقت تک انکا مطالعہ غیر ضروری ہی نہیں بلکہ مخدوش ہے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے ہر مسئلہ کے ہر پہلو پر خود کامل غور و فکر کرنے کے بعد رائے قائم کی ہو۔ اور نہ ہر شخص میں ایسی قابلیت ہوتی ہے۔ عام دستور یہ ہے کہ معمولی دماغ کے لوگ کسی فن کی نسبت جب رائے قائم کرتے ہیں تو اس فن کے کاملین اور محققین کو اپنا پیشوا مان لیتے ہیں۔ مثلاً طالبعلموں کو جب مذہبی تعلیم دیجاتی ہے تو اُن کو خاص انداز پرستش سکھایا جاتا ہے اور خاص قسم کے مذہبی فرائض ادا کرنے کی تلقین کی جاتی ہے اور انکی قابلیت و سن کی لحاظ سے چند مسائل مذہبی بھی انکے ذہن نشین کر دئے جاتے ہیں۔ اسبات کا انتظار نہیں کیا جاتا کہ جب ان کی تعلیم درجہ کمال پر پہونچ جائے اور جب وہ خوب فلسفیانہ تنقید کے اصولوں سے واقف ہو جائیں تو اسوقت انکے سامنے کوئی مذہبی عقیدہ پیش کیا جائے اور پھر کہا جائے کہ تم اسکو ہر پہلو سے جانچ لو اور اگر پورا اطمینان ہو جائے تو اسے قبول بھی کر لو۔ ظاہر ہے کہ مذہب کے مسائل پولیٹکل مسائل سے ہزار درجہ زیادہ پیچیدہ اور بحث طلب ہیں پس اسی اصول پر ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے پولیٹکل مذہب کے پیمبروں کے اصول طالبعلموں کے ذہن نشین کرتے رہیں۔ اور یہ اسی صورت پر ممکن ہے کہ جن بزرگوں نے اپنی عمر پولیٹکل اور تمدنی مسائل کی تحقیق میں بسر کر دی ہے انکے مضامین یا انکے شاگردوں کے مضامین جو کہ اخبار اور رسالوں میں شائع ہوا

کے بیٹھے ہیں، طالبعلموں کی نظرات گزرتے رہیں جسقدر طالبعلمونکی قابلیت اور عمر بڑھیگی اسیقدر وہ ان مسائل کی پیچیدگیاں سمجھتے جاینگے۔

اکثر فدائیانِ مذہب کا یہ قول ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم میں پولیٹکل تعلیم بھی شامل ہے پس اسکے لئے جداگانہ انتظام کرنے کی ضرورت نہیں۔ مثلاً ان صوفیان صافی طینت کا یہ قول ہے کہ پولیٹکل تعلیم حب الوطن "پر اپکار" یا ([illegible]) کی ایک شاخ ہے۔ اور "پر اپکار" کی تلقین ہندو مذہب میں خصوصاً اور دیگر مذاہب میں عموماً موجود ہے۔ ان خدا کے بندوں کی خدمت میں ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ مذہبی یا اخلاقی تعلیم چند قسم کے فرائض کی تلقین کا مجموعہ ہے۔ یہ فرائض اصولی حالت میں ضرور جامع ہیں مگر عملی حیثیت سے ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے یہ کارآمد نہیں ثابت ہوسکتے مانا کہ "پر اپکار" ہندو مذہب کا جزو اعظم ہے۔ اور ہندو تہذیب کی تاریخ میں اس قسم کے "پر اپکار" کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ فلاں شخص گھر بار چھوڑ کر جنگل کو نکل گیا یا فلاں شخص نے کثرت روپیہ خرچ کر کے شوالہ بنوادیا مگر اس قسم کے "پر اپکار" کی ایک مثال بھی نہیں ملتی جسکا نام "حب وطن" ہے اور جسکا نمونہ آج جاپان نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ پس اسوقت اگر آپ مذہبی یا اخلاقی تعلیم کو ضروری سمجھینگے اور محض اس قسم کے "پر اپکار" کے نمونے طالبعلموں کے سامنے پیش کرینگے جنکا پتہ ہندو تہذیب کے کارناموں میں ملتا ہے تو انکے دلوں میں حب الوطن کا جوش ہرگز نہ پیدا ہوگا اس بحث سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمکو پولیٹکل تعلیم کے لئے ایک خاص درجہ قائم کرنا چاہئے۔ یعنی علاوہ اخلاقی و دماغی تعلیم کے طالبعلموں کو پولیٹکل اخبار و رسائل کے مطالعہ کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہئے۔ یہ خیال کرنا کہیں پولیٹکل جوش حد اعتدال سے نہ گذر جائے محض نادانی ہے۔ کیونکہ یہاں تو پولیٹکل جوش کے دبانیوالی اسقدر قوتیں موجود ہیں کہ انکے فنا کرنے کے لئے اک زمانہ درکار ہے۔ ایک تو سیکڑوں برس کی پولیٹکل غلامی کی وجہ سے اہل ہند میں قومی حمیت وغیرت کا احساس بے شکل ہو باقی ہے۔ ذات کی تفریق اور ہندو مسلمانوں کا احمقانہ اختلاف قومی یگانگت اور حب الوطن کے جذبات کی نشو ونما میں حارج ہے حکام وقت کا پولیٹکل تحریکوں سے اختلاف ظاہر

کرنا پولٹیکل جوش کے زائل کرنے کے لئے ایک زبردست قوت ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم پولیٹکل تعلیم کے فروغ دینے کے لئے غیر معمولی کوشش کریں۔ اور ایسی کوشش کریں۔ اور ایسی تدبیریں عمل میں لائیں کہ طالب علموں کے دل و دماغ پر پولٹیکل زندگی کا پرتو ہی پڑتا رہے۔ ایام طفولیت و شباب میں انسان کے تمام ترین جذبات کی تربیت بتدریج ہوا کرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ حب الوطن کے جذبات عالیہ کی نشوونما کی فکر نہ کی جائے۔

فقط۔ "ایک طالب علم"

انتخاب بیاض جناب محمد علی آزاد مرتب رسالہ صبح بہار منڈی محلہ میسور

(شوکت بخاری)

مانی چو نقش آں بت بدست می کشد | جو می رسد بہ ساعد او دست می کشد

خواجہ آصفی ہروی

چنداں مپس دہید کہ بیہوشی آورد | شاید کہ یاد مابفراموشی آورد

انیسی شاملو

وفا آموختی از مابکار دیگراں کردی | ربودی گوہرے از مانثار دیگراں کردی

امیر خسرو دہلوی

افتادہ بودم در رہش از ناز گفتا کیست ایں | گفتند بیمار غمت گفتا نخواہد زیست ایں

میرزا سید رضا اصفہانی

ہر کس کہ چشم مست ترا یاد می کند | خاموش می نشیند و فریاد می کند

رشید گازرونی

ز فریاد شکست شبہا مرا خوں در جگر باشد | مبادا بر سر کوے تو غیرے در گذر باشد

ملا شیدا

تواز تمکین من از حیرت نہ ایماء نہ تقریرے | بداں ماند کہ ہم بزم ست تصویرے بہ تصویرے

لا اعلم

صیاد کو جو یارب مجھ پر ترس نہ آئے | باغوں میں موسم گل لاکھوں برس نہ آئے

فقط

آسمانی کتب - اور شاعری

عام اصطلاح میں شعر مقفےٰ اور موزوں کلام کا نام ہے۔ لیکن دراصل یہ نظم کی تعریف ہے
نظم میں اور شعر میں بہت فرق ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی میں نظم کا مادہ ہوتا ہے لیکن
شعر جسکا نام ہے اُسکی نظم میں ایک بھی نہیں ملتا۔ اور کبھی انسان شاعر ہوتا ہے لیکن وہ ایک
بیت بھی نظم نہیں کر سکتا۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ نظم سے شعر کی لطافت اور اُسکی تاثیر بہت بڑھ جاتی ہے۔ گویا نظم
ایک سانچا ہے جسمیں شعر ڈھالے جاتے ہیں۔

شعر کی حقیقی تعریف جو اُسکے تمام معانی کو شامل ہو مختصراً بیان کر دینا مشکل ہے کیونکہ اسکی حقیقت
میں بیان کے وہ تمام اسلوب شامل ہیں جنکی وجہ سے طبیعت پر ایک خاص اثر پڑتا ہے جو
معمولی کلام سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ معمولی کلام صرف
اُن باتونکو شامل ہوتا ہے جنکو ہم دیکھتے بھالتے رہتے ہیں۔ یا اپنی زندگی کے کاموں میں
قیاس اور دلائل سے نتائج نکالتے ہیں جو ہمارے روزمرہ کے معاملات میں کام آتے ہیں
بخلاف اسکے شعر میں اُن باتونکو ظاہر کرتے ہیں جو ہمارے نفس کے اوپر اثرات اور جذبات
واقع ہوتے ہیں۔ اسمیں نہ قیاس کی ضرورت ہے نہ دلائل کی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ
سکتے ہیں کہ معمولی کلام عقل کی زبان سے ہوتا ہے اور شعر اثراتِ طبیعت کے بیان کا
نام ہے۔ بعضوں نے شعر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ طبیعت کے مختلف جذبات کی کھلی
ہوئی تصویر ہے چونکہ جذبات طبائع کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اسلئے شاعری بھی قدیم
سے رائج ہے اور دنیا کی کوئی قوم اس سے خالی نہیں۔

ہر قوم کی شاعری اُسکے آداب۔ اخلاق۔ جنگی وقائع اور مذہبی خیالات کا مرقع ہوتی
ہے کسی قوم کے اصلی خیالات دیکھنے کے لئے اُسکی شاعری سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔
ہر قوم کے خیالات اور تواریخ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ترقی کے قبل اکثر

اندر شاعری کا رواج تھا اسکی وجہ یہ ہے کہ قبل اسکے کہ اُن کی عقل میں روشنی پیدا ہو اور وہ علوم سے دلچسپی لیں اُنکی طبیعتوں میں ایک جوش اور تحریک پیدا ہوتی ہے - جو شاعری کی اصلی اسپرٹ ہے - یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ذخیرہ ہر قوم متمدن کا شاعرانہ خیالات اور دواوین ہیں - جنمیں اُنکے مذہبی ادبی - اخلاقی حالت اور عادتوں کے سچے جذبات کی اصلی تصویریں نظر آتی ہیں - ہندوؤنکی رامائن اور مہابھارت یونانیونکی آلیڈ اور اوڈیسی - اہل اٹلی کی انیاڈ - فارس والونکا شاہنامہ اور اہل عرب کے دواوین سے اُنکے خیالات معتقدات تاریخی حالات معبودونکی پرستش کی کیفیت نہایت وضاحت سے معلوم ہوتی ہے - اسکی وجہ یہ ہے کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ شعر نفس کے تاثرات کا نام ہے - اسلیئے ہر قوم کی شاعری اُسکے تاثرات نفس کا اصلی مرقع ہوتی ہے -

شعر کی حالتیں بھی مختلف ہیں - اکثر قوموں نے یہ قید لگا دی ہے کہ وہ منظوم ہو لیکن نظم کی کیفیت میں بھی اختلاف کیا گیا ہے - بعضوں نے تو صرف اُسکے موزوں ہونیکی شرط لگائی ہے بعض صرف قافیہ ہی کو ضروری سمجھتے ہیں - وزن کی شرط نہیں لگاتے - اہل عرب نے اپنی شاعری میں وزن اور قافیہ دونوں کو ضروری سمجھا ہے - اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو اُنکے نزدیک شعر ہی نہیں ہے یہی حال فارس والونکا ہے - سریانی صرف وزن کو ضروری سمجھتے ہیں قافیہ کا التزام نہیں ہے - جیسا کہ افرام سریانی اور اسحاق (اسحق) انطاکی کی نظمیں ہیں[1] انگریزی کی بلینک ورس بھی قریب قریب ایسی ہی ہے - کیونکہ اس میں بھی قافیہ کی پابندی نہیں ہے - وزن شروط ہے لیکن اُسکے مساوات کا لحاظ نہیں - عبرانیونکے نزدیک نہ وزن مشروط ہے نہ قافیہ - اسلئے جب وہ قرآن شریف کی آیتوں کو سنتے جنمیں اسلوب بیان ہی دلیل اور برہان کا کام دیتا ہے تو کہتے کہ یہ اشعار ہیں - اور اپنی زبان کے اشعار پر اُسکی مقفٰی اور غیر مقفٰی آیتوں کو قیاس کرتے تھے -

اسمیں شک نہیں کہ وزن اور قافیہ سے شعر کی لطافت اور تاثیر بڑھ جاتی ہے مگر یہ اُمور شعر کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں - کیونکہ لکچر کا اثر طبیعت پر بہت پڑتا ہے اور بعض مرتبہ اُسکو سُنکر انسان جوش سے بے تاب ہو جاتا ہے حالانکہ وہ مقفٰی اور موزوں نہیں ہوتا - صرف اُسکا اسلوب بیان شاعرانہ ہوتا ہے -

[1] شعراء السریان

عبرانی قومیں بہ نسبت دیگر اقوام عالم کے خیال میں زیادہ مستغرق تھیں - اسلئے توحید اختیار کرنے میں اُنکو بہت آسانی ہوئی - کیونکہ مذہبی معتقدات بھی ایسی ہی چیزیں ہیں جو حواس سے دریافت نہیں ہوسکتیں۔

وہ لوگ شاعرانہ خیال سے بہت مناسبت رکھتے تھے جسکی دلیل اُن آثار شعریہ سے ملتی ہے جنکو وہ دنیا میں چھوڑ گئے ہیں۔ سب سے پہلا نمونہ اُنکی شاعری کا توراۃ ہے۔ جب اسمیں اُنکو شاعرانہ خیالات ملے جو اُن کی طبیعت کے مناسب تھے تو اُنھوں نے اُس تمام کتاب ہی کو نظم کر ڈالا۔

توریت میں شاعرانہ تخیلات کی بہت سی مثالیں ہیں۔

حضرت موسیٰ مع حضرت یوشع کے پہاڑ پر سے لوح شہادۃ لئے ہوئے اتر رہے ہیں یوشع کہتے ہیں کہ محلہ سے لڑائی کی آواز معلوم ہو رہی ہے حضرت موسیٰ جواب دیتے ہیں نہ یہ شور فتحمندی کا ہے نہ شکست کا بلکہ ایک شیریں راگ ہے جسکو میں سُن رہا ہوں[1] غالباً یہ ایک ضرب المثل ہوگی جسکو موسیٰ نے اس موقع پر استعمال کیا۔

فرعون کے دریا میں ڈوبنے کی کیفیت کن پُر زور الفاظ میں ہے "تونے اپنی ہوا سے پھونک ماری - دریا نے اُنہیں چھپا لیا وے سیسے کی طرح زور کے پانی میں تلے بیٹھ گئے"[2] یہ تشبیہ نہایت عمدہ ہے ہندوستان میں بھی بھاری چیز کی مثال اسی سے دیجاتی ہے۔

ایک جگہ خدا کے فرمان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اُن قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا میراث کر دیتا ہے کسی چیز کو جو سانس لیتی ہو جیتا نہ چھوڑیو"[3] میراث وہ ہے جو ترکہ میں ملے یہاں میراث استعارۃً قبضہ کے لئے ہے دوسرے جملہ میں "جو سانس لیتی ہو" سے تاکید مزید کا کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ اس عموم میں ایک خاص جوش مضمر ہے۔

حنّہ سموایل کی ماں اداس بیٹھی ہوئی ہے - اُسکے صرف ہونٹھ ہلتے ہیں آواز نہیں سُنائی دیتی عیلی اسکی یہ کیفیت دیکھکر پوچھنے لگتا ہے کہ کیا تو نشہ میں ہے - تونے مے پی ہے - وہ جواب دیتی ہے "نہیں میرے خداوند میں تو دلگیر عورت ہوں میں نے نہ مے اور نہ کوئی نشہ پیا - پر خداوند کے آگے اپنا دل انڈیل دیا ہے"[5]

[1] ترجمۃ العبرانیات جلد ۱ خروج ۳۲ : ۱۸ [2] (خروج ۱۵ : ۳۵) [3] (استثنا ۲۱ : ۲۷) [5] (سموایل ۱ : ۳۸)

ے دلکو اُسنے ایک برتن سے استعارہ کرکے اُسکی اندرونی آرزونکے خدا کے سامنے
ڈنے کو انڈیل دینے سے تعبیر کیا۔
نچونکہ بانجھ تھی۔ اور اپنی سوت کے طعنے سنتے سنتے اُسکا کلیجہ پک گیا تھا۔ جب اُس سے
پیدا ہوے۔ اور اوسکی کوکھ کھل گئی تو وہ جوش طرب میں خدا کی قدوسیت کا گیت گاتی
سنے ساتھ ہی ساتھ نصیحت بھی کرتی ہے جسکا روئے سخن سوت کی طرف ہے" غرور
نہ لہو اور بُرا بول تمہارے مُنہ سے نہ نکلے۔ کیونکہ خداوند دانش کا خدا ہے۔ اور اعمال
سکے تولے جاتے ہیں" اب وہ جوش میں بھر گئی اور اپنے سوآرزؤں سے پائے ہوئے
بچے سموایل کو سامنے غوں غوں کرتے ہوئے دیکھکر چھاتی سے لگا لیا سرور سے اُسکی
بند ہو گئیں۔ گریہ شادی سے دو چار قطرے آنسو کے رخساروں پر ٹپک پڑے
لگی" زور آوروں کی کمانیں ٹوٹ گئیں۔ اور وے جو لڑکھڑاتے تھے اونکی کمریں مضبوط
۔۔ وے جو پیٹ بھرے تھے روٹی کے لئے مزدور ہو گئے۔ اور وے جو بھوکے تھے
نے فراغت پائی۔ جو بانجھ تھی وہ سات جنی اور اولاد والی ناطاقت ہو گئی ہے" جو لوگ
کلام کے قدرداں ہیں وہ ان جملوں کے فورس کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ہر ایک قوم کا قاعدہ
اوسکی شاعری اُسی زمانہ میں چمکتی ہے جبکہ (دسیوں) دولتمندی اور عشرت کے اسباب
جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی شاعری کی عروج کا بھی یہی حال ہوا۔ یعنی حضرت داودؑ
نہ میں ان کی شاعری چمکی۔ کیونکہ اسوقت تمام اسباب عشرت کے مہیا ہو گئے تھے اور
بعد حضرت سلیمان کے زمانہ میں معراج کمال پر پہونچگئی کیونکہ بنی اسرائیل کے لئے
زمانہ تھا۔ جیسے اہل عرب کے لئے ہاموں کا زمانہ یا اہل ہند کے لئے رامچندر جی کا۔ حضرت
حضرت سلیمان ع بادشاہ ہونیکے علاوہ بڑے جید شاعر بھی تھے۔ حضرت داودؑ صرف
ور نصائح منظوم کرتے تھے کیونکہ بنی اسرائیل کا عام مذاق مذہبی رنگ میں شرابور
۔ وہ دردناک اور روح فرسا اشعار کو پسند کرتے تھے۔ لیکن حضرت سلیمان نے صرف
ئی اور اخلاقی شاعری ہی پر اکتفا نکر کے تغزل کی طرف بھی قدم بڑھایا جسکو آگے
لکھینگے۔

حضرت داود نہایت پرجوش آدمی تھے۔ اُنکے مواعظ اور اُنکی عام بانیں بھی جوش سے پُر ہیں شاعری کا تو کیا کہنا ہے۔ تالیق جب جنگ کرنے گئے تو اُس لڑائی میں ساؤل جو بنی اسرائیل کا ماہتاب مشہور تھا کیونکہ بہت ہی خوبصورت تھا اور اوسکا نوجوان بیٹا یونتن دونوں مارے گئے۔ یہ خبر سنکر حضرت داؤد کو نہایت رنج ہوا۔ اور اُنہوں نے ایک مرثیہ لکہا جسکو ہم کتاب الیاشر سے نقل کرتے ہیں

"اسرائیل کے غزال تو اپنے پہاڑوں پر مارا پڑا — ہائے بہادر کیوں گر گئے
جات میں خبر نہ دو۔ اسقلوں کے بازار میں منادی مت کرو نہ ہو کہ فلسطیوں کی بیٹیاں خوش ہوں۔ نہ ہو کہ نامختونوں کی بیٹیاں شادیانہ بجائیں"

اے جلبوت کے پہاڑو۔ تم پر اوس نہ پڑے۔ تم پر مینہ نہ برسے۔ اور تمہارے دامنوں میں ہری کھیتیاں نہ اگیں۔ کیونکہ وہاں بہادروں کی سپر پہینکی گئی۔ سپر ساؤل کی"
مقتولوں کے خون سے اور بہادروں کی چربی سے یونتن کی کمان ہی کبھی ٹل نہ گئی اور ساؤل کی تلوار کبھی خالی نہ لوٹی۔

ساؤل اور یونتن اپنے جیتے جی عزیز تھے۔ دلپسند تھے۔ اور وے اپنی موت میں بھی جُدا ہوئے۔ وے عقابوں سے زیادہ تیز بال تھے اور شیروں سے زیادہ قوی۔

اے اسرائیل کی بیٹیو ساؤل پر روو جسنے تمہیں ارغوانی اور قرمزی لباس پہنائے اور جسنے تمہاری پوشاک کو زیوروں سے زینت بخشی۔

ہائے وے بہادر لڑائی کے درمیان کیوں گر گئے۔ اے یونتن تو اپنے بلند مکانوں میں مارا پڑا مجھے تیرے لئے اے میرے بھائی یونتن بڑا دکھ ہے۔

تو مجھے نہایت دلپسند تھا۔ مجھے تیری محبت عجیب تھی۔ بلکہ عورتوں کی محبت سے بھی زیادہ ہائے وے بہادر کیوں گر گئے۔ اور لڑائی کے ہتیار نابود ہو گئے"

آج جبکہ دنیا اُس زمانہ سے جس زمانہ میں یہ مرثیہ کہا گیا ہے ڈہائی ہزار برس آگے نکل آئی ہے اور ہر چیز میں ترقی ہو گئی ہے لیکن اسوقت کے مرثیوں اور خاصکر اردو شاعری کے مرثیوں سے اسے ملا کر دیکھو۔ اس مرثیہ میں وہی اصلی خیالات میں جو ایسے وقت میں

پیدا ہوا کرتے ہیں جبکہ ایک بہادر عزیز مارا جائے۔ پہاڑوں کو کوسنا۔ شماتت کا خوف کسقدر
دلچسپ پیرایہ میں ہے۔

حضرت داؤد کے تمام امثال مواعظ اور اقوال حکمیہ شاعری سے بھرے ہوئے ہیں
کہانتک نقل کروں مشکیل کے گیت میں سے جنمیں وہ خدا کو اپنی طرف مائل کرتے
ہیں چند فقرے سنئے۔

"جس طرح سے کہ ہرنی پانی کے سوتوں کی نہایت پیاسی ہوتی ہے۔ ویسی ہی میری روح
اے خدا تیری نہایت پیاسی ہے۔ زندہ خدا کے لئے میری روح ترستی ہے
میرا آنسو رات دن میرا کھانا ہے"

"میرے دشمن اُس تلوار کے مانند طعنے دیتے ہیں جو میری ہڈیوں سے گذر جائے
مجھے ملامت کرکے دکھ دیتے ہیں"

"اے میرے جی تو کیوں گرا جاتا ہے۔ اور تو مجھ میں کیوں بے آرام ہے"[1]
دیکھو تلوار کی جو ہڈیوں سے گذر جائے طعنے کے ساتھ کیسی نئی تشبیہ ہے اور جی کا
گرنا یا بیٹھ جانا تمہارا خود محاورہ ہے۔

ایک جگہ خداوند کی نعمتوں کا شکر کرتے ہیں۔ اور انکو گناتے ہیں۔ اُس کلام کی
طاقت اُسوقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہر نعمت کے بعد وہ کہتے ہیں (کہ اللہ لا یزال) (خداوند ابد تک ہی) جیسا ایسی
جیسے کہ قرآن شریف میں سورہ رحمان ہے جسمیں خداوند عالم اپنی نعمتیں گنواتا ہے
اور ہر ایک نعمت کے بیان کرنے کے بعد فبای آلاء ربکما تکذبان کہتا ہے۔ جس سے
کلام کی طاقت برابر بڑھتی چلی جاتی ہے۔

خالق سے تمام مخلوقات کا سلسلہ شکر گذاری اسطرح قائم کرتے ہیں۔

"اے ساری سرزمینو! خداوند کے لئے خوشی کا نعرہ مارو۔ سمندر اور اُسکی معموری
شور مچاویں۔ ساری دنیا بھی اور وہ سب جو اسمیں بستے ہیں۔ نہریں تالیاں دیویں۔ پہاڑ
ملکے خوشیاں کریں خداوند کے خوف سے اُنکے کانپتے ہیں اور زمین لرزتی
ہیں۔ اوسکی جباریت کی تقدیس ہو"[2]

[1] زبور ۴۲ [2] زبور صفحہ ۹۸-۹۹-۱۰۰-۱۰۱

اب حضرت سلیمان کی غزلیں سنئے۔ غزل کے اصلی معنے۔ عورتوں سے گفتگو کرنے کے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ اظہار تعشق جس کلام میں کیا جاتا ہے اصطلاح میں اُسکا نام غزل رکھا گیا ہے۔ عام اقوام عالم میں غزل کا یہی طریقہ تھا کہ مرد عورت کو مخاطب بناتا تھا۔ فارس کے خلاف وضع فطری مذاق نے مردونکو مخاطب کرنے کا نام غزل رکھدیا اور اُسی کا بگڑا ہوا خاکہ اُردو شاعری ہے۔ بھاشا کی شاعری بھی اگرچہ اُس اصطلاحی غزل کے تحت میں نہیں آتی لیکن اُسنے فطرت سے تجاوز نہیں کیا۔ بلکہ ایک عجیب لطافت پیدا کی کہ عورت مرد کو مخاطب کرے بحیثیت عاشقانہ مذاق کے بھاشا شاعری کا پلہ تمام دنیا کی شاعریوں سے بھاری ہے۔ لیکن شجاعت۔ استقلال خودداری جو بعض دوسرے اقوام کی شاعری میں ہیں اور جوانسان کے نہایت اعلیٰ و ارفع مقاصد ہیں اُنسے یہ کسیقدر معترا رہی۔ اسلئے کہ عورتونکو ان صفات سے کیا واسطہ۔ اگر آلہا اودن وغیرہ کے جنگی جوش وخروش کی نظمیں انہیں رائج نہ ہوتیں تو یہ اوصاف کبھی کے بھاشا سے رخصت ہو گئے ہوتے۔

شامی اقوام کا تغزل سریانی۔ کلدانی۔ عبرانی۔ تینوں زبانوں میں بالکل اصُول فطرت کے مطابق ہے۔ یعنی مرد عورت کو مخاطب کرتا ہے۔ اور کبھی عورت بھی مرد کو مخاطب کرتی ہے۔

حضرت سلیمان کی غزلونمیں یہ دونوں رنگ موجود ہیں۔ مثلاً کلیسے کے جمال کی تعریف کرتے ہیں۔

"اے میری جانی تو شکیل ہے۔ دیکھہ۔ تو خوبصورت ہے۔ تیری آنکھیں تیرے چادر کے آڑ میں کبوترونکی سی ہیں۔ تیرے لب قرمزی ڈورے ہیں۔ تیرے رخسار تیری چادر کے پیچھے آدھے انار کے مانند ہیں۔ اے میری پیاری تو سراسر جمال ہے تجھہ میں کوئی عیب نہیں ہے" [1]

رخسارونکی تشبیہ میں آدھے انار کی قید بہت ہی دلچسپ ہے۔

"تیرا سر تجھہ پر کرمل کی مثل ہے۔ تیرے سر کے بال ارغوانی کے مانند ہیں۔ بادشاہ

تیری کاکلو نیے انگا ہے! اے مجوبہ تو کیسی جمیلہ ہے ۔ عیش کے لئے تو کیسی جان افزا ہے
تیری قامت تاڑ کی مثال ہے اور تیری چھاتیاں انگور کے گچھونکے مانند ہیں"۔
انگور کے گچھوں سے تشبیہ دینا بہ نسبت اُن تشبیہونکے جوالیشیائی شاعر سیب یا
انار کے ساتھ دیتے ہیں بہتر ہے ۔ مولانا جامی ایک سیب مکرم نبی کی بیوی کی تعریف
میں گل افشانی فرماتے ہیں ؎

دو پستان سہر یکے چوں قبہ نور حبابے خواستہ از عین کافور

حباب چشمہ کافور کے ساتھ وہی تشبیہ ہے ۔ جو حبشی کے مقابلہ میں کم درجہ کی ہے مولانا
غنیمت کہتے ہیں ؎

بروے سینہ اش سیب دو بارہ علاج قوت ضعف نظارہ

دوسرا مصرعہ سراسر بہرلی کا ہے ۔ اور یہ مولانا غنیمت کا خاص شیوہ ہے کہ وہ حشو کو
پرہیز نہیں کرتے اور کرتے ہیں جامی کا مقابلہ جامی فرماتے ہیں ؎

پدر زین واقعہ چوں گشت آگاہ دوا جوشد نزد دانا یان درگاہ

اور مولانا غنیمت صاحب کہتے ہیں ؎

پدر زیں حال چوں آگاہ گردید امیر نوجہاسے آہ گردید

دونوں کا ایک ہی مضمون ہے ۔ لیکن غور کرو اور انصاف سے کہو کہ غنیمت کا مصرعہ
ثانی کسقدر لاطائل ہے ۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا ۔ اب سیب دو بار اور حباب چشمہ
کافور ۔ اور انگور کے گچھونکا مقابلہ کرو ۔ اگر نہ سمجھو تو کسی ڈاکٹر سے پوچھو کہ ان تینونمیں
سے کونسی تشبیہ اچھی ہے ۔
اردو کے شاعر کی زمزمہ سنجی سنئے یہاں تو جو بات ہے دنیا سے نرالی ہے ۔ پستان
گرز کی طرح ہیں لیکن پھر بھی معشوق مذکر ہی ہے ۔ ؎

.... وہ گرز تانے تنکے بیٹھے ہیں"

ہمارے یہاں دہن کی تشبیہ غنچہ کیساتھ دیجاتی ہے ۔ حضرت سلیمانؑ کی غزلوں
میں ہمکو اسکی پانچ تشبیہیں ملی ہیں ۔

"ایک مقفل باغیچہ ہے" شاید یہ خیال ہو کہ باغ وسعت رکھتا ہے اور معشوق کا ذہن معدوم ہونا چاہیئے لیکن یہ تشبیہ وسعت کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ خوشبو وجہ شبہ ہے۔

"آبِ حیات کا ایک چشمہ" "لبنان کا جھرنا" "سر مہر ایک چشمہ" "بند کیا ہوا ایک سوتا" انہیں سے چشمۂ آب حیات کی تشبیہ اب تک رائج ہے۔

کلیسئے کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

"اے میری دُلہن لبنان سے تو چلی آ۔ آمانہ کی چوٹی پر سے سنیر اور حرمون کے قلہ پر سے شیروں کے مکانوں سے۔ چیتوں کے پہاڑ و نیز سے نظر دوڑا۔ اے میری زوجہ تو نے میرا دل غارت کیا اپنی آنکھوں کی ایک نگاہ سے اپنے گلے کی ایک زنجیر سے تو نے میرا دل لوٹ لیا۔ اے میری دُلہن تیرا عشق کیا خوب ہے تیری محبت مے سے کتنی زیادہ لذیذ ہے۔ تیرے عطروں کی بو ساری خوشبوؤں سے خوب ہے۔ تیری پوشاک کی بو لبنان کی سی بو ہے۔ تیرے ہونٹوں سے شہد کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ شہد اور شیر تیری زبان کے تلے ہیں۔ تیرے گال خوشنما ہیں۔ کہ اُن پر موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ اور ایسی ہی تیری گردن کہ اُس پر سونے کی زنجیریں ہیں۔ ہم تیرے لئے سونے کے طوق بناوینگے اور اُنہیں چاندی کے پھول جڑینگے۔ میری جانی دیکھ تو خوش رو۔ تو کبوتر چشم ہے۔ ہاں تو مہندی کے پھولوں کا ایک گلدستہ ہے[1]"

رشک رقابت عشاق اور شعر اسکے لئے نار جحیم ہے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

"نگین کے مانند مجھے اپنے دل میں لگا رکھ۔ اور تعویذ کے مانند اپنے بازو پر کیونکہ عشق موت کے مانند زبردست ہے۔ اور غیرت گور کی سی بے مروت ہے۔ اوسکی لویں آگ کی لویں ہیں۔ اور یہوواہ کے شعلے کے مانند بڑا پانی عشق کو بجھا نہیں سکتا۔ اور نہ باڑھیں اُسے دبا سکتی ہیں[2]"

اب وہ راگ سنئے جو کلیسیا سلیمان ؑ کے عشق میں گاتی ہے۔ اسمیں کچھ کچھ بھاشا شاعری کا مزہ آتا ہے۔

"میرا محبوب سُرخ و سفید ہے۔ دس ہزار آدمیوں میں وہ جھنڈے کے مانند کھڑا ہوتا ہے۔

[1] غزل الغزلات [2] غزل الغزلات

اسکی قامت لبنان کی سی ہو وہ خوبی میں رشک سرو ہے - اُسکا سر ایسا ہے جیسے چوکھا سونا اوسکی کاکلیں پیچ در پیچ ہیں - اور کوے کیسی کالی ہیں - اوسکی آنکھیں اُن کبوتروں کے مانند ہیں جو لب دریا دودھ میں نہا کے تمکنت سے بیٹھے ہوں - اُسکے رخسارے پھولونکے چمن اور بلساں کی ابھری ہوئی کیاریاں ہیں - اُسکے لب سوسن ہیں - جنسے بہتا ہوا مُر ٹپکتا ہے - اُسکا مُنہ شیریں ہے - اے یروسلم کی بیٹیو یہ میرا پیارا یہ میرا جانی ہے" اہیں آنکھونکی تشبیہ دودھ میں نہائے کبوترونکے ساتھ جو تمکنت سے بیٹھے ہوں کسقدر نفیس ہے - جیسے کہ سیب کا درخت بن کے درختوں کے بیچ ویسے میرا محبوب بیٹونکے بیچ ہے انجیر کے قرصوں سے مجھکو قرار دو - سیبوں سے مجھکو تازہ دم کرو - کیونکہ میں عشق کی بیمار ہوں - میں سوتی ہوں پر میرا دل جاگتا ہے میری محبوب کی آواز ہے - جو کہ دروازے پر کھٹکھٹاتا ہے - میرے لئے کھول - میری جانی - میرے کبوتر کہ میرا سر اوس سے تر ہے - اور میری زلفیں رات کے بوندونسے بھری ہیں"

پھر سلیمان ع کی بادشاہی کی تعریف کرتی ہے -

"سلیمان بادشاہ نے لبنان کے لکڑیونکی ایک پالکی بنائی - اُسکے ڈنڈے روپے کے اور اُسکے تکیئے سونے کے اور اوسکی گدی ارغوانی ہے - اُسکے اندر کا فرش یروسلم کی بیٹیوں نے عشق سے مرصع کیا ہے - صیہوں کی بیٹیو - باہر نکلو سلیمان بادشاہ کو دیکھو جسکے سر پر وہ تاج ہے جو اوسکی ملنے بیاہ کے دن میں اور اوسکے دل کی شادی کے دن میں اوسکے سر پر رکھا"

اُن کی محبت کی تعریف کرتی ہے -

"وہ میرے محبوب کی آواز - ! دیکھ وہ پہاڑوں پر سے کودتے - اور ٹیلوں پر سے پھاندتے ہوئے آتا ہے - دیکھ وہ ہماری دیوار کے پیچھے کھڑا ہے - وہ کھڑکیوں سے جھانکتا ہے - جھنجھریوں سے آپ کو دکھاتا ہے"

بہار کی سبزی دیکھو -

"جاڑا گذر گیا - اور موسم کا بھاری مینہ برس چکا - اور نکل گیا - زمین پر پھولونکی بہار ہے

چڑیوں کے چہچہانے کا وقت آپہونچا - اور ہماری سرزمین میں قمریوں کی آواز سننے میں آتی ہے - انجیر کے درختوں میں ہرے انجیر پکنے لگے - اور تاکونکے پھولوں سے خوشبو آتی ہے اے اتر کی ہوا جاگ - اور دکہن کی ہوا چل - میرے بلغ پر بہہ - کہ اوسکی باس مہکے - میرا محبوب باغیچے میں آوے - اور اوسکے لذیذ میوے کہا دے -

آہ میرا محبوب میرا ہے - میں اپنے محبوب کی ہوں - وہ سوسنونکے پہولوں کو چنتا ہے[1] اپنی چہوٹی بہن کے حسن وجمال کی تعریف کرکے اُسکے ساتہہ محبت اور ہمدردی کا اظہار کرتی ہے "جسدن اس (بہن) کی بات چلے کیا کریں - اگر وہ دیوار ہووے تو ہم اُسپر چاندی کا ایک قلعہ بناوینگے - اگروہ دروازہ ہووے تو ہم اُسپر سرو کی تختیونکا پشتہ دینگے"[2]

یرمیاہ نبی کا نوحہ کن پردرد الفاظ میں ہے - وہ اپنے قوم کی بربادی اور یروسلم کے لٹ جانے اور مفتوح ہوجانے کا کس غمناک طریقہ سے نقشہ کہینچتے ہیں - "وہ بستی کیونکر اکیلی بیٹہی ہے جو خلایق سے بہری تہی - وہ بیوہ ہوگئی - جو قوموں کے درمیان بزرگ اور صوبونکے بیچ ملکہ تہی - سو خراج گذار ہوئی - وہ راتوںکو زار زار روتی ہے - صیہونکی راہیں ماتم کرتی ہیں - کہ کوئی مقررہ عیدونکو نہیں آتا - اُسکے سارے پہاٹک سنسان ہیں - اوسکے کاہن - ٹہنڈا سانس بہرتے ہیں - اوسکی کنواریاں غمگیں اور وہ آزردہ خاطر ہے - دیکہہ اے خداوند میری انتڑیاں اُبلتی ہیں اور میرا دل مجہہ میں چکر مارتا ہے"

آگے چلکر اپنی قوم کی مصیبت کا فوٹو کہینچتے ہیں -

"صیہون کے بیٹے کی بزرگ زمین پر بیٹہے ہیں - وے چپ رہتے ہیں - اُنہوں نے اپنے سروں پر خاک اُڑائی - اپنی کمروں پر ٹاٹ باندہا - یروسلم کی کنواریاں اپنے سروں کو زمین تک جہکاتیاں ہیں"

اب اپنے رنج وغم کی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں -

"تیری قوم کی شکستہ حالی کی بابت میری آنکہونکی بینائی آنسوؤں سے گہٹ چلی - میری انتڑیوں میں مروڑ ہے - میرا کلیجہ بہکے زمین پر گرا - اسلئے کہ اطفال اور دودہ پیتے بچے

[1] غزل الغزلات [2] غزل الغزلات

شہر کے کوچوں میں غش کہاتے ہیں۔ دیکھو۔ کہ عورتیں اپنے پہل۔ اپنے بالشت بہر لمبے بچوں کو کہاتی ہیں۔ رحم دل عورتوں کے ہاتھوں نے اپنے بچوں کو پکایا۔ میری قوم کی بیٹی کی ہلاکت میں وہی خوراک ہوئے۔"

آگے چلکر کن پُر درد الفاظ میں فرماتے ہیں۔

گیدڑ بہی چہاتیاں نکالتے ہیں۔ وے اپنے بچوں کو دودہ پلاتے ہیں۔ میری قوم کی بیٹی بیابان کے شتر مرغوں کے مانند بے رحم ہے۔ دودہ پیتے بچے کی زبان تالو سے جا لگی ہے ننہے بچے روٹی مانگتے ہیں۔ پر اُنکے لئے کوئی توڑتا نہیں۔ وے جو مزہ دار کہانے کہاتے تہے۔ سو گلیوں میں بے تاب پڑے ہیں۔ وے جو قرمزی پوشاک پہنے ہوئے پلے تہے مزبلے سے ہم آغوشی کرتے ہیں۔ وہ برف سے بہی صاف اور دودہ سے بہی سفید تہے۔ اُنکے بدن مونگے سے بہی زیادہ سُرخ تہے۔ اُنکا لید نیلم کا سا تہا اب اُنکا چہرہ سیاہی سے بہی زیادہ کالا ہے۔ وے گلیوں میں پہچانے نہیں جاتے۔ اُن کا چمڑا ہڈیوں سے لپٹا ہے۔ وے جو تلوار سے قتل کئے جاتے ہیں اُنسے [illegible] جو بہوک سے مرتے ہیں۔"

آخر میں نہایت جوش میں کہتے ہیں۔

بزرگ لوگوں کا پہاٹکوں پر جمع ہونا موقوف ہوا۔ اور جوان اپنی نغمہ پردازی سے باز آئے۔ ہمارا ناچنا ماتم سے مبدل ہوا۔ تاج ہمارے سر سے گر گیا۔ ہم پر افسوس کہ ہم نے گناہ کیا۔ اس باعث میرا دل ناتواں ہوا۔ ان باتوں کے سبب میری آنکہیں دہندہلا گئیں۔" اسکا ایک ایک جملہ غور سے دیکہو۔ ہر ایک میں دل کی حقیقی کیفیت اور اصلی رنج و غم کا اظہار ہے نہ تصنع ہے نہ تکلف۔ اور پہر کسقدر پر اثر ہے اسیکا نام شاعری ہے۔ کتاب مقدس میں زبور کے گیت سلیمان ع کی غزل الغزلات۔ اور یرمیاہ نبی کا نوحہ تو قطعاً شاعری ہے لیکن اسکے اور حصے گو وہ شاعرانہ لطیف جوش اور دلچسپی سے خالی نہیں ہے مگر شاعری سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ یہی حال قران کا بہی ہے اسکی بعض بعض آیتیں یا سورتیں مثلاً اذا الشمس کورت۔ گو شاعری کے اعلیٰ رتبہ میں شمار

ہوسکتی ہیں مگر اُنکا درجہ اُس سے بلند ہے سو وہ خطبہ ہیں۔

شاعر اور خطیب میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے یعنی جسطرح شاعر اپنے کلام کو موثر اور دلکش بناتا ہے اسیطرح خطیب بھی لیکن اسقدر امتیاز خطیب کو حاصل ہے کہ شاعر تو اُسی اثر میں خود محو ہوجاتا ہے اور اُسکے اوپر وجد کی حالت طاری ہوجاتی ہے مگر خطیب اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا ہے کیونکہ اُسکو غیروں کا متاثر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً انجیل کے یہ فقرے جو مختلف مقامات سے ہم نقل کرتے ہیں۔

"وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو۔ اور اپنے موتی سوروں کو آگے مت پھینکو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اُنہیں پامال کریں"

"مانگو کہ تمہیں دیا جائیگا۔ ڈھونڈھو کہ تم پاؤگے۔ کھٹکھٹاؤ کہ تمہارے واسطے کھولا جائیگا۔ ہوا کے پرندوں کے واسطے بسیرے ہیں۔ لومڑیوں کے لئے ماندیں۔ پر ابن آدم کے لئے جگہ نہیں۔ جہاں اپنا سر دھرے"

بالکل خطیبانہ ہیں۔ اور شاعر کی زبان سے ایسے پُرجوش جملے نہیں نکل سکتے۔ [illegible]

اسلم جیراجپوری۔ مدرسۃ العلوم علیگڈہ۔

گلدستہ نغز المعروف بہ کلام کلیم یعنی دیوان مولانا محمد عبدالرحیم صاحب کلیم لکھنوی شاگرد لطافت مرحوم لکھنوی حجم تقریباً ۱۹ اجزو تقطیع ۲۰×۲۶/۸ بہت اچھا لکھا اور چھپا ہوا۔ قیمت صرف ۱۲ عہ حضرت مصنف سے لکھنؤ محلہ چاہ کنکر کے پتے سے ملیگا۔ اسموقع پر بطور نمونہ ایک غزل برائے ملاحظہ ناظرین درج کیجاتی ہے۔

ناوک جو وہ لگائے پھر کوئی راہ نکلے
سینے سے دل جو نکلے تو دے کے آہ نکلے

روز شمار آخر میں بے حساب ٹھہرا
فرد گنہ میں میری اتنے گناہ نکلے

اُس شرمگیں سے قاصد خط دیکے کچھ نہ کہنا
تیرے نہ لب سے میرا احوال تباہ نکلے

وہ باوفا ہوں ظالم تاثیر اگر دکھائے
دل اپنا تھام لوں میں جب دل سے آہ نکلے

سینۂ عدو میں خنجر ترا در آئے
ایسا سیاہ دل ہے وہ بھی سیاہ نکلے

تیر اُنگلا ستمگر اور پھر مری زبان سے
موقع جو آہ کا ہو تو منہ سے واہ نکلے

جلوہ کلیم اُسکا حیرت میں گر نہ ڈالے
پردے میں شب کے چھپکر ہرگز نہ ماہ نکلے

مکتوبات امیر مینائی

(مرتبہ ثاقب)

سید محمد نوح صاحب شہیر رئیس مچھلی شہر کے نام

دلنوازا امیر فقیر حضرت شہیر سلمکم اللہ القدیر۔

سلام مسنون اخلاص مشحون۔ شدائد مرض عسر بول و حبس بول سے اوقات
میں سخت اختلال ہے۔ ضعف پیرانہ سالی کو خستہ حالی نے اور قوت دی کہ رکھی ہے یہی سبب ہے
کہ احباب سے بھی رسم و راہ خط و کتابت ترک ہو گئی۔ آپ کی محبت اور عنایت کا خیال تو اکثر
رہتا ہے مگر خط لکھنے کا اتفاق مدت سے نہیں ہوا۔ آج محمد احمد سے آپ کی خیر و عافیت سنکر
فی الجملہ تسکین ہوئی مگر جو حالات اپنی پریشانی کے اجمالاً آپ نے لکھے انہوں نے میرے دل
دردمند کو بہت دکھایا علی الخصوص سرمایۂ نتائج افکار کا جونپور سے گم ہو جانا سنکر مجھے ایسا قلق
ہوا کہ اسکے بیان کو لفظ نہیں ملتے۔ خدا جانے کس بیدرد نے یہ ظلم کیا۔ اتنے بڑے دیوان کا چوری جانا
سمجھ میں نہیں آتا کچھ تفصیل تو لکھئے یہ کیا غضب ہوا۔ آپ سے نامور شاعر کا کلام کسی دوسرے کے کلام
کیونکر آ سکتا ہے یہ بھی لکھیئے کہ خدانخواستہ اس کلام کے ملنے سے یاس ہو گئی یا احتمال باقی ہے
اور درصورت نہ ملنے کے کچھ مسودات ایسے ہیں جنسے پھر تسوید و تبییض ہو سکے یا نہیں۔ خدا کرے
وہی دیوان مل جائے ورنہ آپ ہرگز ہمت نہ ہارئے اور مسودات سے جسقدر ممکن ہو پھر جمع کیجئے
ایسے ریزہ ہائے جواہر کا تلف ہو جانا آپکے احباب پر نہایت شاق ہے۔ میرا دل تو یہ خبر سنکر بسمل
ہو گیا۔ زیادہ اسوقت کیا لکھوں یہ چند سطریں طبیعت پر بہت جبر کر کے لکھی ہیں۔ میری کوتاہ قلمی
پر نظر نہ فرما کر کبھی کبھی مجھے اپنی خیر و عافیت اور صحت و سلامت سے مسرور کیا کیجئے تو کمال احسان ہے

آپکا منت پذیر مسرت ضمیر و یاس تصویر۔ امیر فقیر

تکملۂ التماس یہ ہے کہ غدر میں میرا بھی کلام جسقدر اس زمانے تک مرتب ہوا تھا اور میں نے
اسکو خوشنویس سے لکھوا کر مطلا اور مذہب کروایا تھا سب تلف ہو گیا مگر کچھ اپنی یاد سے کام
لیا اور کچھ پھر موزوں کیا کہ مراۃ الغیب کی صورت بندھی اگرچہ ہزارہا شعر یاد نہ آیا اسکے لکھنے سے
غرض یہ ہے کہ آپ بالکل اس دیوان سے قطع نظر نہ فرمائیں اور کوشش کریں کہ کچھ یادگار باقی رہے۔

تنقید

مخزن۔ مکتوبات آزاد | کئی ماہ سے رسالہ مخزن لاہور میں حضرت آزاد صاحب آبحیات کے خطوط شائع ہو رہے ہیں۔ ان خطوط کی دلچسپی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ جا بجا انہیں بعض ایسی غلطیاں نظر سے گزرتی ہیں جو مخصوص بہ محاورۂ پنجاب ہیں۔ مثلاً پرچۂ جولائی کے صفحہ ۴۱ میں ہے کہ "میرے نئے کونسا پنجاب سے نکاح کیا ہوا ہے"۔ بلاشبہ یہ حضرت آزاد کے طویل قیام لاہور کا نتیجہ ہے۔

فصیح الملک | غالباً مکتوبات امیر مینائی مرحوم کی اشاعت سے متاثر ہو کر حضرت احسن مارہروی نے فصیح الملک میں مکتوبات داغ کا بھی سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ ہمارے خیال میں داغ مرحوم کی نثر نگاری اس قسم کی عزت افزائی کی مستحق نہیں ہے۔ لیکن اگر حضرت احسن کو اس قول کی صحت سے انکار ہو تو انکو کم از کم اتنا لحاظ ضرور رکھنا چاہیے کہ آئندہ سے "طوائف کے نام" کے خطوط اشاعت نہ پائیں اسی قسم کی ناگوار غلطی اڈیٹر مخزن سے بھی ہو چکی ہے جنہوں نے واجد علیشاہ مرحوم بادشاہ اودھ کے پرائیویٹ خطوط بلا امتیاز شائع کر دیے تھے۔

اخبار گیلک امریکن نیویارک | آئرش باشندگان امریکہ کے اس اخبار میں تقریباً ہر ہفتے اہل ہند کی دلچسپی کا بھی کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا ہے۔ کیونکہ محکومی انگلستان کے لحاظ سے قدرتاً ایک حد تک دونوں ملکوں کی حالت یکساں ہے اور اسلئے ایک کو دوسرے کے ساتھ ہمدردی بھی ہے۔ ۳۰ جون کے پرچے میں اخبار پنجابی لاہور سے ایک مسلمان کا خط نقل کر کے اس اخبار نے ان چند ضمیر فروش مسلمانوں کی بہت بری طرح خبر لی ہے جنہوں نے خرخشۂ عقبہ کے موقع پر بعض آزاد خیال مسلمانان علیگڈھ کے تار کے جواب میں اخبار پانیر کے ذریعے سے گورنمنٹ کو یہ باور کرانا چاہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو سلطان عبدالحمید خاں خلد اللہ ملکہ سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہے۔ اس معاملے کے متعلق علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں نواب محسن الملک بہادر نے اس بات کا مکرر اعلان کیا ہے کہ علی گڈھ کالج کو شیخ عبداللہ اور قاضی عزیز الدین احمد کے خوشامدانہ تار اور تحریر سے کوئی سروکار نہیں ہے اور ساتھ ہی اس امر کی شکایت بھی کی ہے کہ لوگ بلا وجہ کالج کو بدنام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی اس بات کو مانتے

که کالج کو شیخ عبد اللہ کے تار سے کوئی تعلق نہ تھا چنانچہ کالج کے ۹۰ فیصدی لڑکے اُن کی
اس حرکت پر نفرین کرتے تھے۔ لیکن نواب صاحب کو شکایت کا کوئی موقع نہیں ہے کیونکہ جب
کالج کے ایک ٹرسٹی نے پہلے تار بھیجنے والوں میں دو ایک اہل کانگرس کی شرکت کے لحاظ سے
اُس تار کو کانگرسی مسلمانوں کا تار بتانے میں خوف خدا سے کام نہ لیا تو اگر عوام الناس نے
کالج کے دو ٹرسٹیوں کی تحریر پر اُس تار کے افسوسناک جواب کو کالج سے منسوب کیا تو کچھ
بیجا نہیں کیا۔"

مسٹر برائن امریکن کے خیالات | کچھ روز ہوئے کہ امریکہ کے مشہور اخبار "دی سن" میں مسٹر
برائن نے، جو پریسیڈنٹی ممالک متحدہ امریکا کے امیدوار رہ چکے ہیں اور اب بھی ہیں، اپنے
سفر ہندوستان کے نہایت دلچسپ حالات لکھے تھے۔ چنانچہ شمالی ہندوستان کے شہروں میں سے علیگڈھ
کا ذکر کالج کی تعریف کیا تھا کرکے آپ نے نہایت دور اندیش رائے ظاہر کی تھی کہ عنقریب یہاں کی تعلیم
یافتہ نوجوان، جو اب تک کانگرسی تحریک کے مخالف رہے ہیں، یقیناً تعلیم اور آزاد خیالی سے بہرہ مند
ہوکر کانگرس میں شریک ہو جائینگے۔ پہر آگرہ کے روضہ تاج گنج کی بیحد تعریف کرنیکے بعد لکھا تھا کہ اس
لاجواب عمارت کے بانی کی نسبت تحسین و عزت کے تمام خیالات رنج سے مبدل ہو جاتے ہیں جبکہ
میں یہ خیال کرتا ہوں کہ جس خاتون کی ظاہری حرمت اس درجہ کی گئی کہ اُسکا مقبرہ دنیا میں لاثانی
قرار پایا اسکی حقیقی عزت صرف یہ کیجاتی تھی کہ وہ محلسرائے شاہی کی چار دیواری میں محدود و مقید رہا کرتی
تھی۔ مسٹر برائن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی رسم پردہ اُنکو نہایت درجہ ناگوار
معلوم ہوئی۔ ہندوستان میں انگریزی طرز حکومت کے عیوب پر صاحب موصوف نے حال ہی میں جو
خیالات ظاہر فرمائے اُنکا مطالعہ ہر ہندوستانی اور انصاف پسند انگریز پر فرض ہے۔ آپ نے انگریزی
حکومت کو دو باتوں میں روسی حکومت سے بھی بدتر قرار دیا ہے اول اس لحاظ سے کہ روس میں شخصی اور
جابرانہ حکومت ضرور ہے لیکن پہر بھی وہ خود روسیوں کی حکومت ہی حالانکہ ہندوستان پر دوسری
قوم حکمراں ہی۔ دوم اس صورت سے کہ حکومت روس کو جو کچھ رعایا سے وصول ہوتا ہی وہ روس ہی میں صرف ہوتا
ہی برخلاف اسکے ہندوستانکے محاصل کا بڑا حصہ ملک کے باہر چلا جاتا ہی۔ ہمارے کرمفرما مولوی برکت اللہ صاحب کی
بھی ایک تحریر اخبار میں شائع ہوئی ہی جسمیں اُنہوں نے مسٹر برائن کی بے لاگ رائے کی تائید اور تعریف کی ہے۔ فقط

حصہ نظم

غزل از مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب مدیر قندپارسی

غم سے شب فراق میں وابستگی تو ہے | عشاق خستہ حال کا مونس یہی تو ہے
آوارہ وطن کا دیار غریب میں | کوئی اگر نہیں ہے تو بیکسی تو ہے
گو دشت فتنہ خیز ہے گو چرخ حیلہ جو | خضر رہ مراد مری بیخودی تو ہے
ہو جاں گداز و تاب شکن گرچہ سوز ہجر | مرنے کی آپ روز ہمیں اک خوشی تو ہے
ملجائیگی کبھی نہ کبھی دولت سرور | پیر مغاں سے نسبت رنداں قوی تو ہے
دل دزد یا کسیکو اگر ہمنے کیا گناہ | عہد شباب و عشق و ہوس مقتضی تو ہے
راہ وفا میں کوئی نہیں اس کا ہمقدم | ثاقب کے گو مزاج میں آشفتگی تو ہے

غزل از مولوی مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی

درد دل ختم شب غم کی خبر دیتا ہے | رنگ بیمار کا پیغام سحر دیتا ہے
کچھ وہی واقف اسرار محبت ہوگا | زندگی وقف شب ہجر جو کر دیتا ہے
اسکی قدرت سے شب ہجر تعجب کیا ہے | زندگانی یوہیں دیتا ہے اگر دیتا ہے
اس تصور نے غم بے اثری دور کیا | کون ہے جو مرے نالوں میں اثر دیتا ہے
بیخودی کوچہ جاناں میں لئے جاتی ہے | دیکھئے کون مجھے میری خبر دیتا ہے
تمکو انگڑائی وہاں آئی یہاں دم ٹوٹا | یوں کوئی جذب محبت کی خبر دیتا ہے
انتظار اُسکا خیال اُسکا امید اُسکی نہ پوچھ | صبح سے شام ترے در پہ جو کر دیتا ہے
ہے یہی غفلت بیمار کی اب کچھ تدبیر | چارہ گر آپکے آنے کی خبر دیتا ہے

غزل جناب ضامن کنتوری

مخل معرفت نفس ہے حجاب نفس | کہ وجہ برہمی دل ہے پیچ و تاب نفس
رجوع قلب نہیں یاد یار کیا آسے | خرد شکار ہوس ہے تو دل خراب نفس
سمند عمر پہ غافل نہ بیٹھ او نادان | نہ ٹوٹ جائے کہیں تسمۂ رکاب نفس
ہیں کرتے بحر سے کیوں لوگ عمر کو تعبیر | خبر نہیں کہ یہ ہے موجۂ سراب نفس

خیال پیروی نفس [illegible] نفس ہے جنہیں
خدا کے سامنے کیا دینگے وہ جواب نفس

[illegible] دل کو خرابات [illegible] کیا ہو
تمام وجود میں ہے جوش زن شراب نفس

[illegible] دل میں اگرچہ ہے [illegible] تیغ صائب
یہ یاں ہے قید اضافت سے سدباب نفس

غزل جناب مولانا حکیم محمد عابد علی صاحب کوثر خیرآبادی شاگرد حضرت امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ

میرے سینے میں چھپا رہنے دی پیکاں کوئی
دل بہلنے کے لئے چاہئے ساماں کوئی

یہی دہر کا ہے کہ میرا دل شوریدہ نہ ہو
آج نکلا ہے تری بزم سے نالاں کوئی

گر [illegible] دل میں خیال رخ گلرنگ نہیں
ایک غنچے میں چھپائے ہے گلستاں کوئی

خاک کے ذروں میں ہے نور کا عالم پیدا
کبھی گزرا تھا ادھر سے مہ تاباں کوئی

منتیں کرتا ہوں ای عہد جوانی پھر آ
روٹھتا یوں نہیں اے عمر گریزاں کوئی

قید میں بھیجکے یوسف کو زلیخا نے کہا
کھینچے لیتا ہے مرا دل سوے زنداں کوئی

سرمگیں آنکھوں میں کاجل جو لگاتا جاتا ہے
مانگ لے ہم سے سواد شب ہجراں کوئی

میں جو اٹھتا ہوں بناوٹ سے بگڑ کر کوثر
نیچے زانو کے دبا لیتا ہے داماں کوئی

غزل جناب نواب سید محمد رضا صاحب موج عظیم آبادی

تری جستجو میں سنتے تجھے یوں تلاش کرتے
اسی ایک دھن میں رہتے کبھی یوں بھی کاش کرتے

اسی کچھ نہ تو ناصح وہ جفا پہ ہوتے مائل
جو ہم اس طرح کے نالے نہ جگر خراش کرتے

کوئی پوچھے محتسب سے کبھی کچھ ترس بھی آیا
بھرے شیشے میکدہ کے تجھے پاش پاش کرتے

کبھی بے نقاب اسکو نگزرتے ہمنے دیکھا
سر راہ عمر گزری ہمیں بود و باش کرتے

ہیں صدا ای صورتگر اسی سر زمیں سی اٹھتا
مجھے دفن اسی گلی میں مرے دوست کاش کرتے

وہ ہزار بیخودی تھی پہ مجال کیا تھی ساقی
کہ ہم اور میکدہ کا کوئی راز فاش کرتے

ہمیں اسکی جستجو کا یہ پڑا ہے موج لپکا
اسے ڈھونڈھ بھی جو پاتے تو نہیں تلاش کرتے

غزل جناب محمد احمد صاحب بیخود موہانی

کریں وہ لن ترانی مجھسے ایسا ہو نہیں سکتا
کبھی ہر طالب دیدار موسیٰ ہو نہیں سکتا

قیامت میں وہ محو ناز ہے ہم محو حیرت ہیں
نظارا ہو نہیں سکتا اشارا ہو نہیں سکتا

کرم اے خود فراموشی کہ کوئی جلوہ آرا ہے — قیامت ہے کہ میں محو تماشا ہو نہیں سکتا

کچھ اُسیکی شان ہے مجھ میں کچھ اپنی شان مجھ میں — تکلف برطرف وہ بت بھی مجھسا ہو نہیں سکتا

مری ایذا پرستی مجھکو یوں تسکین دیتی ہے — کہ تیرا ہو کے وہ ظالم کسیکا ہو نہیں سکتا

سلامت دم ہے جب تک آپکے حسرت پرستو نکلا — ہجوم یاس محروم تمنا ہو نہیں سکتا

جو خود بینی وہاں ہے یاں وہی ہے خود فراموشی — بیاں کچھ امتیاز قیس و لیلیٰ ہو نہیں سکتا

کسیکا جلوہ بیتاب بھی پابند محشر ہو — فریب ناز ہے اے شوق ایسا ہو نہیں سکتا

ترے حسن خود دشمن سے جب اک حال ہے سبکا — ہجوم حشر میں پھر کوئی رسوا ہو نہیں سکتا

ترے جلوہ کو ظالم انتظار روز محشر ہے — دل بیتاب سے یاں صبر اتنا ہو نہیں سکتا

عبث شوق تماشا شکوہ سنج بے نیازی ہے — وہ مست ناز ہے بیخود کسیکا ہو نہیں سکتا

غزل جناب حکیم معشوق علی خانصاحب جوہر ساکن بھوپال

دل پہ داغ کو کیونکر بچاؤں چشم پرفن سے — زرِ مسکوک بچتا ہی نہیں ہے دستِ رہزن سے

مزہ دیوانہ پن کا وادی وحشت میں جب آئے — نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے

خدا جانے خزاں نے کیا ستم ڈھایا ہے پھولوں پر — صدائے نالۂ بلبل چلی آتی ہے گلشن سے

رگ جاں پردۂ زنار میں کرتی ہے کام اپنا — نیا رشتہ نکالا عشق نے طفل برہمن سے

زمانہ سے نرالا آپکا طرزِ ستم دیکھا — میرے منہ پر شکایت میری کرنا میرے دشمن سے

خزاں میں لطف کیا سیر گلستاں کا ہوا جوہر — بہار لالہ و گل چل بسی ہے صحن گلشن سے

شعلہ ۔ سید محمد سلطان صاحب لکھنوی ۔ شاگرد جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

بدِ نظر جفا ہے تو کیجے جفا ضرور — اچھا تو ہے کہ ہو ستم ناروا ضرور

کہتے ہوئے یہ ولولہ دل سے آئے ہیں — اُنسے کرینگے آج تو کچھ التجا ضرور

یارب غم فراق میں مرنا عبث نہ ہو — آئیں لحد پہ میری وہ بعد فنا ضرور

اے شوق انتظار لبوں اب جان چھوڑ دے — ہم مر گئے تو یار کا آنا ہے کیا ضرور

وابستہ اس امید سے ہے اپنی زندگی — پوچھے گی ہمکو ہجر میں آکر قضا ضرور

کہتے ہیں آسماں سے شب غم مریض ہجر — کچھ ہو نہ ہو مگر ہو نزول بلا ضرور

ذکر وصال ہجر میں ناصح نہ چاہیئے
جو خود ہی رو رہا ہو ہنسی اُس کو کیا ضرور

کیوں وہ چراغ پا ہوئے نام وصال پر
انسان ہی سے ہوتی ہے شعلہ خطا ضرور

غزل جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اعظم اجیگڑھ سنٹرل انڈیا

دیا ہے ساتھ اثر نے جو میرے نالوں کا
تو حال دیدنی قابل ہی عرش والوں کا

رہ طلب میں جو تھکتے ہیں نالہ کرتے ہیں
عصائے راہ ہے یہ ہم شکستہ حالوں کا

اُسی کے طالب خواہاں ہیں کافرودیندار
جو سجدوں کا ہے داتا وہی سوالوں کا

جو سامنا تیری زلف سیاہ کا ہو جائے
چراغ زلیت سر شام گل ہو کالوں کا

وہ گلعذاروں کا مجمع ہی یاد اے اخگر
وہ سیر نہر کی میلا وہ پھول والوں کا

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خان بہادر مدظلہ

مصاحب ظلم واں۔ مانوس شوق فتنہ گر ہمسے
لگاتے ہیں یہی کمبخت۔ اُدھر اُنسے ادہر ہمسے

ذرا کم ہو گیا تھا ضبط۔ پھر دریا اُمڈ آیا
خدا جانے پھر ہی بیٹھی تھی کب کی چشم تر ہمسے

کیا ہے ذکر ملنے وامق و فرہاد و مجنوں کا
کہانی خفتہ بختی کی کہی ہے رات بھر ہمسے

لحد میں آ گئے ہم۔ رہ گیا دل کوی جانا نہیں
یہ منزل سخت ہی ایسی کہ چھوٹا ہمسفر ہمسے

نہ ہمکو تاب رونے کی۔ نہ اُسکو ضبط کی طاقت
خجل رہتے ہیں چشم تر سے ہم اور چشم تر ہمسے

نہیں کرتے احبا ذکر تک فرہاد و مجنوں کا
چھپائی جاتی ہے اُلفت کے کشتوں کی خبر ہمسے

بھلا اسے جذب دل کیونکر یقیں ہو انکے آنیکا
تصور نے کہی ہے بارہا جھوٹی خبر ہمسے

مبصر ہوں خبر رکہتا ہوں حال نرگس گل سے
چھپی رہتی نہیں اید وست دشمن کی نظر ہمسے

سمجھ لیں گے اگر منزل پہ ہم ای شاد جا پہنچے
خبر تک بھی نہ کی اور بڑھ گئے سب ہمسفر ہمسے

دل کو میل آتا ہی فرقت سے نہ ساز آتا ہے
اور نہ کمبخت ترے عشق سے باز آتا ہے

کھل گیا ہے جو ترے شوق کا احوال تو اب
نالہ بھی سینے کرتا ہوا ناز آتا ہے

غم نے بے صبر کیا مجکو۔ جنوں نے رسوا
ہائے جو آتا ہی یاں دشمن راز آتا ہے

رک گئے کیوں در جاناں پہ قدم اے زاہد
آ حقیقت میں اگر سوئے مجاز آتا ہے

دلکو بہلائیو رہ شاد شب ہجر میں یوں
اب سحر ہوتی ہے اب وقت نماز آتا ہے

اردوئے معلّٰی

علی گڑھ

جلد	بابت ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء	نمبر ۴

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی۔ بی۔ اے

(فہرست مضامین)

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلّٰی علیگڈھ

احسن المطابع واقع علی گڑھ میں طبع ہوا

(قسم اول ...) ...

البشیر اٹاوہ

اخبار البشیر ہفتہ وار اٹاوہ سے شائع ہوتا ہے۔ درخواست کرنے پر نمونہ مفت روانہ کیا جاتا ہے۔ المشتہر محمد بشیر الدین مدیر البشیر

اطلاع

ہندوستان میں کپڑا بننے کی صنعت کو ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ جسکو پورا کرنے کیلئے پنجاب ہینڈ لوم کافی سمجھی گئی ہیں۔ مگر ان لومز کے متعلق عام تکلیف یہ ہے کہ اچھی طرح کام کرنے والے کاریگر نہیں ملتے۔ جو ان لومز پر کام کرنا جانتے ہوں۔ اس عام شکایت کو رفع کرنے کیلئے پنجاب ہینڈ لوم سکول بیرون دروازہ شاہ عالمی متصل سیتلا استھان کھولا گیا ہے جس میں چند روپیہ داخلہ لیکر امیدواران کو بغیر کسی قسم کی زائد فیس کے کام سکھایا جاتا ہے۔ باہمت نوجوان جو ایک عمدہ اور آزاد روزگار حاصل کرنیکے خواہاں ہوں اس اسکول میں آکر کام سیکھیں اور ملک میں کپڑا سازی کی صنعت کو ترقی دیں۔ المشتہر کرشن سنگھ منیجر پنجاب ہینڈ لوم اسکول لاہور۔ شاہ عالمی دروازہ۔

اخبار الکیمیا الیر کوٹلہ

اس نام کا ایک طبی اور کیمیائی مضامین کا دلچسپ اخبار جس میں علم کیمیا شرقی اور مغربی کے متعلق محققانہ بحث ہونیکے علاوہ ہندوستان کے مسلم و مستند حکماء و اطباء کے مضامین و مراسلات بھی درج ہوتے ہیں اور جس کا کام مایوس مریضوں کو مفت مشورہ دینے اور ہر ایک قسم کے طبی و کیمیائی سوالات کا جواب لکھنے کے علاوہ کیمیا کے وہ سربستہ و مخفی رازوں کا اظہار کرنا ہے کہ جن کا انکشاف اسکے جاننے والے پر شاق گذرتا ہے اور بڑے بڑے علماء و حکماء نے اسے ایک معزز اور قابل قدر اخبار مانا ہے۔ نمونہ مفت منگوا کر ملاحظہ فرما دیں۔ قیمت سالانہ عہ۔ درخواست بھیجنے کا پتہ دوست محمد خان اڈیٹر اخبار الکیمیا مالیر کوٹلہ

رسالہ الاخلاق آگرہ

ہندو مسلمانوں کو متحد بنانے والا ہندوستانیوں میں صلح [illegible] اخلاق [illegible] بنانے والا۔ اتفاق و اتحاد کا حامی تعصب و نفاق کا دشمن۔ غرضکہ کل ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانے والا آگرہ کا باتصویر ماہوار رسالہ ۱۸×۲۲ کی تقطیع کے ڈیڑھ جزو پر تین سال سے ہر مہینہ کی ۲۵ تاریخ کو نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے۔ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ کاغذ ولایتی درجہ اول ہر ماہ کسی نہ کسی مشہور شخص کی تصویر بھی شائع ہوتی ہے۔ قیمت سالانہ بہت کم عوام سے عہ طلباء سے بشرط تصدیق عہ۔ ممالک غیر سے عہ محصول ڈاک علاوہ ہے۔ نمونہ کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے بلا ٹکٹ کوئی صاحب نمونہ طلب نہ فرمائیں۔ المشتہر

منیجر رسالہ "الاخلاق" آگرہ

رسالہ اجماع

مصنفہ جناب ڈاکٹر راما نند صاحب پر دیرا ہیڈ و سپرنٹنڈنٹ کارخانجات میڈیکل ہال

ناظرین یہ وہ رسالہ ہے کہ جسکا رسالہ کر کے انسان کے فوراً آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور بیساختہ یہ کلمہ بابت نکلتا ہے کہ ہائے میں مارا گیا اور آئندہ کے لئے بچ گیا۔ اب ایسے ایسے کام نہ کرونگا۔ واقعی ایسی نادر کتاب آپ کے مطالعہ سے نہ گذری ہوگی۔

نوٹ۔ راجاؤں امیروں کبیروں، عالموں، فاضلوں اور عموم کو اطلاع کیجاتی ہے کہ اس اشتہار کے پڑھتے ہی لوگوں کو اکٹھا کر کے اور اُن سے دریافت کر کے کہ اتنے آدمیوں کو کتنے رسالے درکار ہیں فوراً جناب جنرل سیکرٹری صاحب کارخانجات رائل میڈیکل ہال جگادھری ضلع انبالہ کو بذریعہ کارڈ اطلاع دیں۔ آپ کی تحریر کے بموجب اتنی ہی رسالے آپ کی خدمت میں بغیر قیمت بلکہ ٹکٹ بھی کارخانہ کیطرف سے چسپاں کر کے فوراً روانہ کر دیے جاوینگے تاکہ آپ اُن سب لوگوں کو تقسیم کر دیں۔ لیکن اطلاع آنے میں دیر نہ ہو کیونکہ یہ رسالہ چار ہزار کی تعداد میں روزمرہ مفت تقسیم ہو رہا ہے۔

از سکرٹری کارخانجات رائل میڈیکل ہال سیڈ آفس جگادھری ضلع انبالہ

ید بیضا

زبان اُردو کا ایک ماہوار علمی رسالہ جس میں ہر قسم کے ادبی تنقیدی تمدنی اخلاقی تاریخی اور فلسفیانہ مضامین اور تازہ غزلیات اور دلچسپ نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ حجم ۸۰ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶

مقاصد ضروری۔ اُردو علم ادب کی تزئین و توسیع

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک

والیان ریاست سے ... ... عطیہ مرضیہ

روساء، علماء سے ... ... ہے/

عام شائقین سے (قسم اول عمدہ کاغذ پر) ... ... ہے

" (قسم دوم معمولی کاغذ پر) ... ... عہ

خریداران ممالک غیر سے ... ... ہے

درخواست خریداری بنام حکیم محمد سعید منیجر سکندر آباد ضلع بلند شہر ارسال کیجئے

جاپانی ریشم بہت خوبصورت ارزاں اور چمکیلا۔ جو تا تھان ۱۲ گز کا بڑا تھان ۵۰ گز کا عرض ۲۲ انچ سے ۲۷ انچ تک۔ رنگ حسب الحکم کے حسب خواہش و نمونہ۔ بیلدار چھوٹے پھول والا۔ بڑے پھول والا اور سادہ۔ قیمت بلحاظ عرض و پھول ۸ فی گز سے عہ فی گز تک۔ ایک چھوٹے تھان سے کم نہ روانہ ہوگا۔ تعمیل بصورت زر پیشگی یا بذریعہ وی۔ پی ہوگی۔

عبد السلام رفیقی اینڈ کمپنی رنگون

بسم اللہ

حضرت قدر بلگرامی

اودھ کے قصبوں میں جو نمایاں شہرت اور علم و فضل و کمال کے جو شرف و اعزاز بلگرام کو حاصل ہے۔ وہ اور قصبوں کو بہت کم نصیب ہوا ہے۔ سنہ ہجری کی تیرھویں صدی کے قبل بارھویں صدی تک کم و بیش اُسمیں فضل و کمال کا خوشنما جلوہ نظر آتا رہا۔

ایک طرف علما و فضلا کا گروہ عالم کی ہدایت اور انکی تعلیم میں مشغول۔ دوسری جانب مشایخ و کملا کا مجمع اپنے خداداد اور باطنی فیض کے پہونچانے میں معروف تہا۔ حکماء وہ موجود تھے جن کے کارنامے تاریخ کی سیر کرنے سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

ہر فن کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ بڑی خوبی کے ساتھ جاری تہا۔ جسکو دیکھو حصول علم میں کوشاں تہا۔ تصنیف و تالیف میں گرانبہا ترقی ہو رہی تہی۔ امارت و ریاست نے اپنا وہ رنگ جمایا تہا کہ سب کے سب خوشحال نظر آتے تھے۔ سخاوت نے اپنی الگ دھومیں مچا رکہی تہیں ہر طرف بلگرام ہی کا ذکر بلگرام ہی کا تذکرہ سننے میں آتا تہا۔ سبحان اللہ وہ زمانہ بہی عجیب زمانہ تہا۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ باغ سخن کی بہی وہ وہ گلچین موجود تہے جنکو بلبل شیراز شیریں مقالی کہتے تو زیبا، گل گلزار نازک خیالی کہتے تو بجا۔ خدائے سخن یا پیمبر فن کہتے تو صحیح، خلیل کعبۂ فصاحت یا کلیم سینای بلاغت کہتے تو درست تہا۔ شعرا باکمال مشق ناز خیال سبہی موجود تہے۔ گہر گہر شاعری کا چرچا مشاعرہ کی طیاریاں تہیں۔

علامی میر عبدالجلیل بلگرامی نور اللہ مرقدہ کیا خوب اور کس فخر کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

اللہ اللہ چہ بلگرامے	آب و گل من کہ فیض عام است
کوثر مہ و آفتاب جامے	از خطۂ پاک بلگرام است

غرضکہ ایک عجیب سین نظر آتا تہا۔ مگر افسوس فلک کج رفتار سے نہ دیکہا گیا۔ زمانے نے نیا پہلو بدلا۔ اور یہ پر لطف سمان نظروں سے غائب ہو گیا ان مٹے ہوے حال پر بہی اسی خطۂ پاک کے

دو درخشندہ گوہر شمس العلما سید علی بلگرامی اور عالیجناب نواب سید حسین بلگرامی اُس زمانے کی کچھ یادگار باقی ہیں جن سے باوجود اسکے کہ وہ بلگرام اور اہل بلگرام سے دور اور بالکل بے خبر ہیں بلگرام کا نام قایم ہے اور اب بھی اسکا نام بڑی عزت اور قدر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ (خدا اُن دونوں کی عمر و اقبال میں برکت دے آمین) اسوقت ہم اسی نامی گرامی قصبہ بلگرام اور اسی بارہویں صدی کے اُس آخری باکمال یعنی حضرت قدر بلگرامی کا دلچسپ تذکرہ لکھنا چاہتے ہیں، جو بلگرام کے آخری دور دورے میں اپنا دور دورہ دکھاکر بہار شاعری بھی اپنے ساتھ لیتا ہوا ملک عدم کو راہی ہوگیا۔ اور بلگرام کے لئے اپنے آپکو خاتم الشعرا ٹھہرا گیا۔

حضرت قدر مرحوم بلگرامی کا نام نامی سید غلام حسنین اور والد ماجد کا نام سید خلف علی ہے آپ حسینی واسطی سید ہیں آپ اپنے وطن بلگرام ضلع ہردوئی محلہ سلہڑہ میں ماہ جمادی الآخرہ ۱۲۴۹ ہجری کو متولد ہوئے۔ آپکے عم مکرم مولوی سید سلطان علی مرحوم نے غلام حسنین آپکا تاریخی نام کہا حضرت قدر خود ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎ سو بار نسب ہیں فدا ئے نام حسنین + ہے ختم دو دل جگر مقام حسنین + ہم روز ولادت سے ہوئی نام آور + ہے تاریخی نام ہے غلام حسنین۔ آپکے نسب کا سلسلہ حضرت زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین علیہما السلام سے ملتا ہے۔ پہلے پہل سید محمد صاحب الدعوۃ الصغریٰ جد القبیلہ واسطیہ (جنکا علم مشہور ہے) بلگرام میں آکر متوطن ہوئے تھے۔ آپکا مذہب امامیہ تھا۔ جیساکہ خود ہی اس شعر میں ایک خاص لطف کیساتھ فرماتے ہیں۔ ؎ خدا معلوم کیا گو مگو ہے قدر کا مذہب + کہ شیعہ ہے۔ نہ سُنی ہے۔ مسلمان ہے۔ نہ ہندو ہے۔ العاقل تکفیہ الاشارہ

بلگرام میں آپ نے فارسی حاصل کی اور جب آپ کو اُس میں پوری دستگاہ حاصل ہوگئی تو علوم عربیہ کی تحصیل کی غرض سے حضرت واجد علی شاہ بادشاہ اودہ کے عہد میں بلگرام سے لکھنؤ تشریف لے گئے اور کچھ عرصے تک اُسیں مشغول رہے۔ عہد شاہی میں شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ بڑے بڑے اُستاد فن موجود تھے۔ آپ شیخ امان علی صاحب سحر کے حلقہ شاگردی میں داخل ہوئے اور قدر تخلص پایا۔ اسکے بعد میرزا محمد رضا برق المخاطب بہ فتح الدولہ بہادر سے عروض و قافیہ پورے طور سے حاصل کیا۔ ابتدا میں آپ کی غزلیں سحر پھر برق دیکھتے تھے۔ اور آپ شاہ غازی الدین حیدر کی بیگم مخاطب بہ نواب سرفراز محل کی سرکار میں خدمت منشی گری پر مقرر تھے۔ اسی زمانے میں حضرت سحر اور جناب برق نے انتقال فرمایا۔ مجبوراً آپ شیخ امداد علی صاحب بحر ارشد تلامذہ حضرت ناسخ مغفور کو اپنا کلام دکھانے لگے تھے۔ پھر زمانے کے

اتھوں جب ۱۲۷۳ ہجری مطابق ۱۸۵۶ء میں بہار لکھنؤ پر خزاں آئی اور دفعتاً ۱۸۵۷ء میں غدر کا دور دورہ ہوا فوج انگریزی سرکار سے پھر گئی ۔ دلی لٹی لکھنؤ بے چراغ ہوا ۔ حضرت قدر بھی لکھنؤ سے بلگرام چلے آئے ۔ اتفاقات زمانہ سے حضرت غالب کے بھانجے میرزا عباس بیگ دہلوی اور نواب غلام حسین خاں شاہجہانپوری تخلص بہ حسین اور میرزا قادر بخش صابر دہلوی شاہزادۂ خاندان تیموریہ وغیرہم غدر کے مصائب اٹھاتے ہوئے وارد بلگرام ہوئے ۔ اور حضرت قدر کی پر لطف صحبت کو مغتنم جانکر تا ایام غدر یہیں رہے ۔ انہیں دنوں میں بلگرام کے کیشروں سے آپنے بہاشہ میں کامل مہارت پیدا کی اور بعد غدر تسلط سرکار انگلشیہ آپ بتلاش معاش پنجاب کو چلے گئے ۔ اور چندے سرکاری فوج میں منشی رہے ۔ پنجاب میں آپکی طبیعت نہ لگی آخر مستعفی ہو کر دھلی میں آئے ۔ وہاں نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی سے نظم و نثر میں اصلاح لینے لگے اور تا حیات حضرت بحر لکھنوی و حضرت غالب دہلوی دونوں سے شعر و سخن میں مشورہ لیتے رہے ۔ چنانچہ آپکے کلام میں دہلی کی سادگی لکھنؤ کی ادا دونوں کا جلوہ نظر آتا ہے ۔ ایک رباعی میں آپنے چاروں استادوں کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ تحریر فرماتے ہیں ۔ ؎

سیکھے سحر و برق سے بندش کی بند	پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند	
مجھسا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر	بدنام کنندۂ نکو نامے چند	

دھلی سے تھوڑے زمانے کے بعد آپ پھر اپنے وطن یعنی بلگرام تشریف لے آئے اور بلگرام میں پہونچنے کی خوشی میں آپنے یہ رباعی کہی ؎

پھر شہر میں قدر سا سخنداں آیا	پھر باغ میں بلبل خوش الحاں آیا	
کیونکر نہ جواں ہو پھر زلیخائے سخن	پھر مصر سے یوسف سوئے کنعاں آیا	

انھیں دنوں میں صوبۂ اودھ کی ضلعبندی ہوئی اور بلگرام کا ہردوئی ضلع قرار پایا اور جابجا مدرسے قائم ہونے لگے تو میرزا عباس بیگ صاحب دہلوی ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع ہردوئی نے صاحب ضلع سے سفارش کرکے آپکو ہائی اسکول ہردوئی کا مدرس فارسی مقرر کرا دیا ۔ یہاں بھی آپکی شاعری نے وہ رنگ جمایا کہ آپ کے ذوق و شوق اور انہماک کو دیکھکر اکثر طلبا بھی اصلاح

مائل ہوگئے۔ تعلیم مدرسہ میں اُنکا بڑا حرج ہونے لگا ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہ حال دیکھکر آپکو اس سے روکنا چاہا لیکن حضرت تذ پر اُس کا کچھ اثر نہوا - اور یہ شغل ترقی پکڑتا گیا - آخر یہ نتیجہ ہوا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی رپورٹ پر علم ریاضی کے حاصل کرنے کے لئے آپ نارمل اسکول لکھنؤ میں بھیجے گئے۔ وہاں رہکر تھوڑی بہت ریاضی میں لیاقت پیدا کرنیکے بعد آپ تحصیلی اسکول موہنا ضلع لکھنؤ کے افسر مدرس کردئے گئے وہاں سے کالن برونگ صاحب بہادر ڈائرکٹر نے ازراہ قدردانی آپ کو پھر ضلع اسکول ہردوئی کا مدرس فارسی مقرر کرکے ہردوئی بھیجدیا - ع آپ رفتہ دگر بجو آمد -

چنانچہ اس خدمت کا اظہار ذیل کی رباعی میں آپنے بڑے دلپسند پیرائے میں فرمایا ہے ملاحظہ ہو

درجے میں بڑا ہوا ہے جس شی ہی قدر	دونا ہوا رتبہ یہ کہے کس سے قدر
اول تو مدرس ہی سے ہردوئی کا	پھر اسپہ ہمعدد ہے مدرس سے قدر

ایک سال تک آپ ہردوئی میں اس عہدے پر ممتاز رہے - اسی زمانے میں استاذی حضرت محمد لکھنوی کے والد ماجد رفیق الدولہ دبیر الانشا منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر متخلص بہ ظہیر جو کیننگ کالج اورنٹیل ڈپارٹمنٹ کے فارسی مدرسی کے عہدے پر ممتاز تھے اس دار فانی سے راہی ملک بقا ہوئے اُس وقت آپ کے قدیم قدردان اور دلسوز مربی میرزا عباس بیگ صاحب دہلوی نے (جو اُسی زمانے میں پنشن پاکر لکھنؤ میں کالج مزبور کے ممبر ہوگئے تھے) آپ کو ہردوئی سے بلاکر صاحب کمشنر بہادر کی منظوری سے منشی صاحب مرحوم کی جگہ پر مقرر کرادیا۔

آپنے سات برس چھ مہینے دسمبر ۱۸۹۳ء تک کیننگ کالج لکھنؤ میں اس عہدے کا کام بڑی سرگرمی اور جانفشانی سے انجام دیا اور فی الحقیقت آپنے وہ دلسوزی اور توجہ کی کہ اورنٹیل کلاس کے طلبہ آپکے فیض تعلیم کے باعث اعلیٰ درجہ کی لیاقت حاصل کرکے برابر امتحانوں میں کامیاب ہوکر سند حاصل کرتے رہے۔

اسی زمانے میں آپنے پنگل یعنی ہندی کا عروض پنڈت جٹا شنکر پانڈے سے جو اُس وقت کالج ڈپارٹمنٹ میں سنسکرت کے پروفیسر تھے حاصل کیا اور مدعمہ اور قواعد العروض میں ترجمہ کرکے نئی بات عروضیوں کو بتائی۔

افسوس کہ مرحوم کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ارادہ تھا کہ ایک مبسوط کتاب مثل قواعد العروض

کے فن قافیہ میں بھی لکھیں۔ ع۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

جنوری ۱۸۸۴؁ء میں نبیرہ میرزا غالب نواب آغا میرزا بیگ خاں بہادر سرور جنگ ستاد حضور پرنور کی تحریک سے بتقریب مسند نشینی حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ اثنائے سفر کلکتہ بمقام بنارس شرفیاب حضوری اعلیحضرت ہوکر ایک قصیدہ تہنیت نظر انور سے گزرانا۔ یک ایک حرف اُسکا آب زر سے لکھنے کے قابل تھا اسکے صلہ میں ملبوس خاص عطا ہوا اور امیدوار ملازمت ہوکر پ ہمرکاب بندگان عالی کلکتہ جاکر بلدۂ فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں تشریف لائے۔ دکھواہ اد پائی۔ چارسو روپیہ ماہوار کے ملازم سرکار آصفیہ ہوئے۔

آپ ہمیشہ سے نہایت ضعیف الجثہ تھے اسپر مرض ضیق النفس اور ضعف معدہ اکثر آپکے حق حال رہتا تھا۔ حیدرآباد پہونچکر اختلاف آب وہوا سے اور بھی مستولی ہوگیا۔ آخرکار جب پنے عوارض کی شدت دیکھی تو مجبوراً معالجہ کی غرض سے لکھنؤ تشریف لے آئے لیکن وہاں ن کوئی تدبیر کارگر نہوئی اور باون برس کی عمر میں تیئیسویں ذیقعدہ ۱۳۰۱؁ھ مطابق ۱۴ ستمبر ۱۸۸۴؁ء اتوار کے روز لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔ اور میر خدا بخش کی کربلا میں دفن کئے گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

در مرحوم کے بہت سے لایق تلامذہ اور ذی قدر احبا نے کثرت سے آپ کی تاریخ وفات کے لعات نظم کئے۔ یہاں پر صرف حضرت تمد کا وہ قطعہ درج کیا جاتا ہے جو مرحوم کی لوح مرقد پر کندہ یا گیا تھا۔ ؎

یکشنبہ بہ و بست و سوم ذیقعدہ را — بر دو پہر روز سہ ساعت چو نازیبا بشد
خ از و اثر دلی چسوخ و تر آہنگ نزند — کان علم از دہر یعنی اُستاد ما بشد

زد رقم سال وفاتش تمد صوری معنوی
در ہزار و سہ صد و یک قدر از دنیا بشد
۱۳۰۱

لیفہ۔ قدر مرحوم کی ایک مشہور غزل کے ایک مقطع کے دوسرے مصرع سے بھی اُسکے ات کے سن نکلتے ہیں وہ مقطع یہ ہے ؎

ساخر ہوئی ہے قدر کی تربت پہ میلا ہے — یہاں بیٹری بڑھانے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے
۱۳۰۱؁ھ

حضرت قدر کی ذات مجمع صفات وکمالات تھی۔ فن شعر میں آپ بڑے بلند پایہ اور عالی خیال تھے۔ عروض وقافیہ اور تحقیقات لغت میں وہ کمال حاصل کیا تھا کہ لکھنؤ سے شہر میں شعرا آپ کی تحقیقات کو مسلم الثبوت اور آپ کو کامل استاد تصور فرماتے تھے۔ آپکے کلام کا لطف آپکے دیوان کی سیر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ سادگی۔ شوخی۔ رنگینی۔ نزاکت۔ ادا۔ اور حسن بیان کا مزا لفظ لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ خصوصاً قصیدہ نگاری میں جو رتبہ حضرت قدر نے پایا تھا وہ اوروںکو بہت کم نصیب ہوا ہوگا اور اسکا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنکو قدرت نے انصاف پسند طبیعت عطا فرمائی ہے۔

حضرت قدر کے دیوان میں ایک بات ضرور غیر مناسب پائی جاتی ہے وہ یہ کہ انہوں نے تعصب مذہبی کو اپنے کلام میں بہت جگہ دی ہے۔ جسکی مثال بجز شعرا متقدمین ومتاخرین اور اُنکے ہم مذہب ہم عصر اساتذہ کے کلام میں کم ملے گی۔ مثلاً اُن کے دیوان کے الف کی ردیف میں ایک غزل اسی رنگ سے بھری ہوئی ہے اُسکا مطلع یہ ہے۔

لکھتا ہے وصف غازی دلدل سوار کا	نیزہ بلند ہے قلم حق نگار کا

اسی غزل میں کہتے ہیں۔

کیا کیا کنوئیں جھکاتے ہیں دنیا میں آشنا	کیا کوئی اعتبار کرے یار غار کا

ہمارے خیال میں ہر فرقے والے کو اپنے دیوان کی ترتیب کے وقت اسکا ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ کوئی لفظ کسی کی دلشکنی کا نہ آنے پائے۔ اور جو اشعار ایسے ہوں وہ داخل دیوان نہ کئے جائیں۔

خیر اس سے حضرت قدر کی لیاقت خداداد اور مسلم الثبوت استاد ہونے میں کسیطرح کی کمی نہیں آسکتی۔ بلکہ یہ بات اتفاقات سے تھی جو اُنکے قلم سے نکل گئی یا جن صاحب نے اُنکے دیوان کو مرتب فرمایا اور طبع کرایا ہے اُنہوں نے اسکا کچھ خیال نہ فرمایا اور ایسے اشعار داخل دیوان کر دیئے۔ آمدم برسر مطلب۔

قدر مرحوم نے عجیب بامذاق طبیعت پائی تھی۔ ایک مرتبہ آپ کو کچھ بانسوں کی ضرورت پڑی بہت جگہ تلاش کرائے لیکن نہیں ملے۔ کسی نے کہدیا کہ تحصیل میں بانس موجود ہیں یہ حال

سنکر آپ نے منشی جواہر لال صاحب تحصیلدار کی خدمت میں یہ رقعہ نظم فرماکر بھیجا :۔

جناب منشی عالی گہر جواہر لال	میں جس مکان میں رہتا ہوں سنئے اسکا حال
جو دن کو دھوپ ہے سر پر تو رات کو شبنم	یہ خشک و تر ہے مری جان کے لیئے جنجال
تمام بانسونکی خاطر کنوئیں بانس پڑے	گر کسی نے نہ اک بانس کا کیا اقبال
سُنا ہے آپ کی تحصیل میں ہیں بانس بہت	چلا تھے گنج میں آئے وہاں ہڑتال کی ٹال
مجھے بھی دیجئے اُنمیں سے اسّی نوّے بانس	جو حکم ہو ابھی کٹ آئیں کچھ نہیں ہے محال
جو کچھ پڑیگی کٹائی ڈھلائی میں حاضر	قرار بر کف آزادگان نہ گیرد مال
بُرا جو مانو تو بُرا ماننے کی بات نہیں	نہ آپ ہونگے امیر اسمیں اور نہ میں کنگال

جواب دوگے نہ جبتک نہیں ہے قدر کو چین
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

اس رقعے کو پڑھکر تحصیلدار صاحب بانس کیا اپنے آپکو نذر کرنے کے لئے طیار ہوگئے اور کمال عزت اور قدردانی فرمائی۔

اسکے علاوہ اُنکی کلیات میں اس قسم کی بہت سی پر مذاق اور دلچسپ نظمیں موجود ہیں جیسے بحر طویل از رمل مضاعف الارکان جسکے ہر مصرع میں دو سو چھپن رکن ہیں اور دو مصرعوں میں ختم کیا گیا ہے ۔ ایک اور نظم بھی تر بھنگی چھند کے نام سے موجود ہے جسکے ہر لفظ سے مذاق ہی مذاق پایا جاتا ہے ۔ بخیال طوالت ان سب کو نظر انداز کیا جو صاحب ملاحظہ فرمانا چاہیں وہ اُنکے کلیات میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

آپ نے ان نظموں اور قصائد وغیرہ کے علاوہ ایک علی بند تحریر فرمایا ہے۔ علی بند کیا ہے۔ فصاحت و بلاغت کا نمونہ ہے جسکے ہر لفظ سے آپ کی خداداد لیاقت کا ثبوت ملتا ہے یہ بھی اپنی طرز میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ کلیات میں موجود ہے ۔ قدر مرحوم کو بلا مبالغہ ہزاروں اشعار اساتذہ کے یاد تھے اکثر شعرا نے جب آپکو ٹوکا نہایت ہی دندان شکن جواب پایا افسوس وہ سب مفصل کسی طرح سے معلوم نہو سکے ورنہ یہاں اُنکا ذکر لطف اور فائدے سے خالی نہوتا لیکن جو چند باتیں معلوم ہوئیں وہ درج ذیل کیجاتی ہیں۔

(۱) قدرؔ ۔ ؎

دل شرر تھا سوزشِ غم سے اُچھل کر رہ گیا		ہیں جہاں بیٹھا بہ رنگ شمع جل کر رہ گیا

نواب غلام حسین خاں تخلص جسینؔ نے اعتراض فرمایا کہ شمع کے واسطے بیٹھنا نہیں آیا اُٹھنا البتہ مسموع ہے ۔ حضرت قدرؔ نے مصحفی کا مطلع سنداً پڑھ دیا ؎

شمع کی طرح سے چپ بیٹھے ہیں آسن مارے		گر ہلاتے ہیں زباں جاتے ہیں گردن مارے

(۲) قدرؔ ۔ ؎

قاصد یہ کہنا یار کے مرے یار کا مزاج		پوچھا ہے اک غریب نے سرکار کا مزاج

سر مشاعرہ خواجہ وزیر کے ایک شاگرد نے اعتراض کیا کہ محبوب کو سرکار کہنا کہاروں کی بولی ہے حضرت قدرؔ نے فرمایا تو بہ کیجئے دیکھئے آپکے اُستاد کیا فرماتے ہیں ۔ وزیرؔ ؎

باغ کو جائیگا ابر سیہ مست اُٹھا		پیش خیمہ تو روانہ ہوا سرکار کا آج

اور میاں معروفؔ دہلوی بھی فرماتے ہیں ؎

اُن دنوں سرکار پر معروف ڈگمائی تو دل		جن دنوں صاحب سنئے پہرتے تو بلبل ہاتھ

معترض نے گردن جھکائی اور اہل مشاعرہ نے قہقہہ لگایا ۔

(۳) قدرؔ ۔ ؎

کالی آنکھیں ہیں غضب ۔ زلفیں بلا خال آفت		ایک سے ایک ہیں کلجگ کے زمانے والے

کالکاپرشاد موجدؔ لکھنوی بولے کہ جگ خود بمعنی زمانہ ہے پھر زمانہ کیسا ۔
حضرت قدرؔ نے فرمایا کہ کال اور جگ ملکر ایک اسم ترکیبی ہو کر الگ معنی ہو گیا اور جب یہ الگ ٹھہرا تو اوسکے ساتھ لفظ زمانہ جائز ہے جسطرح ناسخ مغفور فرماتے ہیں ؎

تین تربینی ہیں دو آنکھیں مری		اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

تربینی یعنی تین بینی ۔ گنگا ۔ جمنا ۔ سرسوتی ہیں پس اوسکے ساتھ لفظ تین لفظ تر پر ایسا ہی ہے جیسے لفظ زمانہ جگ پر ۔ موجدؔ نہایت ہی خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ شاعری وہ کرے جسکو آپ کے مثل مثالیں یاد ہوں ۔

(۴) مثنوی قضاؔ و قدرؔ کی تاریخ حضرت تجرؔ نے یوں کہی ہے ؎

یہ مصرعہ مثنوی قدر سے ہے	مثنوی قدر بر مقدور ہے

ذکی بلگرامی شاگرد میرزا دبیر نے اعتراض کیا کہ مہ قدر کے معنی اگر قدر کا چاند ہے تو قافیہ مکرر ہوتا ہے اگر بجائے ماہ شب قدر ہے تو لفظ شب اسمیں نہیں حضرت قدر نے فرمایا کہ مہ قدر بجائے شب قدر آیا ہے حضرت سعدی فرماتے ہیں ؎

دھل زن گو دو نوبت دہ بشارت	کہ دوشم قدر بود امروز نوروز

(۵) ایک دن عارف علی شاہ خراسانی نے کہا کہ خواجہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ نے اس مطلع میں ایسا پایچ کہا ہے کہ معاذ اللہ ؎

صلاح کار کجا و من خراب کجا	ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

حضرت قدر نے فرمایا کہ ہاں ایک جگہ روی ساکن ہو اور دوسری جگہ متحرک۔ اس عیب کو غلو کہتے ہیں۔ مگر یہاں میرے ذہن میں ایک بات گزرتی ہے کہ جب شاعر کوئی عیب کرکے اُسپر اتمام کردے تو وہ اُس سے بری الذمہ ہوجاتا ہو اور یہ نکتہ کتب فن قافیہ میں مبین ہے۔ حضرت حافظ علیہ الرحمتہ نے اس شعر میں دو مرتبہ عذر فرمایا اور خبر دی اول صلاح کار یعنی صحت کہاں اور میں خراب کہاں دوسرے کجا سے کجا تک راہ میں فرق پڑگیا ہے یعنی روی متحرک ہوگئی ہے۔ عارف خراسانی یہ سُن کر پھڑک اُٹھے اور حضرت قدر نے اس قصے کو ایک قطعے میں خاص دلچسپ پیرائے کے ساتھ نظم فرمایا۔ قطعہ ؎

نوشت مطلع پر نور خواجہ شمس الدین	بدیں فروغ گہر بار داز سحاب کجا
صلاح کار کجا و من خراب کجا	ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
فتاد عقدہ در اندیشہ خوردہ گیران	ز لفظ تا بکجا و دگر خراب کجا
کہ یک روی متحرک دگر روی ساکن	خطاست ہر خطا حکم ارتکاب کجا
غلو اگرچہ بود عیب مر قوافی را	ترا ست پایہ این مایہ احتساب کجا
نخست گفت کہ اے صاحبان دانش و داد	صلاح کار کجا و من خراب کجا
سپس ز نفس خطا تا دہ کرد عذر خطا	ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
اشارہ چست و عبارت بلیغ و عذر لطیف	اگر خطا بود اینجا دگر صواب کجا

مباش منکرِ زغو غنائے مدعی اے قدر
سخن یکے است جواب ترا جواب کجا

قدر مرحوم کثیر التلامذہ تھے منجملہ اُنکے جنکے نام اسوقت معلوم ہوسکے و دیے ہیں

(۱) استاذی منشی محمد محمود صاحب تحمر لکھنوی مدظلہم العالی
(۲) فخر المورخین شیخ غلام حیدر صاحب ارشد بلگرامی
(۳) منشی خلیل احمد صاحب وجد مرحوم بلگرامی۔
(۴) سید نورالحسن صاحب بلگرامی (تخلص صحیح نہیں معلوم)
(۵) منشی شنکر پرشاد صاحب صبح بلگرامی۔
(۶) بابو ہزاری لال صاحب جوان بنارسی۔
(۷) معتبر ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر۔ اودھ پنچ لکھنؤ بھی اُنکے حلقۂ تلمذ میں داخل ہیں۔ واللہ اعلم۔
(۸) نیز بابو گوری پرشاد صاحب تعظیم لکھنوی اور (۹) سید سرور حسین صاحب سرور ہردوئی کے نام کے شاید شاگرد قدر بلگرامی ہمنے کئی گلدستوں لکھا ہوا دیکھا ہے۔

اِنکے علاوہ لکھنو وغیرہ میں کثرت سے شاگرد موجود تھے لیکن افسوس اُن سب کے نام معلوم ہوسکے ایک مقام پر حضرت قدر بلگرامی اپنے چار شاگردوں کا ذکر خود ہی فرماتے ہیں ؎

واہ وا وجد و جواں صل علی ارشد و صبح | انہیں لوگوں سے ہوئی ہے مری شہرت کیسی

اُن مرحوم کا لڑکا اُنکے سامنے مرچکا تھا لیکن اپنی یادگار اپنی تالیف و تصنیف کا ذخیرہ چھوڑا جسکی تفصیل یہ ہے

(۱) دیوان غزلیات و قصائد۔ (۲) مثنوی قضا و قدر (۳) داسوخت (۴) عطر مجموعہ۔ شرح مجموعۂ سخن جسپر سرکار انگلشیہ سے انعام بھی پایا تھا۔ اور وہ چھپ بھی چکا ہے۔ (۵) رسم عرفی شرح قصاید عرفی۔ (۶) نظم الارکان فی تقطیع ابیات گلستان (۷) قواعد العروض مع ہنگل۔ مرحمت بہ مارہرہ یہ بھی مطبع شام اودھ لکھنؤ میں منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ و مالک مطبع شام اودھ کے اہتمام سے چھپی ہے۔ (۸) مصطلحات اردو نا تمام۔ (۹) مثنوی نا تمام ترجمہ نثر کلیلہ و منہ۔

(۱۰) متفرقات۔

یہ مختصر سا حال تھا جو کلیات قدر وغیرہ سے منتخب کرکے لکھ دیا گیا۔ اب ہم ناظرین کو اُنکے کلام فصاحت التیام کا نمونہ دکھانا چاہتے ہیں ملاحظ ہو ؎

سنہ فق ہو سحر بنکر جس سے شب امکاں کا
وہ مہر قیامت سے ہے مطلع مری دیواں کا

جیب تو ترکے بھرتا ہنکا پھر دیتے جنوں جہانکا
چاک اپنے گریباں کا جادہ تھا بیاباں کا

اک طرفہ رقم میں تھا دونوں نے کیا سا جہا
الفت نے ہنسے پہ کہا رحمت نے مجھے آنکا

ولہ

ہوگیا ابرو کی صفا کی سے شہرہ یار کا
کام کر جائے سپاہی نام ہو تلوار کا

مثل عیسیٰ اُن کی خدمت میں رسائی ہو گئی
چڑھ گئے کوٹھے پہ ہم زینا لگا کر دار کا

عید کو میخانے میں ہم رند پہونچے اسطرح
جسطرح پہ ہیں ٹوٹے مردم بیمار کا

قدر کیا اصلاح غالب سے مری شہرت ہوئی
وہ مثل ہے بارہ کاٹے نام ہو تلوار کا

ولہ

عدم سے لائے ہیں مضموں ترے دہانیکا
پتہ لگا یا ہے عنقا کے آشیانیکا

ولہ

منتیں کرکے جو آپ سے حیراں ہوا
اب نہ بولوگے تو لو قدر سے لہان ہوا

ولہ

کہانتک کہوں بیوفا یاد رکہنا
سبق ہوگیا روز کا یاد رکہنا

اوڑا سے لئے پھرتی ہی خاک میری
یہ اٹھکیلیاں اے صبا یاد رکہنا

خدا جانے کسنے سکھایا ہے تمکو
بہت بھول جانا ذرا یاد رکہنا

نہ آگے بڑھینگے قدم تیرے قاصد
یہی ہے وہاں کا پتا یاد رکہنا

رقیبوں کا مذکور رہتا ہے ہر دم
کہاں سے یہ سیکھا نیا یاد رکہنا

یہ کہتے ہوئے پاس آتی ہیں میری
غضب ہے جو تمنے چھوا یاد رکہنا

کہا یاد رکہنا تو بولے بگڑ کر
چلو جاؤ آئے بڑا یاد رکہنا

ولہ

خم سے جام شراب نکلا
کہسار سے آفتاب نکلا

دوڑو دوڑو کلیم دوڑو
وہ بام پہ بے نقاب نکلا

آنکھوں میں کہپا ہتا وہ گل تر
اشکوں کے عوض گلاب نکلا

لاکھوں میں چنا تہا اک وفادار
دلکو وہ بہی خراب نکلا

چہپا تہا جب داغدار دلکو
اک مطلع آفتاب نکلا

آج آپ ملے نصیب جاگے
سچا مرا شب کا خواب نکلا

دل میں ہوا آبلہ نمودار
یا آئینے میں حباب نکلا

غش کہاکے گرا میں شعلہ طور
بارے تیرا حجاب نکلا

رسی تو جلی مگر رہا بل
کاکل سے نہ پیچ و تاب نکلا

ذکر شب وصل میں کب اُٹھے
منہ سے جب آفتاب نکلا

اچہا ہوا آئینہ دیکہ
سے گہر میں تیرا جواب نکلا

ولہ

ہر درد پہ ... نالہ و فریاد کرلینا
ہر صورت کسی پردے میں تجھکو یاد کرلینا

نماز و روزہ و تسبیح و استغفار مشکل ہی
مگر ہاں اک نہ اک صورت سے تجھکو یاد کرلینا

ولہ

دامن اس فقر سے چہڑاتے ہیں
چھوڑو چھوڑو ابہی ہم آتے ہیں

دیکھیے حال شمع و پروانہ
خود بہی جلتے ہیں جو جلاتے ہیں

ان دونوں صاف ہی رہ الفت
وہ بہی آتے ہیں ہم بہی جلتے ہیں

یوسف دلکی جستجو میں آج
قافلے آنسوؤں کے جاتے ہیں

قدر ہمانسرا ہے یہ دنیا
لاکھوں آتے ہیں لاکھوں جاتے ہیں

ولہ

چشم حق بیں ہو تو اللہ کا جلوا بہی ہو
صدق صادق اگر ہے دریکتا بہی ہو

کہیئے نالوں سے اُٹہالوں میں زمانہ سر پر
فائدہ کیا ارے صاحب کوئی سنتا بہی ہو

ہی خودی اتنی تو کوتاہی کوئی ہنوا لو
تم خدا ہو تو کوئی عالم بالا بہی ہو

دیکہہ تو دوڑ کے لے قیس بگولوں پہ نہ جا
کیا عجب ناقہ بہی ہو ناقے پہ لیلا بہی ہو

ذکر مذہب پہ الجہتی ہی طبیعت اپنی
اسکا جب لطف ہے انسان کو سودا بہی ہو

کرتے دہرتے نہ بنی حضرت موسی سے بہی کچھ
قدر کیا جانیں کبہی آنکھ سے دیکھا بہی ہو

ولہ

دلکو تم آسنے دو ہاں آنے دو
خوب زد پر مری جاں آنے دو

کچھ میں سایہ ہوں کہ جڑھ جاؤنگا
زیر دیوار مکاں آنے دو

پھر مجھے روک لیں درباں تو سلام
اتنا کہہ دیجئے ہاں آنے دو

تیغ کھینچے ہوئے فرماتے ہیں
قدر کو آج یہاں آنے دو

ولہ

میں دیکھوں یہ چڑھی ہے کیا کالی کالی
کہ پیچھے پڑی ہے بلا کالی کالی

بہت ایسے کالے ہرن ہمنے دیکھے
دکھلاتے ہیں آنکھیں وہ کیا کالی کالی

شب ماہ میں وہ پھرے بال کھولے
ہوئی چاندنی جابجا کالی کالی

مرے کعبۂ دل کے ڈھنے کا غم ہے
جو اوڑھے ہے کعبہ عبا کالی کالی

میں دیکھوں گا منہ اُن کا دیکر یہ فقرہ
تری شکل ہے مہ لقا کالی کالی

سیہ نامۂ قدر محشر میں نکلا
اُٹھی دھوپ میں اک گھٹا کالی کالی

ولہ

پاس آؤ مضائقہ کیا ہے
یوں تو پھر وہم کی دوا کیا ہے

ہم نے مانا کہ تو نہیں کوئی شے
پھر یہ مشہور جابجا کیا ہے

روز عشاق قتل ہوتے ہیں
کوئی کہتا نہیں خطا کیا ہے

آدمی آدمی پہ مرتا ہے
نہیں معلوم یہ بلا کیا ہے

آرزو ہے کہ پوچھ بیٹھے یار
آرزو تیرے دل میں کیا کیا ہے

لیچلی دل نگاہ دزدیدہ
دوڑا اسے قدر دیکھتا کیا ہے

ولہ

زلف کا دہیان رہا کرتا ہے
جی پریشان رہا کرتا ہے

آئینۂ دل ہے کسی عاشق کا
جب تو حیران رہا کرتا ہے

ایک ارمان بھی دل میں نہ رہے
یہی ارمان رہا کرتا ہے

یاد ہے ہمکو تمہاری صورت
حفظ قرآن رہا کرتا ہے

ولہ

منکر ہوتے ہیں مُنہ پر والے
تل جھک جاتے ہیں نظر والے

ہمنے گھورا تو ہنسکے فرمایا
اچھے آئے بُری نظر والے

مہندی ملکر وہ شوخ کہتا ہے
سینک لیں آنکھیں چشم تر والے

صبر تو یار ہمسے مشکل ہے
اور جو چاہے کام کروا لے

ہے سلامت جو سنگ در او نکا	سیکڑوں جبہے مجھسے در دسر والے
قدر کیا اپنے پاس دل کر سوا	اوڑیں پروا سے پھولیں زرد والے

ولہ

جب آنکھ بند ہو گی دیدار دیکھ لینگے	کب تک چھپو گے ہمسے اے یار دیکھ لینگے
پھولیں سگے رقص اپنا ای سرو باغ خوبی	طاؤس باغ جسدم رفتار دیکھ لینگے
وا خانہ میکدے میں شیخی بگھار آکر	ساقی الگ رہیگا میخوار دیکھ لینگے
مرنے کے بعد کوئی ساتھی نہیں کسیکا	سب لوگ اپنی اپنی کردار دیکھ لینگے
غیروں سے دل لگایا عاشق ڈھونڈھا پایا	اب ہم بہی اور کوئی ای یار دیکھ لینگے

کوچے میں اب بتوں کے ای قدر پہر پہرا کر
ہم قدرت خدا کے اسرار دیکھ لینگے

حضرت قدر کی رباعیاں

لازم ہے بشر بجز نکوئی نکرے	وہ بات کرے کہ شکوہ کوئی نکرے
ہوتا نہیں استخوان زبانمیں ای قدر	نکتہ یہ ہے کہ سخت گوئی کرے

ولہ

اللہ پہ شاکر ہوں خدا اسکا گواہ	دیتا ہے وہی رزق وہی عزت وجاہ
بندہ بندوں سے ہے کیا توقع رکہے	لاحول ولا قوۃ الا باللہ

ولہ

جس روز دم شمار اٹھوں گا میں	کیا قبر سے بیقرار اٹھوں گا میں
جب امتی امتی سنونگا ای قدر	احمد احمد پکار اٹھوں گا میں

ولہ

ہیں موج کی مثل خط کی سطریں بیتاب	چکر میں ہے ہر دائرہ شکل گرداب
ڈوبا ہے سفینۂ حواس خمسہ	القاب نہ یاد ہے نہ مجھکو آداب

فقط

وصل بلگرامی اڈیٹر عالمگیر۔ مہردولی

اخبار رفیع (انبالوی) اسپیشہ مدراس میں وانباڑی مسلمانوں کی کثرت آبادی کے لحاظ سے مشہور ہے اسلئے وہاں سے اس اسلامی اخبار کے نکلنے سے ہمکو خوشی ہوئی خصوصًا اس لحاظ سے کہ مجوزہ عنوانہا مندرجہ سرورق، یہ اخبار خوشامد و تعصب سے حلفًا بری رہیگا حجم ۶ صفحے قیمت چہر سالانہ مع محصول

شعرائے عہد اکبری نمبر (۱)

(۱) غزالی مشہدی

(ہم اس مضمون میں شعراء کے خصوصیات بیان کرتے ہوئے انکا کلام ہی پیش کرینگے جس سے انکی اصل حقیقت کا اندازہ ہوگا)

جب غزالی کے الحاد نے اسدرجہ ترقی کی کہ اہل عراق اسکے قتل پر آمادہ ہوگئے تو اُسے بربنائے آزادی طبیعت عراق کے چھوڑنے میں ذرا بھی تامل نہوا - اور وہ عراق کو چھوڑکر دکن ہوتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا - یہاں اُسکی عمر کا مختصر حصہ خانزمان کی صحبت میں گذرا لیکن بعد خانزمان کے مقتول ہونیکے اسکو اکبر کے درباری ہونیکا فخر حاصل ہوا باوجود کم عمر فوت ہونیکے اُسنے پچاس ہزار اشعار لکھے چنانچہ اسکی تصنیفات سے ایک مثنوی اور دو دیوان یادگار ہیں - اسکا انتقال ۲۷ رجب ۹۸۰ھ کو بمقام احمدآباد ہوا اور وہ شاہی فرمان کے بموجب سرگنج میں جو اسگلے بادشاہوں کا مدفن تھا دفن کیا گیا اسکا یہ مطلع مشہور ہے ۔ ؎

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

اسی ردیف قافیے میں اُسنے رات بھر میں ایک سو ایک اشعار کہے تھے ۔

رباعی

درکعبہ اگر دل سوے غیر ست ترا
طاعت ہمہ فسق و کعبہ دیر ست ترا
در دل بحق ست و ساکن میکدہ
می نوش کہ عاقبت بخیر ست ترا

رباعی

بحریست ضمیر من کہ گوہر دارد
تیغیست زبان من کہ جوہر دارد
صور قلم نفخۂ محشر دارد
مرغے ملکوتم سخنم پر دارد

(۲) قاسم کاہی

یہ کابلی تھے - میاں کالے انکا نام تھا گو اُنکے کلام میں پختگی نہ تھی اور مضامین اکثر پامال باندھا کرتے تھے لیکن اُنکی ہیئت مجموعی بہت اچھی ہوجاتی تھی علم تفسیر ہیئت کلام میں اُنکو اچھی مہارت تھی تصوف میں بھی بہت کچھ دخل تھا علم موسیقی میں بہت سی کتابیں انکی تصنیف سے ہیں - معماو تاریخ گوئی میں بھی فرد تھے - اگرچہ اُنہوں نے ملا جامی کا زمانہ پایا تھا لیکن تمام عمر انکی الحاد میں گذری

این نصیحت بشنو از کاہی | قطعہ | تا ہمہ عمر ترا بس باشد
شعر خوب دلپسر زیبا را | | معتقد باش زہر کس باشد

چوں سایہ ہمرہیم بہ ہر سو رواں شوی | ولہ | باشد کہ رفتہ رفتہ بما ہرباں شوی
ای پیر عشق صحبت یوسف رخی طلب | | نبود عجب کہ ہمچو زلیخا جواں شوی
کاہی تو بلبل چمن آرائے کابلی | | زاغ و زغن نہ کہ ہندوستاں شوی

مرغ تا بر فرق مجنوں پر زدن انگیز کرد | مطلع | آتش سودائے لیلیٰ بر سر او تیز کرد

چوں ز عکس عارضش آئینہ پر گل شود | دیگر | گرد راں آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

انکی تصنیف سے ایک دیوان کے علاوہ ایک مثنوی بھی گل افشاں نام بوستان کی جواب میں ہے

بناز گشت جدا نے بت ستمگر من | ہ | ہنوز بر سر ناز ست ناز پرور من

ریخت باران بلا بر تن غم پرور ما | ولہ | چہ بلاہا کہ نیاورد فلک بر سر ما

نرگس ست عیاں بر سر مزار مرا | | سفید شد بہ رہت چشم انتظار مرا

ایک جوگی کی لڑکی پر اسنے برجستہ یہ مطلع کہا ہے

آتشیں رویت بہ خاکستر چو نیلوفر شدہ | | یا نقاب از آتشیں روئے تو خاکستر شدہ

عبدالعزیز متعلم دار العلوم ندوہ

انتخاب بیاض حسرت

چنداں میش دہند کہ بیہوشی آورد | آصفی | باشد کہ یاد ما بفراموشی آورد
برگفت وگو ست مرحلہ عمر اجل کجاست | | تا رخصت ما بوادی خاموشی آورد
صبرے کہ بر جفائے بتاں کرد آصفی | | اہل زمانہ را بہ وفا کوشی آورد

خیز و بجلوہ آب دہ سرو چمن طراز را عرفی۔ آب و ہوا زیادہ کن باغچہ نیاز را

ہر ایک دل و جاں کو مرغوب نظر آئے | سیرن | میں خوب تمہیں دیکھا تم خوب نظر آئے

کیا جانے اسکے جی پر کیا کچھ خیال گزرا | ولہ | کچھ ابھی آپ اپنے دلبر ملال گزرا
ایسی ہی آہ باتیں اس بیوفا نے چھیڑیں | | روتے ہی روتے ہمیں روز وصال گزرا
کن تلخ کامیوں سے راتیں حسن نے کاٹیں | فقط | پر تو نہ اس کو کہا اک دن شیریں مقال گزرا

بلجیم کے دلفریب نظارے

(۱)

سنہ ۱۹۰۶ء کے اگست کا آخری زمانہ ہے۔ لندن میں اس سال غیر معمولی گرمی ہی اکثر لوگ سمندر کے سواحل پر چلے گئے ہیں اس لئے اس عظیم الشان شہر میں ایک خموشی کا عالم ہے۔ میرا دل بھی جو اس غیر معمولی سکوت سے گبھرا گیا تھا شاہ لیوپولڈ کے خوبصورت دارالسلطنت کے دیکھنے کے لئے بیتاب ہونے لگا۔ اس لئے اس موقعہ کو غنیمت جانکر میں نے بھی عزم سفر کیا اور ہلکا سا سامان پورٹمنٹو میں رکھکر چارنگ کراس کے اسٹیشن پر رات کی ٹرین کے انتظار میں جا پہونچا۔

اس خوبصورت اور عظیم الشان اسٹیشن پر اسوقت براعظم یورپ کی طرف جانیوالوں کا نہایت مجمع تھا۔ مجمع کیا بلکہ ایک بھیڑ بھاڑ تھی۔ اگست کا مہینہ کیا آیا گویا کسی دشمن نے شہر پر چڑھائی کی اور سب لوگ گھر بار چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ جبکہ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب اپنے اپنے چل چلاؤ میں مصروف تھے تو میں اک دور افتادہ ہندوستان جنت نشان کا نام لیوا سات سمندر پار یہاں تن تنہا کیا کرتا۔

غرضکہ چارنگ کراس سے ڈوور تک پہونچنے میں کچھ دیر نہ لگی۔ وہاں ٹرین کے پلیٹ فارم سے نزدیک ہی اک چھوٹا سا آگبوٹ ہمارا منتظر تھا۔ اسمیں داخل ہوئے اور گویا دوسری دنیا میں آگئے۔ کہاں لندن کی اُمس اور اوسکی عظیم الشان عمارتیں اور کہاں یہ نیلگوں سمندر تاروں بھرا اور مہتاب سے جگمگاتا آسمان۔ ایک آسمان اوپر ایک آسمان نیچے۔ اسپر ہوا کی روح افزا موجوں میں کیا کہوں کہ کیا عالم تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام فکریں دماغ سے نکل گئیں اور سب کے دل سرور وانبساط سے لبریز ہوگئے۔ جہاز پر غیر ممالک کے لوگ بکثرت تھے۔ انگریزوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی اور ہر طرف گویا منارہ بابل کی طرح مختلف زبانیں سنائی دیتی تھیں۔ ملاح بھی جو اکثر بلجین تھے کچھ کم

زبانوں سے آشنا تھی۔ اگر ہمسے انگریزی میں گفتگو کرتے تو کپتان سے فرنچ میں باتیں کرتے
اور آپس میں ٹھیٹ فلیمش زبان بولتے تھے۔ میں تھک گیا تھا اور نیند کا اتا بھی تھا۔ آرام کرسی ایک
پر بچھا کر اور اسباب قریب رکھکر دراز ہو گیا اور سوچنے لگا کہ صبح دیکھئے نئی سرزمین کیا کیا عجائبات
دکھاتی ہے۔ اسی خیال میں آنکھ لگ گئی مگر جب کھلی تو بلجیم کے سواحل نظر آنے لگے تھے ایک
بجے رات کا وقت تھا اور آسٹنڈ کے خوبصورت کنارے عمارات کی برقی روشنی سے جگمگا رہے تھے
میرا ارادہ پہلے برسلس جانیکا تھا۔ اسلئے جہاز سے اُتر کر سیدھا ٹرین پر سوار ہو گیا۔
اس ٹرین کی گاڑیاں بہت بڑی بڑی اور بھدی سی معلوم ہوتی تھیں اور آرام کے لحاظ سے بھی انگلستان
کی گاڑیوں سے بہت ادنی درجہ پر تھیں۔ مگر کاریڈار ہر گاڑی میں تھی جو لوگوں کی حفاظت کے لحاظ
سے بہت ضروری معلوم ہوتے تھے۔ تعجب ہے کہ اس ملک میں ابھی تک انکا رواج باقی ہے!
میں سمجھتا ہوں کہ چلتی ہوئی گاڑی میں آدمی کو تھوڑی ہی عرصہ میں ملک کے سرسبزی
اور دیہاتیوں کے نمونہ زندگی دیکھنے کا ایسا اچھا موقع ملتا ہے کہ شاید کسی اور طرح ممکن نہیں صبح
صادق کا وقت تھا اور عجائبات عالم کے مرقعے نظر کے سامنے سے گذرتے جاتے تھے۔ ایک
طرف نیا لباس پہنے ہوئے چھوٹے قد کے فلیمش کسان آہستہ آہستہ گھوڑوں کے ہلوں کو
کھیتوں میں چلا رہے تھے۔ دوسری طرف اُن کی عورتیں اپنے ڈھیلے ڈھالے دیہاتی لباس میں
گھاس اور اناج کے پولے جمع کر رہی تھیں۔ کہیں مویشیوں کے گلے کے گلے چر رہے تھے اور
کہیں کوئی چھوٹا سا قریہ اور اسکے کھپریل کے چھائے ہوئے مکانات تیزی کے ساتھ سامنے
سے گذرتے جاتے تھے۔ اور کسی غریب کا ایک گھر سامنے آجاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ کھڑی
رومال ہلاتی نظر آتی تھیں۔ یہاں کے زراعت پیشہ لوگ فرانس کے مقابلہ میں مجھے زیادہ غریب
نظر آئے۔ سرزمین ایسی کوہستانی اور زرخیز نہیں جیسی کہ جنوبی فرانس کی ہے مگر سرسبزی
اور شادابی کی کسی طرف کمی نہیں تھی اور عسرت اور بردباری کا ذرہ بھی کہ ہندوستان میں پائی جاتی
ہے کہیں نشان بھی نہ تھا۔
ہمارے کمرے میں چند خوشمزاج لیڈیاں تھیں جو بظاہر فرانسیسی معلوم ہوتی تھیں اور
ایک جرمن اور چند فلیمش جنٹلمین تھے۔ فرنچ لیڈی کے چہرے پر سفر کی تکان کے آثار پائے

جاسکتے تھے مگر اُسکے لباس سے اسباب کا گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ اس نے کوئی لمبا سفر بھی کپڑے پہنے پہنے کیا ہے معلوم ہوتا تھا کہ گویا ابھی بدلکر آئی ہے۔ سفر میں ان فرانسیسی لیڈیوں کی سلیقہ شعاری مشہور ہے۔ بخلاف انگلستان کی عورتوں کے کہ رات گذرنے کے بعد اُن کی ایک عجیب ہیئت کذائی نظر آتی ہے۔

ہمارے ہمسفر اجنبی وغیر اجنبی سب بلا تکلف ایک دوسرے سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ جرمن نے جو خوب موٹا تازہ آدمی تھا انگریزی میں مجھسے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ اسکو تجارت کی وجہ سے ہندوستان سے دلچسپی تھی۔ مجکو ایک آلے کا طول طویل نقشہ دکھانے لگا جو اونی عمارات کے کروں کے ناپنے کے لئے ایجاد کیا تھا۔ اسکے متعلق جو کچھ اُسے معلوم تھا حتی القدور سب کچھ مجھ سے بیان کر دیا ایسے ہی مزے مزے کی باتیں کرتے کرتے یکایک اوسکی آنکھیں بند ہو گئیں اور فوراً ہمارا موٹا دوست خراٹے لینے لگا۔ دوسرے لوگوں میں اکثر ایسے تھے جو چند روز کے لئے (La mer) لا میر (یعنی سمندر) کی سیر کرنے آئے تھے اور اب بادل ناخواستہ اپنے اپنے کام پر واپس جا رہے تھے۔

پانچ بجے کے قریب گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھیری۔ یہاں چار والے بسکٹ والے اور اخبار بیچنے والوں کی آوازیں کانوں میں آئیں۔ گارڈ نے آکر ٹکٹ لئے اور آدہ گھنٹے بعد ہماری ٹرین آہستہ آہستہ بلجیم کی دار السلطنت میں داخل ہوئی۔ برسلس۔ برسلس۔ برسلس کے آوازیں سنائی دینے لگیں اور ہر طرف قلیوں کی دوڑ دہوپ اور اسباب کی کھینچا کھینچ شروع ہو گئی۔ اسٹیشن کچھ زیادہ بڑا نہ تھا اور اندر سے بھی کچھ خوبصورت نہ تھا۔ ریل سے اُتر کر میں نے ایک ہوٹل کا رُخ کیا جو اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ اور سفر کی ماندگی کی وجہ سے جاتے ہی سو گیا

"ماثی"

غربت و وطن

رشید لکھنے کی میز پر داہنا ہاتھ اور ہاتھ پر سر رکھے ہوئے خیال میں غرق بیٹھا ہے۔ لیمپ کی روشنی اُسکے آدھے چہرے پر پڑ رہی ہے، اور بتا رہی ہے کہ گو شہر میں ــ اُس شہر میں جہاں رشید، غربت کے دن، اُنس و اضطراب کی کچھ عجیب آمیزش کے ساتھ کاٹ رہا ہے ــ گو اس شہر میں اسوقت خاموشی چھائی ہوئی ہے، لیکن اُسکے دل میں خیالات کا طوفان موجزن ہے۔

چاروں طرف سناٹا ہے، اور تاریکی، صرف کمرے میں گھڑی کھٹ.. کھٹ.. کھٹ.. کر رہی ہے، گھڑی کا کٹا ہوا نکتا ہے، قریب کے کمرے میں نوکر، دن کا کام ختم کرکے گہری نیند (عیاں تو سامیانہ کا الغام) سو رہا ہے، اور اسکی خرخراسٹ کی آواز یہاں تک آرہی ہے۔ رشید اپنے خیالات سے عاجز آکر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور بہت مضطرب حالت میں، کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے، اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگتا ہے۔

غربت اچھی کہ نئی دنیا، نیا آسمان، نئے مناظر پیش نظر ہوتے ہیں۔ نہیں، وطن اچھا، کہ پرانے دوست پرانے رفیق، جانی پہچانی آوازیں جانی پہچانی صورتیں سنائی دیتی ہیں، دکھائی دیتی ہیں۔

نہیں غربت اچھی جسمیں ہر تجربہ نیا، ہر بات نئی۔ جو دو آدمی ملتے ہیں، گویا دو دریا ہیں، کہ پہلے جدا جدا بہ رہے تھے، اب سنگم ہوا۔

نہیں، وطن اچھا، جہاں پرانے دوست گویا دو پودے ہیں کہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اُگے اور بڑھے۔

نہیں، غربت اچھی جہاں دوست نا دشمن اور آشنا صورت، غیار تو نہیں ہوتے جنکی مدارات کرنی پڑے ــ جہاں غیر پہچان کہہ سکے ماننا ہو کہ میں غیر ہوں، اور دوست، آہ! دوست نہیں، تو شناسا سبکے جدا ہوتا ہے۔

"نہیں، وطن اچھا، جہاں وہ آدمی نہیں ملتے جنسے دلمیں نہ حسِ محبت پیدا ہو، نہ یاد ایام گذشتہ۔

نہیں، نہیں، بے یار، نہ غربت اچھی، نہ وطن اچھا، اور با یار —— یہ اُن خوش نصیبوں سے پوچھئے جو یار رکھتے ہیں۔"

رشید، ایک آرام کرسی میں گر پڑتا ہے؛ اور پھر خاموش خیالات میں محو ہو جاتا ہے؛ پھر تھوڑی دیر کے بعد کاغذ کے ٹکڑے پر پنسل سے کچھ لکھتا جاتا ہے۔

یہ ایک زائیدۂ اضطراب، غزل تھی، جسے وہ تسکین خاطر کے لئے کونے میں رکھے ہوئے ہارمونیم پر جاکر بجاتا ہے۔

غزل

بنے ہیں ہونٹ مرے نالہ و فغاں کے لئے
ہے سینہ وقف مرا سوزِ شرر فشاں کے لئے

کوئی زمانہ کا شاکی، کوئی فلک کا ہے
ہمارے سارے گلے اپنے مہرباں کے لئے

ہلاک کرکے رہیگا مجھے تغافل دوست
ہے اک نگاہ کا اغماز نیم جاں کے لئے

ہو ڈھونڈہ ڈھونڈہ کے سب مجھ پہ مشق ای احباب
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ہوئے جو طعنۂ اعدا کبھی ذرا کو بند
زباں سے کام اعزا نے خودستاں کو لئے

کڑک، چمک تو نہ اے برق! اتنی بھی لازم
شرارہ ایک تھا کافی، اس آشیاں کے لئے

مرا جو حصہ ہے، وہ مجھکو اے مصیبت دے
ہوا کرے ہے اگر عیش کل جہاں کے لئے

چمن میں بلبل مجبور کی نہیں کچھ یاد
تڑپ رہی ہے قفس میں وہ بوستاں کے لئے

بھلا دے یاد وطن جب میں جانوں اے غربت
وطن کا عشق ہے اک روگ میری جاں کے لئے

مقابل کے مکان کی کھڑکی کھلتی ہے، اور رشید کا پڑوسی، اس شہر کی زبان میں پوچھتا ہے:

"مسٹر رشید! شاید آج آپ کے وطن سے کوئی بڑی خوشخبری آئی ہے۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا ہے، لیکن میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں؛ (اور ذرا معترضانہ تبسم سے) مگر آدھی رات کو تو خوشی نہ منانی چاہیئے۔"

(یلدرم) از بغداد

مکتوباتِ امیر مینائی

(مرتبہ ثاقب)

قاضی محمد خلیل صاحب حیران تخلص رئیس بریلی کے نام

مخدومی مکرمی قاضی محمد خلیل صاحب سلمہ اللہ الجلیل۔ سلام شوق۔ کارڈ آیا ممنون
بازیاد آوری کیا۔ آنچل اور دامن کے جھگڑے میں میری یہ رائے ہے کہ دوپٹے اور اوڑھنی
وغیرہ اوڑھنے کی چیزوں میں آنچل کہنا چاہیے اور قبا عبا وغیرہ پہننے کی چیزوں میں دامن
کہنا چاہیے مگر شعر مبحوث عنہ کی تصحیح یوں ہوسکتی ہے کہ شعرائے گوشہ دامن کو بھی آنچل کہا
ہے چنانچہ اسکو میں نے امیر اللغات میں کسیقدر تفصیل سے لکھا ہے اور یہ دو شعر سند کے بھی
آنچل کے ذیل میں درج کئے ہیں۔ میرے آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں + میر دریا کا سا
اسکا پھیر ہے۔ نسیم ۔ دہان دانتوں کا جو آیا تو یہ سوجھی تشبیہ + صبح نے منہ پہ لیا دامن
شب کا آنچل + ساعت اور گھڑی ساعت کے قافیے میں احتیاط تو مقتضی اسکی ہے کہ شاعر
بلاضرورت شدید وہم التباس سے بھی بچے مگر جواز ثابت کرنیکے لئے بہت سے اشعار شعرائے فارسی
و اردو کے ملینگے جن میں انھوں نے . . . . . . جائز کرلیا ہے۔ قاضی صاحب کی خدمت
میں میری طرف سے تسلیم۔ امیر احمد عفی عنہ۔

مولانا حبیب الرحمن خان صاحب حسرت شروانی رئیس بھیکن پور کے نام

دلنواز ا۔ روحی فداک۔ محبت نامہ آیا ممنون و مسرور کیا۔ الفاظ انگریزی کی نسبت
یہی رائے میری بھی ہے۔ اور یہی مشرب میرے موجودہ شیرونکا ہے۔ کمیٹی میں بھی یہی امر
طے ہوا ہے۔ یہ بہت خوش ہوا کہ آپ بھی ہمراہی نکلے۔ رسالہ ست فہم آپ کی ہر بات سے
پیدا ہے اللہ عمر دراز کرے اور اقبال بڑھائے۔ چند اشتہار بھیجتا ہوں اگر آپکے التفات سے
اس نواح میں بہت سے خریدار پیدا ہوں تو احسان ہے۔ فہرست کتب دیکھی یہ سب کتابیں
اس دفتر میں موجود ہیں اور ان سب سے زیادہ میرا ذخیرہ دینی سالہا سال کہ وقتاً فوقتاً جمع ہوتا گیا ہے

آپ کی لیاقتوں سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے - اب تو رمضان المبارک آئے - زندگی باقی ہے تو عید میں دیکھا جائیگا - سفر کی فرصت مطلق نہیں ملتی - اور آپکا سفر کرنا معلوم نہیں آسان ہے یا مشکل - دیکھا چاہئے - حسرت ملاقات کیونکر برآتی ہے - امیر نقیر - ۱۳ر اپریل ۱۸۹۹ء - غزل کو خیال سے خط بیرنگ بھیجتا ہوں - رسید ضرور ملے -

بنام صاحب موصوف

روحی فداک - سلام و دعا - عین انتظار میں محبت نامہ آیا -

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی - ضیق فرصت سے جان چرا کر غزلیں دیکھیں لیکن سب شعر اچھے ہیں - ایک آدہ جگہ دخل دیا - باقی ضرورت اصلاح کی نہ تھی - میں بھی آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں - دیکھا چاہئے کب آرزو برآتی ہے - آپ اپنے مفصل کیفیات و مشاغل سے تو آگاہ کیجئے کہ سفر اور سفر میں چندے اقامت ممکن ہے یا غیر ممکن اور دشوار ہے یا آسان - امیر احمد بقلم محمد احمد - ۱۲ر جون ۱۸۹۹ء -

بنام نعیم الحق صاحب آزاد شیخپوری

محبی - غزلیں آئیں - بیماری اور بیماروں کی پرستاری کی حالت میں دیکھیں - ماشاء اللہ طبیعت آپ کی اچھی ہے - خدا عمر میں برکت دے - رشک مرحوم نے کس کتاب میں تانیث و تذکیر حروف تہجی کا ذکر کیا ہے اُس کتاب کا نام و نشان ضرور لکھئے اور اگر آپکے پاس ہو تو چندروز کو مستعار مجھے دیجئے - میرے نزدیک میم ضرور مذکر ہے اور میں نے مذکر ہی کہا ہے - سن بمعنی سال کہیں نہیں نکلتا فارسی میں بہت تلاش کیا کوئی سند قابل اعتبار نملی - ان معنی میں سنہ ہے - اردو میں بغیر ترکیب اگر سن یعنی سال کوئی کہے تو تاویل ہوسکتی ہے - محققین اسکی جگہ سال کہتے ہیں - مردم دیدہ مذکر ہے - ولایتی کاغذ پر امیر اللغات کے حصہ اول کی قیمت سات روپیہ اور دیسی کاغذ پر چھ روپے ہیں - امید کہ غزلوں اور خط کی رسید سے مطلع کیجئے - داغ کی کیفیت کامیابی دکن مجھے بخوبی معلوم ہے اُنکے خطوط اکثر آتے رہتے

ہیں۔ امیر فقیر ۴ ار نومبر سنہ ۹۱ء۔

بنام ثاقب کے نام

مخدوم گرامی مناقب مکرمی حضرت ثاقب۔ سلام و نیاز کے بعد التماس ہے کہ مدت کے بعد اسوقت بھی ہوئی آگ بھڑکی یعنی آپنے یاد فرماکر پھر ولولۂ شوق و ذوق بڑھایا۔ میرے تغافل کی شکایت گو بجا ہو مگر میں اسی شکایت کا شکر گذار ہوں ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

مثنوی نشتر تیز کی تاریخ کہنے کی فرصت اور لیاقت مجھکو کہاں مگر تعمیلاً لحکم سر دست جو خاطر فاتر میں آیا ہے وہ قطعہ دو بیتی ذیل میں لکھتا ہوں ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

مرآۃ الغیب کے سو نسخے بقیمت مجھکو بھی لینے پڑے ہیں اطلاعاً عرض پرداز ہوا۔ تحریر مطبع واپس پہنچتی ہے۔ امید ہے کہ ہمیشہ یاد فرماتے رہیے تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں اور کس شغل میں ہیں۔ میں اپنی اسقام جسمانی اور آلام روحانی کا حال اگر لکھوں تو نامہ ایک دفتر ہو جائے دوست کا دل دردمند ہو کیا حاصل اپنے والد صاحب کی جناب میں بشرط گنجایش و التفات نیازمند کی طرف سے تسلیم کہدیجئے۔ امیر فقیر۔

۷ ر محرم سنہ ۱۳۱۰ ہجری۔

البیت یعنی اول درجے کے آبوری فنشن کاغذ اور ۲۰×۲۶ کی تقطیع پر ۰۰ صفحوں کا ایک نہایت خوشخط اور پاکیزہ چھپا ہوا مفید رسالہ جسمیں حضرت اسلم جیراجپوری اسسٹنٹ اڈیٹر رسالہ خاتون علی گڈہ نے سلیس عبارت میں قابل داد کوشش و کاوش کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ازواج مطہرات اور صاحبزادیوں کے صحیح اور معتبر تاریخی حالات عربی کی مستند کتابوں سے اخذ کرکے لکھے ہیں۔ لڑکیوں اور عورتوں کو یہ رسالہ خصوصیت کے ساتھ سودمند ثابت ہوگا۔ قیمت فی جلد ۱۰ ر پیہ اور ہو تقسیم دستیاب ہو سکتا ہے۔ دو ایک موقعوں پر مولف نے بعض مختلف فیہ مسائل مثلاً مردوں کو ایصال ثواب اور زیارت قبور پر اسے اخذ فیض کے خلاف ذاتی رائے ظاہر کی ہے۔ ہماری خیال میں یہ طرز عمل مناسب نہ تہا۔ خصوصاً اس کتاب میں۔

تنقید

(محمڈن ڈیپوٹیشن)

مسلمانوں کے اس وقیع ڈیپوٹیشن کا اڈریس بجز اُن چند کمزوریوں کے جنکا ذکر آئندہ ہوگا، کیا بلحاظ کم آزاری دیگر اقوام اور کیا بلحاظ معقولیتِ مطالب و اداے مطالب ایسا ہے جسکو مسلمانوں کا ابتدائی پولیٹکل کارنامہ ہونے کی حیثیت سے ہم بلا تامل قابل اطمینان کہہ سکتے ہیں۔ اس اڈریس میں مسلمانوں نے اپنی مندرجہ ذیل درخواستوں کو بتاریخ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء عمدگی کیساتھ وائسرای کی خدمت میں پیش کیا کہ:۔

(۱) مینوسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لیکر۔ سنٹ۔ سنڈیکیٹ۔ صوبے کی کونسلوں اور وائسرای کی کونسل تک غرضکہ ان تمام موقعوں پر جہاں نیابت کا طریقہ رائج ہو سکتا ہو، مسلمان ممبروں کی تعداد معین کر دیجائے اور انگریز کی کونسل وائسرای میں بھی ایک مسلمان ممبر مقرر ہو (۲) یہ تعداد صرف اُن کی نسبت آبادی کے لحاظ سے نہو بلکہ اُن کی قومی اہمیت کا بھی خاطر خواہ خیال کر لیا جاوے۔ (۳) طریق نامزدگی کے بجائے طریق انتخاب اختیار کیا جائے۔ (۴) اور مسلمانوں کے انتخاب کا اختیار صرف مسلمانوں تک محدود ہو دوسری قوموں کو اسمیں دخل نہو۔ (۵) اعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر ہوا کرے۔ (۶) ہر ہائی کورٹ میں ایک مسلمان جج واقف شرع محمدی کا ہونا ضروری سمجھا جائے۔ اور (۷) محمڈن یونیورسٹی کی تجویز کی گورنمنٹ تائید کرے۔

البتہ لارڈ منٹو نے اس اڈریس کا جو جواب دیا ہے وہ ہمارے خیال میں مسلمانوں کی جانب سے کسی غیر معمولی شکریے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ جہانتک ہم نے غور کیا ہمکو یہی معلوم ہوا کہ لارڈ صاحب نے صرف اُن باتوں کا جواب دیا ہے جو اُنکے خیال میں انگریزوں کے مفید مطلب ہیں اور اڈریس کے بقیہ حصے کو اسطرح نظر انداز کر دیا ہے کہ گویا اُنہوں نے کچھ سُنا ہی نہیں۔

اڈریس کے شروع میں گورنمنٹ کی کسیقدر بجا لیکن زیادہ تر بیجا ستائش کی گئی تھی (جو آجکل کے اڈریسوں کا عموماً اور حد سے زیادہ وفادار مسلمانوں کی عرضداشتوں کا خصوصاً اسیطور پر ایک بیمعنی و بیمحل لیکن ضروری حصہ قرار پا گیا ہے، جیسے کہ موسم خزاں میں اکثر مقلد شعرا کے قصائد میں بہاریہ تشبیب ہوا کرتی ہے) لارڈ منٹو نے مسلمانوں کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اپنے جواب کا بڑا حصہ انہی غیر مفید مطلب الفاظ تعریف کے دُہرانے میں صرف کر دیا ہے۔ حالانکہ بنگاہ غور سے دیکھئے

تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ اڈریس کا یہ تعریفی حصہ محض برائے بیت تھا مثلاً اڈریس کے یہ فقرے کہ:-

(۱) "انگریزی حکومت کے طرز عمل کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ...... ان معاملات میں جنکا اثر اُنکی فلاح پر پڑتا ہو اس ملک کے لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کا لحاظ کیا جاتا ہے" (۲) "رفتہ رفتہ مسلمہ پولیٹکل یا تجارتی انجمنوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اہم معاملات پر اپنی رائے اور خیالات سے حکام کو مطلع کریں"

ہماری خیال میں ہیچ پوچ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ انگلو انڈین حضرات کے نزدیک اس ملک کے لوگوں سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جن کی رائے ان سے متفق ہو یا جنکی کوئی رائے ہی نہو۔ اور مسلمہ پولیٹکل اور تجارتی انجمنیں صرف وہ انجمنیں ہیں جنکے ممبر یا تو سب یوروپین ہوں یا اُن کی ہاں میں ہاں ملانیوالے۔ مثلاً کلکتے کی چیمبر آف کامرس مسلمہ انجمن ہے۔ اور اسکے یوروپین ممبر ہر طرح سے وایسرائے کی مہمانی کے قابل ہیں لیکن نیشنل کانگرس کا مسلمہ جلسہ ہونا تو درکنار اسکی تجویزیں اس قابل ہی نہیں ہیں کہ لارڈ کرزن بہادر کے سے وائسرائے اُنکو صرف سن ہی لیں اگرچہ اِس کان سُنکر اُس کان اُڑا دیں۔

ہمکو محمدن ڈیپوٹیشن کے ریپریزنٹیٹو ہونے سے ہرگز انکار نہیں ہے لیکن اتنا تعجب ضرور ہے کہ جو انگلو انڈین اخبار اور حضرات اسکے ریپریزنٹیٹو ہونیکا بزور و شور اظہار کر رہے ہیں وہی نیشنل کانگرس کو ہمیشہ ناقابل تسلیم جلسہ قرار دینے میں اس بنا پر بیباک رہے ہیں کہ وہ صرف چند تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا مجمع ہے حالانکہ یہی اعتراض محمدن ڈیپوٹیشن پر بھی عائد ہوتا ہے اور کانگرس سے بڑھکر عائد ہوتا ہے۔ کیونکہ کانگرس اکیس برس سے قائم ہے اور ڈیپوٹیشن کو صرف ایک مہینے کی مہلت ملی۔

اس بیان سے ہمارا مقصد ڈیپوٹیشن پر اعتراض کرنا نہیں ہے کیونکہ ہمارے نزدیک کم از کم ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کی رائے عام اس سے وہ ہندو ہوں یا مسلمان ہمیشہ عوام الناس کی رائے کے موافق ہوتی ہے اسلئے کہ وہ ہمیشہ انکے مفید مطلب ہوتی ہے۔ ہمکو یہاں پر صرف یہ دکھانا ہے کہ کسی جلسہ یا ڈیپوٹیشن کا تسلیم کرنا یا نہ کرنا محض برٹش حکومت کی پالیسی پر منحصر ہے۔ جو انکے مفید مطلب کے وہ مسلم و محمود ہے ورنہ بیقاعدہ و مردود۔

مثلاً اڈریس زیر بحث ہی کو ملاحظہ فرمائیے کہ باوجود ادعاے ہمدردی مسلمانان لارڈ منٹو نے

مدن یونیورسٹی، اعلیٰ عہدہ داروں اور مسلمان ججوں کے مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں کی کیونکہ وہ
انگریزوں کے مفید مطلب نہ تھی کیا معنی کہ اعلیٰ تعلیم شاید گورنمنٹ کے مقاصد کے خلاف ہے اور اعلیٰ
عہدے زیادہ تر یورپین لوگوں کے قبضے میں ہے۔ رہا کونسل کے غیر سرکاری ممبروں کا قضیہ ایں
چونکہ یورپین ممبروں کا تعلق ہی نہ تھا اسلئے مسلمانوں سے ہمدردی ظاہر کی گئی ہے اور قرینہ سے معلوم
ہوتا ہے کہ اُن کی تعداد معین کر دیجائیگی اور کیا عجب ہے کہ حسب خواہش ڈیپوٹیشن انکی نسبت آبادی کے
لحاظ سے زیادہ بھی مقرر کر دیجائے۔ لیکن یہ درخواست کہ انتخاب مسلمانان کا اختیار صرف مسلمانوں کو حاصل
ہے قابل منظوری نہیں ہے اور بہتر ہے کہ منظور نہ کی جائے کیونکہ ہمارے نزدیک اہل ہند کی فلاح کا
دار و مدار تمام اقوام ہند کے اتحاد پر منحصر ہے۔ اور جب مذہبی اور معاشرتی اتحاد نا ممکن معلوم ہوتا ہے
تو اتحاد باہمی کی ایک بقیہ صورت یعنی پولیٹیکل اتحاد کی راہ میں بھی روڑے اٹکانا قطعی ہمدردی کے
بالکل منافی ہے۔ اس تجویز کے منظور ہونیکا نتیجہ سوا اسکے اور کچھ نہ ہوگا کہ پولیٹیکل حیثیت سے ہندوستانیوں
کی ایک متحدہ قومیت کی دلفریب امید ہمیشہ کے لئے مٹ جائیگی۔ اور اکثر ایسے متعصب لوگ منتخب
ہوا کرینگے جنکے باہمی اختلافات سے خوف ہے کہ ملک کو بجائے فائدے کے نقصان پہونچے۔
چنانچہ ہمارا خیال تو یہ ہے، خدا کرے کہ یہ خیال غلط ہو، کہ گورنمنٹ نے مسلمانوں کے ساتھ جو ہمدردی
ظاہر کی ہے اسمیں بھی ہمارے بیان کردہ قاعدہ کلیہ کے مطابق انکی یہ غرض پنہاں ہے کہ مسلمان
ممبروں کے بڑھنے سے مسٹر مارلے کی توسیع کونسل کی تجویز سے انگلو انڈین ممبروں کے خلاف
ہندوستانی ممبروں کی زیادتی کا جو خوف پیدا ہوگیا ہے وہ بہت کچھ زائل ہو جائیگا اسلئے کہ عام
طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ مسلمان ممبر زیادہ تر گورنمنٹ کی تائید ہی پر رہا کرتے ہیں۔

یہاں پر ہم اس امر کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر گورنمنٹ نے مسلمانوں سے مسٹر مارلے کی
تجویز کو بے اثر کر دینے کے خیال سے ہمدردی ظاہر کی ہے تو شاید اُسکو اپنی خواہشوں میں کامیابی
ہوگی کیونکہ تعلیم یافتہ و منتخب شدہ مسلمان ممبروں سے یہ امید رکھنا کہ وہ نواب عماد الملک بلگرامی کی
طرح مسلمانوں کے مقاصد کے خلاف اعلیٰ تعلیم کے اخراجات بڑھا دینے کی سی تجویزوں پر بھی بلا چون
وچرا دستخط کر دیا کرینگے سراسر عبث ہے۔

خیر کسی صورت سے ہو اور کسی خیال سے ہو اس ڈیپوٹیشن سے مسلمانوں کو کم سے کم کچھ نہ کچھ فائدہ پہونچ

کی بیشک امید ہے ۔ اور حق یہ ہے کہ بہت کچھ نفع پہونچ بھی چکا ہے یعنی اسطور پر کہ اس واقعہ
ڈپوٹیشن سے انمیں پولیٹکل تحریک کے نشو ونما کی بہت کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جسکی اگر باقاعدہ
نگہداشت کی گئی تو کیا عجب ہے کہ وہ آیندہ مسلمانوں کے علاوہ تمام ملک کے لئے بھی مفید ثابت ہو کیونکہ
میدان پالٹیکس میں در آنے کے بعد ہمکو مسلمانوں کی موجودہ محدود نگاہی، تنگ حوصلگی و مصلحت
کوشی وغیرہ عیوب کے رفع ہو جانے اور دیگر اقوام ملک سے ملکر کام کرنے کی بہت کچھ امید ہی
اللہ تعالی اس آرزو کو پورا کرے فقط

حصہ نظم

غزل علامہ شبلی نعمانی

دوش کان دلدار با من ہم وفاق افتادہ بود	غلغلے در گنبد فیروزہ طاق افتادہ بود
حالیا من ہم چو زاہد پارسائی پیشہ ام	بادہ خوردن در شبابم اتفاق افتادہ بود
گوئیا دشمن ہم از ذوق نصیبے بردہ است	بادہ وصلش چشیدم از مذاق افتادہ بود
زاہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی	ورنہ عمرے ہر دو را باہم نفاق افتادہ بود
گرچہ من مرد ہوسبازی و رندی نیستم	گاہ گاہم این چنیں ہم اتفاق افتادہ بود
زاہدا ار دم ز آدمیت می زند بس خیرگیست	کو ہم از روز ازل نا اہل و عاق افتادہ بود
بودہ ام در بزم می با محتسب ہم ہمنشیں	گرچہ ایں صحبت مرا بسیار شاق افتادہ بود

از دلِ صد پارہ ات آگہ نیم شبلی و لے
شیشۂ دیدم کہ از بالائے طاق افتادہ بود

صفی جناب مولوی سید علی نقی صاحب لکھنوی

بن پڑی جسپر نہ فتنہ جو تیری	جہاں چلتی ہیں خوبرو تیسری
... میں جان سکے برابر تھی	ایک اک بوند اسے لہو تیری
سنتے ہیں طور جلکے خاک ہوا	حد کی تھی گرم گفتگو تیری

خار وگل کا جدا جدا ہے رنگ
اہیں خو ہے تو اوہیں بو تیری

کوئی خنجر بکف سہے غیر نہیں
بخدا اسے رگ گلو تیری

دل میں یہ کون شے کھٹکتی ہے
پھانس کوئی کہ آرزو تیری

کلک قدرت نے نقش دل کھینچا
رکھ کے تصویر روبرو تیری

ارے او تھک کے بیٹھنے والے
کیا ہوئی اب وہ جستجو تیری

سیج موتی سے کم نہیں ہے صفی
یہ خدا داد آبرو تیری

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب متوطن کلکتہ

نوا ئے بلبلاں ہے یا ہوئی ہی لالہ کار آتش
گل آتش غنچہ آتش گلستاں آتش بہار آتش

اگر دریائے اشک آنکھوں سے بہتے بہتے رک جائے
لگا دے پیکر عشاق میں روئے نگار آتش

ستم کرنا کسی پر باعث اندوہ خاطر ہے
سپند مضطرب کے درد سے ہی بیقرار آتش

ہمارے آبلوں کا خلق پر احساں رہ جاتا
بیاباں میں اگر ہوتی بجائے نوک خار آتش

نہ پہونچائے طراوت قطرۂ شبنم اگر گل کو
گلستاں میں لگا دے تابش رخسار یار آتش

وہ شوخ سنگدل اظہار یاری مجھ سے کرتا ہی
ہوئی پروانۂ آتش بجان کی غمگسار آتش

نہیں بیجا ہے وحشت شکوہ آپکی بدماغی کا
کہ ہوں عاشق بہت پیدا ہو گر خوئے یار آتش

ولہ رباعی

بے سمجھے نہ جام غم پیا تہا میں نے
یہ کام تو جان کر کیا تہا میں نے

انجام پہ بہی نظر جو رو یا تہا بہت
جس روز کہ تجھکو دل دیا تہا میں نے

غزل حضرت ضامن کنتوری

تیرے زخمی کچھ تڑپتے کچھ سسکتے ہیں کہیں
پھول کہلتے ہیں کہیں غنچے چٹکتے ہیں کہیں

فرش تہا نور نظر کنعاں سی تا زندان مصر
کور دل محبوب کی یوں راہ تکتے ہیں کہیں

عاشقوں کے دل بنے ہیں غم کی خاطر ای فلک
لاکھ بھر جائیں یہ پیمانے چھلکتے ہیں کہیں

ساقیا واعظ کے دن کرنیکی باتیں تھیں یہ سب
ظرف والے اتنی سی پیکر بہکتے ہیں کہیں

ایک مدت سے نہیں معلوم ہمکو دل کا حال
ہاں مگر کچھ خار حسرت سے کھٹکتے ہیں کہیں

مرد میدان تھے ہمیں تو عشق کی زد پر گئے
معرکے سے یہ قدم پیچھے سرکتے ہیں کہیں

دل اُبلا جاتا ہے سینے میں ذرا کھو تو ہاتھ
دیکھو یوں مجمر میں انگارے دہکتے ہیں کہیں

شوق ناقص تھا نہ لائے جب تو موسیٰ تاب دید
ناظرہ پڑھنے میں حافظ بھی اٹکتے ہیں کہیں

تجھیں اُنہیں ضامن النساں اور جوانکا ہی ذوق
کہنے کی باتیں بلبل یوں چہکتے ہیں کہیں

غزل از مولوی محمد احسن اللہ خانصاحب ثاقب مدیر قندپارسی

حالِ تباہ ہے دل مضطر نہ پوچھیے
بہتر یہی ہے آپ مکرر نہ پوچھیے

اُس مہر وش کے عہد وفا پر نجایئے
بیمہری و جفائے ستمگر نہ پوچھیے

مہر و وفا کا ذکر یہاں کچھ نہ چھیڑیئے
قصہ یہ آپ بر سر محشر نہ پوچھیے

دل دیدیجیئے کسیکو کہیں زہر کھایئے
انداز و ناز و عشوۂ دلبر نہ پوچھیے

ہی خارزار عشق یہاں خواب ہے حرام
اس رہگزر میں بالش و بستر نہ پوچھیے

جس بزم کے چراغ ہیں یہ انکو دیکھیئے
حیرت طرازئی مہ و اختر نہ پوچھیے

جاتے ہیں لکھنؤ دل پہ آرزو لئے
شوق لقائے حضرت مختر نہ پوچھیے

جو دل غریب ہو اُسے کیونکر نہ ڈھونڈیئے
جو جاں شکیب ہو اسے کیونکر نہ پوچھیے

ہنگام ذبح ثاقب آشفتہ حال سے
ذوق روانئی دم خنجر نہ پوچھیے

ولہ رباعی

دل طالب ذوق ہمزبانی کب تک
کانوں میں صدائے لن ترانی کب تک

اب وقت ہے اور آنکھ کھولو ثاقب
ایام وصال کی کہانی کب تک

غزل جناب حکیم محمد عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی شاگرد امیر مرحوم لکھنوی

عیش و آرام مجھے گردش دوراں میں نہیں
آرزو اسکی ہے جو عالم امکاں میں نہیں

ٹوٹنے پر مجھے توبہ کے عجب ہے ساقی
تیری وعدہ نہیں نہیں کچھ تیری پیماں میں نہیں

جوشِ سودا میں بنا لیتے گلے کی پھانسی
ہاتھ ملتے ہیں کوئی تار گریباں میں نہیں

پیہم آتی ہے مرے زخمِ جگر سے آواز
جو مزہ درد میں ہے وہ کبھی درماں میں نہیں

کچھ بھی عبرت کے لئے حالِ عدم کا کہدے
ہائے آنا بھی کوئی شہرِ خموشاں میں نہیں

اسکو امید وفا مجھکو تمنائے جفا
آرزو غیر کی شامل مرے ارماں میں نہیں

وصل میں ہاں جو نکلتی ہے کبھی بوسے سے
مسکراتی ہے تمہاری لبِ خنداں میں نہیں

پاؤں پھیلائے ہوئے چین سے سب سوتے ہیں
ایک کو ایک کا غم شہرِ خموشاں میں نہیں

شمعِ تربت کے سوا اشک بہانے والا
بیکسی دیکھ کوئی گورِ غریباں میں نہیں

کیوں گلا شام سے گھٹتا ہے ہمارا کوثر
غیر کے ہاتھ اگر گردنِ جاناں میں نہیں

غزل جناب محشر لکھنوی

رخصت اے صبر اُس ستمگر کو عتاب آ ہی گیا
مژدہ باد اے نالہ وقتِ اضطراب آ ہی گیا

دیکھے دلکو یوں ہوئی خواہاں وہ جانِ ناز کے
چارہ ناچار اپنی آنکھوں کو حجاب آ ہی گیا

مر گیا بیمارِ غم کروٹ جو بدلی ضعف سے
عالمِ ہستی میں آخر انقلاب آ ہی گیا

میکدے میں دیکھکر واعظ کو رندوں نے کہا
آشنائے لذتِ دردِ شراب آ ہی گیا

قصدِ مینوشی پہ تمہیدِ وصلِ دوست تھا
کھینچ کے ہونٹوں تک میرے جامِ شراب آ ہی گیا

جاتے جاتے تیغ سے گیسو تک نظر ہوش اڑ گئے
شام بھی ہونے نہ پائی تھی کہ خواب آ ہی گیا

چشمِ بد دور اس ادا پر دیکھنے والا نثار
بنکے یوں لیٹے ہیں گویا ان کو خواب آ ہی گیا

کسقدر نظارہ نازک مزاجی سہل ہے
جب ذرا سی چھیڑ کی اُن کو عتاب آ ہی گیا

جاتے تھے توبہ کو محشر کر کے ترکِ انتظار
ناگہاں وہ مستِ صہبائے شباب آ ہی گیا

غزل جناب حکیم باقر صاحب راز لکھنوی

روزِ ازل سے وصل کی صورت نہیں کہیں
دیکھا تو آسماں کہیں ہے زمیں کہیں

اے نیند ایک چشم زدن کو تو آ کبھی
شاید کہ آئے خواب میں وہ نازنیں کہیں

پردے میں دلکے دیکھ سکے گر آفتاب داغ
دکھلائی دے نہ خلق میں مہر مبیں کہیں

پہنے ہوئے ہوں خارِ در یار کا کفن — مجھ سے لپٹ نہ جائیو دیکھ اے زمیں کہیں
دل سے چلے ہیں اشک بجھانے کے واسطے — سوزِ جگر سے آگ لگی بالیقیں کہیں
پوچھا جو میں نے دل کا پتا کچھ بتائے — بولے مجھے خبر نہیں ہوگا یہیں کہیں
سودائی ہجراں کا دیکھا شکستہ حال — دامن ہے تار تار کہیں آستیں کہیں
ہر جا پہ بحرِ عشق میں طوفان ہے نیا — اے راز ڈوب جائے نہ ایمان و دیں کہیں

قطعہ تاریخ وفات جسٹس بدرالدین طیب جی مرحوم از محمد یوسف صاحب ناظم انصاری متوطن بمبئی

داد ریغا حیف و واویلاہ و صد فریاد وای — عقد یارا فلک از چشم ما پنہاں نمود
رفت بدرالدین طیب جی ز دنیا آہ آہ — مردنش آرام و فخر و راحت از ما در ربود
ت از ما جوہر قابل کہ اندر روزگار — تا نیش گر بود کس خود خویش را ثانی بود
خیر خواہ مسلمین بود و عزیز المسلمین — زین سبب از مرگ وے اسلام را غمہا فزود
شد جہاں پُر دود آتش بار اہل درد و غم — نیست این تار شعاع مہر بر چیں کبود
شد مراحل طے چو از عمر شریفش شصت و چار — مرد وگر انصاف پرسی مردنش بودست زود
مصرعہ تاریخ فوتش ناظم دل خستہ گفت — فخر اہل ہند بدرالدین طیب جی بود

کتب برائے ریویو — مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے پاس پہونچی ہیں۔ ماہ آئندہ میں ان پر ریویو کیا جائیگا۔ اس پرچے میں ملا عبدالقیوم صاحب کے مضمون (حصہ سوم) کے سبب سے گنجائش نہ نکل سکی۔ (۱) سوانح عمری مولانا روم از علامہ شبلی۔ (۲) نیرنگ افغان از حضرت اغلب موہانی۔ (۳) دیوان شاکی و سخن پاکی کلام احمد حسن مرحوم شاکی مرحوم رئیس میرٹھ۔ (۴) ذوالفقار حیدری از بابو رام گوپال صاحب۔

(۳) حصّہ دفع اوہام

ہم شرعاً و عقلاً ثابت کر چکے ہیں کہ اجتماعِ تمدنی، اور تالف باہمی، انسان کے لئے ضروری، اور لازمی چیز ہے، اور باہمی اختلافِ آراء، اور تباینِ عقاید و عصبیت، کا کچھ لحاظ نہیں اور نہ یہ مانعِ اتفاق و الفت ہیں۔ اور فرقِ مختلفہ، و اشخاص متباین الطبع، میں اتفاق و الفت ایسی مفید و ضروری چیز ہے کہ اس سے کسیکو اختلاف ہی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اسکی ضرورت پر عقل و نقل دونوں متفق ہیں۔ کہ ؎

دولت ہمہ ز اتفاق خیزد | بیدولتی از نفاق خیزد

حشمت باتفاقِ ملاحت جہاں گرفت | آرے! باتفاق جہاں می تواں گرفت

مورچگاں راچو بود اتفاق | شیرِ ژیاں را بدر آرند پوست

ہر قسم کی لذت، راحت، قوت، شوکت، دولت، ثروت، رفعت، منزلت، منفعت اور سعادتِ دنیا و آخرت سبکا دار و مدار اسی پر ہے، اسی لئے فتنہ و فساد کو شرع میں قتل سے زیادہ تر اشد بتایا ہے کہ "الفتنة اشد من القتل" کیونکہ قتل تو ہیئت مجتمعہ شخصیہ کے فساد کا موجب ہے۔ اور فتنہ و فساد اجتماعِ بنی نوع، اور ہیئت اجتماعیہ مدنیہ کے انحلال کا باعث ہے جس سے عام نقصانِ قومی، و ملکی، و مالی و دولی، متصور ہے۔ پس اگر تمام شرکاء کافر ہی ہوتے، تب بھی انکی شرکت بروئے شریعت و سیاست مسلمانوں کے لئے ممنوع نہ تھی۔ چہ جائیکہ انمیں اہلِ کتاب، عیسائی، یہود، مجوس، اور اہلِ اسلام بھی شریک ہیں۔ تو اب کسی قسم کا عذر شرعی و عقلی نہیں پایا جاتا۔ پس اب ہم اُن عام اوہام کیطرف متوجہ ہوتے ہیں جو عموماً زبان زد خاص و عام، اور تکیہ کلام عوام کالانعام ہو رہے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ وان ارید الا الاصلاح۔

چونکہ ان تمام اوہام کے مشیع اور بانی مبانی، سرسید مرحوم ہیں۔ اور انہیں نے اس اختلاف کو تمام مسلمانان ہندوستان میں تعلیم یافتہ گروہ اور اپنی ذاتی رائے کے خلاف

ں اغراض و مصالح وقتیہ و ذاتیہ کی وجہ سے پھیلایا تھا۔ اس لئے اُن کے پیش کردہ
بنات کا دفع کر دینا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ سر سید نے اپنی لکھنؤ اور میرٹھ والی اسپیچوں
اُن کو ظاہر فرمایا تھا۔ اور لوگوں کو اپنی ابلہ فریب تقریر سے ان اوہام دور از کار میں
ڈال دیا تھا اور دوسرے برآوردہ گروہ ہند۔ یعنی ہندو، مسلمانوں میں جنکے تمدنی علاقات، اور
اشرتی روابط مستحیل الانفکاک ہیں تفرقہ ڈالدیا۔ اور ایک عام شورش پھیلا دی۔ سر سید
ان دونوں اسپیچوں میں محض دعاوی کے سوائے استدلال، یا واقعات واقعی سے بحث
ہیں کی گئی ہے۔ اُنھوں نے اپنے مخترعات و مزعومات، کو مسلمات و واقعات قرار دے
ا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ والی اسپیچ کا جواب پنڈت اجودھیا ناتھ سرگباشی نے ایسا معقول،
مدلل، مفصل، اور مشرح، دیا ہے کہ درحقیقت وہ لاجواب ہے، مگر ہم بھی سر سید کے مزعومات
اور توہمات کو جو ان دونوں اسپیچوں میں مذکور و مسطور ہیں، ملخصاً درج ذیل کر کے پھر پنڈت
جی اور سر سید کی یاد تازہ کئے دیتے ہیں، اور سب پر ثابت کرتے ہیں کہ یہ اوہام "اوھن
من بیت العنکبوت" ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد، صرف دفعیہ اغلاط و اوہام اہل اسلام
[illegible] ہے اور اس سے صرف سر سید کی تغلیط رائے اور اپنے سادہ دل بھائیوں کو اس مغلطے
سے نکالنا مقصود ہے۔

(۱) سر سید کے زعم میں کانگریس کے بانی مبانی، بنگالی ہیں، جنہوں نے اپنی ذاتی غرض کے
لئے گورنمنٹ کے برخلاف اس کا انعقاد کیا ہے۔ اور چونکہ وہ مشرک ہیں، لہذا ہمکو گورنمنٹ
سے جو اہل کتاب ہیں، اور ہم پر حاکم، اور جنکی مودت و اطاعت، ہم پر واجب ہے، علیحدہ
ہو کر اُن کے شریک ہونا چاہئے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اسکے بانی مبانی، دیوان رگھوناتھ مرہٹہ برہمن ہیں۔ اور
اسکا انعقاد و اجلاس پہلے پہل بمبئی میں ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ جس میں کل ممبر (۷۰) تھے۔ جنکے
منجملہ صرف دو مسلمان اور تین بنگالی تھے۔ دوسرا اجلاس کلکتہ میں ۱۸۸۶ء میں ہوا۔
جس میں (۴۳۶) ممبر مختلف مقامات سے مختلف صوبے، پیشے، حیثیت، وجاہت، اور لیاقت
کے شریک ہوئے تھے۔ ان میں سے (۳۳) مسلمان تھے۔ تیسرا اجلاس مدراس میں ۱۸۸۷ء

میں ہوا۔ جسمیں منجملہ (۲۰۴) ممبروں کے (۸۲) مسلمان تھے، اور جنکے پریسیڈنٹ آنریبل بدرالدین طیب جی مرحوم، اور مدراس کے معزز ترین نوبل، سر ہمایوں جاہ بہادر مرحوم و مغفور بھی شریک تھے۔

دوسرا زعم سرسید کا کہ بنگالیوں نے اپنے فائدہ ذاتی کے لئے یہ جلسہ کیا ہے، یہ بھی سراسر غلط، خلاف واقع، خلاف روئداد و رزولیوشن، اور خلاف غرض و غایت مبینہ و معرحہ کانگرس ہی۔ جیسا کہ خود ہماری تحریر مندرجہ عنوان مضمون ہذا سے ثابت اور متحقق ہے کہ اسمیں عامہ رعایا کا فائدہ بلا امتیاز قومی و مذہبی و ملکی ملحوظ و مرعی ہے۔ نہ کسی خاص قوم و فرقے کا

تیسرا زعم سرسید کا کہ جلسہ خلاف گورنمنٹ ہے۔ یہ بھی سراسر افترا و بہتان ہے۔ اور خود اُن کے اقرار و بیان کے خلاف ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ :- "ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم نے بعض تعلیم یافتہ لوگوں کو زیادہ دلیر کر دیا ہی۔ اور اُنھوں نے نہایت سخت اور بعض اوقات نہایت بیجا اور ناواجب اور نامنصفانہ نکتہ چینی گورنمنٹ پر کی ہے۔ مگر ہم دل سے یقین رکھتے ہیں اور گورنمنٹ کو بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہی تعلیم یافتہ نکتہ چین۔ جسقدر گورنمنٹ انگریزی کے قدرداں ہیں، شاید کوئی دوسرا نہو گا" ملاحظہ ہو۔ حصہ دوم حیات جاوید صفحہ (۱۱۸)

اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس جلسے کے خلاف گورنمنٹ ہونیکے کیا معنے؟ آیا قانون نافذہ وقت کے خلاف ہے؟ یا کسی خاص حکم کے خلاف ہے؟ یا طرز حکومت کے خلاف ہے؟ یا تنگدل حکام قوم فاتح کی ذاتی خواہشوں کے برخلاف ہے؟ جو محض مبنی بخودغرضی و نفع ذاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ قانون نافذہ وقت یا کسی سرکلر یا طرز حکومت برطانیہ کے ہرگز برخلاف نہیں ہے اور نہ کوئی اسکو ثابت کر سکتا ہی۔ کیونکہ حکومت برطانیہ۔ کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ ہی، مشورت اور اتفاق آراے عامہ رعایا و برایا پر اُسکے آئین و قوانین سلطنت جاری ہوا کرتے ہیں، شخصی حکومت نہیں ہے۔ اب رہی بعض تنگدل و خودغرض حکام قوم فاتح کی خواہش، سو جب وہ صرف رعایا ہی کے حق میں نہیں۔ بلکہ سرکار اور رعایا دونوں کے حق میں مضر ہے۔ تو بجا دباؤ کے خوف سے یا اپنے ذاتی منافع، شخصی مضار اکے خیال سے

اُسکا اتباع کرنا ہمپر کچھ ضروری نہیں ہے۔ بلکہ نہایت ناجائز ہے، چنانچہ خود سرسید کے فتوی اور قول پر اور اُنکے تعامل کی رو سے بھی، اس کی مزاحمت و مخالفت ضرور ہے، جیسا کہ وہ اپنے ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ادھر ہم کو اپنی قوم کے تعصب و جہالت سے مقابلہ کرنا ہے، اور ادھر اپنی فتحمند قوم کے اُن تنگدل لوگونکی مزاحمت کا برداشت کرنا ہے۔ جو ہمارے سوشل اور پولیٹیکل حالت کی ترقی اپنی طبعی تنگدلی کے برخلاف سمجھتے ہیں اور ہماری انگلش لائف، انگلش تمدن، جنٹلمین کے سے اخلاق، یہاں تک کہ ہمارے تغیر لباس سے بھی وہ ایسے ناراض ہوتے ہیں، اور چشم خشم آلود سے ہمکو دیکھتے ہیں، جیسے کوئی نہایت نیک دل حاکم بڑے مجرم کو دیکھتا ہو۔ مگر ہمکو اپنی اور اپنی قوم کی بھلائی پر نظر رکھنی چاہیئے، اور جو تکالیف و شکایات ہمکو پیش آئیں، نہایت تحمل و تحمل مزاجی سے برداشت کرنا چاہیئے۔ ہم اسبات کو یقینی رکھنا چاہیئے کہ گریٹ ریفارمر یعنی زمانہ ان باتوں کو ضرور ہونے دیگا، اور کوئی مزاحمت اور کوئی ناخوشی، وخفگی، اُسکو نہ روک سکیگی، لیکن بیشک یہ تنگدلی کے نتائج ہیں، ناراضی کو ترقی دینے والے اور فاتح و مفتوح کی ہمدردی و محبت کو توڑنیوالے ہیں" ملاحظہ ہو حصہ دوم حیات جاوید ۱۱۸ و ۱۹۔

سرسید کا ہمیشہ یہ تعامل رہا ہے اور وہ اپنے پبلک لکچروں اور اسپیچوں میں بار بار آواز بلند پکار پکار کر بتاکید تمام یہ کہا کئے کہ:" اگر گورنمنٹ کی پالسی ہمارے مصالح و منافع اور اغراض قومی و ملکی کے برخلاف و مضر ہو تو ہمکو باستقلال تمام اُسکی مقاومت کرنی چاہیئے۔ اور پوری ہمت و صبر و استقلال سے کام لینا چاہیئے۔ اور اس کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہیئے کہ گورنمنٹ اُس سے خوش اور راضی ہوگی یا ناراض۔ اور گورنمنٹ کو دکھلا دینا چاہیئے کہ گورنمنٹ کو لوگوں کی جانوں پر اختیار ہے۔ مگر لوگوں کے دلوں پر نہیں ہے"

چوتھا وہم و زعم کہ مسلمانوں کو مشرکین کی مخالطت و مشارکت، خلاف اہل کتاب و حکام، قوم ... کے ممد و معاون ... الطالب ... ہے۔ جیسا کہ ہمنے سیاست و شریعت و ...

مفصلاً اُس کا ابطال بوجہ کمال کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ کانگریس کے مطالب بعوض خلاف ہونیکے عین موافق اصُولِ سلطنت ومبنی بخیر خواہی دولت، وخیر اندیشی وخیر طلبی رعیت ہیں۔ چنانچہ خود سید اسکے قائل ہیں اور لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ، صدق دل سے دوستی اور میل جول اور کھانا پینا دینِ حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں؟ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے، کیونکہ اسلام، نفاق سے بتر اور رذیل تر خصلت کوئی نہیں بتلاتا۔ اس لئے ہمیشہ انگریزوں اور تمام **غیر مذہب قوموں** کے ساتھ اُسی صداقت وخلوص کے ساتھ میل جول رکھا، جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے"! ملاحظہ ہو حیاتِ جاوید صفحہ حصۂ دوم

ایک دوسرے مقام پر یعنی بجواب اڈریس انجمن پنجاب وہ یوں فرماتے ہیں:۔

"میری تمام تر آرزو یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم ومذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں مذہب بے شک سب کا علحدہ علحدہ ہے۔ مگر اسکے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دسترخوان پر مختلف کھانے موجود ہیں۔ اُن میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے، کوئی کسی کو۔ مگر اس اختلافِ طبائع کی وجہ سے اُس دسترخوان پر بیٹھنے والوں کو باہم کچھ رنج نہیں ہوتا، اسی طرح اس دُنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے، مختلف مذہب والوں میں، کوئی وجہ باہم رنج کی پیدا نہیں ہوسکتی، ہر شخص اپنے ایمان کا مختار، بلکہ میری رائے میں اُسپر مجبور ہے اس لئے کہ جس چیز کا یقین اُسکے جی میں ہے، اسی کو وہ اختیار کرے گا۔ وہ یقین دوسرے کے دل میں اثر نہیں کرتا، اچھا ہے تو اُس کے لئے اور بُرا ہے تو اُس کے لئے، لیکن آپس کی محبت میں، جو ان کی راحت میں سب سے بڑا جز ہے۔ اُس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا"۔

ایک دوسرے موقع کی اسپیچ میں فرماتے ہیں:۔ کہ "ہندوستان میں خدا کے فضل سے دو قومیں ایسی آباد ہیں، کہ ایک کا گھر دوسرے سے ملا ہے، ایک کی دیوار کا سایہ دوسرے کے گھر میں پڑتا ہے ایک آب وہوا میں، دونوں شریک ہیں، ایک دریا کا پانی پیتے ہیں، مرنے جینے میں ایک دوسرے کے رنج وراحت میں شریک ہوتا ہے، ایک کو دوسرے بغیر ملے چارہ نہیں۔ بس کسی چیز کو جو

معاشرت سے تعلق رکھتی ہو۔ ان دونوں کا علحدہ علحدہ رکھنا دونوں کو برباد کرنا ہے۔ قوم کا لفظ، ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ گو اُن میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا۔ اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے؟ یا اسی زمین کے گھاٹ پر تم جلائے نہیں جاتے؟ اسی پر مرتے ہو، اسی پر جیتے ہو، تو یاد رکھو کہ ہندو مسلمان، ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان، عیسائی بھی جو اسی ملک میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں"

ایک اور موقع پر آپ نے مندرجہ ذیل تقریر فرمائی ہے کہ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے۔ کہ ہندو مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ کیا ہے؟ کیونکہ ہم اُس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے، لیکن جو بات ہم دیکھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں۔ یا مسلمان، ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں۔ ایک ہی حاکم کے زیر حکومت ہیں ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں۔ ہم سب قحط کی مصیبتوں کو برابر برداشت کرتے ہیں یہی مختلف وجوہات ہیں، جنکی بنا پر میں ان دونوں قوموں کو، جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک ہی لفظ سے تعبیر کرتا ہوں۔ ہندو، یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم۔"

ایک اور اسپیچ میں اُنکے الفاظ یہ تھے: "اب ہندوستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے، اس کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں، مقدس گنگا۔ جمنا کا پانی ہم دونوں پیتے ہیں، ہندوستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں، مرنے میں جینے میں، ہم دونوں کا ساتھ ہے، بستے رہتے ہیں دونوں کا خون بدل گیا، دونوں کی رنگتیں، ایک سی ہو گئیں، دونوں کی صورتیں بدلکر ایک دوسرے کے مشابہ ہو گئیں، مسلمانوں نے ہندوستان کی سینکڑوں رسمیں اختیار کر لیں ہندوؤں نے مسلمانوں کی سینکڑوں عادتیں لے لیں یہانتک ہم دونوں آپس میں ملے، کہ ہم نے ملکر ایک نئی زبان اُردو۔ پیدا کر لی، جو نہ ہماری زبان تھی، نہ اُن کی، اے میرے دوستو میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں، کہ ہندوستان ایک دلہن کے مانند ہے جسکی خوبصورت اور رسیلی آنکھیں، ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھینگے تو پیاری دُلہن

نگی ہو جائیگی، اگر ایک دوسرے کو برباد کر دینگے تو وہ کانڑی بجائیگی، پس اسے ہندوستان کے
رہنے والے ہندو مسلمانو! اب تمکو اختیار ہی کہ چاہو اُس دُلہن کو بیٹھا بناؤ - چاہو کانڑا۔"

ہم ان تمام اقتباسات کے بعد کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتے - عیاں راچہ بیان، صرف اسقدر
عرض کرتے ہیں کہ: "اعوذ باللہ من قول بلا عمل - لما تقولون ما لا تفعلون"

واعظاں کیں جلوہ بر محراب منبر می کنند	چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمند مجلس - باز پرس	توبہ فرمایان، چرا خود توبہ کمتر می کنند
گوئیا باور نمی دارند، روز داوری	کیں ہمہ قلب و دغل در کار داور می کنند

(۲) سرسید فرماتے ہیں کہ کونسل والسرائے، اور دیگر مجالس قانونی کی اصلاح
جو کانگریس چاہتی ہے، اُس کی کچھ ضرورت نہیں ہے، وہ اپنے ذات میں، بطور کافی و وافی ادا
کرتی ہے، اُسمیں کوئی نقص نہیں ہے - جب کانگریس اُسکے ناقص کو بادلہ ثابت کرتی ہے،
جسکا کوئی جواب کسی سے نہیں بنتا - اور بجز توہمات و تعللات کے کوئی تشفی بخش اور معقول
بات نہیں کہی جاتی تو سرسید کا دعوی بلا دلیل قابل التفات نہیں ہے -

ہر ایک شائستہ اور مہذب قوم، و ملک، و دولت، نے یہ اُصول تسلیم کر لیا ہی کہ منجملہ
طرق حکومت کے وہی طریقہ عمدہ اور پسندیدہ ہے - جو اپنی رعایا کی قوت علمی و عملی و اخلاقی
کو قوی کرے اور ترقی دے - اور اُن کو شریک نظم مملکت و انتظام دولت کرے،
ہر دولت کے دو ہی معیار قرار دیے گئے ہیں - ایک تو وہ، جس سے یہ جانچا جاے کہ
من حیث المجموع اور فرادی فرادی، رعایا کے ملکات علمی، وعملی و اخلاقی، کو زیادہ کرنے اور
ترقی دینے کی وہ دولت کسقدر صلاحیت و قابلیت رکھتی ہے، اور اسکے لیے کیا کیا اور کیسے
کیسے ذرائع مہیا کئے ہیں؟ کیونکہ قطع نظر اس امر کے کہ حکومت کی غرض اصلی، خود رعایا
کی بہبودی و رفاہیت ہی، رعایا کے قواے علمی، وعملی، و اخلاقی، خود دولت کی کل کو چلانے
کیلئے قوت محرکہ کا کام دیتے ہیں - دوسرا معیار وہ ہی جس سے یہ جانچ پڑتال کی جاے
کہ حکومت کہاں تک رعایا کے علم و لیاقت سے بہرہ مند و متمتع، ہوتی ہے - کیونکہ اگر رعایا
کی لیاقت سے خود دولت منتفع و متمتع نہو - اور اُن سے دولت کا کام و انتظام نہ لیا جائے تو وہ بسود

دیکھا ہے۔

رعایا کی لیاقت علمی و عملی بمنزلہ بخار اور اسٹیم کے ہے۔ اور دولت بمنزلہ انجن کے۔ گو اسٹیم کتنا ہی قوی اور زیادہ ہو۔ اگر انجن اور آلات اُسکے ساعد نہوں، تو وہ محض بیکار ہے۔ اور آلات بدون اسٹیم کے معطل اور بے مصرف محض رہتے ہیں۔ بہرحال جیسا کہ اسٹیم بے انجن، اور انجن بے اسٹیم کے بے مصرف، و غیر مفید و بیکار ہیں، اور عملاً نافع نہیں۔ اسی طرح اقلیم یا قسمتِ رعیت بے دخیل گورنمنٹ ہونے کے، اور گورنمنٹ بے اقلیم یا قدر رعایا کے مستفید ہونیکے بکار آمد اور مفید نہیں ہوسکتے۔ الحاصل جو خوبی کسی آئینِ سلطنت، و قوانینِ سیاست میں خواہ وہ کسی قسم کی ہو۔ پائی جاسکتی ہے وہ دو قسم کی ہے۔

ایک یہ کہ اُس کے آئینِ سلطنت و سیاست سے، گروہ محکوم کی عام علمی و عملی و نظری و اخلاقی قوت میں ترقی ہو۔ دوسری یہ کہ جتنی لیاقت علمی و عملی و عقلی و نظری و اخلاقی اس گروہ میں بالفعل موجود ہے۔ وہ کس درجے تک ایسے طور پر مرتب کرلی گئی ہے کہ امورِ سلطنت پر بدرجۂ غایت، موثر ہوسکے۔

انسان کے معاملات کا اسلوب ہی، بد و خلقت ایسا واقع ہوا ہے۔ کہ آدمی کی نیت اوروں کے حقوق کی حفاظت کے بارے میں گو کیسی ہی خالص کیوں نہو۔ مگر اوروں کو یہ ہرگز مناسب و مفید نہیں۔ کہ وہ ہات پر ہات رکھے خاموش بیٹھے رہیں۔ اور کچھ ہل چل نہ کریں۔ اور اُصولِ "الحرکۃ برکۃ" پر عمل پیرا نہوں۔ ؎

تا نگرید ابر کے خندد چمن — تا نگرید طفل کے جوشد لبن
تا نگرید طفلک حلوا فروش — دیگِ حلوائی کجا آید بہ جوش

لیس للانسان الا ما سعی

اور یہ بھی نہایت سچی اور واقعی بات ہے کہ آدمی اپنی اصلی اور دائمی اصلاح اپنے ہی ہات سے کرسکتا ہے۔

نخارد کسے در جہان پشت من — بغیر از سر انگشت من
لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت

پس جو حکومت کہ نہ رعایا کو تعلیم دے - اور نہ اس کے علم و تہذیب سے انتظام حکومت میں
تمتع اُٹھا کر ورنہ نفع حاصل کرے اُسکی رعایا روز بروز کاشتکاری کی پستی کی حالت میں تنزل کرتے
کرتے پہلے حالت غلامی میں پھر درجہ حیوانات بہائم دبہائم میں پہونچ جائیگی، اور اسکا لازمی نتیجہ
یہ ہوتا ہے کہ مثل حیوانات کے وہ اپنے حقوق و معاملات کے آپ مالک و مختار نہیں ہوتے-
اُن کی پرداخت و پرورش، واقتدار و اختیار کی باگ دوسرے کے ہات ہوا کرتی ہے، جدہر چاہا
پھیرا، اور جسطرح چاہا تصرف کیا-

جب ہر قسم کی دولت کی خوبی کا یہ اصول ممہد ہو چکا، تو اب ہم اس لحاظ سے دلیرانہ
اور دوسری آئینی کونسلوں کو جانچتے ہیں- کہ وہ کہانتک اس کے موافق و مطابق ہیں؟ اور کسقدر
مخالف و مباین-

قاعدہ حال کی رو سے سرکاری کی طرف سے غیر سرکاری ممبر منتخب و مقرر ہوتے ہیں، اور
اُن کی تعداد سرکاری ممبروں سے کم ہوتی ہے- جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ بالاتفاق
آزادانہ رائے دیں- تو اُنکا کچھ اثر نہیں ہوسکتا- اور حالت یہ ہے کہ چونکہ وہ اکثر سرکار کے
زیر اثر اور ہاں میں ہاں ملانیوالے ہوتے ہیں- اس لئے اُن کو رعایا کی ہمدردی و شوق
سے کچھ سروکار نہیں ہوتا-

اس کے علاوہ اور سنئے کہ سکرٹری آف اسٹیٹ نے یہ قاعدہ جاری کردیا ہے کہ اگر کوئی
ممبر کوئی قانون پیش کرتا ہو تو اول بذریعہ گورنمنٹ آف انڈیا اُسکی اطلاع اُن کو دے- اگر
وہ نامنظور کردیں تو وہ پیش نہیں ہوسکتا- اگر دو مہینے کے اندر وہ منظور کریں- یا اپنی منظوری
و نامنظوری کی اطلاع نہ دیں تو وہ پیش ہوسکتا ہے- مگر پیش اور پاس ہونے کے باوجود
بھی اُس کے نامنظور کردینے کا اختیار، نواب گورنر جنرل و سکرٹری آف اسٹیٹ کو بدستور
حاصل رہتا ہی- اور بعض حالتوں میں سرکاری دباؤ سے موافق رائے لینے کی ناجائز کوشش
بھی معیوب نہیں سمجھی جاتی- پس اب انصاف کیجئے کہ یہ حالت کہانتک رعایا، اور ملک، کی اصلاح
و فلاح کے مناسب حال ہے! اور کون شخص اسکو معقول خیال کرسکتا ہی- گو خوشامد سے کتنا ہی
سراہیئے، اور باتیں بنائیے، مگر حقیقت نہیں بدل سکتی، اگر اس کی برائیاں اور عملی خرابیاں

[illegible] تو ایک دفتر درکار ہوگا۔ اس لئے ہم اُس سے درگزرتے ہیں۔

کانگریس کے مجوزہ طریقے میں دو خوبیاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرکاری ممبر من مانے تجاویز بے دھڑک نہ پیش کر سکینگے، سوچ بچار کر پیش کرنا ہوگا، کیونکہ اُن کو معترضین کی جوابدہی ضرور ہوگی۔ اور وکلاء رعایا کی تشفی کرنی پڑیگی، دوسری رعایا کی بدگمانی و غلط فہمی جو سرکاری کارروائی سے مرتفع ہوجائیگی، اور جانبین کی لاعلمی و جہالت سے جو بُرے نتائج پیدا ہونے کا خدشہ و اندیشہ رہتا ہے وہ دور ہوجائیگا۔ یعنی رعایا کی حالت و خواہش سرکار سے پوشیدہ اور سرکاری مصالح رعایا کو نامعلوم رہنے سے جو خرابیاں انتظام میں پیدا ہوتی ہیں، اور جو کشاکشی باہمی واقع رہتی ہے، وہ جاتی رہیگی۔ اور رعایا و دولت کا اتحاد و اتفاق استحکام دولت کا موجب ہوگا۔ علاوہ برآں مشورت کا طریقہ، برابر ہندوں اور مسلمانوں میں، بطور شعار مذہبی کے جاری رہا ہے۔ بلکہ اب تک جاری ہے۔ اور اگر دنیا میں قدیم سے قدیم اقوام کی بھی تاریخ دیکھی جائے۔ تو اُس میں اس طریقہ کا رائج و شایع ہونا ثابت ہوتا ہے۔ پس اس مفید و معقول طریقہ کا خلاف، باوجود اس کے کہ مصالح ملکی کے خلاف ہے اور بالکل پُرخطر و پُرضرر معلوم ہوتا ہے، کیوں کیا جاتا ہے؟

(۳) سرسید کا اپنی اسپیچ میں یہ ڈینگ لینا کہ دو گورنر جنرل کے مشورہ دینے کے لئے شرافت وجاہت۔ وقعت، اور دولت، وغیرہ امور کے لحاظ سے ممبروں کا لائق و فائق ہونا ضرور ہے صرف اُن کی ابلہ فریب اور دلخوش کن چال تھی۔ ورنہ سب پر روشن ہے کہ سرکار [illegible] سوای اشرفی کے اشراف متصور نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دن رات دیکھتے ہیں کہ اکثر ارذل ناس، سرکاری خدمات پر مامور و ممتاز، اور خطابات شاہی سے سرفراز پائے جاتے ہیں۔ سرسید کا یہ عذر کہ انگریز ہماری آنکھوں سے دور ہیں، اس لئے ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ولایت میں کس پیشے، حرفے، اور حیثیت کے لوگ ہیں۔ مگر یہاں کے لوگ اس قسم کے ہوں تو ہم اُن کو برداشت نہیں کر سکتے" یہ بھی محض ایک دل خوش کن دفع الوقتی ہے۔ کیا سرکاری دربارؤں میں اور سرکاری اعلیٰ خدمات پر کونجڑے، بھٹیارے، جولاہے، قصائی، درزی، اور خانساماں وغیرہ [illegible] نہیں؟ کون اس بات سے انکار کرسکتا ہے؟ مگر جھوٹی شیخی اور ہے، اور واقعات پر

کسی راے کا مبنی کرنا اور ہے، اس سے قطع نظر کرکے ہم پوچھتے ہیں کہ کیا سرسید بحیثیت ایک مسلمان ہونیکے سرورِ کائنات کے اس فرمانِ واجب الاذعان سے سرتابی کرسکتے ہیں۔

"اطیعوا امیرکم ولو کان عبداحبشیا وراسہ کالذبیبۃ۔"

کیا کسی مسلمان کا ایمان "انما اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم" پر نہیں ہوسکتا؟ اور کوئی مسلمان اس عقیدے سے علیحدہ ہوسکتا ہے؟ اور کیا یہ آیت حضرت بلالؓ کی شان میں، بمقابلہ اہل قریش نہیں وارد ہوئی ہے؟ پھر ان فضول شیخیوں اور تفاخر بیجا سے جو خلافِ عقل ونقل ہیں نتائج ہی کیا ہیں؟ اسلام نے اور ہماری گورنمنٹ نے بھی بہ پیروی اسلام، ان چیزوں کو ساقط الاعتبار کردیا ہے۔ اور صرف کمالِ انسانیت، وتساوی، وحریت وعلم وعدالت کے اعلیٰ اصولِ ہیئت کو ملحوظ ومنظور رکھا ہے۔ تفاخرِ نسبی۔ بمقابلہ فضائل ومفاخرِ کسبی، کوئی چیز نہیں۔ بلکہ اسلام میں ممنوع اور شعارِ جاہلیت سے ہے۔

شرف المرأ بالعلم والادب لا بالمال والنسب

حضرت علیؓ کا قول ہے:- انا ابن نفسی وکنیتی ادبی ٭ من عجم کنت اومن العرب

ان الفتیٰ من یقول ھا انا ذا ٭ لیس الفتیٰ من یقول کان ابی

سرسید بنگالیوں سے نہایت ناراض ہیں۔ معلوم نہیں کہ اُن کی لیاقت کے حسد سے، یا جناب بہادروں کی خوشامد کے خیال سے، یا محض اُن کی تقلید کے لئے جو اُن کی (سرسید) طبیعت ثانیہ ہوگئی تھی۔ غرض جس وجہ سے ہی ہو بنگالیوں پر لعن طعن کرتے، اور پھبتیاں اُڑاتے ہیں۔ کبھی اُن پر کالے ہونیکا الزام لگاتے ہیں کبھی بزدلی کا، مگر حقیقت شناس جانتے ہیں کہ سرسید بمقابلہ بنگالیوں کے خود اپنے کالے ہونے اور بزدل یا خوشامدی رہنے کا ثبوت دیتے ہیں، صرف آبائی تفاخر کیا کام آسکتا ہے؟ جبکہ خود ہم میں جوہر ذاتی نہو ؎

پسرانِ وزیر ناقص عقل
بگدائی بروستا رفتند
روستازادگانِ دانشمند
بوزیری بہ پادشا رفتند

؎ گیرم کہ پدر تراست فاضل
از فضل پدر ترا چہ حاصل

؎ ناخوش بود آں عروس بدبد
کو ناز کند بحسنِ مادر

(۴) ایک اور اعتراض وشبہ یہ ہے کہ اہلِ اسلام کی تعداد، ہندوستان میں، بہ نسبت ہندوں کے کم ہے۔ لہذا کونسلِ واضع قوانین وآئین کے واسطے منجانب رعایا اگر ممبر منتخب ہونگے تو تعداد ہنود کی زیادہ ہوگی، اور وہ باعتبار دولت ولیاقت کے بھی اُن سے بڑھے چڑھے ہیں، اور چونکہ ان دونوں میں نااتفاقی ہے۔ لہذا کثرتِ رائے ہمیشہ مسلمانوں کے برخلاف ہوگی، اور مسلمانوں کو مضرت پہونچیگی، اور اُن کے حقوق کی حفاظت نہو سکیگی۔!

اگرچہ یہ اعتراض بھی مثلِ سابق کے بےبنیاد ہے۔ مگر بظاہر اسکا اثر، خواص وعوام اہلِ اسلام پر زیادہ ہوا ہے۔ لہذا سب سے اول اس قاعدہ پر جو کانگریس نے انتخاب کے لئے مقرر کیا ہے نظر ڈالنی چاہئے، اور اُسکو بخوبی سمجھ لینا چاہئے کہ اُسکی رو سے کمی تعداد مسلمانان کا خوف کسقدر ہے؟ اور اُس کمی تعداد کا نتیجہ واثر کیا مترتب ہو سکتا ہے؟

کانگریس نے انتخاب کا قاعدہ یہ مقرر کیا ہے کہ فی دس لاکھ، تین شخص قائم مقام رعایا منتخب ہوں، جنکو ڈیلیگیٹ کہتے ہیں، اور جسقدر ڈیلیگیٹ کسی صوبہ کے منتخب ہوں اُسکے ثلث ممبر سرکار مقرر کرے، اور یہ رعایا وسرکار کے منتخب شدہ ممبر ملکر اپنا دسواں حصہ کونسل کے ممبروں کے لئے منتخب ومقرر کریں۔ جنکے ساتھ ایگزکیٹو (یعنی سرکاری ممبر) بھی شریک ہونگے، مثلاً فرض کیجئے کہ کسی صوبہ کی رعایا تین کروڑ دس لاکھ ہے تو منجانب رعایا ۹۳ ڈیلیگیٹ منتخب ہونگے، اور منجانب سرکار ۳۱۔ ان دونوں کا مجموعہ ۱۲۴ = ۱۲ یعنی ڈیلیگیٹ کونسل کے لیے بارہ ممبر انتخاب کرینگے۔ جنکے ساتھ ایگزکیٹو ممبر بھی شامل ہونگے پس اگر ان بارہ ممبروں میں نصف سے زیادہ بھی ہندو ہوئے تو باقی ممبروں کی تعداد جن میں مسلمان اور دوسری قومیں، اور ممبران ایگزکیٹو ہونگے، ہندوؤں کی تعداد سے یقینی زائد ہوگی لہذا موافق ہنود۔ اور مخالفِ اہلِ اسلام کثرتِ رائے کا ہونا بعید از قیاس ہے۔ علاوہ اسکے گورنمنٹ کو یہ اختیار ہوگا کہ سوای ممبران منتخب شدہ کے بعض ممبر اپنی طرف سے بھی کونسل میں نامزد کرے۔ پس سرکار کو دو اختیار حاصل رہینگے۔ ایک فیصدی ۳۳ ڈیلیگیٹ کونسل کے ممبروں کے انتخاب کیلئے منتخب کریگی۔ دوسری کونسل میں خود چند ممبروں کو نامزد کریگی یعنی سوا چند ڈیلیگیٹوں کے منتخب شدہ ممبروں کے بذات خود بھی ممبر منتخب کرسکیگی۔ تو پھر گو

اسکا خوف نہیں ہو سکتا کہ شرارت سے ایک فرقہ دوسرے فرقہ کے آدمیوں کو منتخب ہونے دیگا کیونکہ
اگر کسی فرقہ کے آدمیوں کی تعداد اشخاص منتخب شدہ میں کم ہو تو سرکار اُسی فرقہ کے آدمیونکو
کونسل میں مقرر کر سکتی ہے، اور اس نقص وکمی کی تلافی ہو سکتی ہے۔ پس جسقدر کمی تعداد کے
لحاظ سے اُن کی مضرت کا احتمال خیال کیا جاتا ہے وہ سب رفع ہو جاتا ہے۔ علاوہ اسکے لاہور کے
جلسہ کانگریس میں نسبت عددی بھی ملحوظ رکھنے کا تصفیہ ہو چکا ہے جس سے مضرت کا اندیشہ
وخدشہ بالکلیہ مرتفع ہو گیا ہے۔

چونکہ معاملات وحقوق ملکی وسیاسی میں ہندو مسلمان یکساں متحد ہیں، لہذا اسمیں بدگمانی
کا محل وموقع ہی نہیں کہ ایک فریق خواہی نخواہی دوسرے فریق کی بدخواہی اور مضرت رسانی
کریگا۔ کیونکہ بوجہ اتحاد ہی واتحاد حقوق کے وہ عین اپنی ہی بدخواہی اور مضرت رسانی ہو گی،
اس لئے کہ دونوں فرقے ایک ہی ملک کے باشندے ہیں، اور انتظام ملک کی نسبت دونوں
کے حقوق یکساں اور مساوی ہیں۔ پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایسے قواعد جاری ہوں جو ایک کو مفید
اور دوسرے کو مضر ہوں۔ آخر عیسائی، پارسی، یہودی وغیرہ فرقوں کی تعداد بھی تو مسلمانوں سے
کم ہے، پھر اُن کو اسکا خوف کیوں نہیں؟ کیا ہندو کہدینگے کہ مسلمان ٹیکس دیں اور ہندو نہ دیں؟
کیا ہندو کہدینگے کہ سوائے مسلمانوں کے اور لوگ ہتھیار باندہیں یہ نہ باندہیں؟ اور لوگو الشیر
ہوں یہ نہوں؟ دوسرے لوگوں کی مقبوضہ اراضی پر دوبارہ کی تشخیص ہو۔ ان کی اراضی پر نہو؟ سبکا
دوامی بندوبست ہو، ان کا نہو؟ یہ ناممکن ہے! رہے مذہبی امور۔ اُن کا بھی وہی حال ہے۔ اگر
ہندو خلاف میں بھی ہوئے تو دوسری قومیں کیونکر اُنسے متفق ہو کر مسلمانوں سے خلاف
کرینگی؟ اور یہ خلاف سوای ممالک مغربی وشمالی وپنجاب کے اور علاقہ جات ہند میں نہیں پایا جاتا،
سب جگہ میل جول اور اتحاد ہے۔ اور غالباً زمانہ خود اس کی اصلاح کر دیگا، اور اتفاق کی منفعتیں
کو یہاں کے ہندو مسلمان بھی سمجھ جائینگے، اور یہ تعصب جو آج کل ان میں پایا جاتا ہے باقی
نرہیگا بہت جلد مرتفع ہو جائیگا۔

اصل یہ ہے کہ یہ احتمال بھی صرف مسلمانوں کی شرکت ہی سے رفع ہو سکتا ہے۔ نہ اُن کے
علیحدہ رہنے سے۔ اس قسم کی غلطی اگر عمداً یا سہواً واقع ہو تو مسلمان شریک ہو کر اسکو مرتفع کریں

اور باہمی میل جول سے ان شکوک و احتمالات اور بدگمانیوں کو جو آپس میں پیدا ہو گئی ہیں یا عمداً ڈالی گئی ہیں دور کریں۔ وہ لوگ ہرگز مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ جو ان کو علیحدہ رہنے اور ہمیشہ اس خدشے اور خطرے میں بوجہ احتمالات مبتلا ہونے کی صلاح دیتے ہیں۔ اور وہ ہندو بھی بدخواہ ملک و قوم ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہ آپس میں اتفاق نہ ہو۔ ہمیشہ نفاق رہے۔ در اصل ملکی فوائد بدوں ان دونوں کے اتفاق و اتحاد کے ہرگز نہیں حاصل ہو سکتے۔ اور نہ اس نفاق و شقاق سے ایک دوسرے کو معدوم ہی کر سکتے ہیں۔ بہر حال ملک کی بہبودی اور بہبودی اور دونوں کی صلاح و فلاح کا دارومدار ان کے اتفاق و اتحاد پر ہے۔ لہذا دونوں کو جد و جہد تمام اسکی سعی کرنی ضرور ہے۔ اور اس قسم کے امور کو جو ان دونوں کے رشتہ اتحاد کو توڑنے والے ہوں، طرفین سے ظہور میں نہ آنے دینا چاہئے۔ جب ہم مذہب و قومیت میں متحد نہیں ہو سکتے تو اتحاد کی جو جہت سیاسی باقی رہ گئی ہے۔ اگر اسکو بھی چھوڑ دیں تو پھر وہ کون ذریعہ ہے جو ہمکو متحد کرے ؟ اور جس سے ہم باہم تمدنی منافع حاصل کریں اور مدنیت کے برکات سے متمتع و منتفع ہوں۔ ؟

(۵) ایک اور خدشہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ بنگالی یا ہندو عموماً بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ انگریزی داں ہیں لہذا تمام سرکاری عہدوں پر بنگالیوں یا ہندوؤں ہی کا تقرر ہو جائیگا۔

یہ خدشہ بھی پوچ و لچر ہے۔ اول تو خود گورنمنٹ کے مصالح کے خلاف ہے کہ تساوی بین الاقوام کی مصلحت سے چشم پوشی کرے، پھر مسلمان کیا ایسے کم ہمت و نالایق ہیں کہ دوسروں سے مسابقت نہ کرینگے اور پیچھے رہا دینگے۔ اور اب تک وہ کہاں پیچھے رہے ہیں ؟ زمانہ اُن کو مسابقت پر مجبور کرے گا اور وہ خود مجبور ہونگے۔ کیونکہ:-

"الدھر خیر مودب"

بالغرض اُن کی ہمت بڑھانے کے اُن کو تمام دنیا میں ذلیل و بدنام کرنا، اُن کو بزدل اور پسپا بنا دینا اُن کی ہمتوں، جذبوں، ارادوں، کو پست و سست کر دینا، کوئی خیر خواہی و حب قومی نہیں ہے۔ بہر حال اب چونکہ مسلمان، انگریزی کی تعلیم، تحصیل، اور تکمیل کی طرف بھی متوجہ و راغب ہیں اور روز بروز انگریزی تعلیم یافتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے، لہذا یہ خوف و خدشہ بھی بیجا بے محل،

اور عملی ہر اور خود سرسید کے ذاتی خیالات اور بیانات کے بھی مخالف ہے، چنانچہ وہ البرٹ بل کی تائید میں اسپیچ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "جس دلیل پر قومی امتیازات کا لحاظ کیا گیا ہے میرے نزدیک اُسمیں بڑی غلطی ہے۔ شائستہ گورنمنٹوں میں خاص شخصوں کی اطاعت نہیں کی جاتی بلکہ قانون کی جس چیز کی تعظیم اور ادب و اطاعت، درکار ہے وہ قانوں کی حکومت ہو نہ خاص خاص شخصوں کی، اُن شخصوں کی قومیت، جو قانون کی تعمیل کریں قابل لحاظ ہونی چاہئے، آزادی انصاف، وانسانیت کے اعلیٰ اصول اُس قوم کی طبیعت میں سب سے زیادہ متمکن ہیں۔ جس نے غلاموں کو آزاد کیا اور ہندوستان کو اس امر سے مطلع کیا کہ کانسٹیٹیوشنل حقوق کے معاملے میں قوم و مذہب کے امتیازات کی قانون کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں ہوسکتی۔ تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ کسی ملک کی فلاح و بہبودی کو برباد کرنیوالی اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے، کہ حاکم و محکوم کے درمیان قومی تفرقہ رکھا جائے۔ انگریزی حکومت کے ڈیڑھ سو برس گزر جانے سے ہم شائستگی کے اُس درجہ تک پہونچ گئے ہیں کہ قومی امتیاز کو بہر کیف ملک کے عام قانون کے معاملہ میں کم کرنا، ہر ایک وجہ سے مناسب ہے" (ملخصاً) اسکے علاوہ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے اور ہمیشہ سے میں اس پر زور دیتا رہا ہوں کہ قوم کو اس کمینہ خیال سے کہ غیر قوم کی غلامی کریں اور اسی کو اپنا ذریعہ فخر و مباہات واکتساب دولت و ثروت و عزت سمجھیں نکالنا اور دور کرنا چاہیے، اور اُن کو اس بندگی و بیچارگی سے آزاد کرانا اور رہائی دلانا ضرور ہے، خدمت و نوکری کا خیال، اسقدر عالمگیر ہورہا ہے کہ جسکی کوئی حد باقی نہیں رہی، اور تمام قوم اسی طرف جھکی اور گری ہوئی ہے، اور اسی وجہ سے روز بروز اسکا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے، اور قومی افلاس و فقر و مسکنت کا احاطہ نہایت وسیع ہوگیا ہے۔ اور روز بروز ہوتا اور بڑھتا جارہا ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکاری عہدے کس کسکو اور کہاں تک مکتفی ہوسکتے ہیں۔ اور قوم و ملک، صرف غیر اقوام کی نوکری اور غلامی سے کیونکر مترفہ، متمول اور دولتمند ہوسکتے ہیں جب تک کہ اس غیر طبعی ذریعہ معیشت کو چھوڑکر طبعی ذرائع معیشت جو نہایت وسیع ہیں، حاصل اور پیدا نہ کئے جائیں۔ اس لئے قوم کو اس ذلیل و رذیل خیالی دخبط سے پھیر کر تجارت صناعت، حرفت، زراعت، اور فلاحت، کے وسیع و مکتفی و کافی ذرائع کی طرف لگانا چاہیے

جو اصلی طبعی ذرائع ترقی و تمول ملک و قوم کے ہیں اور جو قوم کو غلامی سے رہائی دینے
والے اور جو مسلمانوں کے قومی، مذہبی، اصلی ملکی ذرائع ہیں سب لوگ جانتے ہیں کہ
مسلمانوں میں اعلیٰ و اشرف قوم، قوم قریش ہے۔ چنانچہ ائمہ مذہب و ماسوا ہوتے تھے، یہ تا اتفاق
خلافت و امامت پر سب قوموں سے زیادہ تھا وہ قریشی ہوتے تھے، قریش کو قریش اسی لئے
کہتے تھے کہ وہ کاسب و تاجر قوم تھی، عربی زبان میں قریش کے معنی کسب تجارت کے ہیں چنانچہ
کون نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی قومی پیشہ کی وجہ سے قبل نبوت
تجارت کرتے تھے اور خلفائے راشدین میں سے ابوبکر، عمر، اور عثمان غنی بھی سب تاجر تھے
اور اسی طرح عشرہ مبشرہ کا حال ہے ہمارے اسلاف وائمہ دین سب کے سب تاجر تھے حضرت
تھے چنانچہ امام اعظم علیہ الرحمۃ بزازی کرتے تھے، قریش کی تجارت، اور ... جیسے کہ اس
تجارتی سفر کی وہ وقعت و عزت تھی کہ خدا تعالیٰ نے سورۂ لایلاف میں اس کی قسم
کھائی ہے:۔

"لایلاف قریش ایلافھم رحلۃ الشتاء والصیف"

چونکہ یمن گرم اور شام سرد ملک تھا، اس لئے شتا یعنی جاڑے میں یمن کا اور صیف میں شام کا سفر کرتے
تھے وہاں کے اجناس یہاں اور یہاں کے اجناس وہاں لے جاتے تھے، خدا تعالیٰ نے جہاں
کہیں تجارت کا ذکر کیا ہے اسکو فضل اللہ سے تعبیر کیا ہے چنانچہ سورۂ جمعہ میں فرمایا:۔

"اذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ (ای من التجارۃ)"

دوسرے مقام پر کہا ہے:۔

"وآخرون یضربون فی الارض ویبتغون من فضل اللہ"

نیز احادیث میں اسکے فضائل بے انتہا وارد ہوئے ہیں:

(۱) "التاجر الصدوق یحشر یوم القیامۃ مع النبیین والصدیقین والشہداء"

(۲) "الکاسب حبیب اللہ"

اور یہ ارشاد ہوا ہے کہ ۹۰ حصے رزق تجارت میں ہے۔ اور ماضی قریب کے زمانہ میں
ہمارے علماء اور ائمہ دین نے کبھی نوکری پسند نہ کی۔ یہاں تک کہ بعضوں نے موت کو ترجیح

ترجیح دی۔ امام اعظم کا وہ قصہ مشہور ہے کہ انہوں نے موت اور زد و کوب کو قبول کیا پر منصب قضا کو ترجیح دی تھی۔ علمائے متقدمین جب تک کسی کو عسرت و تنگدستی نہ دیکھتے تھے تعلیم نہ دیتے تھے کہ کہیں علم کو اپنا ذریعۂ معاش بنا کے ذلیل نہ کرے، اور خود دنیاداروں کی نظروں میں محتاجی کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو۔ بہرحال سرکاری نوکریوں پر زور دینا اور قوم کو اس پر جھکا دینا گویا قوم کو برباد اور مبتلائے افلاس، اور ننگ و عار غلامی قوم غیر میں پھنسا دینا ہے۔ قوم کی حریت و آزادی کو چھنوا دینا ہے، اور اس کی قسمت کا چند داموں پر بکوا دینا ہے۔ قوم کو ذلیل و رذیل کرنے کی تجویز اس سے بدتر کوئی نہیں ہو سکتی کہ ہم ان کو نوکریوں کی طرف مائل کریں۔

اسلام میں دو باتوں پر بہت کچھ زور دیا گیا ہے۔ ایک صدق مقال، دوسرا اکل حلال بدون ان کے کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ نوکری میں یہ دونوں مفقود و غیر موجود ہیں۔ نوکری کی کمائی کبھی خالی از شبہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے علمائے اسلام نے اس سے نہایت احتراز کیا ہے۔ اور اس سے اپنے آپ کو جہاں تک ہو سکا بچایا ہے۔ ہمارے آج کل کے قومی رفارمروں نے اسی کو شرف و عزت، ثروت و دولت، مکنت اور موجب نجات آخرت قرار دے لیا ہے۔ اور قوم کو دن رات اسی کی تعلیم و تلقین کرتے رہتے ہیں۔

لا یصلح القوم فوضی لا سراۃ لھم ٭ ولا سراۃ اذا جھالھم سادوا

اذا کان الغراب دلیل قوم ٭ فما یھدیھم الا الضلالا

الحاصل میری نصیحت و وصیت تمام مسلمانوں کو یہی ہے کہ وہ ہرگز غیر اقوام کی غلامی کا عار اپنے اوپر روا نہ رکھیں۔ بلکہ آزاد و احرار رہیں۔ اپنی قومی، ملکی، مذہبی، پیشہ تجارت کو فروغ دیں، اور اسی کو اپنا ذریعۂ معیشت قرار دیں، اس کے بعد زراعت، فلاحت، صنعت اور حرفت کو اپنا پیشہ کریں، ہمارے ہندوستان میں کئی ہزار سال سے یہ مثل زبان زد خاص و عام ہے :- "اتم کھیتی - مدہم بان - چاکری نکشٹ - بھیک ندان" عام خیال یہ ہے کہ ہندوستان چونکہ زراعتی ملک ہے۔ اس لئے زراعت کو تجارت پر ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن میرے خیال میں اس ضرب المثل کے یہ معنے ہو سکتے ہیں کہ "اعلیٰ کھیتی، مدہم بیوپار کے برابر ہے اور چاکری نکشٹ، بھکاری پن، کے مساوی۔ کیونکہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا اور منہ پسارنا ہو۔

(۶) سرسید کا یہ اعتراض کہ مسلمان لالچ اور طمع دیگر یا اور کسی دباؤ سے، شریک کانگریس ہوئے گئے ہیں، محض نا اصل و بے حقیقت ہے، بلکہ جہاں تک میرا علم ہے۔ البتہ کانگریس کی مخالفت کے اظہار میں اس سے کام لیا گیا ہے۔ اور حیدرآباد کی نسبت تو میں یقیناً اس کی شہادت دے سکتا ہوں۔ کیا کوئی گمان کر سکتا ہے کہ سر ہمایوں جاہ بہادر، آنریبل سید محمد، آنریبل بدرالدین طیب جی، رحمت اللہ سیانی، مسٹر قاضی کبیرالدین احمد بیرسٹر، سید شرف الدین بیرسٹر وغیرہم تجار، و زمیندار، و افسران پنشن خوار، ایسے لوگ ہیں کہ کسی لالچ، طمع، یا دباؤ سے شریک کانگریس ہوئے ہیں؟ معاذ اللہ! استغفر اللہ! یقولون بافواہھم مالیس فی قلوبھم"

از قولِ سید کردیم توبہ ۔۔۔ وز فعل او ہم استغفر اللہ

مارا بہ رندی افسانہ کردند ۔۔۔ پیران جاہل شیخان گمراہ

ہماری نسبت بھی بعض ناواقف پنجابی بھائی، اور ممالکِ مغربی و شمالی کے حضرات یہی گمان کر بیٹھے ہیں کہ ہم کسی لالچ یا طمع شہرت کی وجہ سے آج شریک کانگرس ہوئے ہیں۔ مگر ہم نواب محسن الملک بہادر نواب وقار الملک بہادر۔ نواب عماد الملک بہادر، او مولانا شبلی کو اپنی شہادت و گواہی میں پیش کر سکتے ہیں کہ ہم ابتدا سے اسکے شریک اور ہمدرد اور مواقف اور مشفق ہیں۔ اور سرسید کی پالیسی کو قوم و ملک کے مضر خیال کرتے رہے ہیں۔ بلکہ ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ سرسید کے اظہار مخالفت کے پیشتر سے ہم اسکے ممد و معاون رہے ہیں۔ جو شخص ڈیلیگیٹوں کی فہرست کو کانگریس کی سالانہ رپورٹوں میں دیکھے گا۔ اور اُنکی ذاتی حالات و حیثیت سے بھی واقف ہوگا وہ کبھی اس قول کو نظر اعتبار سے نہ دیکھے گا۔ اور ایک لحظ کے لئے بھی باور نہ کریگا۔ بلکہ بچشم عبرت اسپر نظر ڈالیگا۔

(۷) ایک اور توہم یہ ہے کہ اس ایجیٹیشن سے مسلمان، پٹھان، راجپوت۔ مرہٹہ، اور سکھ آمادہ بغاوت ہو جائینگے۔ اور برٹش گورنمنٹ سے برسر پرخاش و فتنہ و فساد ہونگے یہ بھی ایک لا اصل، معنویانہ، مفسدانہ خیال ہے۔ البتہ وہ لوگ جو نیا سے دولت سلطنت کو عدم مساوات وحریت، عدالت پر مبنی رکھنا چاہتے ہیں وہ اسکے بانی مبانی اور محرک ہیں اور ہو سکتے ہیں، درحقیقت جو لوگ براہ خوشامد و پالیسی۔ ایسے تنگ و تاریک خیالات کی اشاعت کرتے ہیں

وہ گورنمنٹ و رعایا دونوں کے بدخواہ اور دونوں کے خائن ہیں۔ اور یقیناً وہ چاہتے ہیں کہ اس حکومت کو روز بروز ضعیف اور بودا کردیں۔ اور سرکار و رعایا کے اتحاد کو مٹا دیں، سرکار کے ترحم، اور رعایا کی وفاداری کو صدمہ پہونچائیں۔ اور مخدوش حالت میں لے آئیں۔ مگر وہ لوگ انجام اور مآل کار کو نہیں سوچتے سمجھتے۔ اُنکے ذاتی اغراض، اور اخلاقی کمزوری ان کو اس غور و فکر سے باز رکھتی ہے۔ صاحبو! کیا کوئی خیال کرسکتا ہے کہ پٹھان، راجپوت، سکھ، مرہٹہ، ایسے نادان ہیں کہ اپنے مصالح کو خیرباد کہہ کر اس مہلکہ میں جا پڑینگے۔ کیا وہ اس بات کو بخوبی نہیں جانتے اور دل سے باور نہیں کرتے کہ اُن کو یہ راحت، یہ رفاہیت، یہ آزادی اور ترقی و تعلیم و ترفہ و تمول کے یہ ذرائع و وسائل، جو برٹش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت میں حاصل و متواصل ہیں۔ نہ کبھی میسر تھے اور نہ ہوسکتے ہیں۔ کیا پٹھان، راجپوت، سکھ، اور مرہٹہ، جسطرح غدر کے قبل، ناواقف و جاہل تھے، آج بھی باوجود اسکے کہ سرکار نے ان کی تربیت و تعلیم پر، اسقدر صرف کیا اور محنت اُٹھائی ہے۔ اور اُن کے مہذب و شائستہ بنانے کی تدابیر کام میں لائی گئی ہیں، اُسی طرح اکھڑ، جاہل، اور بے خبر ہیں؟ اور کیا اُن کے حالات و خیالات میں اب تک کچھ فرق و تبدیلی واقع نہیں ہوئی؟ اور دنیا و مافیہا پر اُن کو کچھ اطلاع بہم نہیں پہونچی؟ کیا وہ اپنی دولت کی خوبیوں سے واقف، اور دوسری دولت کی بُرائیوں اور مظالم سے آگاہ نہیں ہوئے؟ یہ تو گویا درحقیقت سرکار پر ایک بھاری الزام و اعتراض ہے۔ کہ اُس نے باوجود اسقدر مدت تک انتظام ملک اپنے ہاتھ میں رکھنے کے، اپنی رعایا کو اُسی طرح بے خبر و جاہل رکھا ہے، اور اُن کو کچھ تربیت و تعلیم نہیں دی اور اُن کی معلومات و طرز تمدن میں کچھ تبدیلی و ترقی ہونے دی جسکو سرسید نے اپنے ایک سے زیادہ آرٹیکل میں بے پردہ صاف صاف ذکر کیا ہے اور پنجاب یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی کی تجاویز پر اعتراض کرتے ہوئے اس کا اظہار کیا ہے۔

تجویز ٹکنیکل ایڈوکیشن کی مخالفت بھی اسی بدگمانی پر گورنمنٹ کی گئی تھی، جسکی خرافت پر آج پبلک و گورنمنٹ دونوں متفق القول اور متفق الرائے ہیں، بہرحال مخالفین کانگریس کے برخلاف ہم سرکار کو اس الزام سے بری کرتے ہیں اور اُسکے تمام احسانات کو مانتے ہیں

۵ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

ہزار ہزار شکر ہے کہ ہماری سرکار ابد قرار الیسی بیہودہ [illegible]
مخالفین کانگریس کی ایسی ذلیل و رذیل، خوشامد و پاپلوسی ہے۔ وہ ایسی معزز و [illegible]
لائق و فائق مجمع کانگریس کی طرف سے جو نہایت متدین، صادق، وفادار، اور خیر خواہ [illegible]
سرکار ہے بدگمان ہوجائے یا اُسکو ضرر پہونچائے، یا اُسکے بیش قیمتی مشوروں کی قدر
ومنزلت نہ کرے۔ گو یہ لوگ براہِ جہالت و نادانی، یا اخلاقی کمزوری و بزدلی کے سبب
ہمارا ساتھ نہیں مگر ہم اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو بھی اپنی عالی ظرفی سے [illegible]
محروم و بے نصیب نہ رہنے دینگے جو ہماری تجاویز اور درخواستوں پر [illegible]
ہیں پائندہ ہونگے اور یقیناً ہونے والے ہیں۔ سمجھتے کہ بر [illegible] خفتہ [illegible]
ایشان ہمچنان پرداخت۔ کانگریس اور اُسکے مخالفوں کی مثال [illegible]
مثل شیر اور لومڑی کے ہے۔ اُن کی توفیق و توافق کے لئے بارگاہ رب العزت میں
ہماری یہی دعا رہی ہے، اور رہیگی کہ۔

"رب اھد قومی انھم لا یعلمون"

سرسید کے اختلافات کی وجہ جہانتک ہم خیال کرسکتے ہیں یہ تھی کہ [illegible]
کے اہتمام و سرانجام میں اُن کی مدد و معاونت نہیں۔ بلکہ سراسر مخالفت کرتی تھی۔ [illegible]
اُن کو یہ خیال تھا کہ گورنمنٹ سے تائید لیکر اُنکی پورا کرلے اور کوئی [illegible]
کی مخالفت، منافقت، اور نیز نفع حاصل ہونے [illegible] ترجیح دینے کے متعلق، سرسید
ایک حد تک معذور رکھے جاسکتے ہیں، مگر اُن کے پیرو اور معتقدین، جو

بدنام کنندۂ نکونامے چند

کے مصداق ہیں۔ کسطرح قابل استعذار و معافی نہیں خیال کئے جاسکتے۔ اگر یہ تسلیم
بھی کر لیا جائے کہ سرسید کے زمانہ کا مقتضی و مصلحت یہی تھی، تب بھی اس امتداد زمانہ
کی وجہ سے وہ اب کہاں باقی رہسکتی ہے؟ اختلاف زمانہ کی وجہ سے جب مسائل شرعیہ
و احکام فقہیہ بدلجاتے ہیں۔ تو سرسید کے قول کی عدم تبدیل کی کیا معنے؟ بڑا زور اسباب پر
دیا جاتا تھا کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کمی ہے۔ کیا اب اکیس برس کے عہد میں وہی

(وجوہ اختلاف سرسید)

حالت باقی ہے؟ اور کالج کے تین چار سو گریجوائٹ اور دوسری یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتوں کی تعداد نے اس کمی کی تلافی نہیں کی ہے؟ جو لوگ اس بدیہی امر سے انکار کریں اُن کو بجز اسکے کہ یونیورسٹیوں کے کیلنڈروں کے مطالعہ کی ہدایت کیجائے۔ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور مسٹر گلیڈ اسٹون نے نواب محسن الملک بہادر سے یہی کہا تھا کہ یونیورسٹیوں کے کیلنڈر اسکی تکذیب کرتے ہیں۔ بہرحال نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ مصلحت۔ اور نہ سرسید۔ اب جو چند لکیر کے فقیر اُسی کورانہ تقلید کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کی مثال بعینہٖ اُس طبیب حاذق اور اُسکے تلمیذ نالائق کی سی ہے جسنے قراین حال سے مریض کے چنے کہانے پر استدلال کیا تھا اور بظاہر نبض دیکھکر کہا تھا کہ درد شکم کی وجہ مریض کا چنے کہانا ہے۔ شاگرد رشید جو ہمراہ اُستاد تھا استاد سے اس قاعدہ نباضی کی عدم تعلیم کا گلہ وشکوہ کرکے طالب تعلیم ہوئے اُستاد نے کہا یہ کوئی علمی قاعدہ نہیں ہے صرف تفرس اور محض حدس تھا سے علاقہ رکہتا ہے۔ چونکہ میں نے مریض کے آس پاس چنوں کے چھلکے دیکھے یہ خیال کیا کہ ضرور چنے کہائے ہونگے اور اٹکل سے کہدیا۔ شاگرد نے اسکو قاعدۂ کلیہ قرار دے لیا اور اپنے ایک مریض زیر علاج کو جو بوجہ درد شکم نمدے سی سیکا گیا تہا اور اُسکے بستر کے اردگرد نمدے کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ رات کو تو نے نمدہ کہایا ہے اسلئے درد شکم میں اشتداد رہا۔ اب مریض و تیماردار ہر چند حکیم صاحب کو سمجہاتے ہیں کہ حضرت نمدہ بہی کوئی کہاتا ہے اور یہ بہی کوئی کہانے کی چیز ہے مگر حکیم صاحب ہیں کہ ایک نہیں مانتے اور اپنے ہی کہے پر اصرار کئے جاتے اور بگڑ بگڑ کر کہے چلے جاتے ہیں کہ ناممکن ہے کہ نمدہ نہ کہایا ہو۔ یہی حال ہے سرسید کے ان مقلدانِ بے معنی کا مخالفت کانگرس و شرکا کانگرس میں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

خیر! مخالفین کے یہ شبہات وشکوک، اعتراضات وخدشات، تخیلات وتوہمات، قطعاً سراسر پوچ اور بادر ہوا ہیں۔ اور انیابِ اغوال سے زیادہ وقعت نہیں رکہتے۔ جیسا کہ ہمنے ثابت کردیا ہے۔ لیکن ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ کانگرس کی خواہشوں اور درخواستوں کی منظوری اور پوری ہونے کی توقع کہاں تک ہے؟ اور اُسکی کوشش ٹہکانے لگ سکتی ہے۔ یا یہ صرف ایک بیہودہ شور وشغب اور ناسودمند کوشش ہے؟ اور کسبات پر اُس کی کامیابی موقوف ومنحصر ہے۔

ہر ایک امر میں انسان کی کامیابی، اُسکے استقلال وہمت، اور مساعی جمیلہ پر منحصر ہے۔

ہمت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق ؎ باشد بقدرِ ہمتِ تو اعتبارِ تو

ہمت بلند دار کہ مردانِ روزگار ؎ از ہمتِ بلند بجائے رسیدہ اند

"ان اللّٰہ یحب معالی الھمم و یبغض سافلھا"

ذاتی ہمت، استقلال، اور سعی کے علاوہ سرکار و اہلِ ولایت کی توجہ، مہربانی، اور التفات پر بھی کانگریس کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ سو الحمد للہ کہ ممبرانِ کانگریس، اکیس بائیس سال سے جان توڑ کوشش کر رہے ہیں، اور روز بروز شرکائے کانگریس کے حوصلے اور اُن کی تعداد میں برابر ترقی ہو رہی ہے، اب تک باوجود پوری مخالفت و مزاحمت کے اُن کے ارادوں اور ہمتوں میں کسی قسم کی کاستگی و پستی نہیں واقع ہوئی اور باوجود سخت ترین معارضوں کے پوری مقاومت اور ایسی مزاحمت کے مقابلہ میں کی گئی ہے۔ چنانچہ اب مخالفوں کے حوصلے ہی پست ہو گئے، اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں، اور تعلیم یافتہ روشن دماغ مسلمانوں کی شرکت روبہ ترقی ہے۔ اور علیگڈھ کے لیڈر بھی اُسکو دیکھ کر ڈگمگا رہے ہیں۔ کبھی کانفرنس کو اہلِ اسلام کے سیاسی مقاصد کا مرجع کرنا چاہتے ہیں، کبھی جدید مجلس کی اقامت کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، اور کبھی اسی میں شرکت پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اور سرکار کا التفات بھی اس پر یوماً فیوماً زیادہ ہو رہا ہے، اور ولایت کے لوگ بھی مائل و متوجہ ہو چلے ہیں۔ مسٹر ڈبلیو سی بنرجی۔ نوروزجی، اور آنریبل مسٹر گوکھلے کی لگاتار کوششیں اور پیہم اسفارِ ولایت اور پر زور تقریروں نے لنڈن کی پبلک اور سرکاری حلقوں میں اور با اثر لوگوں میں بہت کچھ اثر پیدا کر دیا، اور ہلچل ڈالدی ہے، اور لندن کے معتبر اخبارات بھی ہم صفیر ہوگئے ہیں، جنکا بہت بڑا اثر پبلک اور سرکار کے خیالات و انتظامات پر پڑتا ہے۔ اور بہت سے معزز نامور انگریز و ممبرانِ پارلیمنٹ آمادہ تائید و مساعدت ہو گئے ہیں، جیسے مسٹر ہوم اور سر ولیم وڈربرن، سر ہنری کاٹن، سر چارلس ٹرنر وغیرہم، اور گورنرانِ مدراس و بمبئی، اور گورنر جنرلانِ ہند، اس سے مراعات و تواضع پیش آئے ہیں اور ولایت میں بھی کانگریس کے اغراض سے اتفاق و ہمدردی روز افزوں ہو رہی ہے۔ خصوصاً مسٹر مارلے وزیر اعظم حال کی اسپیچ نے کانگریس کے مقاصد و اغراض میں جان ڈالدی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا، لوگ کانگریس کی تمناؤں اور آرزوؤں سے کیوں دہشت زدہ ہیں

کہا جاتا ہے کہ ہمدردی کی زیادہ ضرورت ہے اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف زبانی لاتع خرچ تک کفایت کی جاوے - بلکہ اسکے معنی ایک مردانہ خواہش کے ہیں - جس سے اُن لوگوں کی طبائع اور خیالات سمجھنے کی کوشش کیجاوے - جن کے اوپر حکومت کرنے کا ہم کو حق دیا گیا ہے ۔ ۔ ۔

میں خوش ہوں کہ گورنمنٹ ہند، برٹش انسٹی ٹیوشن رائج کرنے کی دل سے کوشش کررہی ہے ۔ مگر عجلت کی اُسکو ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تجربہ کار اور ہوشیار ہندوستانیوں کو اعلیٰ ترین عہدے جو انگریزوں کو دئے جاتے ہیں، دینے ۔ ۔ واسطے کارروائی کرنی چاہیئے"۔

ان سب امور سے یہی گمان ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن کانگریس ضرور کامیاب ہوگی اور یہ مخالفتیں کچھ پیش رفت نہ جائینگی - بہرحال کسی قوم کو، گو وہ حکومت کے ہم ملک، وہم مذہب وہم ملت، وہم زبان، ہی کیوں نہو، بدوں جد وجہد کے حقوق ملکی نہیں ملے تو ہم کو بااین ہمہ فقدان اسباب، و تباین آراے اصحاب، کیونکر اور کسطرح اسقدر جلد حقوق ملکی و اختیارات انتظامی مل جائینگے ؟ ہمکو نہایت صبر، تحمل، بردباری، استقلال، ہمت، اور جرأت، سے کام لینا چاہیے اور اپنے ارادوں میں بہت ثابت قدم وراسخ دم رہنا ضرور ہے، ہم کبھی نہ کبھی کامیاب ہوجائینگے ورنہ چپ چاپ ہات پر ہات رکھکر بیٹھ رہنے سے تو عالم اسباب میں کوئی کام نہ بنا ہے نہ بنیگا من جد وجد - من لج ولج -

آخر میں تمام مسلمانوں سے میری وصیت، والتماس، والتجا، واستدعا، یہ ہے کہ :-

"یا ایہا الذین آمنوا - ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان - انہ لکم عدو مبین ولا تعثوا فی الارض مفسدین - کونوا عباد اللہ اخوانا - ولا تفرقوا ا اصبحوا بنعمۃ اخوانا - ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم "

اور ارکان کمشنر کاے کانگریس سے یہ ہے کہ جسطرح وہ آجتک ثابت قدم وراسخ دم رہکر دائمی ومساعی جمیلہ میں سرگرم رہے ہیں - بدستور رہیں - اور تمام مخالفین کا باستقلال تمام - مقابلہ ومقاومت کریں بھائیو ! جبتک اپنے حقوق کے حاصل کرنے میں بذل نفس رجال، اور نفیس مال نہ کرو ہرگز کامیابی کی توقع نہ رکھو - گو تمہارے سامنے پہاڑ حائل ہوں - لیکن ہمم الرجال تقلع الجبال۔

الی ختمت ھذہ الرسالۃ بعد المقال ومن اللہ الاستعانۃ وعلیہ الاتکال ھو الموفق

الی الھدایت من الضلال ولنعم ما قال ۔ ۵

تا نیاشی تخم طاعت، دخل کیش	برنگیری، رنج بیں [illegible]
چشمۂ حیواں بتاریکی درست	دلو اندر بحر دکنج اندر خراب
ہر کہ دائم حلقہ بر در، می زند	تا کشش روزنے بہاشد فتح باب

رفت باید تا بکام دل رسید
شب نشستن تا برآید آفتاب

دیکھئے آپ کیا کہتے ہیں

[illegible] ماہوار رسالہ [illegible] کے پہلے [illegible] پرنہایت اہتمام سے جاری ہوا ہے جو بالکل ولایتی رسالہ جات کے ڈھنگ پر ہے۔ ہندوستان کے نامی اور مشہور اہل قلم احباب کے سالہ مضامین کے علاوہ [illegible] کی ایڈیٹری

ایک تجربہ کار اخبار نویس کے ہاتھ میں ہے

ہر مہینہ خصوصاً ملکی۔ اسلامی۔ تمدنی جیسے ضروری معاملات پر آزادی مگر کمال متانت کے ساتھ بحث کی جاتی ہے۔ کم از کم ایک درجن تصاویر اور کئی دلچسپ کارٹون ماہوار درج ہوتے ہیں۔ علاوہ اسکے انگریزی رسالہ جات اور صحائف کے ترجمے مضمون ہستانہ اپنی جدت سے۔

یورپ بھر میں دھوم مچا رکھی ہے

ہر مہینہ درج ہوتے ہیں۔ ایک باتصویر تاریخ کا سلسلہ جاری ہے دنیا کے مشہور لوگوں کی باتصویر سوانح [illegible] ہوتی ہیں۔ غرض کہ بلحاظ لکھائی چھپائی وغیرہ [illegible] دیدیگا۔

ایک ہزار صفحہ کی انعامی [illegible] کے ساتھ

رسالہ کی سالانہ قیمت ۴ روپیہ صرف رسالہ کی قیمت [illegible] ار کے ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاتا ہے۔ درخواست [illegible] منیجر العزیز و مطبع عزیزی آگرہ ہونا چاہئے۔

اردوی معلیٰ جلد پنجم

از جولائی ۱۹۰۵ء تا دسمبر ۱۹۰۵ء مع رپورٹ ایجی کانگریس قیمت ۲ روپیہ مع محصول۔ دفتر اردوی معلیٰ علیگڈھ سے طلب کرو

اردوی معلیٰ جلد ششم مکمل

از جنوری ۱۹۰۶ء تا جون ۱۹۰۶ء قسم دوم قیمت صرف ۲ روپیہ مع محصول ڈاک

(منیجر اردوی معلیٰ علیگڈھ)

شرح اجرت اشتہار اردوی معلیٰ

	ایک صفحہ یا ۲ کالم	نصف صفحہ یا ایک کالم	نصف کالم
سالانہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ششماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
سہ ماہی	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک بار	[illegible]	[illegible]	فی سطر ۲

دی رئیس ٹریڈنگ کمپنی بہاگلپور

حضرات تجارت پیشہ و ہر خاص و عام کو مژدہ دیا جاتا ہے کہ فی الحال بہاگلپور کے چند زمیندار و رؤسا نے مندرجہ بالا نام کی ایک کمپنی قائم کی ہے جسکی ہر چند نہیں کہ صرف بالذات ہی اس سے مستفید ہوں بلکہ تجارتی دنیا کے لئے نفع بخش ثابت ہو کر رہے۔ منشا اس کمپنی کا یہ ہے کہ ہندوستانی و ولایتی طرز کے سستے پائدار نفیس دیسی شہری کپڑے از قسم لنگی چادرہ دہوتی و صافہ و رومال و دستی و سوتی لہنگا و ساڑیاں ہر قسم ہر رنگ کے تھان ہر قسم و ہر رنگ کا دہوپ چھاں و سادہ و چیک و دوریا و بافتہ وغیرہ لایق تیاری شیروانی اچکن و پاجامہ و کوٹ انگریزی اندرون و بیرون ہندوستان ہر جگہ باسانی پہونچائے جاتے ہیں نفاست و پائداری میں خاص بہاگلپور کا کپڑا آپ ہی اپنا نظیر ہے اور اسقدر مقبول کہ ہر خاص و عام ہو چکا ہے کہ اب زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔ فرمائشی طرز کے کپڑے بھی نمونہ بھیجنے پر بہت جلد مناسب قیمت پر تیار کر دئے جاتے ہیں۔

حضرات پیشہ کے لئے قیمت میں خاص رعایت کی گئی ہے نمونہ ہندوستان و بیرونجات مفت بھیجے جاتے ہیں فرمائشیں ذیل کے پتے سے آنی چاہئیں۔ المشتہر

ڈاکٹر شرافت حسین سکرٹری رئیس ٹریڈنگ کمپنی بہاگلپور محلہ تاتارپور

الرفیق

یہ اردو کا ماہوار رسالہ ملک کے مشہور مضمون نگار مولوی عبدالسلام صاحب رفیقی کے زیر ایڈیٹری رنگون سے شائع ہوتا ہے۔ بڑی تقطیع کے چار سو صفحے سالانہ لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ درجے کی۔ عموماً مضامین نگاروں کو ایک اشرفی سے لیکر سو روپیہ تک انعام دیا جاتا ہے۔ قیمت سالانہ صرف ۴ روپیہ مع محصول ڈاک جو لاگت سے بھی کم ہے۔ نمونہ کے لئے ۲ آنہ کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ اشتہارات کا تصفیہ بذریعہ خط ہو سکتا ہے۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام منیجر ہونی چاہئے۔

شاید حسن۔ ایم۔ منیجر

شیخ محمد عبد الرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور بتیس چیزیں مفت

ناظرین کو خیال ہوگا کہ یہی ریلوی فیشن کی جیبی گھڑی کسیوقت میں دوسرے سوداگر سات روپیہ کو بیچا کرتے تھے لیکن جب ہم نے دساورسے مال خود منگا اور قیمت ہم نے گھٹا دی تب اور سوداگر حسد کو مجبور کرنے لگے مگر کیا ہوتا ہے اب اسکے ہمراہ بتیس چیزیں مفت دیا کریں یہ گھڑی ہم نے بیچنے کی کوک اصلی ڈال سکتے ہیں ڈاک خانہ ریلوی اور تار گھر کے لئے موزوں ہے۔

[illegible] | نیست دانی پانیدکی کلائی پر باندھنے کی [illegible]
[illegible] | چونکی گھڑی [illegible] عمدہ
[illegible] | آفس کلاک آٹھ روزہ چابی دار

کانپور کے ہر قسم کے بوٹ جوتے

[illegible] | لیس بوٹ [illegible] وارنش
[illegible] | [illegible] بوٹ [illegible] پائدار
[illegible] کانپوری [illegible] | [illegible] وارنش مردانی و زنانی
[illegible] | سلیپر [illegible] خوشوضع
[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible] اصلی [illegible]

ہر قسم کے زین

زین [illegible] | [illegible] ساز سامان
[illegible] | [illegible] کیلئے
زین پولو | [illegible] سامان
زین گھوڑدوڑ | [illegible] کا زین [illegible]
زین [illegible] | کرسی دار بچوں کے لئے

کانپور کے ہر قسم کے ساز

ساز [illegible] کانپوری [illegible] نہایت عمدہ قیمت | ساز [illegible] کانپوری [illegible] عمدہ خوبصورت
ساز [illegible] | ساز [illegible] کانپوری [illegible]
ساز [illegible] کانپوری [illegible] | ساز [illegible] کانپوری [illegible]
ساز [illegible] وارنش [illegible] | سوا اسکے ہر قسم کی اشیاء [illegible]

شیخ محمد عبد الرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک

ممیرے کا سرمہ

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل اگزامنر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معزز انگریزوں اور میڈیکل کالج کے پروفیسروں اور نامور ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کے یونیورسٹی کے سند یافتہ [illegible] بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ سرمہ [illegible] کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت و تاریکی چشم دھند جالا [illegible] سیل سرخی ابتدائی موتیا ناخنہ پانی [illegible] خارش وغیرہ [illegible] استعمال سے بینائی بڑھ جاتی ہے اور عینک کی حاجت نہیں رہتی [illegible] لیکر بوڑھے تک یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت فی تولہ [illegible] کے لئے کافی ہے مبلغ دو روپیہ ممیرہ کا سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ [illegible] ہے خالص ممیرہ فی ماشہ [illegible] روپیہ معمری سرمہ فی تولہ [illegible] محصول ڈاک ذمہ خریدار

اشتہار

[illegible] اہلو والیہ مقام [illegible] ضلع گوجرانوالہ پنجاب

[illegible] اور کیا شہادت ہوگی

(۱) [illegible] ممیرے کا سرمہ جو کہ [illegible] صاحب نے خود [illegible] [illegible] مریضوں پر استعمال کرکے دیکھا ہے اور [illegible] [illegible] کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ یہ [illegible] ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید اور آنکھ [illegible] [illegible] [illegible] اپنی تجربہ میں آج تک کوئی سرمہ [illegible] [illegible] دیکھا ہے ان لوگوں کی آنکھوں میں ذرا سی بھی کسی قسم [illegible] [illegible] سرمہ استعمال کرنیکی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح [illegible] ثابت ہوگا پانی آنا دھند خارش سرخی چشم کیواسطے انگریزی [illegible] زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا اور سچ یہ ہے آپنے [illegible] سرمہ ایجاد کرکے ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے [illegible] میں ہونا محال ہو۔ ضرور ہے کہ ملک کے تمام لوگ آپکے سرمہ سے [illegible] ہوکر فائدہ ہو جائے اور ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات حاصل کریں۔

راقم

پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر حضور نواب صاحب بہادر بھوپال

رجسٹرڈ نمبر (۲۵۱)

اردوئے معلی

(علی گڑھ)

نمبر | بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۰۶ء | جلد

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلی علی گڑھ

احسن المطابع واقع علی گڑھ میں طبع ہوا

قسم اول مع دو ادیب ... للعہ سالانہ مع محصول
قسم دوم (معمولی سفید کاغذ) عہر ایضاً

اُردوئے معلیٰ

یعنی صحیح اور فصیح اردو کا ایک قابل دید ماہوار رسالہ تقطیع ۲۶×۲۰ حجم ۵۰ صفحے کاغذ آبوری فنش لکھائی چھپائی بنہایت پسندیدہ

جسکے ساتھ

ہر سال اساتذہ قدیم کے غیر مطبوعہ دواوین میں سے کئی دیوان مع دیباچہ و مقدمہ

بلا قیمت نذر ناظرین ہوتے ہیں

چنانچہ دو سال میں دیوان حسرت۔ ریورٹ بمبئی کانگرس۔ دیوان سوز۔ دیوان قائم اور دیوان شیفتہ نذر ہو چکے ہیں

مقاصد ضروری منجملہ دیگر مقاصد لٹریچر و پالٹیکس

قیمت سالانہ
(۱) رسالہ مع دواوین اول درجے کے کاغذ پر ... للعہ سالانہ مع محصول — نمونہ قسم اول ... ۲/
(۲) صرف رسالہ ″ ″ ″ ″ ″ عہ
(۳) ″ ″ دوم درجے کے کاغذ پر ″ ″ عہ — نمونہ قسم دوم بلا قیمت

درخواست خریداری بنام سید فضل الحسن حسرت موہانی بی۔اے اڈیٹر اردوئے معلیٰ

(۱) دیوان غالب (طبع ثانی)

مع شرح دیوان

تقطیع $\frac{۲۰×۲۶}{۸}$ حجم تقریباً ۱۲ جزو۔ کاغذ معمولی سفید صرف عہ مع محصول ڈاک و خرچ ویلیو میں منیجر اردوئے معلیٰ سے ملسکتا ہے۔

فہرست مضامین:۔ (۱) دیباچہ (۲) مقدمہ (الف) غالب کے حالات (ب) غالب کی شاعری (۳) دیوان مع شرح (۴) ضمیمہ یعنی وہ غزلیں اور اشعار جو مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہیں۔

نوٹ۔ طبع ثانی میں تقطیع پہلے سے بڑی کردیگئی ہے۔ اور مطالب اشعار میں زیادہ توضیح و تشریح کے علاوہ مفید ترمیم بھی کردیگئی ہے۔

(۲) دیوان مصحفی | ماخوذ از دیوان اول و دوم و سوم تقطیع ۲۲×۱۸ حجم ۶ جزو قیمت ۸/ مع محصول۔

(۳) دیوان شیفتہ | مع مقدمہ مفید و ضمیمہ مشتمل بر غزلیات فارسی شیفتہ تقطیع $\frac{۲۲×۱۹}{۸}$ حجم ۶ جزو قیمت ۸/ مع محصول

(۴) دیوان حسرت | آثار و جرات مع مقدمہ مرتبہ حسرت ۴/ ″

(۵) دیوان میر سوز | استاد مشہور مع مقدمہ ″ ۳/ ″

(۶) دیوان قائم۔ | چاندپوری شاگرد رشید سودا ″ ″ ۴/ ″

۷۔ ریورٹ اردو بمبئی کانگرس مکمل مرتبہ ″ ″ ۸/ ″

۸۔ اردوئے معلی جلد پنجم قسم اول از جولائی تا دسمبر ۱۹۰۶ء ″ عہ

۹ ″ ″ جلد ششم قسم دوم از جنوری تا جون ۱۹۰۷ء عہ

۱۰۔ انوار العیون ملفوظات مخدوم احمد عبدالحق ردولوی ۸/ ″

اخبار الکیمیا مالیر کوٹلہ

اس نام کا ایک طبی اور کیمیائی مضامین کا دلچسپ اخبار ہے جس میں علم کیمیا مشرقی اور مغربی کے متعلق محققانہ بحث ہوتی ہے علاوہ ہندوستان کے مسلم و مستند حکماء و اطبا کے مضامین و مراسلات بھی درج ہوتے ہیں اور جسکا کام مایوس مریضوں کو مفت مشورہ دینے اور ہر ایک قسم کے طبی و کیمیائی سوالات کا جواب لکھنے کے علاوہ کیمیا کے سربستہ و مخفی رازوں کا اظہار کرتا ہے کہ جنکا اکثر شائقین اسکے جاننے والے پریشان گذرتا ہے اور بڑے بڑے علماء و حکماء نے اسے ایک معزز اور قابل قدر اخبار مانا ہے۔ نمونہ مفت منگوا کر ملاحظہ فرماویں۔ قیمت سالانہ عاً۔ درخواست بھیجنے کا پتہ۔

دوست محمد خان اڈیٹر اخبار الکیمیا مالیر کوٹلہ

رسالہ الاخلاق آگرہ

ہندو مسلمانوں کو متحد بنانیوالا ہندوستانیوں کی اصلی تہذیب اخلاق پھیلانیوالا۔ اتفاق و اتحاد کا حامی تعصب و نفاق کا دشمن۔ غرضکہ کل ہندوستانیوں کو ایک قوم بنانیوالا آگرہ کا باتصویر ماہوار رسالہ ۱۸×۲۲ کی تقطیع کے ڈیڑھ جزو پر تین سال سے ہر مہینے کی ۵ تاریخ کو نہایت آب و تاب سے شائع ہوتا ہے لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ کاغذ ولایتی درجہ اول ہر ماہ کسی نہ کسی مشہور شخص کی تصویر بھی شائع ہوتی ہے قیمت سالانہ بہت کم عوام کو عہ طلبا کو بشرط تصدیق عہ ممالک غیر سے ہر محصول ڈاک مقرر ہے۔ نمونہ کے لئے ۱/ کا ٹکٹ آنا ضروری ہے بلا ٹکٹ کوئی صاحب نمونہ نہ طلب فرمائیں المشتہر

منیجر رسالہ "الاخلاق" آگرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حکیم آغا حسن ازل لکھنوی

(از سنہ ۱۲۳۴ تا سنہ ۱۳۱۴ھ)

نام و خاندان | میرزا آغا حسن نام ازل تخلص خلف میرزا عباس لکھنوی نواب مرزا شوق صاحب زہر عشق کے داماد اور صبا کے شاگرد تھے استاد کے حکم سے کبھی کبھی خواجہ آتش کو بھی اپنا کلام دکھاتے تھے۔

لیاقت و مشاغل | حضرت ازل کا زمانہ طالب علمی و شباب لکھنؤ میں بسر ہوا تھا۔ فارغ التحصیل نہ تھے تاہم عربیت اچھی تھی اور تجربہ کار خاندانی طبیب تھے چنانچہ آخر میں تخمیناً تیس سال عظیم آباد و بہار میں باوقات مختلف بسلسلہ طبابت قیام رہا اور وہیں سے بیمار ہو کر لکھنؤ گئے اور اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

وضع و خصائل | خوش رو، وضعدار۔ لکھنؤ کی قدیم وضع، دو پلی ٹوپی، چُنا ہوا انگرکھا، گیتلا جوتا، بالوں میں خضاب، نہایت منکسر مزاج اور اول درجے کے خلیق تھے۔ کبھی تنہا رہنا پسند نہ کرتے تھے اور ہر وقت چائے حقہ پان کا دور دورہ اور آس پاس لوگوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ شیعہ مذہب تھے لیکن قیام بہار کے زمانے میں کسی مصلحت سے بظاہر تبدیل مذہب کر کے سُنی ہو گئے تھے اور حضرت شاہ امین احمد فردوس مرحوم کے ہاتھ پر، جو اسوقت حضرت مخدوم بہاری کے سجادہ نشین تھے، بیعت بھی کر لی تھی مگر آخر وقت میں اپنے تقیہ و مذہب امامیہ کا اعلان کر کے لکھنؤ میں انتقال کیا۔

تصانیف | آپکا دیوان ضیائے تمنا عرف پرکالۂ آتش۔ ۲۰۷ صفحوں میں چھپکر شرف پریس بہار سے شائع ہوا۔ ایک قومی مسدس عظیم آباد میں چھپا اور ایک مثنوی سحر عشق نام مرحوم کے نواسوں یعنی حکیم واجد حسین نظر اور مہدی حسن احسن کے اہتمام سے لکھنؤ میں چھپی۔ یہ مثنوی زہر عشق کے طرز پر لکھی گئی ہے اور دیکھنے کے قابل ہے۔

کلام کی بربادی | جسطرح مصحفی کی حکایتیں مشہور ہیں، مرحوم کی بھی غزلیں فروخت ہوا کرتی تھیں اور جب بعض شاگرد اس بے پروائی پر اعتراض اور ترتیب دیوان پر اصرار کرتے تھے تو آپ کہتے تھے کہ بھائی مجھے روپے ملتے ہیں۔ شعر ہر وقت کہتا ہوں۔ دیوان مرتب کرنا اختیار میں ہے۔ روپے تو نہیں ڈھال سکتا۔ آخر عمر میں آپ کے ایک شاگرد رشید نے قسم لی کہ جو غزل داخل دیوان ہو جائے پھر کسی کو نہ دیجائے اور اسطور پر بڑی محنت سے ایک ضخیم کلیات مرتب ہوا اور چھپنے کیلئے مطبع بھیجا گیا لیکن

افسوس کہ حیات نے وفا نہ کی۔ مرحوم نے لکھنؤ جا کر سفر آخرت اختیار کیا اور ادھر یاروں کو موقع ملا اور چوری سے یا بزرگوں کا تبرک سمجھکر آپکا کلام تقسیم کر لیا۔ جس مختصر دیوان کا ذکر ہمنے اس مضمون میں کیا ہے وہ اُسی کلیات کے بعض ابتر اجزا سے مرتب کیا گیا اور آپکے بعد شائع ہوا۔ اس دیوان کی زیادہ اشاعت نہ ہوئی اور ہوتی کیونکر۔ اچھا کلام تو ضائع ہو گیا اور معمولی کلام نے دیوان میں جگہ پائی اور حضرت ازل کو "اپنی جگہ سے بہت نیچے دکھایا"

ازل کی شاعری | سادگی اور صفائی حضرت ازل کی شاعری کا خاص جوہر ہے۔ اور یہ وہ مسلک ہے جسے عہد آخر کے بعض شاعروں نے اسقدر پسند کیا اور کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک تراکیب فارسی سے کلام کا پاک ہونا اردو شاعری کا خاص حسن سمجھا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

غیر کی آنکھوں میں جب نشتر لگایا جائیگا
ہم تمہیں سے پوچھتے ہیں ہمسے دیکھا جائیگا

میں تو جاؤں کوچۂ دلدار میں آنکھوں کے بل
ضعف کہتا ہے کہ بیٹھے بھی نہ جایا جائیگا

کیا گھٹا چھائی ہوئی ہے میکدے پر آج کل
ہو خفا زاہد بلا سے اب تو بندا جائیگا

دل دیا ہے آپ نے اک بت کو سنتے ہیں ازل
یہ تو کہیے ناز بھی اسکا اٹھایا جائے گا

کیوں شب وصل میں آتی نہیں گھنگھور گھٹا
چھپتی پھرتی ہے پہاڑوں میں کہاں جو گھٹا

کعبۂ دل میں بتوں کو نہ ازل جا دینا
راہ پر بھی جو یہ آئیں تو نہ رستا دینا

آئینہ لیکے ذرا چاند سی صورت دیکھو
ایسی آنکھوں میں تو اندھیر ہے سرما دینا

اب ملا ہے تجھے محبوب وہ نایاب حضور
آپ کیا حضرت یوسف کو بھی آداب حضور

پیجئے پیجئے برسات میں توبہ کیسی
کیا گھٹا آئی ہے منگواؤں مے ناب حضور

لائیے گور غریباں پہ نہ غیروں کو مدام
سونے سوتے کہیں مردے نہ ہوں بدخواب حضور

پیر ہوں میں نہ دستگیر ہوں میں
خانہ بردوش اک فقیر ہوں میں

حال گلشن نہ پوچھ اے بلبل
ایک مدت ہوئی اسیر ہوں میں

منہ ازل عشق سے موڑو تو سہی
ہو گی راحت اسے چھوڑو تو سہی

یہ ہمیں ہیں کہ نہیں کچھ کہتے
دل کسی اور کا توڑو تو سہی

پھر تمہارا میں وہی عاشق ہوں	ساتھ تم غیر کا چھوڑ دو تو سہی
کہتے ہیں وہ نہ انگوٹھی دونگا	اب مرا ہاتھ مروڑ دو تو سہی
ہنس پڑینگے وہ ازل سوتے ہیں	گدگداؤ تو جھنجھوڑ دو تو سہی
تجھکو ظالم مری پروا ہی نہیں	اسلئے دل تجھے دیتا ہی نہیں
اور سے بھی تو رہے راز و نیاز	ایک عاشق ترا بندا ہی نہیں
زیر خنجر سے تجھے کیونکر دیکھوں	ہاتھ قاتل ترا رکتا ہی نہیں
شب فرقت میں خدا خیر کرے	دل سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں
یونتو رہتی تھی در یار پہ بیٹھ	آج سنتے ہیں کہ رستا ہی نہیں
قبر سے آتی صدا اے لبیک	سے تمنے تربت پہ پکارا ہی نہیں
کسطرح وصل کو اس سے میں کہوں	بات مطلب کی تو سنتا ہی نہیں

اس زمین میں حضرت ازل کا ایک ۲۰ شعر کا ایک سہ غزلہ ہے جسکے مندرجہ بالا سات منتخب اشعار کو مشتری طوائف معروف لکھنوی نے آخر شعر میں مشتری تخلص ڈالکر اپنا کر لیا اور سینے ہی کے ایک گلدستے (خانہ عشاق) میں چھپنے کے لئے بھیجدیا۔ طرفہ تر یہ کہ جب مشتری کے استاد آغا علی شمس سے مالک گلدستہ نے شکایت کی تو انہوں نے تنبیہ کے بجائے اپنی شاگردہ کیطرف سے توارد کا عجیب غریب عذر پیش کیا اور مدت تک اخباروں میں بحث جاری رہی آخر کار شمس نے معافی مانگی اور حضرت داغ کی سفارش کے خطوط آئے۔ حضرت ازل فیاض تو تھے ہی کہنے لگے "چھوڑ دو یہی ان اشعار کو دیوان سے" لیکن صفیر بلگرامی شاغل دہلوی فریاد عظیم آبادی فسون دہلوی۔ وحید الہ آبادی وغیرہ نے اس امر سے اختلاف کیا ترتیب دیوان کیوقت بھی سید شاہ عبد الرحمن حفیظ عظیم آبادی شاگرد رشید حضرت ازل اور مہدی حسن احسن سلمہ اللہ تعالیٰ کے اصرار سے یہ اشعار دیوان میں قائم رکھے گئے۔ فقط

مکتوبات امیر مینائی - (حضرت کوثر خیر آبادی کے نام)

گرامی گوہرا - امروز سختے فرصت دست داد تا نظر بریں گہر ریزہ ہا افگندم و دریں نظر ہر چہ از دلم بزبان آمد بقلم سپردم ہجوم کار و مکروہات رخصت نوشتن وجوہ محو و اثبات نمیدہد و نیز بر استعداد و سلامت و رسائی ذہن سامی اعتماد ہاست البتہ جائیکہ ذکر کار نکند و غلطی نے بماند

بازش باید پس حق تعالیٰ در عمر و جمعیت خاطر گرامی بیفزاید - امیر فقیر عفی عنہ - یکم فروری ۱۹۰۰ء
(۲) نسیامی کوثر سلامت - کل محبت نامہ آیا ممنوں کیا جو شبہات آپ نے لکھے ہیں اُنمیں سے بعض تو میں رفع کئے دیتا ہوں اور بعض اسپر موقوف ہیں کہ پورا شعر اپنا اور اصلاح میری لکھیے واضح ہو کہ دکھائے پہرتے او دہار ہم بھی ہیں " محاورہ فصحا کا نہیں ہے اور بندش بھی تعقید سے خالی نہیں کہاں پھرتے ادہر اور ہیں اُدہر او بیچ میں اُدہار ہم بھی خوشنما نہیں صحیح ہونے میں شک نہیں - جا ہو رہنے دو - " سیہ بختی میں عدیم المثل " سیہ بختی میں یاے تحتانی کا اسقاط نہ چاہیے ترکیب فارسی ہے اگرچہ بعض اساتذہ اُردو کے کلام میں سند ملتی ہے مگر کیا ضرور ہے - نباشد جزبتو اے شوخ عیار - اسمیں اگر جز بتو پسند نہیں تو غیر تو رکہیے کچہ مضائقہ نہیں - منشی ریاض احمد صاحب کا دیوان جسقدر ہے مجہے بہیجا تہا اُتنا رکہ لیا مابقی ابھی آیا نہیں بلکہ سوا مہینے سے کوئی خط ہی نہیں آیا - اخبار ادیب ہندوستان کے اچہے ہونے میں شک نہیں مگر بغیر جمع ہوے درخواستوں کے محض اس امید پر کہ اشاعت کے بعد رونق ہوگی، جرات نہیں پڑتی ایک بار بہت نقصان اُٹھا چکا ہوں - سب احباب کو ماو بہ - جناب برادر صاحب قبلہ سلام و شوق اور استادی منشی صاحب قبلہ بہی سلام و دعا فرماتے ہیں - امیر فقیر

بیاض حسرت

(ماخوذ از تذکرہ مصحفی) شیخ ولی اللہ محب شاہجہاں آبادی (شعر را بمتانت و پختگی تمام میگفت)

اسے ذبح کرنے دیجو تو نہ منہ سے آہ کیجو	جو یہ رسم عاشقی ہے تو محب نباہ کیجو
یہ امید وار کبتک جیئے اتنی آرزو میں	کبھی مرکے اسطرف بھی تو ذرا نگاہ کیجو

ظہور اللہ خاں نوا بدایونی - از حضور جہاں ارشاہ خطاب خوش فکر خانی یافتہ نقیر را عمو گوید (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

اب اشک تو کہاں ہے جو جا ہوں ٹپک پڑے	آنکھوں سے وقت گریہ مگر خوں ٹپک پڑے

محمد امان آشنا رشاگرد شاہ حاتم (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

خنجر نہ کمر میں نہ وہ تلوار رکہی ہے	نظروں ہی میں چاہیے ہے جسے مار رکہی ہے

نواب محبت خاں محبت (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

تجھکو چھوڑ اے بت مغرور نہیں جانیکا	نقط	جاؤں تو پر مجھے مقدور نہیں جانیکا

گلشن ہند

مقدمہ و ریویو

یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر تذکرہ ہے اور نایاب ہے جسکا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں اور ایک انڈیا آفس کی لائبریری میں ہے اور ہندوستان بھر میں ایک ہی نسخہ ہے جو اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں خود بے بضاعت تاہم اس فرمائش کو جو انہوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا اور بسر و چشم قبول کیا۔

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد اور امیر الممالک لارڈ وارن ہسٹنگز گورنر جنرل کے زمانہ میں علی ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ریختہ کا فارسی میں لکھا تھا۔ اور اسکا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۴ء میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کی بڑی قدردان اور محسن مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا انہوں نے مولف تذکرہ ہذا سے فرمائش کی کہ اگر اسکا ترجمہ سلیس اردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ انکا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں اور ان میں اردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اسطرح یہ کتاب اردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ نرا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اسمیں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ حالات میں بھی اور کلام میں بھی جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے۔

یہ تالیف اس زمانہ میں ہوئی جب کہ دلی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنو میں نواب سعادت علیخاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بیکسی کی حالت میں تھے اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلی کے اہل کمال اپنے وطن سے منہ موڑ اسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے جب

حاشیہ مولوی عبداللہ خانصاحب۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن۔

زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادہر کے اساتذہ جو پہنچے تو انہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادتعلیخاں جیسا عالی دماغ متین نظم او کلام کرنے والا شخص بہی کی اثر سے نہ بچا۔ باوجود اسکے انشاء اللہ خاں نے جو ہزار پھکڑ و نکا ایک پھکڑ تھا آخر انہیں اپنے کوں نہ رنگا کہہ ہی دیا۔

میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہی مقطع تیرا میرا میل نہیں

کہتے ہیں کہ یہ اردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک۔ لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جسکے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی عروج تو اسلئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی اور صاف و شستہ ہوتی جاتی تھی اور زوال اس خیال سے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص اسکے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہولئے شاعری بس اسیکا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہو۔ قافیہ کو اچھی طرح نبھا دیا ایک آدہ محاورہ آگیا یا نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہدی۔ کبھی کبھا ر ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارہ کا استعمال ہو گیا۔ رہا مضمون سو خدا کے فضل سے اسمیں برکت ہی برکت تھی اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے کیونکہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اسکے لیے سند طلب کرتے ہیں جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم پر تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اسمیں شک نہیں کہ یوں شعرا کی محنت سے زبان صاف ہو گئی لیکن اردو شاعری کی طرح ٹہہر کے رہ گئی اور جو حد کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اسکے گرد باندہ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکے۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری کا دعوے ہے اردو کے استاد ہیں مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں۔ دیوان اردو ہی مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں۔ کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک ہے) سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے مکتبوں میں تعلیم فارسی۔ یہانتک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی۔ اب اردو کی وسعت ہو تو کیونکر ہو۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جسکا تسلط اسوقت ہندوستان پر اسطرح بڑھتا
چلا جاتا تھا جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔ اس نے اُردو کی دستگیری کی۔
اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے
کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی۔ جان جہاں تک
بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے اسیکا دور دورہ تھا علاوہ اسکے ہندوستان کی جدید زبانوں میں
سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی اس لئے انہوں نے اسکی سرپرستی کی۔ اُنیسویں صدی کے شروع
میں بمقام فورٹ ولیم کلکتہ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلگرسٹ کا ہے۔ جس نے ایک ایک
محکمہ قائم کیا جسکا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں اُنکی
تعلیم کے لئے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ اور غالبًا یہ اسی شخص کا
احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے اور یاد
رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی تھیتی زبان تھی ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل
کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی اور دوسرے دور میں اُردو نے ایک انگریز کی وساطت
سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اُسوقت کے قابل قابل لوگ بہم پہونچا کے
اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا لکھنا اسیوقت سے شروع ہوا
اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو احسان ولی نے اُردو نظم پر کیا تھا اس سے زیادہ نہیں تو
اسیقدر احسان ڈاکٹر جان گلگرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے۔

چونکہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا۔ لہذا اس مقام پر مختصرًا
یہ بیان کرنا کہ اسکی نگرانی میں یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا اور اُردو زبان میں کس
قدر اضافہ ہوا نامناسب نہو گا۔

اس سلسلہ میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۱ء
میں توتا کہانی لکھی جو اصل میں انہوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن
نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانہ میں دکھنی زبان میں لکھا تھا۔ مگر ماخذ اسکا ایک سنسکرت
کتاب ہے۔ آرائش محفل یعنی مشہور قصہ حاتم بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے

انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گلِ مغفرت یا دہ خلص مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہارِ دانش کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے جسکا نام گلزارِ دانش ہے ایک اور کتاب تاریخِ نادری اردو میں لکھی یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے۔

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انہوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور معروف مثنوی سحرالبیان (قصہ بدرِ منیر و بے نظیر) کو اردو نثر میں لکھا ہے اور اس کا نام نثرِ بے نظیر رکھا ہے اور ایک اور کتاب اخلاقِ ہندی کے نام سے لکھی ہے۔ اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء میں لکھی گئیں۔

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔ احمد شاہ درانی کے زمانہ میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ آرہے یہاں سے ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء و ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اسکا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا۔ بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی دکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا اور اس کا نام نوطرزِ مرصع رکھا تھا میر امن نے اخلاقِ محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنجِ خوبی بھی اسی زمانہ میں لکھی حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے ۱۸۰۳ء میں انہوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیارِ دانش کا ترجمہ اردو میں کیا اور خرد افروز اسکا نام رکھا اصل کتاب سنسکرت میں ہے اور عربی میں کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی اس سلسلہ میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر انکے بیٹے میر نوازش علیخاں کے ہاں ملازم رہے اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیاں میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے مگر جب شاہزادہ عالم کا کوچ شاہجہاں آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے لہذا ان کو میر حیدر علی حیران سے ہے اور بعض کا قول

ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ ۱۷۹۸ء میں صاحب عالیشان بارلو صاحب نے گلکرسٹ کے مشورے سے زبان دانان ریختہ لکھنؤ سے طلب فرمائے چنانچہ رزیڈنٹ لکھنؤ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کرکے پانسو روپیہ خرچ راہ دیا اور کلکتہ روانہ کیا سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انہوں نے ایک قابل قدر کتاب آرائش محفل لکھی۔ جسمیں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے۔ اور مرنے سے سال بھر پہلے (یعنی سنہ ۱۸۰۸ء) سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے اُردو زبان میں کیا۔

نہال چند نے سنہ ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاولی کو اُردو نثر میں لکھا اور نام اسکا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے بعد ازاں لکھنؤ میں آئے اور وہاں سے سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج آئے انہوں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاشا میں (سنہ ۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی اسکا یہ ترجمہ ہے انہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی کہا ہے اور اسمیں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے جسکا نام دستور ہند ہے اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے سنہ ۱۸۱۰ء میں اخوان الصفا کے ایک رسالہ کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا۔ جسمیں شاہ اجنہ کے سامنے انسان وحیوان کا جھگڑا پیش ہے۔ کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے

سری لالو گجرات کا برہمن تھا جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں مثلاً پریم ساگر و راج نیتی و لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں سنگھاسن بتیسی سری لالو اور جوان نے ملکر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی جو آدہی اُردو اور آدہی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے اور نیز ولا کے مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اسکے خود گلکرسٹ نے (۱۸۱۰ء میں) اردو کی لغت لکھی۔ زبان کے بعض قواعد لکھے اور مختلف طرح سے اردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے اول ہی ایک شخص فرگس نامی نے اردو کی ایک لغت لکھی تھی جو ہندی کا تھی ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی جنرل ولیم کرک پیٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا۔ جسکے انہوں نے تین حصے کئے۔ مگر اسکا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آگئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنیکے لئے انہیں ناگری ٹائپ کا انتظام تھا وہ جلد تیار نہو سکا اور کتاب ناقص رہ گئی۔

یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں۔ تو چاہا کہ دونوں ملکر اسے انجام دیں مگر چونکہ انہیں بہت سے کام کرنے تھے اسلئے تھوڑے دنوں بعد وہ الگ ہوگئے اور ڈاکٹر گلکرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ "انگریزی ہندوستانی" لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۰ء میں چھاپ دیا۔ مگر دوسری جلد "ہندوستانی انگریزی" لغت ختم نکر سکے۔

علاوہ ان تمام دقتوں کے جنسے وہ گھبرا گئے تھے۔ ایک وقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے صرف ۲۰ صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالانکہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت افسوس و حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اسکے بعد میجر ڈیوڈ طامس رچرڈس سپرنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری ایکاڈمی نے اردو لغت لکھنی شروع کی مگر افسوس کہ اسکا بھی وہی حشر ہوا اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔

اسکے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی آدمیوں کی امداد سے نظر ثانی کر کے چھپوایا۔ گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شکسپیر نے ایک اردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی۔ یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت ہی سے ماخوذ ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی برٹرنڈ نے

بھی ایک لغت لکھی جو پیرس میں ۱۸۵۰ء میں شائع ہوئی۔ براؤن کی لغت ۱۸۶۲ء میں لندن میں
چھپی۔ پلیٹس نے بھی ایک لغت لکھی ہے جسکے طبع ہونے کا سن معلوم نہیں۔ اسی زمانہ میں
ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھے۔ انکی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے
بہتر ہے یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو ایک دو لغات لکھے ہیں ان میں بھی زیادہ تر فیلن
کا تتبع کیا گیا ہے بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمہ میں جو انگریزوں کے اس احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے
کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں
کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی اور اسکے ترقی دینے میں انہوں نے حتی الامکان کوشش
کی۔ میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے اور وہ ہمنے اسی تذکرہ سے لیا ہے۔ میر کے
حال میں لکھا ہے " جن ایام میں کہ درخواست صاحبان عالیشان کی زبان دانان ریختہ کے
مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی
لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول کے محمول ہوئے اور جوانان نومشق مرلی
گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے
اکثر اہل لکھنؤ پکارتے رہتے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست خالی ہے" غالباً
اسی جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا۔ کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا!
چونکہ انکی نظم میں انتہا درجہ کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے
اسلئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جاکر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل
زباں انکی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے اور اردو زبان میں ایک عجیب اور قابل
قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خاں محبت خلف الرشید نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی ذکر
میں لکھا ہے کہ انہوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمائش سے قصہ سسی پنوں
کا اردو میں نظم کیا اور نام اسکا اسرار محبت رکھا۔

میر قمر الدین منت کے حال میں درج ہے کہ انہوں نے میر محمد حسین فرنگی لقب کے

توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر مالنسین کے سرکار میں توسل حاصل کیا اور انکی رفاقت میں کلکتے آکر نواب والا دولت گورنر مسٹر ہسٹنگز (ہسٹنگز) بلادت جنگ بہادر کی اعانت سے پیشکار نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔

اس زمانہ میں علاوہ ڈاکٹر فالن کے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کرنل ہالرائڈ سابق ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بہت مفید اور بہادرانہ کی سلسلہ تعلیم کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں۔ انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں اور اسمیں مفید اور نیک مشورہ دیا کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا اور اسمیں کارآمد اصلاحیں کیں اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قائم کی جسمیں نیچرل مضامین پر عمدہ نظمیں لکھوائیں شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے۔ اسی لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر کی طرح اردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آجکل مسٹر بل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اردو کی صدارت قبول فرما کر اردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں ہے۔

اسی سلسلہ میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھ سے ہوا اور جسکا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ۔

سب سے اول اردو کتابیں بھی انہوں نے چھپوائیں۔ اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں۔ اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ اور اسکی جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوئی تھیں وہیں چھپتی تھیں۔ اسکے بعد لیتھوگراف پریس سب سے پہلے دلی میں ۱۸۳۷ء میں استعمال ہوا۔ اور اسکے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی۔

وہ انگریز حاکم جسنے اس ملک میں آکر جو اردو کا تیسرا موجد اور وطن مالوفہ ہے، اسی دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہا تھا سخت غلطی پر تھا۔ وہ اگر اس زبان کی تاریخ سے واقف

ہوتا اور یہ جانتا کہ اُسکے واجب التعظیم بزرگوں نے اسکے حاصل کرنے اور آراستہ و شستہ بنانے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب و غریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب و غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے۔ اسپر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے۔ ہندو اس کی ماں ہیں مسلمان اسکے باوا ہیں اور انگریز اسکے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اسکی مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں جو تینوں کی اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں جب تک ہندو مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں کم سے کم اُسوقت تک یہ زبان ضرور قائم رہیگی۔

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے دیباچہ میں تو ذکر ہی نہیں شعرا کے سلسلہ میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلہ میں بالکل کم اور ناکافی ہے۔ البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھکر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہذا ہمنے کچھ اُنکے کلام ہی سے کچھ اِدہر اُدہر سے تہوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے۔

نام میرزا علی تخلص لطف تہا۔ انکے والد کاظم بیگ خان استرآباد کے رہنے والے تہے ۱۱۵۲ھ میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہان آباد تشریف لائے۔ اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تہے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تہے۔ میرزا لطف دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تہا مگر چونکہ مسٹر گلکرسٹ[1] نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھسے اس تذکرہ کے لکھنے کی فرمائش کی لہذا میں نے بسر و چشم قبول کیا۔ اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۱ء کے ہیں عہد سلطنت قائم ہے اُسی بادشاہ روشندل خداپرست سے،، پہر اسکے بعد نواب سعادت علیخاں بہادر کا ذکر کیا ہے اور بعد ازاں مارکوئس آف ولزلی گورنر جنرل ہند کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے نام نامی اور اسم گرامی اسکا اوپر مذکور ہوا ہے اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مرتب

[1] ڈاکٹر جان گلکرسٹ۔

نے ۱۲۱۵ء میں ترتیب دیا۔ مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ ہجری میں لکھی گئی ۔

حیراں بہار ہیں سب سرو پا ہمن اور سے
تاریخ اسکی سب سے کہ رشک بہشت ہے

۱۲۱۵

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے - دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمائش کے بعد نہیں تو اول ضرور حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے کیونکہ انکے کلام میں وہ قصائد مدح میں ہیں جو انہوں نے امیر الاعظم ارسطوجاہ اور میر عالم کی مدح میں کہے تھے - امیر الاعظم مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۵ء میں وزیر مقرر ہوئے - اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف اس زمانے میں حیدر آباد چلے گئے تھے - چونکہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا یا اہل حیدر آباد سے اسلئے انہوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے ۔

ہوا آوارہ ہندستاں سو لطف آگے خدا جانے
دکن کے سازلوں نے مارا یا انگلش کے گروں نے

جو قصیدہ انہوں نے اعظم الامرا ارسطوجاہ کی مدح میں کہا ہے اس سے معلوم ہوتا کہ پہلے بھی وہ فراغبال اور خوشحال تھے اور دکن میں جاکر ارسطوجاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے اضافہ کی درخواست کرتے ہیں اور بڑی زد سے لکھتے ہیں ۔

کل ہی کی بات ہے یہ مسافر وطن میں تھا
سو دہ سوا سے سنا کا حق بندگی گزار

شکر خدا کہ آج بیک بینی و دو گوش
گرچہ دکن میں ہے نہیں ہر در پہ خوار زار

ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکون
لازم و گرنہ تھا بشریت کو اضطرار

. . . .

اس سے سامعہ خراشی سے مجھکو جو ہے غرض
سو یہ ہے اے امیر فلک قدر وسکے تبار

سرکار سے تری جو زراہ تفضلات
ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند ہاے شکر سے پر سہ میں کیا کروں
جز طرح اسمیں کاٹتا ہوں لیل اور نہار

ہے گفتگو بجا اس تو ان ذیرہ سرمیں سے
ہوکر سوار جیاتی پہ لیجاتے ہیں کہار

خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو ستور ہے کئی دن میں زباں پہ پھر
مثل مجردات فقط اُن کا ہے شمار

تجھ سا جو قدر دان نکات اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار

فضل و ہنر جو مجھ میں ہیں وہ سب بیک طرف
اور قدر دانیاں ہی ترے سب بیک کنار

ہے ہمت بلند کا تیرے جو اقتضا
اس امر میں تو ہے سبجھے آئندہ اختیار

ورنہ کہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے
بالفعل تو اضافہ کا ہوں گا امیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہو سے برای نام
کافر ہوں سو بچاس میں گر ہو کشود کار

تضعیف اصل یا بنا کر تجھ پر یہ تضعیف
کیونکہ یہ بیچا لی نہیں ہو لی بار بار

غالب ہے تجھ پہ شاق نہوں سیر کر تین سو
چھ سو جب اتیونکو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے معلوم ہوتا ہے وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہے اور اب تک باقی ہے۔

اسی قصیدہ میں شاعر نے تعلی کی لی ہے اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ لکھا اور صرف اسکے اس مطلع پر سے

اے شان حیدری ز جبیں تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذو الفقار

امیر الامرا نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اسمیں کیا رکھا ہے۔

جز لفظ ذو الفقار نہیں اسمیں کوئی بات
ایسی کہ ڈال دیوے سپر جیسے آگے یار

آئین قدر دانی میں لیکن بڑا ہے نام
لازم یہی ہے کر گیا جو خان با وقار

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے۔

کہتی ہے فارسی میں مجھے طبع "مطلعے"
ہاں در جواب مطلع ناصر علی بیار"

اے ذرہ ہا ز نام تو خورشید اعتبار
تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اسمیں بھی سوائے لفظ اعظم اور کیا رکھا ہے مگر افسوس سے کہتے ہے کہ باوجود اسکے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی یہی رونا رویا ہے۔

پراتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہے تجھسے		کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک کوس و طبل لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ ما یحتاج کی رُو سے		نہوں محتاج عند الوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنی تذکرۂ شعرا (گلشن بیخار) میں لکھتے ہیں کہ مرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں۔ اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں لیکن خود مرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں "اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی طبع ناصواب سے ہے" اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہئے۔ اسمیں شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہ انکی شاگردی سے منسوب کردئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں۔ غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے جو از دو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چونکہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہے زبان صاف اور سادہ ہے تاہم قافیہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اور بھی لکھے گئے ہیں مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

اول تو سو برس پہلے کی زبان ہے جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتا لگ سکتا ہے اور محقق علم اللسان اور نیز اُن لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں اس تذکرہ میں بھی جابجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں "شورش تخلص متوطن عظیم آباد کے مشہور میر بیتا کرکے تھے"

اسی طرح میر قمر الدین منت کے حال میں لکھا ہے "چنانچہ شکرستان کر کے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستان کے مشہور ہے"۔ دکن میں بعض لوگ " بعد میں " کے جگہ " بعد از " بولتے ہیں ۔ سوز کے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے ۔ ؎

ہے جیتی جی تو بہے مجھے کوئی یار میں رونا	
رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا	

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہی ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں مثلاً فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کو لحاظ سے آیا ہے ۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے " دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے تو بطور سکونت کا وہیں ٹھہرا سئے " تقیر کے تذکرہ میں لکھتے ہیں " بیشتر دکن بطور سیاست کے دیکھے ۔ اور اکثر مقاموں میں سیر کے وضع پر بہرے " "میں کہا" دکن میں عام طور پر بولتے ہیں ۔ قائم کہتے ہیں ۔

میں کہا عہد کیا کیا تھا رات	ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں	

دوسری ۔ علاوہ اسکے مولف ایسے زمانہ میں تھا جب کہ اردو زبان عروج پر تھی اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے مولف اُن کا ہم عصر تھا اور ان میں سے اکثر سے اسکی شناسائی اور دوستی تھی اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا ۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئی ۔ مثلاً رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا اور بوجہ پیرانہ سالی منتخب نہونا یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جسکا دل پر بہت اثر ہوتا ہے اور جو صرف اس تذکرہ کا مولف ہی لکھ سکتا تھا کیونکہ وہ اُن کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا ۔ علاوہ اسکے اس سے میر صاحب کی خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو انہوں نے عمر بھر نبھائی وہ لکھتا ہے " نا قدر دانی سے اغنیا کی اور نا سمجھی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے اور ہوا سے

شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر ہو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے
خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز بے مثال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہو
اور بات کوئی نہیں پوچھتا اسکی آج ہے۔" شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب
آبحیات میں لکھتے ہیں کہ جب میر صاحب لکھنؤ آئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو
روپیہ مہینا کر دیا۔ مگر چونکہ بدمزاج انتہا درجے کے تھے نواب سے بگاڑ کر لیا اور گھر بیٹھ
رہے اور زندگی فقر و فاقہ میں گزار دی۔

مگر اس تذکرہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ اسمیں لکھا ہے
کہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سو روپیہ مشاہرہ
مقرر کر کے تحسین علیخاں ناظر کے سپرد کر دیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے اُن کی روز بروز
صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور رہا اور نواب سعادت علیخاں
بہادر کے عہد میں آج کے دن تک کہ سنہ ۱۲۱۵ھ ہیں وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا" مگر صاحب
تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ کہنا کہ وہ نان شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے یا یہ ہے کہ دوسروں
کے مقابلہ میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ ہے کہ بعض باتیں اسمیں نئی نظر
آتی ہیں۔

۲۔ صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت
جسقدر تعلق سلطنت سے رہا ہے اُن کے تذکرہ میں تاریخی حالات بھی خوب خوب
لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حالات میں اُن کا بزمانہ ولیعہدی عماد الملک
کے خوف سے دلی چھوڑنا۔ باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا۔ اور
انکا سنہ ۱۱۷۳ھ میں تخت نشین ہونا۔ رام نراین سے جنگ۔ دلیر خاں کی دلیری اور جاں
نثاری۔ فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ بالتفصیل لکھا اور آخر میں کور نمک سنگدل
غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے اور بادشاہ کی دردناک غزل
بھی نقل کر دی ہے جسمیں یہ واقعہ منظوم ہے۔ خود اردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج
کی ہے اسلئے کہ تذکرہ اردو کا ہے اور اصل غزل حاشیہ پر لکھ دی ہے البتہ اتنا تکلف

کیا ہے۔ اسی طرح آصف الدولہ۔ تانا شاہ۔ میرزا محمد رضا امید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات و قصص لکھے ہیں خصوصاً میرزا محمد رضا امید کے تذکرہ میں امیر الامرا حسین علیخاں اور انکے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔

۴۔ اس کتاب سے اُس زمانہ کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بیفکرا تھا جسکو دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی اخیر میں جب ہمارے بادشاہ نواب و امرا اس طرف جھکے تو وہ بھی ویسے ہی ہوگئے اور ان لوگوں نے رہا سہا انہیں اور کھو دیا۔ ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی اسلئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اسکے ساتھ ہی رخصت ہوگی جسمانی اور دماغی قوے میں انحطاط پیدا ہوگیا تھا۔ ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں یعنی خوشحالی اور جھوٹی ذہنی دلی موجود تھی شعر شاعری نے اس کا سامان اور مہیا کردیا "دیوانہ را ہوئی بس است" ان شاعروں کی بن آئی وہ اس شغل میں رہے اور یہاں کا تمام ہوگیا

اس زمانہ کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے انکے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے۔ اسکے خاص خاص آداب تھے۔ بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے باکمال سخنوروں کو دل کھول کے داد دیجاتی تھی کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہوجاتے اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان جو ان شاعروں میں شریک ہوتے تھے اور اپنے کانوں سے تحسین و آفریں کے نعرے سنتے تھے جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہولیتی تھی۔ کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے شاگرد ہوگئے اور شعر کہنا شروع کردیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہوجانا کافی ہے یہ شاعرے درحقیقت "شاعو گر" تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو اُس سوسائٹی کی حالت کیا ہوگی۔

علاوہ اس عام حالت کے تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کردی ہیں۔ وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ایک واقعہ جسکا مجھپر بھی اثر ہوا۔ یہ ہے کہ نواب وزیر اودہ اُس زمانہ میں

جب کہ اُنکا عروج و اقبال تھا اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، شاہان دہلی اور اُن کے
گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے اور تعظیم بھی ایسی کہ آجکل کے نوجوانوں کے خیال
میں بھی نہیں آسکتی ۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ
میں دلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے جو مراتب آداب خدمت
گزاری کے تھے سب ادا کئے ۔ خواصی میں بیٹھنے کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے
رہتے ۔ باوصف اس ناز پروری کے کہ پیادہ قدم کاہیکو چلتے تھے ۔ پانچوں ہتیار باندھے
ہوئے ایک الائچی اور گلوری کے بخشش پر دس دس مرتبہ مجرہ گاہ پر سے جاکر آداب بجا
لاتے تھے۔"

۵ ۔ بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جن کی نسبت اُردو شاعری کا گمان بھی نہیں ہوسکتا
مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے اور اُنکا تخلص اشتیاق تھا ۔ یا
عبدالقادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے ۔ یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے
جو آدھا اُردو آدھا ہندی ہے ۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام دیا ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور
ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا ۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات
میں لکھتے ہیں کہ "ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا
چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے اسمیں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ
کی ہجو ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی
اور چھڑیوں والوں کی جزئیات رسوم کیا کیا تھے ۔ میںنے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی
تھی اب نہیں ملتی ۔ لوگ بہت تعریف کرتے ہیں" حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس
مثنوی کا وہ حصہ جسمیں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ کی ہجو ہے میر حسن کے حالات میں نقل
کر دیا ہے ۔ ناظرین کو لکھنؤ کی ہجو میں یہ شعر دیکھکر بہت تعجب ہوگا ؎۵

اگر شیعہ کہے نیک اسکو بد ہے	زبس کوفہ سے یہ شہر ہم عدد ہے

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تھا۔

۵ تعجب ہے کہ اس مثنوی کا نام آبِ حیات (مولفہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد) گلشن بیخار (مولفہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) نیز اس تذکرہ میں کہیں نہیں لکھا۔

میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے۔ درحقیقت کلام بہت اچھا ہے مگر افسوس آجکل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی میاں سید محمد میر اثر کی مثنوی خواب و خیال اب تک نایاب سی تھی۔ اسکے چند شعر اثر کے حالات میں درج کئے ہیں۔ شمس العلما مولوی شبلی نے اسپر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے۔ جو اس کتاب کے صفحہ [illegible] پر درج ہے۔

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن چونکہ اُنکے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہوسکتی۔ اسلئے اُسکی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی اور اسکا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اس مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کرسکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہوسکتی ہے؟"

ہمیں تعجب ہے کہ مولوی شبلی نے صرف اعتراف کا لفظ لکھا ہے حالانکہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اسقدر توصیف و ثنا کی ہے، کہ اس سے بڑھکر ممکن نہیں یہانتک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی اپنے موازنۂ دبیر و انیس میں انیس اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو حسن کی نظر ظاہر ہیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے۔ حالانکہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی بلکہ عام شاعری پر یا اُردو شاعری کے نشو و نما اور اسکے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا جو ذکر آگیا ہے (اور اسمیں دلی لکھنؤ والے دونوں ہی ہیں) اسپر شاید لوگوں نے ایسا گمان کرلیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ میں کوئی خاص لحاظ اسکا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یاردوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب اور کلام پر تقریظ سُننے کے شائق ہیں۔ تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے وہ صرف اُن کے

دیوان کا مقدمہ نہیں بلکہ اردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے اسمیں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہوسکتی ہیں تو لوگوں کے عام (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا اور وہ بُت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے یکایک متزلزل ہوئے اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہوگیا ہے۔ مولانائے اسیر خواہ مخواہ اسلئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے بلکہ درحقیقت وہ اس رتبہ کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو الٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا۔ صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کردیا ہے جو اگرچہ صریح اور بین ہیں مگر اسقدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اسکی پوری قلعی کھلجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ مولانا کا اگر اسمیں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انہوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اوّل تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آئے ہیں چنانچہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے۔ "مثنوی ایشان شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است و ازیں جہت مرغوب عام"

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں "ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے اور بہت اچھی کہی ہے"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اسمیں درد زبان کی صفائی شستگی اور لطافت بدرجہ کمال موجود ہے اور یہ سب باتیں مثنوی کی لئے خاص طور پر مناسب ہیں مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا جس سے کسیطرح صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ سراپا کا مضمون اسقدر مبتذل ہے کہ اسمیں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا یا اسمیں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے اور چونکہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے اسلئے صرف سراپا کے چند اشعار پر حکم لگانا درست نہیں ہے صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی

ایک ادہ جگہ دیا ہے۔ مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا مگر انتخاب کے اشعار بہت اچھے

ہین - اسیطرح مصحفی کی تعریف کی ہے لیکن انتخاب اسقدر خراب دیا ہے کہ اس سے

کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کوئی اچھا شاعر ہے لیکن اسکا کیا جواب ہے کہ جو شعر خواجہ

اثر کا بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کرلیاہے (یعنی آخر ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا۔ کھلتے

جاتے میں ڈانپتے جانا = شوق ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا + چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے

جانا) مولانا فرماتے ہیں کہ " خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت

سے بہار عشق میں موجود ہیں " یہ ایک مزید ثبوت ہے، اس سے صاف یہ بات ثابت

ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا اُن کے بعد نواب مرزا شوق - اگر

یہ شعر اُن کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہی تو اس

طرز کا اثر ضرور اسپر پڑا ہوگا - دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مثنوی اس زمانہ

میں لکھی گئی جب کہ اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی - باوجود اسکے مولانا حالی نے صاف

لکھدیا ہے " اسمیں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب وخیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت

نہیں ہوسکتی "

خیر اسمیں تو ظاہرا ایک حد تک کسی جگہ گنجایش بھی نظر آتی ہے مگر ہمیں افسوس ہے

کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھکر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم

کے متعلق ایک خط میں لکھدیا تھا جسے پنڈت چکبست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں

بطور سند کے درج فرمایا ہے - تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق

کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں اور خصوصاً

ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اسکے کہ اسمیں زبان کا لطف نام کو نہیں سیکڑوں لفظی اور

معنوی غلطیوں سے پُر ہے - ہم اسوقت پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے - اور اس بحث

کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں موقع آپڑا تھا اسلئے یہ چند الفاظ لکھے گئے -

۶ - صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی

ہیں جنمیں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے - مثلاً مولانا شاہ ولی اللہ کی نسبت لکھا ہے

"قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسنین" اور "جنت العالیہ فی مناقب المعادیہ" ان کی تصنیف سے ہیں حالانکہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں نہ شہادۃ حسنین کا ابطال کیا ہو نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے۔ یہ محض اتہام ہے۔ اسکے بعد یہ کہکر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے خوب ہجو ملیح کی ہے۔ اور آخر میں یہ لکھا ہے "کیوں نہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور نابکاروں کے نابکار بقول شاعر

شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزوں ہے
ہونک میں کتّے کی پلّی کی سگی موجود ہے

یا مظہر جانجاناںؒ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "سنہ گیارہ سو پچانوے ہجری تھی کہ اس روشن ساز سائل صدیقی نے اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریق پر کیا"

یا تانا شاہ کے حالات میں مولف عالمگیر کے نسبت یوں گہرفشانی کرتا ہے کہ "خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا اور مکہ مسجد کھدوا کے وہ کچہ مظلمہ اپنی گردن پر لیا خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے" مکہ مسجد کا کھدوانا تا زا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مولف نے جو خود حیدرآباد میں رہا ہے اس کذب کا لکھنا کیونکر گوارا کیا ہمیں ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں کہ مکہ مسجد موجود ہے اور ابتک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگزر نہیں کرتا۔ مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں اُن کی داد و دہش فیاضی اور مروت کی بے انتہا بہت کی ہے لیکن آخر میں صاف لکھدیا ہے "افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی نا اہلوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر اور شکار سے کام نہ کہا، شیر کو کوئی لائق اور کام کا نہ پایا اسواسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا بنایا" یا سراج الدین علی خاں آرزو نے جو مکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے اسکی نسبت کہتے ہیں کہ "عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں

سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے نہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے جب باریک بینوں کی
نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے"

اس تذکرہ کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور
اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اسمیں جنم لیا۔ وہاں اسکا
یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں۔ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے
تو یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے۔ زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلائق رہا۔ کبھی
راجاؤں یا مہاراجاؤں کی راجدھانی ہے۔ کبھی سلاطین اسلام کا دارالخلافت۔ کبھی طغیانی
کی بدولت بگڑ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا۔ کبھی معرکۂ جنگ و جدل و قتل عام ہے
اور کبھی گھر گھر عید رات شب برات ہے۔ کبھی تختگاہ شاہان اور مرجع کمال ہے۔ اور کبھی
ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصا کھنڈر ہے۔ کبھی مورد بلیات و آفات ہے
اور کبھی منزل حسنات و برکات۔ غرض یہ نگری یونہیں اُجڑتی اور بستی بگڑتی اور بنتی رہی۔ مگر
باوجود اسکے حسن عالم افروز میں ہمیشہ نئی ادا پیدا ہوتی رہی اور ہر حادثہ کے بعد فوراً
سنبھل گئی۔ لیکن اخیر زمانے میں سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامتیں پیدا
ہو گئیں تو دو ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا۔ سب سے اول نادرشاہ کا ایسا تھپیڑا
لگا کہ اس نے بھنا ہی تو دیا۔ اسکے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی پھر
مرہٹوں نے وہ اُدہم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا اب تک جو باکمال دلی میں پڑے
وضعداری نبھا رہے تھے، ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوائے ایک میر درد کے
جنکی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ "جن ایام میں معمورہ شاہجہان آباد کا اور ہر ایک
کوچہ اس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے رشک ہفت
اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمور یہ شہر کے عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور اس خراب آباد
کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود بلیات
کے سبب خراب ہوا اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے اور
ہر ایک جابر زاویہ گزیں نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے اور ہر امیر عالی مقدار نے فرار کو

غنیمت جانا اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والاتبار کہ نام نامی اسکا خواجہ میر تھا اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوسے، اور شاہجہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے"۔ ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اسکا ساتھ دیا۔ اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانہ اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا۔ آصف الدولہ سا کلمہ لُٹ نواب تھا۔ اہل کمال کی قدر ہونے لگی۔ پھر توجو اُٹھا وہیں پہنچا اور پھر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادرشاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علیخاں آرزو پہونچے۔ اسکے بعد سودا تشریف لے گئے۔ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کوچ فرمایا۔ میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہو گئی اور میر حسن۔ میر سوز۔ جرات سب لکھنؤ میں جا بسے۔ اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آ گئی۔ اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ اب یہ امر کہ لکھنؤ کی سوسائٹی کا اُردو زبان اور اردو شاعری پر کیا اثر ہوا۔ اسوقت ہماری بحث سے خارج ہے۔

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرہ سے میر انشاء اللہ خاں کے حالات کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہو گی۔ اور کم سے کم اس قصہ کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اُن کی اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ھ میں لکھا گیا اور ۱۲۱۵ھ تک میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے یا اسی سال نواب سعادت علیخاں کے ہاں رسائی ہوئی۔ کیونکہ مرزا سلیمان شکوہ اس سال (۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی نقل کیا، صرف یہ لکھکر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم کس سے کہتے تھے۔ اور آزاد نے کس سے سُنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگین کا حوالہ دیتے ہیں مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی ۱۲۱۵ ہجری میں لکھی گئی۔ میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں

لازم تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اسلئے یوں بھی اسمیں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مولف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے کہ یہ کتاب میںنے دو حصوں میں لکھی ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے جسمیں سلاطین نامدار امراے عالیمقدار اور شعرکے اصحاب وتمار کے حالات لکھے گئے ہیں دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا۔ اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ کبھی لکھی گئی تھی یا نہیں۔

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اسمیں ہمنے اتنا تصرف ضرور کیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں۔ اُنکے انتخابی کلام کو کم کر دیا ہے صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں۔ مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا۔ اُن کے کلام کو بجنسہ ویسے ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دئے ہیں۔ اپنی چیز اور خصوصًا اپنا کلام ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے۔ خود اُن سے انتخاب کیونکر ہوتا لہذا ہمنے اسکا انتخاب کر دیا ہے۔ صرف تھوڑے سے اشعار رکھے ہیں اور باقی سب نکال ڈالے ہیں۔

اب مجھے اس تذکرہ کے متعلق اسقدر کہنا اور باقی ہے کہ اسکے طبع ہونے سے اُردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اور جو لوگ اُردو کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اسکی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔ یہ کام دراصل انجمن ترقی اُردو کا تھا۔ مگر یہ انجمن اب براے نام رہگئی ہے جسکا ہونا نہونا برابر ہے۔ ہمیں اس باہمت شخص کا ممنون چاہئے جس نے باوجود بے بضاعتی کے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور اُردو خواں پبلک پر احسان کیا۔

عبدالحق۔ حیدرآباد دکن

غزلیات حضرت سید الشعرا مولانا شاد خان بہادر مدظلہ

نگاہیاں ہیں کچھ ایسے اداو ناز اونکے
کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سے باگباز امنگے

جفا کی شان کہاں سیکدہ۔ کہاں واعظ
کدہر ہیں آج وہ رندوں سے احتراز اونکے

تجھی کو نزع میں پوچھا ترے خموشوں نے
اخیر وقت جب آیا چھپے نہ راز اُن کے

جنہیں نصیب ہوئی ہے تمہاری ہم بزمی
زمانے بھر میں ہیں مشہور امتیاز اُنکے

نظر اٹھانے میں ہوتا ہے باز پرس کا ڈر — جھکائے رہتے ہیں گردن کو سرفراز اسکے

اجل کے غمزۂ بیجا سمائیں کیا دل میں — تمام عمر اٹھائے ہوئے ہوں ناز انکے

مرے کلام کا جنکو مزا نہیں ارشاد — یقین مان کہ دل ہی نہیں گداز انکا

بھلا منظور ہوا اپنا تو خدمت کر فقیروں کی — قضا کو دور کر دیتی ہے دعا روشن ضمیروں کی

جہاں میں ہر طرف حسن جمال یار کا غل ہے — جھکائے سے رہے کیونکر طبیعت گوشہ گیروں کی

گذرگاہ جہاں میں راہرو سب ایک سے کب ہیں — رہے جاؤ کبھی تو کوئی [illegible] رہے گا فقیروں کی

قضا سے چھٹنے نہ دے اسکا تو کچھ چارہ نہیں لیکن — بہا دیتی ہیں دل صیاد کا آہیں اسیروں کی

میں ویرانے کو اپنی جانتا ہوں تخت طاؤسی — خدا آباد رکھے تا ابد ڈیوڑھی ان امیروں کی

غزل جناب احسن مرزا صاحب شرر لکھنوی

دل کو خلوت سرا کیا سینے — جلوہ گاہ حیا کیا سینے

دل میں تیرا گھر کیا سینے — ہاں خلافت وفا کیا سینے

کیا ہوئے ہائے وہ [illegible] اوقات — تجھکو اے عمر کیا کیا سینے

نام اپنا ڈبو دیا [illegible] — خود ادا کو فنا کیا سینے

[illegible] — چشم کو حق نما کیا سینے

قبل از وقت مرگ [illegible] — تجھکو عبرت سرا کیا سینے

سجدہ کرکے مثال [illegible] — ان بتوں کو خدا کیا سینے

حال وہ پوچھیں ہیں ہوں خاموش — اب تاسف ہے کیا کیا سینے

دلمیں کی عشق کی کشش پیدا — کاہ کو کہربا کیا سینے

فکر اوس [illegible] کی سینے — جسکو خود لا دوا کیا سینے

قطعہ

نظر آیا شرر عجب [illegible] — عقدۂ دل جو وا کیا سینے

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اردوئے معلّیٰ

علی گڑھ

نمبر ۵ | بابت ماہ مئی ۱۹۱۱ء | جلد ۱۲

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی بی اے

فہرست مضامین

ضمیمہ اردوئے معلّیٰ غزلیات مشاعرہ علیگڑھ

اردو پریس علی گڑھ میں چھپا

علم فلسفہ

معیار الخیالات

اس عالمانہ کتاب کا مطالعہ کرنے ہی سے پتہ لگ سکتا ہے کہ فاضل مصنف نے مضامین مفصلہ ذیل
مثلاً روحانی ہیر۔ خدا۔ فعل خدائی۔ عبادت۔ پرستش یعنی پوجا۔ خیرات۔ مذہب
جیو آتما بمرادروح انسانی۔ تعلیم۔ دولت۔ عشق۔ ادب۔ دوستی۔ رحم
حمل میں آنے سے تا موت قواعد حفاظت جسم۔ نشہ بازی۔ استفراغ
موت۔ حیات مابعد الموت کے اوپر کن عالمانہ دلایل سے بحث
کی ہے۔ اور ہر ایک مذہب وملت کے انسان کو کتاب ہذا کا مطالعہ کرنا کن کن معلومات کا
ذخیرہ پیدا کرتا ہے

چونکہ فاضل مصنف نے اس کتاب کو کئی ہزار کی لاگت سے باعلم سوسائٹی میں بالکل مفت
بلکہ محصول ڈاک بھی اپنی طرف سے چسپاں کر کے تقسیم کیا ہے۔ اس لیے نوٹس ہذا کا مطالعہ فرماتے
ہی بذریعہ کارڈ نہایت جلد اطلاع دیں۔ کیونکہ یہ رسالہ روزمرہ ہزارہا کی تعداد میں معززین
وعالمان کی خدمت میں روانہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس لیے تاکہ جلدی ختم نہ ہو جائے۔
اور پھر جناب کے حکم کی تعمیل نہ ہو سکے
اور رسالہ بلینگ بھی چھپ گیا ہے جو کہ بغیر قیمت اسی رسالہ کے ہمراہ روانہ ہوگا۔

سکریٹری لائبریری رسالہ معیار الخیالات

جگادھری ضلع انبالہ (پنجاب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاگردان مائل و شوق

آشفتہ دہلوی | عظیم الدین خاں نام عرف جھوٹے خاں قوم افغان شاگرد میر محمدی مائل "یہ شخص ایک مرد[1] خلائق۔ آشفتہ طبع وارستہ مزاج سپاہی پیشہ۔ مولد ان کا دہلی وہ لکھنؤ میں بیچ ۱۷۹۳ء کے فارسی اور ریختہ دونوں کہتا تھا۔ صاحب دیوان ہے فارسی میں فرزند علی مضمونؔ سے اصلاح لیتے تھے ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔
"آخر کو بسبب اکتساب[2] باطن مائل بخدا ہوا اور توبہ شعر کہنے سے کی۔ وجہ تجارت سے ایام بسر کرتا تھا۔ اور ہر غزل کے مقطع میں مضمون زلف کا باندھتا تھا"

صاحب آب حیات نے تذکرۂ معروف میں ضمناً آشفتہ کا بھی کچھ ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ معروفؔ کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ہر مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں اس رعایت سے اس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا ... جن دنوں اس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمایش تھی کہ کوئی مثل کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ ... ہوتے ہوتے میاں آشفتہ ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور ان کے مرید تھے وہ وظیفہ بھی پاتے تھے انکے شعر میں ہری چگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا ان سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا ہے

آج یہاں کل وہاں گذرے یونہیں جگ ہمیں   کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری چگ ہمیں

انہیں سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دیدئے کہ تمہاری کاوش کیوں خالی جائے
ان سب تعلقات کے باوجود آخر میں معلوم نہیں کس وجہ سے انھوں نے معروفؔ اور ان کے عزیز دوست نواب حسام الدین حیدر خاں نامیؔ کی ہجو کہی نتیجہ یہ ہوا کہ پھر باوجود معذرت معروفؔ نے جیتے جی ان کی صورت نہ دیکھی۔ شاعری انکی معمولی ہے۔

جام گدائی ہاتھ میں لے نت شام سویرے پھرتے ہیں   شمس و قمر ہیں دونوں بھکاری حسن کے تیرے پھیرے ہیں

---

[1] ترجمہ تذکرہ ڈی تاسی بحوالہ تذکرہ مصحفی ص۱۰ سراپا سخن محسن ص۱۰ ڈی تاسی
[2] نمونۂ جاوید سے معلوم ہوا کہ کسب باطن کی طرف متوجہ ہو کر مولانا فخر الدین کے مریدوں میں شامل ہو گئے

پنڈت پوچھو ہاتھ دکھاؤ فال کھلاؤ کوئے پر — بخت جو ہوں برگشتہ اپنے کسلئے پھیر پھرتے ہیں
عقل ہوئی بیتاب ہماری آہ جنوں ہے واہ جنوں — کوچہ بکوچہ اب تو ہم کو لڑکے گھیر کے پھرتے ہیں
یوں کاندھے پر زلفیں اسکی بل کھاتی ہیں وقت خرام — مار سیہ کو ڈالے گلے میں جیسے سپیرے پھرتے ہیں
جوگ لیا آشفتہ ہمنے دیکھ لٹک ان زلفوں کی — گلیوں گلیوں حال پریشاں بال بکھیرے پھرتے ہیں

ناخواندہ مرے خط کو الٹا ہی پھرا لایا — قاصد کا گلا کیا ہی قسمت کا لکھا لایا

میں بیرنگی ہے آشفتہ برنگ مختلف — آفت جاں اس گل رعنا کی رعنائی ہوئی

برگشتہ بخت ہم سے دیکھے ہیں کم کسی نے — جب ہم ہوئے مقابل وہ منہ کو موڑ بیٹھے

ہوتا ہے تازہ آہ سے جوں گل ایاغ دل — کھلتا ہے اس نسیم سے اپنا تو باغ دل
آشفتہ کرکے کوچۂ زلف بتاں میں گم — ڈھونڈھا بہت و لیک نہ پایا سراغ دل

کرم رامپوری } میرزا معروف کرم خاں مرد معصوم صفت تیز طبیعت صاحب ذوق شاگرد مولوی قدرت اللہ شوق اپنے عہد کے بڑے از ۱۲۰۹ھ تا ۱۲۵۳ھ
نامور تھے دور دور تک مشہور تھے انکے بھانجے احمد خاں غفلت نے انکی وفات کی
جو تاریخ موزوں کی تھی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے اس سے انکا مختصر حال بھی معلوم ہو جائیگا

شاعر کامل و ذی حوصلہ ماموں صاحب — جن کو استاد کرم خاں کہے اعلیٰ ادنےٰ
متخلص بہ کرم نام کریم اللہ خاں — مجمع خوبی و اہل ہنر و شرم و حیا
ایک استاد کے شاگرد تھے ہم وہ دونوں — تھا اس آفاق میں دونوں کا برابر بہرا
مرض ضیق کی تکلیف اٹھائی دو سال — شست و یکسال تلک کھائی ہوائے دنیا
آخر اسکو بہی خوش یہاں کی اقامت آئی — تا ابد کوئی جہاں میں نہ رہیگا رہا
سوئے اقلیم بقا ملک فنا سے جس دم — وہ سخن فہم جہاں رخت سفر باندھ اٹھا
ظہر یکشنبہ و ہفتم مہ ذی الحجہ کی تھی — کہتی یہاں کن تھے انہے ہند میں پیر و برنا
طلب اس خسرو ثانی نے کیا سال وصال — آئی ہاتف کی یہ آواز کہ خوش فکر موا ۱۲۵۳

صاحب دیوان تھے چنانچہ امیر مینائی مرحوم نے ان کے دیوان سے منتخب کرکے یہ چند شعر اپنے تذکرے میں لکھے ہیں ۔

۵۷ انتخاب یادگار

آنکھیں ذرا اٹھائیے اوپر کو لت کرم ❊ شب جبکہ آپ نے کیا میں وہاں تھا
مرتے تو ہیں پر ایک نظر دیکھ لیں اسکو ❊ اے زندگی ہم سے کوئی دم اور وفا کر
یار نے آ کے دم نزع جو کی پرسش حال ❊ بات بھی منہ سے نہ نکلی کہ زباں بند ہوئی
چیچ گجھاز کے حق میں یہ مثل سیدی ہے ❊ اونٹ رے اونٹ تری کونسی کل سیدھی ہے

اشعار در ہجو آب کوٹہ

پئیں گر خضر آ کر یہاں کا پانی ❊ تو پھر آ خر ہے عمر جاودانی
بہشتی یہاں کے کرتے ہیں بزا تھر ❊ کہ پانی بیچتے ہیں گھول کر زہر
بجھائیں یہاں کے پانی میں جو تلوار ❊ نہ مانگے اس کا مارا آب زنہار

ان اشعار میں ان کی شاعری کی کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی تاہم انکے استاد ہونے میں کوئی شک نہیں ریاست رامپور کے اکثر صاحبزادے ان کے شاگرد تھے جنمیں سے صاحبزادہ کرامت علی خاں نبیرہ نواب فیض اللہ خاں اور صاحبزادہ غلام حضرت خاں زخمی نبیرہ نواب محمد یار خاں امیر قابل ذکر ہیں آخر الذکر کے دو شعر قابل ملاحظہ ہیں۔

نظم ابر و نثر خط پڑھتا ہے فر فر آئینہ ❊ سب رسالہ حسن کا رکھتا ہے از بر آئینہ
جہر کی کا بھی اندیشہ ہے بوسے کی بھی امید ❊ گویا لب جاناں ہے محل خوف و رجا کا

غفلت رامپوری اخوندزادے احمد خاں ولد برہان الدین خاں شاگرد رشید از ۱۱۹۵ھ تا ۱۲۵۹ھ مولوی قدرت اللہ شوق بقول امیر مینائی مرحوم بڑے مضمون آفرین اور بڑے صاحب ذوق تھے تعلی مضامین سے سرزمین سخن کو آسمان بنایا۔ مدح و قدح دونوں میں شعرائے سلف کا رنگ دکھایا۔ اکثر وطن میں رہے چندے لکھنؤ تشریف لیگئے تھے۔ وہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوئے تھے شیخ غلام ہمدانی مصحفی مغفور نے بھی اپنے تذکرہ میں انکی مدح لکھی ہے ...... مسودہ دیوان کا انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہاتھ آیا۔ وقت مطالعہ ہر رنگ میں انکی طبع رسا کو قادر پایا" ان کے قصاید کا زور قطعات کی بختگی ہجو یہ مثنویوں کی بے تکلفی یہ سب چیزیں ان کی قادر الکلامی اور

استادی پر دلالت کرتی ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ہوں وہ روشن طبع گر ہو مجھسے روکش آفتاب — چرخ نظروں سے گرا دے صورت تیر شہاب
گرم جولاں ہے جہاں میرا سمند فکر وہاں — اڑتی ہے گرد شکست رنگ ماہ و آفتاب
حسن و خوبی اسکے ہاتھ کی بیاں کیا کیجئے — مائل رفتار ہو جسوقت وہ رفعت مآب
دیکھکر مستوں کو آئے اسقدر اسکا خیال — گوشہ مغرب میں جائے شب سمجھکر آفتاب

جہاں میں ہو نہ تنک مایہ کامیاب کبھی — کرے نہ دانۂ شبنم کو سبز ابر مطیر
اگر وہ جانب دریا نگاہ پیش کرے — ہوا سے پاسے تری حباب کی تعمیر

بردے گم ہیں سماعت کے ہی ہوش — دیکھئے اب جسکو دیتا ہے بگوش
اپنے اپنے گھر میں اب پیر و جواں — آگ روشن کر کے بیٹھے پنجسال
شمع سے ہے انس پروانہ غلط — سینکنے کو ہاتھ آتا ہے فقط
بسکہ ہے آتش سے ہر طائر کو ساز — پٹ اور جگنو میں کب ہو امتیاز
آگ پر گرتا ہے عالم اس طرح — شمع پر دوڑے پتنگا جس طرح

ترے چہرے کے آگے شمع کشتہ کٹ نہیں جاتی — یہ حیرت ہے کہ آئینے کی جہائی بہت نہیں جاتی

سوزن سے ہو سکا نہ رفو اپنے زخم کا — پایا ہے کسنے فائدہ اپنے کمال سے

اسی میں دل ہے وہی اس دل حزیں میں ہے — مکاں میں ہے مکیں اور مکاں مکیں میں ہے

آیا سواد نجد سے جو کوئی اس طرف — میں نے کہا کہ قیس کی کیا کیا نشاں ملی
کہنے لگا کہ لپٹے ہوئے برگ بید سے — جوں تار عنکبوت کئی استخواں ملے

رامپور اور نواح رامپور میں جتنے شاگرد غفلت کے ملے اتنے ان کے کسی ہمعصر کو نصیب نہیں ہوئے مثلاً اخوندزادے محمد سعد الدین خاں شعور مولوی قیام الدین فرقت محمد ضیا خاں یاس نبیرہ حافظ رحمت خاں والی بریلی صاحبزادہ عبد القادر خاں قادر و صاحبزادہ امداد اللہ خاں ثاقب خلف صاحبزادہ کفایت اللہ خاں نبیرہ نواب عبد اللہ خاں۔ صاحبزادہ احمد یار خاں افسر[1] خلف نواب

[1] نواب علی محمد خاں بانی ریاست رامپور کے پوتوں میں نواب محمد یار خاں امیر سے زیادہ علم دوست اور شاعری کے قدردان تھے۔ جنکا ذکر شاگردان قائم کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ سرپرستی شعرا کا یہ سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہا چنانچہ ان کے صاحبزادے افسر اور افسر کے سب بیٹے مثل رنگین۔ افکار حزیں غلام مرشد خاں مرشد اور غلام حسین خاں حسین شاگرد آتش خود شاعر اور شاعروں کے قدردان گذرے ہیں

محمد یار خاں امیر کے تین بیٹے۔ اصغر علیخاں اذکار۔ غلام محی الدین خاں حزیں اور غلام حضرت خاں زخمی۔ صاحبزادہ امداد علیخاں امداد نبیرہ نواب فیض اللہ خاں۔ ان سب کا مفصل حال اور کلام لکھنا طوالت سے خالی نہو گا اسلیے ہم صرف چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ شعور (۱۸۰۰ تا ۱۸۷۶ء) ولد محمد اسلم خاں فارسی اور اردو دونوں کے شاعر تھے اور بیان بدیع پر نظر رکھتے تھے۔

گراں ہے اپنی خاطر پر یہ بار زندگانی بھی ۔۔۔ ہنوز ہو ہم سے تم ظالم ہماری ناتوانی کا

۲۔ فرقت مولوی برہان الدین عالم مشہور کے پر پوتے تھے۔ فارسی میں مولوی تاج الدین اور شیخ امام علی سے مشورہ تھا۔ ۱۸۹۵ء میں ۹۰ سال کی عمر تھی۔

مزاج میں اپنے بد گمانی ہے بسکہ رکھتے نہیں کیا یاد ۔۔۔ یہی دعا ہی کرتا ہے محشر نہ دیکھے بے لقا مجھکو

۳۔ یاس (۱۸۰۰ تا ۱۸۶۲ء) کلام بہت تھا تلف ہو گیا۔

حال دل ہمکو سنانے کو تو بیٹھا ہوں و لے ۔۔۔ منہ سے کیا نکلے دم گفتار دیکھا چاہیے

۴۔ قادر (۱۸۲۳ تا ۱۸۶۲ء) خط نسخ کے خوشنویس تھے۔ بانک پٹے وغیرہ فنون سپہگری کا بھی شوق تھا۔

خاک تربت سے ہو اپنے گل سوسن پیدا ۔۔۔ داغ ماتم ہے ہمارا پس مردن پیدا

۵۔ تاب (۱۸۱۰ تا ۱۸۵۷ء) فنون متداولہ میں کمتر کوئی فن ایسا ہوگا جسمیں دخل تام نہ تھا جوانی میں بہت صاحب حسن و جمال تھے زبان بھاکا اور اردو دونوں میں کہتے تھے چنانچہ تذکرہ انتخاب یادگار میں انکے کئی لاجواب کبت درج ہیں۔

جو تو برسوں شکم میں صدف کے رہا تو میں لطف تم ذکر کے بنا ہوئی قطرہ مے ذ گہر سے کہا تو او دہنیں میں سنیں

۶۔ اذکار ۔۔۔ کے علاوہ آتش ذوق اور بہار سے بھی اصلاح لی تھی ۱۸۹۵ء میں اٹھاون سال کی عمر تھی۔

دیدیا طاق سے آئینہ اٹھا کر انکو ۔۔۔ حال مجھسے دل حیراں کا دکھایا نہ گیا

۷۔ حزیں سہ گنگ بہتر ہی زباں سن نالہ شبگیر سے * ناک میں دم آگیا ہی آہ بے تاثیر سے

۸۔ امداد (۱۸۲۰ تا ۱۸۸۲ء) صاحب دیوان مرد خوش اوقات حمیدہ صفات مشغلہ ذکر و درود کہتے تھے

سحر کر دے شب تار میری روشن ۔۔۔ جب جاییں سمجھے کہ مہ لقا سے ہے *

طالب رامپوری | مولوی الٰہ داد عرف حافظ شیرازی عالم باعمل تقویٰ اور پرہیزگاری میں ضرب المثل تھے۔ تہجد گزار، شب بیدار لڑکپن میں چیچک سے آنکھیں جاتی رہی تھیں اسی عالم نابینائی میں سب درسیہ کتابیں پڑھیں۔ ملا حسن مرحوم کے شاگرد و نیں نامور ہوئے ... خوش فکری ہر شعر سے ہویدا ہے اس فن میں مولوی قدرت اللہ شوق سے مشورہ تھا۔ یہ چند شعر ان کے دیوان سے انتخاب کر کے درج تذکرہ کئے گئے[1]

ہر چند رہ سیہ میں بلے تو رو بے ایصبر تھا | لیکن ہزار نگ سرمہ منظور نظر تھا
چیر سینے سینے کو شوق کھینچے دل دلگیر کو | تیر دو جا گئے ہیں اور کہا گیا ہیں تیر کو
اتنی بڑی عزت ملی اس نالہ پر شور سے | دیکھکر مجکو ہٹا شور قیامت در سے
کچھ خبط نہیں ہے مجھے وسواس نہیں ہے | وحشت کا یہ باعث ہے کہ تو پاس نہیں ہے
جابجا نکلے ٹکڑے ترے دیوانوں کے | خاک اوڑاؤں میں کہاں نام کو صحرا نہ رہا
جائے خوں سرخی گل تھی اس میں | چیر کر جب دل بلبل دیکھا
سب ہمصفیر اوڑ گئے صیاد دام سے | پر ہم تھے اور ڈھب کے گرفتار رہ گئے
میں تو ہوں محو ہجوم آرزو فرمائیے | آپ سے ہر دم بھلا کیا کیا اجازت چاہئے
اک حسرت جدائی اک شوق وصل جاناں | دو چیزیں ہیں لے چلے ہم اید دو ستو جہاں سے
ہجر کے صدمے وہ ترے وصل کے وعدے | جینے نہیں دیتے مجھے مرنے نہیں دیتے
جنت ہی نہیں ملک خدا حضرت ناصح | آخر تو کہیں ہم بھی گنہگار رہیں گے
مر کے ہی ہم نے سب کو دیکھ لیا | کوئی مرتا نہیں کسی کے لیے
رات بھر نالے کئے ہم نے تو دن بھر روئے | جسقدر شام سے گرجے تھے سحر ہی برسے

اے مظہر رحمت الٰہی | اے عین عنایت الٰہی
اے نور فزائے چشم آدم | اے باعث ہستی دو عالم
اے ختم رسل شفیع محشر | اے مالک آب حوض کوثر
اے قبلۂ دین وشاہ کونین | اے صدر نشیں قاب قوسین
اے ابر کرم سحاب احساں | اے لطف خدا حبیب یزداں

[1] انتخاب یادگار

اے عذر پذیر اے خطا پوش ۔۔۔ باخلق کریم در کرم کوش

اے گوش نہ ندائے طالب ۔۔۔ مقبول ہو یہ دعائے طالب

افسر رامپوری (۱۲۶۷ تا ۱۲۶۶ھ) طالب کے شاگردوں میں صاحبزادہ احمد یار خاں افسر بجائے خود استاد اور دو دواوین اردو کے مالک تھے ابھی گیارہ ہی سال کا سن تھا کہ انکے والد نواب محمد یار خاں امیر نے انتقال کیا اور نواب فیض اللہ خاں والی رامپور نے کہ انکے چچا تھے انکا ۱۶۰۰۰ سالانہ وظیفہ مقرر کردیا۔ بہادر[۱] بے بدل۔ فنون سپاہگری خصوصاً علی مد لکڑی پھینکنے میں ضرب المثل تھے شعر کا بھی شوق رکھتے تھے۔ ابتدا میں قائم چاندپوری کے شاگرد تھے

قاصدا تو ہی بتا کون سا پیغام لکھوں ۔۔۔ ہوں میں گمنام سر نامہ پہ کیا نام لکھوں

برقع جو رات منہ سے ترے دور ہو گیا ۔۔۔ خجلت سے ماہ چرخ پہ بے نور ہو گیا

جوں گل یہ حسن ہوئے ہی اک آن میں ہوا ۔۔۔ وہ چیز کیا ہے جس پہ تو مغرور ہو گیا

قدرت پہ یاں کی بھول نہ افسر کہ فیض الٰہی ۔۔۔ کیا کیا جہاں میں خلق کو مقدور ہو گیا

سن بجیوا انسوں نے فلک سے گزر گیا ۔۔۔ جسدم کہ نقف گریہ میں خوں جگر گیا

مستی کی اس نگاہ کے کچھ کیفیت نہ پوچھ ۔۔۔ گردش نے جس کی ایک جہاں بیخبر کیا

صنعت رامپوری (۱۲۰۵ تا ۱۲۶۵ھ) شیخ کریم الدین[۲] ولد شیخ منتو صناع زرگری میں کامل اور ساتھ اسکے مشاغل کے عابد و زاہد و ذاکر و شاغل تھے۔ شاعر رنگین طبیعت و صاحب ذوق مولوی قدرت اللہ شوق کے صاحب دیوان اور مشہور شاگرد تھے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

دم توکب کا نکل گیا ہوتا ۔۔۔ ضعف سے تا بلب نہیں آتا

اور صنعت تو یاد ہے لیکن ۔۔۔ اسکے ملنے کا ڈھب نہیں آتا

ہجر و وصال دونوں میں کٹتی ہیں بے کلے ۔۔۔ یارب یہ کیسی شب ہے کہ جس کی سحر نہیں

مجکو بلایا غیر کے گھر جا کر آپ نے ۔۔۔ اسکو ستم کہوں کہ مدارات کیا کہوں

فریاد کو محشر میں سند کچھ نہیں درکار ۔۔۔ گل کھا نے سے ہاتھ اپنے ہیں محضر سے زیادہ

رسید کتب برائے ریویو (۱) جام سرور (۲) کلام فیروز (۳) کلام فوق (۴) دیوان آزاد بلگرامی ۵ کتاب المعارف (۶) برقابی (۷) گلدستہ سہرا (۸) مسدس میلاد (۹) الجریان (۱۰) دیوان بہار (۱۱) م

[۱] انتخاب یادگار [۲] ایضاً

بیاض حسرت موہانی

شیخ ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ

جانم بلب از لب خموش تو رسید — وز لعل خموش بادہ نوش تو رسید
گوش تو شنیدہ ام کہ دردے دارد — درد دل من مگر بگوش تو رسید

مرزا جلال اسیرؔ

گداخت بر لب حسرت ترانۂ دل ما — تبسمے کن و بشکن بہانۂ دل ما

مولانائے روم

بکشائے لب کہ قند فراوانم آرزوست — بنمائے رخ کہ باغ گلستانم آرزوست
یکدست جام بادہ و یکدست زلف یار — رقصے چنیں میانۂ مستانم آرزوست

میر ضیاء الدین ضیاؔ استاد میر حسن (ماخوذ از تذکرہ میر حسن)

آہستہ پانوں رکھیو اے بوئے گل چمن میں — سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

ق

تربت ضیا کی دیکھی کل رات دستے میں — آئے نظر مجھے واں روشن چراغ کتنے
جاکر جو آج دن کو دیکھا میں کر تفحص — اک دل جلے کی اس میں حسرت کے داغ کتنے

بر عکس ضعیں آئیں اسکے نباہنے کی — شاید یہی سبب ہے تاثیر اس دلکے چاہنے کی
جلدی ضیا خبر لے آتی ہے تجھ جگر سے — آواز ناتواں سی دل کے کراہنے کی

کیا عیش و نشاط و شادمانی کرتے — کیا نازو نیاز و جاودانی کرتے
گر بار کیے میں اپنے ہوتا تو ہم — کیا خوب طرح سے زندگانی کرتے

نے کھلنے کی امید ہے نے بو کی آس ہے — غنچہ ہوں دل کا مجھ میں فقط داغ یاس کی

مکتوباتِ امیر مینائی

نمبر ۲

پہلے نمبر میں جو کچھ لکھا گیا وہ دیباچہ مکتوبات سے متعلق تھا۔

اصل کتاب کی نسبت ہم کو صرف یہ کہنا ہے کہ ان مکتوبات کو جمع کر کے حضرت ثاقب نے اپنے واجب التعظیم استاد کا حق شاگردی ادا کرنے کے علاوہ اردو زبان کی بھی ایک نمایاں خدمت انجام دی ہے۔

اول اس لحاظ سے کہ بقول مولانا حالیؔ کسی مصنف کی وفات کے بعد اس کے مکتوبات کا فراہم کرنا درحقیقت اسکی سوانح عمری کا ایک مہتم بالشان حصہ قلمبند کر دینا ہے کیونکہ انسان کے اخلاق اور جذبات کا انکشاف جیسا اسکی بے تکلفانہ خط کتابت سے ہو سکتا ہے ایسا کسی اور چیز سے نہیں ہوتا اسی واسطے مکتوبات کو نصف ملاقات قرار دیا[1] گیا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ جب اس کا وجود عنصری خاک میں پنہاں ہو گیا اور اس سے ملنے کا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہا اب اس کی ملاقات محض اس کی خط کتابت پر منحصر ہے اور بس"

دوسرے اس لیے کہ بقول حضرت ثاقبؔ جو لوگ طالبانِ فن انشا ہیں ان کے واسطے یہ خطوط استاد شفیق کا کام دیں گے، زبان کی فصاحت و متانت، معاملہ نگاری، مختصر نویسی، ہر بات کی تحقیق، صحت و خطا کی احتیاط، یہ تمام باتیں بغور کرنے والوں کو ان سے زیادہ یہ تحریریں تعلیم دیں گی،

ان امور کے علاوہ احباب سے اخلاص، تلامذہ کے ساتھ شفقت، عزیزوں سے محبت، تقویٰ، صبر و رضا، استقلال اور دوسری پاکیزہ صفات کا سبق بھی حاصل ہوگا"

مثال کے طور پر ہم مکتوبات امیر سے چند فقرے اور عبارتیں نقل کر کے اس طویل تقریظ کو ختم کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:-

حکیم برہم کے نامے میں اکثر، وقات دعا سے صحت دلخواہ میں مصروف رہتا ہوں

[1] قرار دیا ہے یا قرار دیتے ہیں، چاہیے مگر ... قرار دیا گیا ہے صحیح نہیں ہے۔۱۲ حسرت

مجیب الدعوات مستجاب فرمائے" تم سا رسا آدمی اور اب تک اس باب میں حسن کارگزاری کا پتا نہیں" "اب جو تم نے اپنی ملاقات سے سرور کرنے کا وعدہ کیا ہے خدا تمہارے وعدہ کو پورا کرے جو تمہارا وعدہ ہے وہی میری تمنا ہے اور اپنی تمنا کو پورا ہوتے میں نے بہت کم دیکھا ہے اس لیے اس وعدے سے دل کو پوری خوشی نہیں ہو سکتی۔

'مایقرء' کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہی جیسے کیس فلاں شخص کا خط مایقرء ہے' خوشنویس نہیں اور کسی چیز کے ساتھ استعمال میں نے نہیں سنا'

بحر نے جو ایک شعر میں ۵

اب مجھسے التیام کی باتیں نہ کیجئے　　دل تم سے ہٹ گیا جگر افگار ہو گیا

مصرع اولی میں 'کیجئے' کے ساتھ خطاب کیا ہے اور دوسرے میں 'تم سے' یہ بحر پر موقوف نہیں بلکہ اس زمانے تک اکثر معاصرین بحر جنکا شمار اساتذہ میں ہے اس کے تارک نہ تھے' ان کے بعد متاخرین نے اس اختلاف خطابات سے احتراز کیا میں بھی انہیں تارکین میں ہوں

"یہاں برہم اب خط لکھا ہی تو تکتے رہو پھر ایسا غوطہ نہ لگا نا کہ مہینوں کی خبر نہ لو خدا کرے اس خط کے پہنچنے تک تمہاری طبیعت صاف ہو گئی ہو اور مژدہ صحت و نخوا ہ جلد سامعہ نوازی کرے" "خدا وند تعالیٰ ہر جگہ آپ کو رسا اور کامروا رکھے' میں بھی حسن یاد آوری کا شکر گزار ہوں' بارش یہاں بھی دسویں صفر سے جو شا جوش ہے" "صنخا نہ عشق کو نظر ثانی سے مکمل و مہذب کر لیا ہے کچھ کسر باقی ہے...... یہ دیوان دیوان اول سے بدرجہا اولی تر ہے باعتبار زبان اور مزے کے اور باعتبار بلاغت کے بھی"۔

حکیم عابد علی کو خط کے نام" مدفن بکسر فا لغتہ صحیح' پھر موزوں کرنے کو کون منع کرتا ہے' اچھا نہ معلوم ہو نہ کیجئے' میں نے بھی کیس نہیں کہا حلد تشیاں نے موزوں کیا تھا' بہت چرچا رہا' مگر بیت نہیں کی تھی کہ لفظ صحیح ہی چپقلش معنی جنگ شمشیر غیاث میں بفتح لام ہے' اور اردو میں بکسر لام اتو ہ کے معنی میں ہے۔ خانہ کعبہ کا ترجمہ کعبے کا گھر بالکل مستعمل نہیں اور نہایت برا معلوم ہوتا ہے وجہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ ترکیب اضافی نہیں ہے' ترکیب توصیفی یا بدل مبدل منہ ہے' پھر کعبے کا گھر کیونکر درست ہو گا' آپ کسی سے تو لڑتے نہیں اور منجھیے

ملہ شاعرانہ نثر کی یہ پسندیدہ مثال ملاحظہ طلب ہے۔ حسرت

کہ غلط ہیں ہاں معتبرین کے کلام میں نکلے تو خیر اگر کوئی آپ سے پوچھتا ہے تو سمجھا دیجئے
کہ میرا تو یہ خیال ہے، پھر وہ تاویلات کرے تو چپ ہو رہیئے۔
"گرہنا" اور "گرہنا" دونوں صحیح ہیں مگر گرہنا شعرا کے کلام میں نہیں پایا جاتا فصحاے لکھنو گرنا کو ترجیح
دیتے ہیں "بھانا" پسند آنا کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک
ہے "مہیں" میں ہی کہونگا۔ بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں
گزرا حکم اس کو استعمال کا نہیں دیا جا سکتا حضرت امیر مرحوم کی نظر سے آپ کے شعر
میں نہیں معلوم کیونکر رہ گیا، اور میں نے بھی اسے دیکھا ہے تو سوا اپنے سہو نظر کے اور کیا کہا جائے
انکھڑیاں چشم معشوق کے لیے مخصوص ہیں اور یہ لفظ مجھے پسند ہیں "بدنا" لفظ نہیں ہے "بدنا" بدی
اور سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہیں صبا سے

شور جسکا ہی وہ ہے عشق جنوں زا دل میں بدہ گیا ہے نمکِ حسن کا سودا دل میں

حضرت زاہد سہارنپوری کے نام "عین الانسان و انسان العین پیارے زاہد حسین
صانکم اللہ عن کل شین، ۹ ستمبر کی تحریر سعادت خمیر نور افروز نظر منتظر ہوئی "ذُمّل" لفظ عربی ہے
دامیل اس کی جمع ہے۔ ذمیل صحیح نہیں آپ کے قلم سے کسی جگہ یونہی نکلا لہذا اطلاعاً
لکھا گیا ہے" اب بتانے کی یہ بات رہی کہ مشتری ستارہ مذکر ہے یا مونث واضح ہو کہ یہ ستارہ
مونث ہی اور جہاں کہیں سخندانوں اور سخنوروں نے استعمال بتذکیر کیا ہے وہاں ستارہ
مقصود نہیں ہے جس کو مشتری سے تشبیہ دی ہے جیسے ناسخ کے اس مطلع پر سے

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

ان کے شاگرد رشید مرزا محمد رضا برق نے جو مصرعے لگائے ہیں اس میں قمری کو جس کی
کی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں بتذکیر استعمال کیا ہے تو بات یہی ہے کہ وہاں قمری طایر
مقصود نہیں ہے وہ تضمین یہ ہے۔ سے پروانہ ہوں ازل سے سراج منیر کا + قمری ہو
سرو باغ علی کبیر کا + میں نغمہ سنج ہوں چمن بے نظیر کا + بلبل ہوں بوستان الخ۔
جہاں تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ آئے گا۔ وہاں مشتری سے دولہا ہی
مقصود ہوگا جیسے قمری سے برق کے شعر میں عاشق یا خود متکلم و مصنف مراد ہے"

جامع مکتوبات حضرت ثاقب کے نام "اگر اردو زبان میں کچھ موزوں کرنے کا اتفاق ہوتا ہو تو طرح دامن گلچیں میں طبع آزمائی ضرور فرمائی جائے کہ اس کی رونق بڑھے اور ترتیب حروف تہجی میں آپ کے تخلص سے ثائے مثلثہ کا گھر آباد ہو کہ وہ ویران پڑا ہے"

تذکرہ انتخاب یادگار حسب فرمایش سرکار مرتب ہوا اور چھپکر سرکار میں داخل ہوا میں اپنی تالیفات کو اس قابل نہیں جانتا کہ ہدیہ احباب کروں علی الخصوص یہ تذکرہ جس میں مجھکو عالات تاریخی اور انتخاب اشعار میں کوئی مداخلت نہیں ہے قلم کو دست کاتب ہیں"

فصیح الملک مرزا داغ کے نام "میاں کبھی کسی مزار پر انوار پر جانا ہو تو درا اس سیہ کار کے حق میں بھی دعائے حسن ختام کر لو ہر نفس نفس واپسیں ہے دیکھا چاہیے کیا معاملہ پیش آتا ہے پیارے داغ! افسوس کہ میں نے ہمیشہ سے کوئی ساعت آپ کی خدا کی طرف متوجہ نہ کی سنئے" اے میرے اللہ مجھ ناصح بے معنی کو جو خود نصیحت ہے اور داغ کو نصیحت کر رہا ہے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے مرضیات میں کوشش کی توفیق دے اور میرے سب عزیز دوستوں کی عمر و کیا خزانہ ہی اپنے انوار رحمت سے بھر دے آمین"

مولوی نور الحسن خلف حضرت محسن کاکوروی کے نام "مسالا معلوم ہوتا ہے کہ مصالح کیا مخفف ہے جو عربی میں مصلحۃ کی جمع ہے اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہی محل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے جیسے عمارت کے لیے چونا سرخی وغیرہ تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے لیے گوٹا پٹھا بنت کناری کھانے کے لیے لونگ الائچی دھنیا مرچ بال دھونے کا مسالا محرم کا مسالا مسالے کا تیل دتی والے اصل کی طرف جاتے ہیں مگر چونکہ زبانوں پر مصالح نہیں ہے یعنی کوئی یہ نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا گرم مصالح ہو گیا کڑھی میں مصالح کم پڑا اب کے محرم کا مصالح ہمکو نہیں دیا اس لیے میری رائے ہے کہ اردو میں جو بولیں وہی لکھیں جس طرح مسالا بولتے ہیں اسی طرح لکھا بھی جائے اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنؤ کا ہے جیسا رشک نے لغت میں لکھا ہے مسالا بمیم مفتوح سین

ممدود و لام بالف کشیدہ ضروریات ہر چیز باشد کہ بداں ضروریات رونق و لذت آں چیز شود ظاہر
ایں لغت از مصالح باشد" اور اسی کی تقلید جلال نے بھی اپنے لغت گلشن فیض میں کی ہے۔ نیر
مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے ؎

کھک چیز کئے کو مانگے جراحت دل پر — جو دیکھیے آپ کے موباف کا مسالا سانپ
کالا سانپ ہو یا لا سانپ زمین سے نہ ڈسے

کسی کے سینۂ سوزاں سے کیا لگتی نہیں ہو — کیا بات ان کی کچھ کچھ اکھو کرتی ہے یہ مسالے میں
لاتے ہیں پیالے میں زمین سے اور جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے
کہ محلات لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی ؎

لے جان ایسا چاق سے بیٹا یا ہیچ کر — لگیا کا میری ہاتھ مسالا مسل گیا

حضرت صفیر بلگرامی نے تذکرۂ جلوۂ خضر میں امیر مرحوم کا حال اور عظیم آباد میں
حضرت شاد سے جو ملاقات میرے والد سے اپنی ملاقات کا ذکر درج کر کے ایک خط بھی نقل کیا
ہے۔ ہم اس مکتوب کو بھی اس مضمون میں شامل کئے دیتے ہیں۔ وہو ہذا۔

حضرت صفیر بلگرامی کے نام

بلبل شیراز و طوطی ہند کے ہم صفیر سلامت۔

سلام مسنون۔ اشتیاق بیاس مشحون۔ سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی
پرستاری نے مجھ سے جی بھر کے اُن آسائشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقات جناب
سے سفر میں پائی تھیں۔ وہ سرگزشت لکھوں تو منظوم مرثیہ ہو جائے۔ کتنے ہی عزیز چل بسے
خدا مغفرت فرمائے۔ اس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے نیاز نامہ کے امیر کو یہ
سمجھیں کہ وطن پہنچ کر آپ کی مہربانیوں اور قدردانیوں کی لذت بھول گیا۔ نہیں نہیں اسے یاد ہیں
امیر اللغات کے اصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب باصواب
کی آرزو ہے۔ زیادہ حاجت تصدیع نہیں۔

امیر احمد عفی عنہ۔ ۵ دسمبر ۱۸۸۸ء

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک	تنقید رسائل و کتب Islamic Fraternity	دو شلنگ یا ۱؎ فی پرچہ ۲/

اخبار اسلامک فریٹرنٹی - ٹوکیو

ہمارے قدیم کرم فرما مولوی محمد برکت اللہ صاحب بھوپالی خدمت اسلام میں ہر وقت اور ہر حال میں سرگرم رہتے ہیں۔ نیویارک میں آپ جب تک رہے برابر امریکن اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے رہے آجکل آپ ٹوکیو یونیورسٹی میں اردو زبان کے پروفیسر ہیں یہاں سے بھی اپنے تمام مشاغل سے وقت بچا کر آپ نے ایک ماہوار اخبار اسلامک فریٹرنٹی نکالنا شروع کیا ہے جس کی پہلی جلد مارچ سنہ [illegible]ء میں ختم ہو گئی ہے اور اب اپریل سنہ ۱۱ء سے دوسری جلد شروع ہو گی۔ حامیان اسلام کے لیے اس اخبار کی خریداری کا یہ موقع بہت اچھا ہے اُس کے اجرا سے مولوی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ وابستگان ملت بیضا میں پیوند اخوت مستحکم کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانان عالم اور دیگر مذاہب کے درمیان سلسلہ اتحاد و آشتی کی صورت پیدا ہو" مولوی صاحب کا پتہ یہ ہے :-

مولوی محمد برکت اللہ صاحب ۴۰ ڈائی ماچی اکاساکا ٹوکیو (جاپان)

فروری سنہ ۱۱ء کے پرچے میں زیر عنوان "خلیفہ اسلام سلطان محمد خامس" ایک قابل غور مضمون شائع ہوا ہے جس کے ضمن میں مولوی صاحب نے تمام اسلامی ممالک کو یورپین خطرے کے مقابلے میں متحد ہو جانے کی جو قابل قدر صلاح دی ہے اسپر کاربند ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے حریت، مساوات اور برادری کو اسلام کا اصل اصول سمجھنا چاہیئے جب سے مسلمانوں نے اس اصول کی پابندی ترک کر دی اسی وقت سے انکا تنزل اور یورپین طاقتوں کا عروج شروع ہوا۔ خدا کا شکر کہ ایک عرصہ دراز کے بعد مسلمانوں نے اپنے سوشلزم کے قدیمی او صحیح اصول کو از سر نو اختیار کرنا شروع کر دیا ہے چنانچہ ٹرکی و ایران میں جمہوری حکومت قائم بھی ہو گئی ہے۔ لیکن اہل مغرب کو جو ہمیشہ مشرقی اور اسلامی سلطنتوں کو باہم تقسیم کر لینے کے درپے رہا کرتے ہیں ان ممالک کی یہ آزادی اور جمہوری استحکام ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ البانیا کی بغاوت یمن کی شورش ایران

Manlvi Prof Barkatullah no 40 Dai machi Akasaka Tokyo (Japan).

کی بدنظمی غرضکہ تمام خرابیوں کا سبسے قوی سبب یہی ہے کہ باغیوں کو خفیہ امداد اور آلات
حرب بہم پہنچاکر یورپین طاقتیں اسلامی ممالک کو ہمیشہ اندرونی جھگڑوں میں مبتلا رکھنا چاہتی
ہیں تاکہ انہیں اپنی بری و بحری فوج کی ترتیب نیز وسائل ترقی کی اختیار کرنیکا کسی طرح
سے کوئی موقع ہی نہ مل سکے لارڈ کرزن نے اپنے رکٹورل ایڈریس گلاسگو میں صاف
صاف اشارہ کر دیا ہے کہ اہل مغرب کو ٹرکی ایران افغانستان اور عرب وہی کچھہ کرنا
ہے جو وہ وسط ایشیا ہندوستان اور انڈوچائنا میں کر چکے ہیں۔ ایسی حالت مسلمانان
عالم کا فرض ہے کہ حفاظت اسلام کا ایک خاص فنڈ قائم کرکے ٹرکی و ایران کو مالی اعانت
بہنچائیں اور فرانس انگلستان و روس کے مقابلے میں تمام اسلامی ممالک کو لازم ہے
کہ متحد ہو کر اپنے قیام و بقا کی فکر کریں اور مذہبی اختلافات کو فراموش کر دیں جسکی ایک قابل
قبول عمل صورت نادرشاہ درانی نے یہ تجویز کی تھی کہ حنفی شافعی مالکی اور حنبلی مصلوں
کے مانند مسجد مکہ میں اہل تشیع کا ایک پانچواں جعفری مصلیٰ بھی قائم کر دیا جائے تاکہ شیعہ
سنی کا اختلاف اس سے زیادہ باقی نہ رہے جتنا مثلاً حنفیوں اور شافعیوں کے درمیان
پایا جاتا ہے۔ مولوی برکت اللہ صاحب کو امید ہے کہ انکے پرانے اور عزیز دوست
عبداللہ آفندی ترکی پارلیمنٹ میں اس مسئلے کو ضرور پیش کرینگے اور جب تک وہ
منظور نہوگا برابر اس پر زور دیتے رہینگے۔

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک صرف للعہ	اخبار وکیل امرتسر اور مسلم یونیورسٹی	حجم ۱۲ صفحے ہفتے میں دوبار

زبان کی صحت اور لٹریچر کی خوبی کے لحاظ سے زمیندار کی طرح وکیل بھی ایک خاص امتیازی
حیثیت رکھتا ہے جس کے اڈیٹوریل مضامین کی آزادی کا مقابلہ نسبتاً کوئی دوسرا اسلامی
اخبار نہیں کر سکتا مثلاً ۲۹۔ اپریل کے پرچے میں مسلم یونیورسٹی اور عام رائے کے مطالبے
پر ایک قابل قدر مضمون نکلا ہے جسکا مفہوم یہ ہے کہ قائم ہونیوالی مسلم یونیورسٹی کو بحیثیت حکومت
کی ماتحتی سے آزاد رہنا چاہئے۔ اس کا چانسلر مسلمان ہو اور اس کی عنان انتظام بھی
مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہے اور سبسے زیادہ یہ کہ اس کی تعلیمی زبان اردو رکھی جائے

یہ سچ ہے کہ اردو زبان کا علمی ذخیرہ ابھی بالکل ہی ناقابل اطمینان حالت میں ہے مگر مدعا یہ نہیں ہے کہ اس تحریک پر ابھی سے عملدرآمد شروع ہو جائے بلکہ غرض یہ ہے کہ اصولاً یہ مسئلہ طے ہو جانا چاہیئے اور اسکو عملی صورت میں لانیکے لیے یونیورسٹی کے ماتحت مغربی علوم و فنون کے ترجمہ و تالیف کا ایک محکمہ کھول دینا چاہیئے۔ حکومت سے آزادی کے متعلق ہم کچھہ لکھنا نہیں چاہتے اس لیے کہ ہمکو ٹرسٹیان علیگڑھ کے دلوں میں محکومی اغیار کی محبت اسدرجہ راسخ ہو گئی ہے کہ ان سے کسی قسم کی آزاد خیالی کی توقع رکھنا خیال است و محال است و جنون۔ البتہ مسئلہ زبان کی نسبت ہم یہی کہیں گے کہ جب تک تحصیل علوم سے قبل ایک غیر زبان کے سیکھنے میں زمانہ طالبعلمی کے بہترین دس بارہ سال ضائع ہوا کریں گے اسوقت تک مسلم یونیورسٹی سے کسی حقیقی فائدے کی امید رکھنا عبث ہے یہ غلط کہ انگریزی میں ہر مضمون علوم و فنون کا اتنا ذخیرہ مہیا ہو جاتا ہے جسکا اردو ترجمہ سال بھر میں ہی نہیں ہو سکتا محض فضول ہے اس لیے کہ مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کی تعلیم بدستور لازمی رہیگی جس کی مدد سے طالبعلم حسب استعداد اپنی معلومات وسیع کر سکیں گے تاریخ۔ جغرافیہ۔ ریاضی۔ سائنس۔ پولٹیکل ایکانومی منطق۔ فلسفہ وغیرہ کی درسی کی کتابیں ابتدا اردو میں ہوں گی۔ جنکے پڑھنے سمجھنے۔ یاد کرنے اور پہنچنے کے بعد اسی قسم کی کتابیں تصنیف و تالیف کرنے میں بے انتہا آسانی ہو جانے کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ طالبعلموں کو ابتدا ہی سے تحصیل علوم کا موقع مل سکیگا۔ اگر اس موقع پر مسلمانوں نے اردو کو تعلیمی زبان قرار نہ دیا تو ہندو یونیورسٹی میں ترجمہ علوم و فنون سے مالامال ہو کر ہندی اردو کو ایسی شکست دیگی کہ پھر اسکا کہیں ٹھکانا نہ رہیگا اور مسلمان لیڈروں کی باتیں بھرتی کا کام آئیں

اڈیٹر ظفر علیخان صاحب بی اے علیگ	اخبار زمیندار لاہور	قیمت سالانہ مع محصولڈاک ۶

نقل مکان کرکے یکم مئی ۱۹۱۱ء سے اخبار زمیندار کرم آباد کے بجائے لاہور سے شائع ہونیلگا ہے یہ اخبار بڑی تقطیع کے ۱۲ صفحوں پر (جو معمولی اخبار اور ہندوستان کے ۲۴ صفحوں کے برابر ہوتے ہیں) مہینے میں چار بار شائع ہوتا ہے اسکے اڈیٹر اردو زبان کے ایک مشہور انشاپرداز ہیں یہی وجہ ہے کہ لٹریچر کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی اخبار اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اخباری حیثیت سے بھی اسکی خوبی میں کلام نہیں۔ ہم ناظرین اردوئے معلی سے اس کی خریداری کی سفارش کرتے ہیں۔

سلہ جسطرح ہندو یونیورسٹی والوں نے طے کر دیا ہے کہ وہاں رفتہ رفتہ تمام علوم کی تعلیم ہندی میں دیجائیگی اڈیٹر سلہ مضمون نواب وقار الملک بہادر بجواب کیل

سلہ موجودہ صورت میں علوم کی تعلیم کا آغاز ایف۔ اے بی اے سے قبل نہیں ہو سکتا۔

غزل جناب مولوی عبد الاحد صاحب شمشاد لکھنوی مدظلہ العالی

روز غم کیوں روشنی سے تیرگی ہمدوش ہے
دود دل کیا ساغر خورشید کا سرپوش ہے

بد زبانی کج بیانی کا سراسر جوش ہے
اور جو فصیح ہے ابکم سے سوا خاموش ہے

بیخودی کی جس کے دل میں کچھ بھی لذت نہیں
ہوش کا پتلا سہی لیکن بڑا بیہوش ہے

جو با قدرتنے میں نے سب بے تکلف لے لیا
یہ تو جیا میرے حق میں نیش یا نوش ہے

یہ مری تقدیر کی خوبی ہے میں مخمور ہوں
میکدے میں ہر طرف آواز نوشا نوش ہے

ساقی نے یہ کہکر میری باری ٹالدی
ایک ساغر اسکو کیا دوں یہ تو دریا نوش ہے

آسمانوں کو لیے پھرتا ہے جو شکل حباب
میری دریا بار آنکھوں کا یہ ادنے جوش ہے

والے غفلت رہنے والونکو نہیں اس کی خبر
بہر طفل اشک حلقہ آنکھ کا آغوش ہے

ضبط سے ہونے لگا غبارے دل کیوں ناشکیب
عشق چشم مست ہے یا بادہ پر جوش ہے

درد ہجراں کی شب جمل آگئی کیا دل کو یاد
شام ہی سے مثل شمع صبح کیوں خاموش ہے

نقد دل تو لے چکا ایمان کی اب فکر کیا
لے بت کافر ترا دل سخت ناحق کوش ہے

میکدے پر جھوم کر بادل نہیں آئے ہیں یہ
دامن رحمت کسی کا ذیل عصیاں پوش ہے

جب سے شمشاد پڑھ دو تم ہی سنئے شعر تر
ایک گل اندام سننے کو سراپا گوش ہے

غزل جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت متوطن کلکتہ

جو مجھ سے ہو سکے تو کاوہ اپنا چشم تر کر دے
[illegible] دل کی آنکھو پردے پردے میں خبر کر دے

اک آہ نا تواں کافی ہے [illegible] عمر کو
شکایت ہجر کی طولانی ہے اے دل مختصر کر دے

مری امید ہے امید گویا نا امیدی کی
اثر کی آرزو شاید دعا کو بے اثر کر دے

ہنسی کو مضطرب کتنی ہے تو نے [illegible]
میں جب جانوں کہ اس کافر کے دلکو بھی خبر کر دے

[illegible]
مجھے بیتاب اگر خود خواہش زخم جگر کر دے

[illegible]
امید صبح عشرت میں شب غم کو بسر کر دے

[illegible]
یہ اپنی عمر کو تو جسطرح چاہے بسر کر دے

[illegible] ہوتا جاتا ہوں سبب کیا ہے
مری سنگین دلی میرا ہی پتھر کا جگر کر دے

سیہ ہے تیرے گیسو کی طرح غمخانۂ عاشق
رخ روشن کو اکدن آفتاب بام و در کردے
گراں ہوتا ہی طبع شعر کو طول سخن حشت
اگر پر لطف رکھنا ہے غزل کو مختصر کردے

غزل جناب مولانا شفق عمادپوری شاگرد امیر مینائی مرحوم

آنسو ہوئے کیوں جاری کیوں دل ہوا گردیدہ
کیا دیکھ لیا تو نے اے دیدۂ غم دیدہ
زاہد کی گلیں آئے رندوں کے تصدق میں
بے مانگے جو ملجائے در دے کے نوشیدہ
شمشاد کی کیا ہستی طوبی کو بھی ہے پستی
بالا ہے صنوبر سے سرو قد بالیدہ
در ہے نہ کوئی روزن دیوانے کدھر جائیں
دیواریں ہیں زنداں کی وقف سر شوریدہ
گلچیں کا بھی کھٹکا ہی صرصر کا بھی دھڑکا ہے
گل رنگ پریدہ ہیں سبزہ بھی ہی کاہیدہ
زاہد تری طاعت ہو یا میری ندامت ہو
رحمت کو پسند آئے جو کار پسندیدہ
سنتے تھے شفق دیکھا تل اوٹ پہاڑ او جہل
ہے مردم دیدہ میں اک جلوۂ نادیدہ

غزل جناب نواب شمشیر بہادر صاحب اخگر رئیس اجیگڑھ

مہماں ہو مرے گھر میں مجھے باوری نہیں
وہ صنم وعدہ شکن ہی ہے ستمگر ہی نہیں
کوہ و صحرا میں بگولوں کی طرح پھرتے ہیں
آپ کے خانہ بدوشوں کا کہیں گھر ہی نہیں
خلد میں بھی نظر آتے ہیں سے عشق کے مست
جگمگا بادہ کش و یکا لب کوثر ہی نہیں
جان بھی طائر بسمل کی طرح ہے بیتاب
میرے پہلو میں تنہا اک دل مضطر ہی نہیں
دل میں ہی سوز محبت نہ کوئی گرمی عشق
دیکھنے آئے ہو کیا اب کہ وہ اخگر ہی نہیں

غزل جناب سید اعجاز حسین صاحب اعجاز لکھنوی تلمیذ مشتاق مرحوم

پھر آئے اشک دل میں بڑھ گیا جب سوز غم میرا
عرق کی طرح بھکر آ گیا آنکھوں میں دم میرا
عجب سلطان شاہانہ ہے ہنگام رقم میرا
نشان آمد فوج معانی ہے قلم میرا
میرے اشعار ہے اصلاح ہیں پھولوں کے گلدستے
برنگ شاخ گل ہی ناتراشیدہ قلم میرا
ہوا نے خاک اڑائی رہروں نے ٹھوکریں ماریں
رہا میری طرح ثابت قدم نقش قدم میرا
بجائے اسکے اظہار مسرت جب کیا میں نے
پشیماں ہو کے قاتل نے کہا ہے یہ ستم میرا
میرے دل میں تصور اسکا قائل ہو انا الحق کا
خلاف حق نہیں ہے نعرۂ منصور دم میرا

مری رفتار سے شکل قلم مطلب ٹپکتا ہے — ارادہ دل کا کرتا ہے عیاں نقش قدم میرا

غزل مولوی سید امین الحسن صاحب بسمل موہانی

زمانہ نے چھوڑایا کیا تعلق میگساری سے — ہے میخانہ میں سناٹا میری پرہیزگاری سے

بظاہر ترک الفت سے تڑپ دبی ہوئی دل کی — میں سمجھا تھا کہ فرصت ملگئی اب بیقراری سے

جنون فتنہ زا کیا جانئے کیا آفت اٹھائیگا — ذرہ دامن بچائے او ستمگر ہوشیاری سے

جو دل پر ہاتھ رکھا آپ نے غم تھا نہ حسرت تھی — مریض آہ تھا تو اچھا ہو گیا تیمارداری سے

حیا مانع نہیں مجھسے وہ ملتا ہے مگر بسمل — نظر اٹھتی نہیں اس بیوفا کی شرمساری سے

غزل حسرت موہانی

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے — ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

یاد بھی دل کو نہیں صبر و سکون کی صورت — جب سے اس ساعد رنگیں کو کھلا دیکھا ہے

پھر اسی لطف ستم کوش کا مشتاق ہے دل — ہمنے جس لطف کو ہمرنگ جفا دیکھا ہے

تجھ میں کچھ بات ہے جو کسی میں نہ ملی — یوں تو اوروں سے بھی دل ہمنے لگا دیکھا ہے

دل بیتاب جو قابو میں نہیں ہے حسرت — نگہ شوق نے کیا جانئے کیا دیکھا ہے

ولہ

ماخوذ از رسالہ ادیب الہ آباد

محبوبی و رنگینی ہیں حسن و بدن تیری — سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

مجبور وفا کر کے محروم کرم کرنا — بھولینگی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری

باطن میں وہ بیمہری ظاہر میں یہ دلجوئی — ہم خوب سمجھتے ہیں ترکیب سخن تیری

غارتگر تمکیں ہے آشوب دل و دیں ہے — یہ طرز نگہ تیرا یہ وضع حسن تیری

جو ہم سے چھپائی تھیں ہمکو نہ بتائی تھیں — روشن ہیں وہ سب ہم پر باتیں من و تن تیری

اب رونے سے کیا ہوگا پروا تھی بے پروا — برباد ہے سب محنت اے شمع لگن تیری

اس شاہد رعنا کے اکرام و اقامت سے — تقدیر چمک اٹھی اے ملک دکن تیری

تنہائی غربت سے مغموم ہو حسرت — کب تک نہ خبر لینگے یاران وطن تیری

نوید مقدم شاہی[1]

از افکار تازہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سابق مدرس فارسی گورنمنٹ نارمل اسکول آگرہ

نو بہار بوستاں آنے کو ہے
خسرو گل ہم عناں آنے کو ہے

بہر استقبال رایات بہار
لشکر سرو رواں آنے کو ہے

ابر گوہر بار بحر مغربی
سوئے مشرق درفشاں آنے کو ہے

راہ دریا سے سفینوں کی قطار
صورت سیارگاں آنے کو ہے

نوجواں بنکر نگاہ خلق میں
داستان باستاں آنے کو ہے

جام صحت بنکے بزم عیش میں
گردش رطل گراں آنے کو ہے

طاقہ طاقہ مخمل روم و فرنگ
فرش راہ دوستاں آنے کو ہے

طبلہ طبلہ مشک تاتار و ختن
حسب حکم میزباں آنے کو ہے

بیچنے جنس نادرات روزگار
مجمع بازارگاں آنے کو ہے

مرہم آفاق کا جو غیر [illegible]
کارواں در کارواں آنے کو ہے

ہر طرف سے لشکر آراستہ
مثل دریائے رواں آنے کو ہے

[illegible] ہندوستاں
جانب ہندوستاں آنے کو ہے

[illegible]
مژدۂ امن و اماں آنے کو ہے

مہر و الفت کی گراں مایہ متاع
بر سبیل ارمغاں آنے کو ہے

منتظر [illegible] زبان خلق پر
شادباش [illegible] آنے کو ہے

[illegible]
آخر سال رواں آنے کو ہے

[illegible] کی انتہا [illegible] اکتوبر ۱۹۱۰ء [illegible] سالہ کو استاد [illegible] فرمایا انا للہ وانا الیہ راجعون [illegible] رسالے میں [illegible] کا تذکرہ [illegible] دیوان [illegible] بطور [illegible] میں [illegible]

[1] رسالہ ادیب الہ آباد سے [illegible] کیا گیا۔

ضمیمہ اردوے معلّٰی بابت ماہ مئی ۱۹۱۱ء

مجموعہ غزلیات

مشاعرہ علیگڑھ

منعقدہ ۱۲ فروری ۱۹۱۱ء

جسکو

سید فضل الحسن حسرت موہانی نے بفرمایش منشی منگل سین صاحب بیدل
جہنجانوی اپنے

اردوے پریس علیگڑھ میں چھاپا اور شایع کیا

تمہید

علیگڈھ میں ہر سال ماہ فروری کے شروع میں ایک پسندیدہ میلہ ہوا کرتا ہے. جس میں ضلع کی پیداوار اور دوسری صنعتی چیزوں کی نمایش کے علاوہ گھوڑوں اور متفرق تجارتی سامان کی بھی اچھی بکری ہو جاتی ہے۔ اس موقع پر ضلع کے تمام رؤسا اپنے خیمے مقام نمایش سے متصل قائم کر کے سات آٹھ روز تک مصروف سیر و تماشا رہتے ہیں۔ گھوڑدوڑ اور دنگلوں میں بھی اچھا مجمع ہو جاتا ہے۔

اس سال منشی منگل سین صاحب بیدل جھنجھانوی نے ان دلچسپیوں پر ایک اور جدید اضافہ کیا یعنی ایک سالانہ مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ جس کا اشتہار قبل سے چھپا کر ضلع و نواح ضلع کے شعرا کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۲- فروری کو یہ مشاعرہ منشی رام دیال صاحب علم رئیس علی گڑہ کے خیمے میں منعقد ہوا۔ اور دیر تک شعر و شاعری کے چرچے سے حاضرین محظوظ ہوتے رہے۔

طرحیں دو قرار پائی تھیں (۱) تیرا گناہگار ہوں تیرے سوا ہے کیا

(۲) آئینہ آئینہ دیکھے تو حیراں ہوگا

بعض شعرا نے دونوں طرحوں میں طبع آزمائی کی تھی اور بعض نے صرف ایک میں بہر حال ان غزلوں میں سے جسقدر دستیاب ہوئیں انکا مجموعہ تفریح طبع ناظرین کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

لہ نمایش کے انتظام میں منشی صاحب ہی شریک تھے. چنانچہ حسن کارگزاری کے صلے میں آپ کو حاکم ضلع نے انعام سے بھی سرفراز کیا ہے۔

بسم اللہ

جناب سید مخدوم عالم صاحب اثر مارہروی

یہ تو بتا اثر کہ تجھے ہو گیا ہے کیا
تو بھی اس انجمن کا نکالا ہوا ہے کیا

آتا نہیں سمجھ میں کہ خط میں لکھا ہے کیا
یہ بھی کوئی نوشتۂ کلک قضا ہے کیا

ساقی پناہِ خلق ترا آستانہ ہے
پھر جاؤں ترے در سے مرا سر پھرا ہے کیا

ہر ذرہ آفتاب سے کرتا ہے روشناس
آئینہ مجاز حقیقت نما ہے کیا؟

بدمست کر دیا ہے ہوا سے بہار نے
سنتا کہ عندلیب کی دلکش صدا ہے کیا

تیرا امیدوار کس امید پر رہوں
تو آپ آکے دیکھ تو مجھ میں رہا ہے کیا

میں اور نا امید ہوں درگاہ سے تری
آمرزگار تو ہے تو میری خطا ہے کیا

ان کا ہی میں شکار رہوں اور میری سادگی
ان سے ہی پوچھتا ہوں کہ مجکو ہوا ہے کیا

اے شوق بڑھ کے یار کے قدموں پہ لوٹ جا
دیوانہ ہو گیا ہے کھڑا سوچتا ہے کیا

آخر کسی کا ہو کے رہی ہی غریب دل
میرا اگر نہیں ہے تو پھر آپ کا ہے کیا

کیوں ہم کلام تجھ سے ہوں خلوت میں اے اثر
وہ خوب جانتے ہیں ترا مدعا ہے کیا

جناب سید علی احسن صاحب احسن مارہروی

خوش بہت عشق سے اول دل ناداں ہو گا
مگر انجام یہ ہو گا کہ پشیماں ہو گا

سب سے بیگانہ جو سمجھا کوئی انساں ہو گا
آپ کے سر کی قسم آپ کا خواہاں ہو گا

عیش ہے منحصر اے وقت مساعد تجھ پر
تو نہ ہو گا تو نہ پورا کوئی ارماں ہو گا

خواب میں دل کو جدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے
اس کی تعبیر یہ ہے عشق حسیناں ہو گا

اپنے مہجور کو تیروں کا نشانہ نہ بنا
تیر کیا تیرا تصور لئے پیکاں ہو گا

کیوں نہ افشا ہیں اُس چمن حسن کے ساتھ
کیا کہیں کانٹوں سے خالی ہی گلستاں ہو گا

خاک دیکھے یہ تو مجھ سا پشیماں خاطر
وہ بھی میری ہی طرح سر بگریباں ہو گا

کوئی غم عشق میں ایسا نہ بچے گا جو نہو
کل ہوا صدمۂ دل آج غم جاں ہو گا

قتل کچھ بات نہیں وصل محالات نہیں
تم جو چاہو گے تو دشوار بھی آساں ہو گا

کس بھروسے پہ شب غم کوئی مرنا چاہے
قبر میں بھی وہی رنگ شب ہجراں ہو گا

اے دل حسن طلب ناز بجا ہے تیرا
کیا خبر تھی کہ وہ خود بھی ترا خواہاں ہو گا

ایک دیدار کی حسرت ہی نہیں مایۂ عشق
دل سلامت ہے تو سب کچھ مجھے ارماں ہو گا

پھانس چبھ کر جو نکل جائے تو کیا لطف خلش
کوئی درد جو نا قابل درماں ہو گا

فصل ہو گی تو حواسوں میں نہ آئے گا خلل
عشق ہو گا تو یہ مجموعہ پریشاں ہو گا

ہے شہیدوں کی جوان کے ہی کثرت حسن
ایک دن سارا جہاں گنج شہیداں ہو گا

دیگر

اے دل نہ آئے وہ تو کہوں کیا ہوا ہے کیا
تقدیر کا بگاڑ ہے تدبیر کا ہے کیا

غفلت شعاریوں نے غضب یہ کیا ہے کیا
مجھکو خبر نہیں مرے دل کو ہوا ہے کیا

سودا نہیں ہے مجھکو تو پھر یہ بلا ہے کیا
دل دے کے کہہ رہا ہوں کہ میرا گیا ہے کیا

کس کا نیا سا نام یہ تو لے رہا ہے آج
میرے سوا بھی کوئی ترا مبتلا ہے کیا

پہلو میں جب سے دل نہیں خانہ بدوش ہیں
ہم کیا بتائیں ہائے ہمارا پتا ہے کیا

رہنے دے اے صبا نہ سنگھا نکہت چمن
ہاں یہ پتا بتا کہ وہاں کی ہوا ہے کیا

اے برق ہم تو دل کے لیے بے قرار ہیں
تیری بغل سے بھی کوئی ظالم جدا ہے کیا

خاک آستاں کی تیرے نہیں ہے اگر مفید
پھر میرے درد دل کی ستمگر دوا ہے کیا

مجھ کو ادر دکتے ہیں مجھے خودکشی سے کیوں
مرنے میں درد دل سے اذیت سوا ہے کیا

لیتا ہے بزم غیر میں نام اس کا بار بار
او بدحواس دل یہ تجھے ہو گیا ہے کیا

حاضر ہیں امتحاں کو جاں باز ہر طرح / تلوار کیا ہے زہر کیا شے قضا ہے کیا

آتے ہی شام وعدہ بیاں ہو رہی دہوم / لیکن خبر نہیں کہ وہاں ہو رہا ہے کیا

تم آؤ گے تو ہم شب وعدہ بتا ملیں گے / تاثیر کیا ہے اور ہماری دعا ہے کیا

اپنے نیاز مند سے رہتا ہے بے نیاز / اے حسن دلفریب یہ تیری ادا ہے کیا

احسن کے نام سے انہیں نفرت ہے کس لیے / پوچھے تو کوئی نام یہ اس کا برا ہے کیا

حضرت بیخود اترولوی

دور آنکھوں سے جو وہ ماہ درخشاں ہوگا / صورت صبح مرا چاک گریباں ہوگا

سنبل یار سے سنبل بھی پریشاں ہوگا / آئینہ آئینۂ حسن سے حیراں ہوگا

زلف گر سورہ واللیل ہے سر رشتۂ دیں / آپ کا مصحف رخ بھی مرا ایماں ہوگا

آگیا چہرۂ دلبر کا تصور دل میں / جلوہ پرداز اسی میں مہ تاباں ہوگا

درد دل سوز جگر چھوڑ نہ جانا اس کو / بیخود خستہ جگر بے سر و ساماں ہوگا

جناب منگل سین صاحب بیدل جھنجھانوی مہتمم مشاعرہ

یارب مصیبت دل درد آشنا ہے کیا / کہتی ہے موت ہائے اسے ہو گیا ہے کیا

درماں نصیب کس سے کہے ماجرا ہے کیا / تیرا گنہگار ہوں تیرے سوا ہے کیا

تھا لطف پیتے خضر اگر ساغر فنا / تھوڑی سی عمر اس پہ یہ آب بقا ہے کیا

درپردہ ہیں رقیب سے میری شکایتیں / بے پردہ مجھ سے آج پھر ان کا گلا ہے کیا

پہلے تو خود ہو مثل عدو منکر وفا / پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ تو بے وفا ہے کیا

بیدل چلے ہو وادی ایمن کو دیکھنے / مثل کلیم تم کو یہ سودا ہوا ہے کیا

تم جو آباد و گے سرسبز گلستاں ہو گا
غنچے کھل جائیں گے گل دیکھکے خنداں ہو گا

خضر کے واسطے وہ چشمۂ حیواں ہو گا
سبزۂ خط جو ترے رخ پہ نمایاں ہو گا

کعبہ و دیر میں جلوا ترا یکساں ہو گا
بندہ عشق ہر ایک گبر و مسلماں ہو گا

تم پریشاں نہو سنکے مرا نالۂ دل
اور ہو گا کوئی کمبخت جو نالاں ہو گا

شرط انصاف ہی گر چرخ سے پتھر برسیں
یہ بھی میرے سر شوریدہ پہ احساں ہو گا

بے سبب پاؤں میں مہدی نہ لگائی تمنے
آج پامال کوئی گنج شہیداں ہو گا

کشتۂ زیست نہیں کشتۂ دیدار ہیں ہم
ڈوب مرنے کو ترا چاہ زنخداں ہو گا

دیکھ لے گا جو ترا جلوۂ حسن یکتا
گبر پھر گبر مسلماں نہ مسلماں ہو گا

ظلمت قبر سے مجھکو نہ ڈرا اے واعظ
خانۂ دل میں مرے وہ مہ تاباں ہو گا

آج کیا بات ہے اغیار سے وہ کہتے ہیں
کیئے اس بزم میں بیدل ہی غزلخواں ہو گا

جناب قاضی سید تہور علی صاحب تہور

بعد مرنے کے نہ کم شوق میری جاں ہو گا
روز محشر بھی تری دید کا ارماں ہو گا

کچھ بھی باقی نہ رہا چھیڑ کا ساماں دل میں
اب بھی کیا شکوہ کوتاہئ مژگاں ہو گا

گریہ ناکامی امید رہیگی قائم
جلد آباد تو لے شہر خموشاں ہو گا

جادۂ عیش تو سب برق نگہ نے پھونکا
کس کے آنکھوں میں ترا خواب پریشاں ہو گا

کس کو دے آئیں تہور دل ناشاد اپنا
کون اس جنس سبک قدر کا خواہاں ہو گا

جناب مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب
مدیر قند پارسی علی گڈھ

جز عشق اور شمع حریم بقا ہی کیا
اے عقل تو بتا کہ ترا مدعا ہے کیا

منزل ہے ایک راہ کا کچھ پھیر ہے تو ہو
ہنگامہ آفرینیٔ عشق و ہوا ہے کیا

دل ہے کہ اک بہشت تصور نہیں نصیب
تسخیر تیری یاد کی راحت فزا ہی کیا

اللہ رے جانفروزیٔ انوار عشق یار
حیراں ہے چشم شوق کہ یہ ماجرا ہی کیا

اک آگ ہی جہان میں گویا لگی ہوئی
نیرنگی جمال حقیقت نما ہے کیا

غفلت محیط عیش یہاں زمانہ رام
ان ظلمتوں میں نور کہاں ڈھونڈتا ہی کیا

جاتا ہوں ارجعی کی صدا پر بڑھا ہوا
میں بندۂ رضا ہوں مرا پوچھنا ہی کیا

رحمت وسیع دوست کی سرکار عذر جو
یہ ابتلا یہ شورش روز جزا ہے کیا

بدعت سے پاک شرک کا کھٹکا ذرا نہیں
ثاقب طریق سنت خیر الوری ہے کیا

جناب سید فضل الحسن صاحب حسرت موہانی بی اے
اڈیٹر اردوئے معلی علیگڈھ

سرگرم ناز آپ کی شان جفا ہے کیا
باقی ستم کا اور ابھی حوصلہ ہے کیا

آنکھیں تری جو ہوش ربائی میں فرد ہیں
ان میں یہ سحر کاریٔ رنگ حیا ہے کیا

گر جوش آرزو کی ہیں کیفیتیں یہی
میں بھول جاؤں گا کہ مرا مدعا ہے کیا

آتے ہیں وہ خیال میں کیوں میرے بار بار
عشق خدا نما کی یہی ابتدا ہے کیا

ایک برق مضطرب ہی کہ اک سحر بے قرار
کچھ پوچھئے نہ وہ نگہ فتنہ زا ہے کیا

چل بھی دئے وہ چھین کے صبر و قرار دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

نزدیک بام یار نہ ہے نردبان عشق
اے دل یہ جانے حوصلہ ہی دیکھنا ہی کیا

اس درجہ دلپذیر ہے آہنگ نغمہ کیوں
پنہاں لباس درد میں تیری صدا ہی کیا

حسرت جفائے یار کو سمجھا جو تو وفا
آئین اشتیاق میں یہ بھی روا ہی کیا

ولہ

مجھکو خبر نہیں کہ مرا مرتبا ہے کیا ‌ ‌ یہ تیرے التفات نے آخر کیا ہے کیا
ملتی کہاں گداز طبیعت کی لذتیں ‌ ‌ رنج فراقِ یار بھی راحت فزا ہے کیا
حاضر ہی جانِ زار جو چاہو مجھے ہلاک ‌ ‌ معلوم بھی تو ہو کہ تمہاری رضا ہے کیا
ہوں دردِ لادوائے محبت کا مبتلا ‌ ‌ مجھکو نہیں خبر کہ دوا کیا دعا ہے کیا
میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر ‌ ‌ یہ دیکھئے مناسب شانِ عطا ہے کیا
ہیں بہتریں صلح یہ ظاہر کی رنجشیں ‌ ‌ ناحق ہوں میں ملول وہ مجھسے خفا ہے کیا

گرویدہ جس سے تو ہی خبر ہی نہیں اُسے
پھر تیرے اضطراب کی حسرت نبا ہی کیا

ولہ

کیا کیجئے آرزوئے دل مبتلا ہے کیا ‌ ‌ جب یہ بھی ہو خبر کہ وہ رنگیں ادا ہی کیا
کافی ہیں میرے بعد پشیمانیاں تری ‌ ‌ میں کشتۂ وفا ہوں مرا خونبہا ہے کیا
وقت کرم نہ پوچھے گا لطف عمیم یار ‌ ‌ رند خراب حال ہے کیا پارسا ہے کیا
دیکھو جسے ہی راہ فنا کی طرف رواں ‌ ‌ تیری محفل کا ہی راستا ہے کیا
ہم کیا کریں اگر نہ تری آرزو کریں ‌ ‌ دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا
یوں شکر جور کرتے ہیں تیرے ادا شناس ‌ ‌ گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں گلا ہے کیا

رونے لگے ابھی سے کہی ابتدائے حال
تمنے ابھی فسانۂ حسرت سنا ہے کیا

ولہ

ہم بندگاں درد پہ مشق جفا ہے کیا ‌ ‌ دلجوئی وفا کا ہی مقتضا ہے کیا
محرومیوں نے گھیر لیا ہے خیال کو ‌ ‌ اے عشق یار تیری یہی انتہا ہے کیا
شوقِ لقائے یار کہاں میں خریں کہاں ‌ ‌ اے جانِ بے قرار تجھے یہ ہوا ہے کیا

ہو جائے گی کبھی نہ کبھی جان نذر یار
بیمار عشق ہم ہیں ہماری شفا ہے کیا

لاکھوں کو جس نے صبر سے بیگانہ کر دیا
کیا کہئے آہ وہ نگہ آشنا ہے کیا

گرویدہ اسقدر ہی جو محرومیوں سے دل
اے دردِ یار تیری اسی میں بقا ہے کیا

سودائے عشق یار ملامت کی جا نہیں
حسرت کو پیر عقل یہ سمجھا رہا ہے کیا

جناب ابوالبیان محمد سعید عالم صاحب خنجر مودودی مارہروی تلمیذ حضرت احسن مارہروی

گل اپنے رنگ و بو پہ پھولا ہوا ہے کیا
دو دن کی ہے بہار ہمیشہ رہا ہے کیا

بے چین ہے جو دل تو کسی کی خطا ہے کیا
قسمت کا ہے بگاڑ خدا سے گلا ہے کیا

اسکو جلا کے خاک کر دوں تو بات کیا
یہ چرخ میری آہ کو سمجھا ہوا ہے کیا

ناصح جو بک رہا ہے تو پوچھے کوئی ذرا
مجھکو تو ہے جنوں اسے ہو گیا ہے کیا

ناراض کیوں ہوئے جو کہا انکو بیمثال
تعریف حسن کی بھی کوئی بد دعا ہے کیا

کیا خاک تجھسے حال زبوں ہمنشیں کہوں
مجکو ہی کب خبر ہے مجھے ہو گیا ہے کیا

یہ کیا کہا کہ وصل کی قیمت نہیں ہے دل
حاضر ہے جان بھی دل بے مدعا ہے کیا

کیوں بار بار دیکھ رہے ہو تم آئینہ
میری طرح تمہارا بھی دل آگیا ہے کیا

ہم ٹھان کر گئے تھے کہ سب کچھ کہینگے حال
پوچھا نہ اس نے یہ بھی ترا مدعا ہے کیا

قاصد سمجھکے یار کا میں ساتھ ہو لیا
پیکِ قضا کا مجھ پہ یہ چھپا چلا ہے کیا

بے پردہ ہوئے تو بنی پردہ دار تو
اے بیخودیٔ شوق تجھے ہو گیا ہے کیا

ارماں ہیں باغ باغ تو ہے آرزو نہال
داغوں سے صحنِ دل میں چمن سا کھلا ہے کیا

ضبطِ فغاں کی داد جو چاہی تو کہہ دیا
دنیا میں اک تو ہی فقط باوفا ہے کیا

غمخوار ہے کوئی تو کرے وہ دوائے دل
یہ پوچھتا ہے کیا کہ تجھے ہو گیا ہے کیا

کعبے میں جس کو ڈہونڈتے ہو وہ تو دل میں ہے
خنجر تمہاری عقل پہ پردا پڑا ہے کیا

ولہ

دل ٹہکانے نہ اگر دیدۂ حیراں ہوگا	خاک حاصل تجھے نظارۂ جاناں ہوگا
کیا عجب عقدۂ دشوار جو آساں ہوگا	درد جب حد سے گزر جائے گا درماں ہوگا
بخت سیدھا جو مرا گردش دوراں ہوگا	خود بخود غیب سے تفریح کا ساماں ہوگا
غیر سے ربط تجھے مجھ سے قضا کو نفرت	کون حال دل بیمار کا پرساں ہوگا
قیس کی طرح مجھے دشت نوردی سے غرض	جوش وحشت سے مرا گھر ہی بیاباں ہوگا
ناوک ناز کو ترکش میں نہ ڈہونڈا و قاتل	کہ رگ جاں کی طرح وہ کہیں پنہاں ہوگا
مجھسا خود رفتہ و حیراں تو نہو گا کوئی	اک نظر جو بھی مجھے دیکھے گا وہ حیراں ہوگا
اُن کو آنا ہی تو لازم آئیں عیادت کو مری	ورنہ کل کنج لحد میں تن بے جاں ہوگا
بزم جاناں بھی قیامت کا نمونہ ہوگی	کوئی خنداں کوئی گریاں کوئی حیراں ہوگا
یاد آئیں گی وفائیں مری تجکو ظالم	قتل کرکے مجھے تو خود ہی پشیماں ہوگا
وعدۂ وصل سے کیا خوش ہوں کہ ٹہکا ہی نہیں	حسرتیں نکلیں جو دل سے تو یہ ویراں ہوگا
جیتے جی جس نے لیا ہو نہ کسی کا احساں	طالب گور و کفن خاک وہ انساں ہوگا
وہ دم نزع بھی آئے تو یہ فرما کے گئے	حشر کے دن بھی نہ پورا ترا ارماں ہوگا
وہ بھی دن ہوگا خدایا کہ بر آئے گی امید	وہ بھی دن ہوگا کہ کوئی مرا مہماں ہوگا

یہ تو ممکن نہیں خنجر ہو کسی پر شیدا
ہاں مگر ناز و ادا پر ترے قرباں ہوگا

جناب سید امیر حسن صاحب دلیر مارہروی

کوئی تو اس دل بیتاب کا خواہاں ہوگا	شکن زلف ہو گوشۂ داماں ہوگا

عقل سے عشق جہاں دست و گریباں ہوگا
کچھ وہاں شعبدۂ حسن ہی پنہاں ہوگا

ضد سے کیا فائدہ دل میں کوئی پنہاں ہوگا
مرا ارماں نہ سہی آپ کا پیکاں ہوگا

یاں تو ہی اور بھی ہنگامۂ شور و شیون
ہم بیاباں کو سمجھتے تھے کہ ویراں ہوگا

ذکر اس گیسوئے برہم کا نہ کر باد صبا
اس حکایت سے تو دل اور پریشاں ہوگا

حسرت اغیار سے ملنے کی اگر ہے تم کو
میرے دل میں بھی کسی بات کا ارماں ہوگا

مجمع اہل شکایت سے تمہیں کیا مطلب
کوئی دل سے کوئی تقدیر سے نالاں ہوگا

اسکو دی جائے گی کیوں اور گناہوں کی سزا
جس کے حصہ میں عذاب شب ہجراں ہوگا

لاکھ تو عشق سے بچنے کی سکھائے گھاتیں
شدنی امر تو اے ناصح ناداں ہوگا

خوب وحشت میں تری دشت و بیاباں چھانے
خاک مجکو غم پابندی زنداں ہوگا

جس کے غم میں تری آنکھوں سے نہ ٹپکے آنسو
وہ کوئی کشتۂ بے مہری پنہاں ہوگا

ایکدن تو مری گردن پہ چھری پھیر تو دیکھ
میں تو میں غیر بھی شرمندۂ احساں ہوگا

حشر میں تم نہ سہی غیر سہی میں ہی سہی
اپنے کردار پہ کوئی تو پشیماں ہوگا

غم فرقت کا نتیجہ یہ نہیں ہے نہ سہی
اور ہی کچھ سبب سوزش پنہاں ہوگا

پھاڑ کر دست جنوں جس کو بہت پچھتایا
ہو نہو وہ ترے وحشی کا گریباں ہوگا

اس طبیعت کا یہ صدقا ہے کہ وہ پوچھتے ہیں
کیا دلیر آج علی گڑھ میں غزلخواں ہوگا

ولہ

اب اے جنوں عشق ترا پوچھنا ہے کیا
وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ تجکو ہوا ہے کیا

اہل چمن بھی خلق میں یہ ماجرا ہے کیا
ناشاد و نامراد کوئی مر گیا ہے کیا

اس وقت جبکہ میری زباں بند ہو گئی
وہ کیوں نہ پوچھتے کہ تری التجا ہے کیا

کیوں میرے خط کو دیکھکے آنسو نکل پڑے
پوچھو تو نامہ بر سے کہ حرف آشنا ہے کیا

ہٹ جاؤں سامنے سے تو میرا قصور ہی
ناوک اگر خطا ہو تو میری خطا ہی کیا

دل کا یہ ان کو پاس نہ کچھ جان کا خیال
کیا جانئے طریقۂ اہل وفا ہے کیا

شوق ستم ہے تیرے بھروسے پہ اے وفا
میں چیز کیا ہوں اور مرا حوصلہ ہے کیا

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
بیٹھے بٹھائے آج مجھے ہو گیا ہے کیا

صورت نمائے حسن ہی آشفتگی مری
جو مجکو دیکھتا ہے تجھے دیکھتا ہے کیا

ہم خار جنگلے والوں سے صحرا کے واسطا
گلچیں سے پوچھئے کہ چمن کی ہوا ہے کیا

جس کو دبی زبان سے بھی تم نہ کہہ سکو
ایسا وہ مدعی کا مرے مدعا ہے کیا

ہم جانتے ہیں تیری طبیعت کا مقتضا
ظالم تجھے ضرورت عذر جفا ہے کیا

ہیں پائے شوق اپنے سلامت تو ایکدن
ہم آپ ڈہونڈہ لیں گے تجھے رہنما کی کیا

شاید پیامبر کی زباں اس نے کاٹ لی
کچھ منہہ سے بولتا نہیں یہ ماجرا ہی کیا

اندیشۂ فراق سے کرتا ہے ترک عشق
ہمت کو اے دلیر تری ہو گیا ہے کیا

جناب تلسی رام صاحب شوخ ساکن ضلع علیگڑہ

پھر مہرے جوش جنوں کیلئے ساماں ہوگا
پھر وہی طوق و سلاسل وہی زنداں ہوگا

آئینہ رو ہو تم آئینہ کو دیکھا نہ کرو
آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا

مجکو تنہائی میں رہنے کی تو عادت ہی نہیں
قبر میں ساتھ مرے وصل کا ارماں ہوگا

مجھسے وعدہ ہی میرے گھر پہ وہ آئیں گے ضرور
کالا منہ دیکھ ترا اب شب ہجراں ہوگا

آہ کے ساتھ جو یہ لخت جگر آتے ہیں
دل کی جا پہلو میں شاید کوئی پیکاں ہوگا

چھوڑ دے عشق بتاں کر تو عبادت اسکی
آخری وقت میں اے شوخ پشیماں ہوگا

جناب سید کاظم علی صاحب شوکت بلگرامی تلمیذ امیر مینائی مرحوم

میں سن تو لوں اگرچہ مرا حوصلہ ہی کیا
اے ابتدائے عشق تری انتہا ہے کیا

جز مرگ اور ہستی اہل فنا ہی کیا
میں بھولنے کی چیز ہوں میرا پتا ہے کیا

اے جذب شوق سب ہیں تری فتنہ سازیاں
منصور سے نہ پوچھ کہ سازِ انا ہی کیا

دنیا خلاف چرخ عدو بخت نارسا
یہ زندگی تو ہے ۔ مگر اس میں مزا ہے کیا

کرتا ہے چھیڑ چھیڑ کے کیوں ذکر آرزو
اس بدنصیب دل سے کوئی پوچھتا ہی کیا

رہتا ہے دل پہ کس کے خیالات کا ہجوم
یہ کون ہے؟ یہ کثرت وحدت نما ہی کیا

آتی ہے نالۂ دل صد چاک پر ہنسی
گل کیا ہی اور دامن گل کی ہوا ہے کیا

آنکھیں ہوئیں جو بند تو عقدہ یہ وا ہوا
اب ہم سمجھ گئے دل بے مدعا ہی کیا

اے کاش میرے بعد کوئی ان سے پوچھتا
اسکو تو تھا جنوں یہ تم کو ہوا ہے کیا

مثل حباب چشم براہ فنا ہوں میں
اب اے نگاہ ناز مرا دیکھنا ہے کیا

دعوی تو یہ کہ دعوی مہر و وفا غلط
پھر میرے پوچھنے سے ترا مدعا ہے کیا

روتا ہوں دیکھ دیکھ کے دیوار و در کو میں
اس کی خبر نہیں کہ ابھی دیکھنا ہے کیا

سن سن کے میرے نغمۂ دلکش وہ بول اٹھے
سنا ذرا یہ شوکت شیریں نوا ہے کیا

جناب حکیم فدا حسین صاحب فدا مارہروی

عشق کا راز نہ دل میں کبھی پنہاں ہوگا
رنگ بنکر مرے چہرہ سے نمایاں ہوگا

زندہ درگو تو تو نے مجھے کر رکھا ہے
اور کیا حال مرا اے شب ہجراں ہوگا

تو مرے قتل سے پہلے یہ سمجھ لے ظالم
حشر میں ہاتھ مرا اور ترا داماں ہوگا

مجکو دے تیغ کہ کاٹوں میں گلا خود اپنا
تم کو یہ کام ہے مشکل مجھے آساں ہوگا

میرے پہلو میں جو رہ رہ کے خلش ہوتی ہے
ہو نہ ہو ناوک دل دوز کا پیکاں ہوگا

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
آنکھ سے اشک جو ٹپکے گا وہ طوفاں ہوگا

ہاتھ میں تیر کمر میں ترے تلوار بھی ہے
اور کیا قتل کا عشاق کے ساماں ہوگا

اثر ہجر سے گھر ہی مرا ہوگا ظالم
بڑھ کے اب اس سے بھی کیا خاک بیاباں ہوگا

اس کو امید رفاقت ہو بھلا کس سے
تیرے وحشی سے تو سایہ بھی گریزاں ہوگا

ہجر کی رات میں تنگ ہا کرتا ہوں
مجھکو تم قتل جو کردو گے تو احسان ہوگا

دم مٹے دولہا کی ہوئی ہے فدا ساری برات
دل نہو گا تو مجھے خاک کچھ ارماں ہوگا

ولہ

اے دل کسی کے وعدے پہ بھولا ہوئی کیا
ان بے وفا حسینوں کو پاس وفا ہے کیا

شکوہ تمہارے عشق کا کس منہ سے میں کروں
مجرم ہے میرا دل ہی تمہاری خطا ہے کیا

پوچھے تو کوئی دل سے کہ ہے شاد شاد کیوں
محفل میں ان کی جا کے تجھے ملگیا ہی کیا

عاشق تو ہوں ضرور گدا گر مگر نہیں
جز خواہش وصال مرا مدعا ہے کیا

ہم جس کو دیکھتے ہیں وہ مشتاق ہے ترا
دنیا ہماری طرح تری مبتلا ہے کیا

تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ سب جانتا ہوں میں
اچھا بتاؤ دل میں مرے مدعا ہے کیا

مجھ سا نحیف و زار کرے کیا بیان حال
صورت ہی دیکھ حال مرا پوچھتا ہے کیا

تم دیکھتے ہی بزم میں مجھ پر برس پڑے
کہو قسم کہ میں نے زباں سے کہا ہی کیا

جس دل کو چاہتے ہیں نہیں چھوڑتے
اللہ ان بتوں کو یہ کیا ہو ملا ہے کیا

رحم اے پیامبر دل پر اضطراب پر
اتنا بتا دے جلد کہ اس نے کہا ہی کیا

اے جان حسن تو نہیں بیوجہ بے نیاز
عاشق ہزار ہا ہیں ترے اک فدا ہی کیا

جناب منشی رام دیال صاحب فلکؔ رئیس علی گڑھ

وصل میں اور میرا حال پریشاں ہوگا
آئینہ رو کے مقابل دل حیراں ہوگا

ہائے یہ خستہ تنی ہائے میری تنہائی
میری حالت کو جو دیکھے گا وہ گریاں ہوگا

شکوۂ جور عبث ذکر وفا ہونے دو
آپ ہی اپنے کیے پر وہ پشیماں ہوگا

دیکھ پائے گا جو وہ چہرۂ پر نور ترا
طاق میں زاہد صد سالہ کا ایماں ہوگا

اے فلکؔ حشر میں ہم بیٹھ چکے خالی ہاتھ
دیکھنا ہاتھ میں اس شوخ کا داماں ہوگا

جناب سرفراز حسین صاحب نوشاہ مارہروی

دل کا میرے عیب و ہنر دیکھتا ہے کیا
جب مفت ہاتھ آئے تو اچھا برا ہے کیا

کر متاع ہوش دل اب سوچتا ہے کیا
انجام عاشقی کا ضرر کے سوا ہے کیا

ے خلاف شان کے میں نے کہا ہی کیا
تو بت نہیں تو کون ہے کافر خدا ہی کیا

ں نے کہا کہ دست ازل بانٹتا ہی کیا
دل نے کہا کہ رنج و الم کے سوا ہی کیا

کچھ تھی کائنات وہ نذر جنوں ہوئی
اب میرے پیرہن میں سلامت رہا ہی کیا

ٹھکرا کے اک غریب کی میت کو چل دئے
پوچھے تو ان سے کوئی یہ طرز جفا ہی کیا

نیا سے بھی چین ملا جب کسی طرح
پھر اور التہاب جگر کی دوا ہے کیا

آئے کبھی تو اور بگڑے ہو کے بات کی
تم یوں ملو تو لطف ملاقات کا ہے کیا

کیا آج کل مزاج گرامی کا حال ہے
یہ پوچھنا ہے اور مجھے پوچھنا ہے کیا

اب دل تو مانتا ہے برابات بات پر
ایسے اکل کھرے سے ہمیں آسرا ہے کیا

چھوڑو خیال قیس سنو میری داستاں
افسانہ ہائے عہد کہن میں دھرا ہے کیا

دل لے کے تم یہ کہتے ہو کیا اب لینگے کچھ
اک جان میرے پاس ہی رہا ہے کیا

کیا دل کو چین آئے گا بے ہم بغل ہوئے
خالی تسلیوں سے ستمگر ہوا ہے کیا

تم اک جھلک دکھا کے ہمیں چل دئے کدھر
دیکھو تو زیر بام قیامت بپا ہے کیا

خط بھیجنے کا قصد کریں کس امید پر
یہ بھی خبر نہیں کہ تمہارا پتا ہے کیا

پرسان حال جب کوئی عشاق کا نہیں
پوچھے کوئی نتیجہ روز جزا ہے کیا

اس پوچھنے پہ حشر میں دیکھیں وہ کیا کہیں
فتنہ یہ آپ ہی کا اٹھایا ہوا ہے کیا

دیکھا ہے فاقہ مستیوں میں بھی تجھے مگن
نوشاہ تیرے پاس کوئی کیمیا ہے کیا

ولہ

لیک ہنگامہ وہاں اے دل نالاں ہوگا
حشر میں کون ترے حال کا پرساں ہوگا

خاک جینے کا مجھے ہجر میں ارماں ہوگا
قتل کر دینگے اگر آپ تو احساں ہوگا

تیری فرقت میں گوارا نہ مری جاں ہوگا
کوئی مردود ہی فردوس کا خواہاں ہوگا

اسکو تسکین کہاں اس کو تسلی کیسی
جس کے پہلو میں کھٹکتا ہوا ارماں ہوگا

میری فریاد سلامت ہی تو ان کے در پر
نہ ہوا ہے نہ مقرر کبھی درباں ہوگا

ہائے کب تک کوئی بے آس رہے او ظالم
کبھی سچا بھی ترا وعدہ و پیماں ہوگا

اتنی تکلیف اٹھاتا ہے عبث دست جنوں
اب تو شاید ہی کوئی تار گریباں ہوگا

مذہب عشق میں تقلید کا پابند نہیں
جو کسی کو نہوا وہ مجھے ارماں ہوگا

رحم کر اہل وفا قابل بیداد نہیں
ہم سے کیے دیتے ہیں بیدرد پشیماں ہوگا

دم نکل جائے کسی روز تڑپ کر میرا
کیسا کہنا نہیں اس بات کا ارماں ہوگا

تو ہی قاتل نہیں قاتل ہے ادا بھی تیری
زخم تو دیگا تبسم نمک افشاں ہوگا

تیرے جانباز ہیں اوقات کے پابند کہاں
موت بے وقت جو آئے گی تو احساں ہوگا

کون پوچھے گا مریضوں کو ترے دنیا میں
تو نے بیمار کیا تجھ سے ہی درماں ہوگا

ہے وصیت کہ مری قبر پہ لکھدیں یہ عزیز
جو محبت نکرے گا وہ پشیماں ہوگا

زن زمیں زر یہی جھگڑے کی ہیں چیزیں نوشا
یہ نہوں پاس تو بے فکر پھر انساں ہوگا

انڈین نیشنل کانگرس

اور

مسلمانان ہند

از

جناب مولانا مُلا عبدالقیوم مرحوم حیدرآبادی بانی حجاز ریلوے فنڈ

مشتملہ

۱- دلائل عقلی بہ نسبت ضرورت کانگرس
۲- بحث شریعت درباب اتحاد اقوام ہند
۳- ازالہ اوہام جواب اعتراضات مخالفین کانگرس

ماخوذ از رسالہ اردوئے معلی علی گڈھ بابت ماہ ستمبر و اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۰۶ء

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انڈین نیشنل کانگرس اور اہل اسلام

ما قصہ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہزار دشمن اگر برسر ند ملا را	بدوستی کہ بگوید بجز حکایت دوست
بآب دیدہ خونین نوشتہ صورت حال	نظر بصفحۂ اول مکن کہ تو بر توست

میرا ایک مدت سے خیال تھا کہ کانگرس کے نسبت جو غلط اور لا اصل اوہام اہل اسلام میں پھیل گئے ہیں اُن کو رفع کر کے واقعات پر تلبیس کا جو پردہ ڈالا گیا ہے وہ اُٹھا دیا جائے تاکہ کانگرس کا روے زیبا اپنے اصلی خط و خال میں نظر آجاوے اور اپنے دلفریب نظارہ سے مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرے۔ اسکے متعلق بہت سے مضامین لکھے جا چکے ہیں اور کئی لائق حضرات نے سابقاً ولاحقاً اظہار حقیقت و تائید کانگرس میں زور قلم دکھایا ہے مگر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اُس میں استیعاب او نہیں کیا گیا اسلئے ایک خاص حد تک کامیابی ہوئی ہے۔

گذشتہ سال جب میں بغرض شرکت کانگرس بنارس گیا ہوا تھا تو مولانا فضل الحسن حسرت موہانی مدیر اُردوی معلی نے تحریک کی کہ میں ایک مبسوط مضمون اُردو میں لکھوں۔ اس سے میرے خیالات کی تجدید ہوئی۔ خوش قسمتی سے میری شرکت کانگرس اور تائید تحریک موقوفی قہر نطلینہ بمبی پر بعض اُردو اخبارات نے بہت کچھ ناشایستہ حملات کئے۔ لہذا مجھے ضروری معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی شرکت کانگرس کے ضروری و مفید و ناجائز ہونے پر میرے نزدیک جو دلائل عقلی و نقلی موجود ہیں وہ ظاہر کر دوں اور اپنے فریضۂ قومی سے عہدہ برآ ہو جاؤں وما علینا الا البلاغ المبین۔

کانگرس کے مخالف مسلمانوں میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ ہی جو سرے سے کانگرس کو اپنے لئے غیر مفید و مضر بتلاتا ہے اور گورنمنٹ کو عالم الغیب اور ارحم الرحمین سمجھکر اظہار واستحقاق حقوق کو گناہ جانتا ہے اور اپنے آپ کو گورنمنٹ کے محض رحم و کرم پر چھوڑتا ہے۔

طبقہ قدیم سلطان کو صرف ظل اللہ ہی سمجھتا تھا مگر آجکل کی نئی روشنی میں یہ گروہ اُن سے بھی بڑھ چڑھکر تاریک خیال نکلا۔ چونکہ موجودہ ترقی تمدن وماہیت کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ اور اسکی رعایا کے حقوق اور طریقہ استحصال حقوق سے یہ گروہ محض نابلد ہے اسلئے ایسی تنگ خیالی و گرداب جہالت میں مبتلا ہی مگر الحمد للہ کہ یہ فرقہ روز بروز ضعیف ہوتا جارہا ہے۔

دوسرا وہ گروہ ہے جو اصُول کانگرس کو تو مفید خیال کرتا ہی مگر موجودہ کانگرس میں سلمانوں کی شرکت کو بعض سیاسی پہلوؤں سے مضر و نقصان دہ بتلاتا ہی۔ اسکے افراد سرسید مرحوم کے خیالات کی کورانہ تقلید کرنیوالے ہیں اور چونکہ مصلحت وقت وضروریات زمانہ کو نہیں سمجھتے نہ کبھی اپنی قوت فیصلہ کو کام میں لاتے ہیں، نہ واقعات وحالات کی تحقیق و تفحص کرتے ہیں؛ اسلئے جو کچھ انکے اذہان میں جما دیا گیا ہی اُسی پر اذعان کئے ہوئے ہیں اور شرکت کانگرس سے جو فرضی نقصانات اُن پر ظاہر کئے گئے اُنسے خائف و ترساں ہیں۔

اسی گروہ میں ایک فرقہ ایسا بھی ہی جو مسلمان اور ہندوؤں میں تغایر مذہبی کی وجہ سے اتحاد سیاسی کو ناممکن سمجھتا ہے۔

اسلئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان تمام شکوک وشبہات کو رفع کرنیکے لئے سلمانوں کی شرکت کانگرس پر بروے سیاست وشریعت مفصل بحث کریں اور آخر میں یہ دکھلائیں کہ سرسید مرحوم کے اعتراضات کہانتک درست اور بجا ہیں اور اُنکے اس اختلاف کے کیا وجوہ تھے اور پھر اسکا تصفیہ کریں کہ آیا مسلمانوں کو اس زمانہ میں اُسی کورانہ تقلید پر قائم رہنا چاہیے یا زمانہ کا ساتھ دینا اور اپنے ضروریات وحوائج کا خیال کرنا اور کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ کی نعمتوں سے مستفیض ہونا؟ مگر اسکے قبل یہ ضروری ہے کہ کانگرس کی ماہیت اور اسکی غرض وغایت بتلادیجاے لہذا سب سے اول ہم یہ بتلاتے ہیں کہ کانگرس کیا ہی۔

کانگرس ایک سیاسی مجلس ہی جسکی غرض گورنمنٹ ورعایا کی خیر خواہی، حفاظت حقوق جانبین ورفع کدورت طرفین، استحکام اساس وفاداری رعایا، اور استقامت حکومت برطانیہ ہے۔ اُس کا یہ کام ہے کہ رعایا کی تکالیف وشکایات کو گورنمنٹ تک پہنچاے، مضر طرق حکومت اور متناقص ومفاسد قوانین سے حکومت کو مطلع اور متنبہ کرتی رہے، اور سلطنت اور رعایا کو ان

برے نتائج سے بجائے حریت، مساوات اور عدالت کے قائم رہنے کے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

چونکہ عامۂ رعایا و برایا اس بھاری ذمہ داری کو فرادی فرادی انجام نہیں دے سکتے لہذا بہ چند سربرآوردگان قوم کا وکیل رعایا ہونا اور کسی ایک جگہ مجتمع ہو کر تمام امور پر بحث مباحثہ کرنا اور رد و قدح کے بعد جو امر منقح ہو جائے اسکو گورنمنٹ میں پیش کرنا نہایت ضروری ہے تاکہ اس جماعت کی آواز ملک و قوم کی آواز اور رعایا کے مختلف طبقات کی متحدہ آواز سمجھی جائے اور گورنمنٹ کو اپنے طرز حکومت اور قوانین و آئین دولت کی اصلاح کا پورا موقع ملے اور اسکی وجہ سے رعایا کے دلوں میں اوسکی محبت متمکن ہو جائے اور ان کی اطاعت و وفاداری روز افزوں ترقی کرتی جائے اور حکومت کی بنیاد نہایت مضبوط و مستحکم ہو جائے کیونکہ اگر گورنمنٹ اور رعایا میں شکایات باہمی کی وجہ سے ناراضی پھیلتی جائے تو اس حالت میں رعایا [illegible] حکام و [illegible] انتظام سے مخالف و ناراض ہے [illegible] وفاداری کی [illegible] کی جا سکتی ہے اور جب رعایا سے وفاداری کا مادہ جاتا رہا تو دولت اندرونی و بیرونی خطرہ سے ہرگز محفوظ و مصئون نہیں رہ سکتی۔ اسلئے کہ سلطنت اس اجتماع و اتحاد و تالیف کا نام ہے جو رعایا میں کسی نسبت پیدا ہو جاتا ہے خواہ بجبر و قہر ہو یا بارادت حکیم شیرازی کا یہ مقولہ نہایت سچا اور بجا ہے کہ "خلقے بر گرد آمدند و سلطنت بر وے مسلم شد"

پس وہ جماعت جو سلطنت و رعیت دونوں کو اس آفت و مصیبت سے بچانا چاہتی ہے آیا وہ خیر خواہ دولت و خیر خواہ قوم و ملک کہلا سکتی ہے یا وہ لوگ جو دونوں کو خطرہ میں پڑنے دیں مگر ان کی رہائی کی کوئی فکر و تدبیر نہ کریں؟ اسکا فیصلہ انصاف پسند حضرات پر موقوف رکھا جاتا ہے

بہر حال یہ اغراض ایسے صاف اور بدیہی النفع ہیں جس سے کوئی عاقل مخالفت نہیں کر سکتا دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہ ملیگا جو ان کو برا سمجھے یا مضر بتلائے۔ البتہ چند ایسے خود غرض افسر و عہدہ دار اسکے مخالف ہو سکتے ہیں جو شخصی اور ذاتی اغراض [illegible] اپنے مد نظر رکھتے ہیں، [illegible] نفسانی خواہشات کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور حکومت میں مساوات و عدل و حریت کے

خود رائی کے غیر متمدنانہ اور وحشیانہ قواعد پر عمل پیرا ہونا حکومت و سلطنت کا اصلی مقصد قرار دے لیا ہے۔

سرسید مرحوم نے انہیں قومی اور ملکی ضروریات کو مد نظر رکھکر ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی تھی جسمیں ہندو مسلمان عیسائی سب شریک تھے تاکہ ہندوستانی اپنے حقوق اپنے درد دل اور اپنی شکایتوں کے اظہار کے لئے براہ راست گورنمنٹ ہند، سکرٹری آف اسٹیٹ، اور پارلیمنٹ سے تعلق پیدا کریں۔ اگرچہ وہ اسکو قائم نہ رکھ سکے اور باقاعدہ چلا نہ سکے مگر پھر بھی بہت سی تحریکیں مثل مسافران ریل کی شکایات، تخفیف محاصل کتب، ورنیکولر یونیورسٹی کی اقامت وغیرہ وغیرہ امور میں کامیابی ہوئی۔ سرسید نے دوبارہ نواقص کے لئے کانگریس کی مخالفت ... ایک ایسی مجلس بنام پیٹریاٹک ایسوسی ایشن یا انٹی کانگریس قائم کرنا چاہی تھی مگر بموانع چند در چند اسکو بھی پورا نکر سکے اور یہ دوسری تجویز بھی مکمن خفاء سے منصۂ ظہور پر جلوہ گر ہونے پائی۔

کانگرس کی ضرورت کیوں ہوئی

بیان صدر سے یہ امر پوری طرح ثابت ہو گیا کہ ان اغراض سے سرسید کو بھی اختلاف نہ تھا۔ بلکہ اقامت کانگرس سے بہت پہلے انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور یورپین باشندگان ہند کی نظر سے جنہوں نے اپنے لئے ایک ایسی اسوسی ایشن قائم کی تھی سرسید نے فائدہ اٹھاکر اپنے ہموطنوں کے لئے بھی ایک ایسی ہی اسوسی ایشن قائم کی تھی۔ کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد کمپنی کا تعلق اٹھ جانے سے ہندوستان کے معاملات کا تعلق بجائے کورٹ آف ڈایرکٹرز کے خاص پارلیمنٹ سے ہو چکا تھا۔ اور سکرٹری آف اسٹیٹ اور ممبران پارلیمنٹ کو رعایا کے اصلی حالات اور خواہشات کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ حکام مقامی کا توسط اسکے لئے ایک بڑا سد راہ تھا جسکا ارتفاع بجز ایسی تدبیر کے ممکن نہ تھا۔ جب خود یورپین باشندگان ہند نے جن کی وجاہت اور جنکا رسوخ بہ نسبت نیٹو انڈین رعایا کے بہت زیادہ تھا ایک ایسی مجلس کی اقامت کی ضرورت سمجھی تھی تو بے رسوخ اور ضعیف دیسی فرقہ کو جس کے حکام نہ ہم مذہب ہیں نہ ہم ملک نہ ہم قوم ہیں نہ ہمزبان اور جن کا مرکز حکومت سات سمندر پار ہے

زیادہ تر اسکی ضرورت ہے اور ہونی چاہیے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جب یہ اغراض کانگرس گورنمنٹ اور رعایا دونوں کے لئے ہرطرح مفید اور ضروری ہیں اور اُنکے حاصل کرنیکا صرف یہی ایک شائستہ، مجرب اور عمدہ طریقہ ہے جسکو مخالفین کانگرس بھی تسلیم کرتے ہیں تو آیا ایسی مجالس ہرصوبہ، ہر قوم، اور ہر مذہب کے لئے علیحدہ علیحدہ ہونی چاہئیں یا سبکے اتفاق واجماع سے ایک ہی مجلس کا ہونا زیادہ تر مفید ہے۔

جہانتک غور کیا جاتا ہے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جُدا جُدا مجالس قائم ہونیکے عوض مختلف اقوام کے اتفاق واجتماع سے ایک ہی مجلس کا قائم ہونا نہایت مناسب اور مفید بلکہ ضروری ہے۔ کیونکہ جُدا جُدا اور متفرق مجلسوں سے قومی و ملکی مجتمع قوت متفرق اور ضعیف ہو جائیگی اور وہ استحکام اور وقعت واعتبار جو متحدہ مجلس کا ہوگا اُس صورت میں ہرگز حاصل نہو سکیگا اور نہ متفرق مجالس کی کارروائی تمام رعایا کا متحدہ خیال اور اُن کی متفقہ خواہش متصور ہوسکیگی۔ کیونکہ ہندوستان کی مختلف قومیں اگرچہ مراسم قومی۔ عقائد مذہبی اور زبان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ومتمایز ہیں مگر انقلاب زمانہ نے ان تمام مختلف قوموں، مختلف مذہبوں اور مختلف زبان والوں کو ایک ہی دولت وحکومت اور ایک ہی قانون کے تابع وزیر فرمان کر دیا ہے اور ایسی گورنمنٹ کے تابع کیا ہے جو کانسٹی ٹیوشنل قواعد کے روسے ہمپر حکمرانی کرتی ہے اور جسنے ہم سبکو مراسم قومی وعقائد مذہبی میں پوری پوری آزادی دے رکھی ہے اور جو اسکا خیال رکھتی ہے کہ مختلف اقوام اس آزادی میں ایک دوسرے کے حارج نہوں جس کی وجہ سے وجوہات اختلاف زایل ہو چلے ہیں۔ پس ان وجوہات کے نظر کرتے مختلف اقوام ہند معاملات سیاسیہ میں متحد ہیں اور ہو سکتے ہیں اور اسلئے اُن کو ان معاملات سیاسی میں متحد مساعی کام میں لانا چاہئے۔

مگر ہم اس امر پر کہ آیا اقوام باوجود اختلاف قومی ولسانی وعقائد مذہبی امور سیاسیہ میں متحد ومتفق ہوسکتے ہیں یا نہیں تفصیل سے بحث کرنا چاہتے اور پوری روشنی ڈالتے ہیں جسکے بعد اس کا فیصلہ خود بخود ہو رہیگا کہ آیا مسلمانوں کو بروسے قواعد سیاست اصُولاً کانگرس سے علیحدہ رہنا ضروری ہے یا شریک ہونا اور کونسی حالت اُنکے ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے

اُن کے مناسب ہے۔

جہانتک ہم خیال کرتے ہیں اور تاریخ عالم پر نظر ڈالتے ہیں اور اصول سیاست مدن کو دیکھتے ہیں ہمکو یہی ثابت ہوتا ہے کہ جوں جوں مدنیت ترقی کرتی ہے قومیت، زبان اور مذہب کا اختلاف مانع اتحاد سیاسی نہیں ہوتا۔

انگلستان میں کلٹک سیکسن - اور نارمن نسلیں خلط ملط ہیں اور سب کے سب انگلش کہلاتی ہیں اسیطرح اسکاٹلنڈ والے انگلنڈ کے باشندوں سے مختلف ہیں مگر دونوں باایں ہمہ اختلاف سیاستہً متحد ہیں اور انگلش کہلاتے ہیں۔ اسیطرح کناڈا کا حال ہے کہ مختلف قومیں مثلاً فرانسیسی، انگریزی وغیرہ وہاں جابسے ہیں اور سب کے سب ایک ہی نیشن سمجھے جاتے ہیں آسٹریا میں تین مختلف قومیں آسٹرین - بوہیمین - ہنگیرین مشتمل ہیں۔ سوٹزرلنڈ اور جرمنی کے اقوام کا اختلاف لسان اُنکے ایک نیشن ہونے سے مانع نہیں۔ چینل آیلنڈ اور انگلنڈ کے باشندے مختلف الالسنہ ہیں مگر سیاستہً متحد ہیں۔ امریکہ اور انگلنڈ کے باشندے ہمزبان ہیں مگر سیاستہً ایک دوسرے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ مختلف ومخالف ہیں۔ قدیم ہندووں کے زمانہ سلطنت میں بھی السنہ واقوام ہند مختلف تھے مگر ایک ہی نیشن یعنی ہندو کہلاتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں بھی سب ہندو ہی کہلاتے ہیں جس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ مرہٹہ مراد ہیں یا تلنگے - بنگالی مراد ہیں یا پنجابی۔

اسیطرح اختلاف مذہب بھی مانع اتحاد سیاسی نہیں ہے۔ موجودہ یورپ اسکی بین نظیر ہے جہاں سیاسی حیثیت کے لئے مذہب کوئی چیز نہیں۔ مسلمانوں میں ذمیوں کے حقوق مسلمانوں کے مانند تسلیم کئے جاتے ہیں[1] اور اُن کے اتحاد سیاسی میں مذہب کی وجہ سے کوئی فرق وامتیاز نہیں پایا جاتا۔

افریقہ کے حبشی باشندے اُسیطرح کے حقوق رکھتے ہیں جو فرانسیسی اور جرمنی جنکے وہ زیر سیاست وحکومت ہیں۔ لنکا کے باشندے بھی حقوق میں انگریزوں سے مساوات رکھتے ہیں یہ ہندوستانیوں ہی کی بدقسمتی ہے جو یورپین انگریزوں کے مقابلہ میں ایک نظر سے

---

[1] ملاحظہ ہو کتب شریعت۔ حدیث انما بذلوا الجزیۃ لتکون دماؤھم الخ

نہیں دب سکتے جاتے ۔ پھر لوگوں کا یہ خیال کہ اختلاف قومی و مذہبی و لسانی مانع اتحاد و سیاست ہے غلط اور محض غلط ہے ۔ اصل یہ ہے کہ قوم کا اطلاق مختلف اعتبارات سے بنی نوع انسان میں ہوا ہے، کبھی نسل اور خون کے لحاظ سے کبھی مذہب کے اعتبار سے کبھی ایک ملک کے باشندے ہونے کی حیثیت سے جیسا کہ عرب میں مسلمان باشندگان ہند کو بھی ہندو ہی کہتے ہیں ۔

مذکورہ بالا دلائل کے علاوہ ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اصول علم سیاست مدن کے لحاظ سے اختلافات مذکورہ کے باوجود یہ اتحاد ممکن ہے یا نہیں ۔ تاکہ واضح طور پر حقیقت حال منکشف ہو جائے اور کوئی خلجان اسکے اذعان و ایقان میں باقی نہ رہے ۔ چنانچہ سیاست مدن میں حسب ذیل قواعد ممہد ہو چکے ہیں :۔

(۱) ہر کثرت کا مقتضا اور منتہا وحدت کی طرف ہوا کرتا ہے ؛ بلکہ ہر صفت کا کمال اسی میں ہے کہ وہ اپنی ضد سے متقارب ہو جائے اور اُس سے جا ملے ۔

(۲) ہر موجود اشتمال کثرت کے باوجود، جو اوسکی ترکیب ماہیت کا لازمہ ہے، جس قدر وحدت کے احکام و آثار اُسمیں زیادہ تر ظاہر ہونگے اُتنا ہی وہ اشرف و اعلیٰ ہو گا ! اور جسقدر کثرت کا ظہور و غلبہ اُس میں زیادہ ہو گا اُسیقدر اسکا اساس انتظام درہم و برہم ہوگا چنانچہ نغمات متناسبہ، اشعار موزونہ، اور صور حسنہ، وغیرہا کی تاثیریں صرف وحدت تناسبی کی وجہ سے حاصل ہوتی اور نفوس پر اثر کرتی ہیں ۔

(۳) علم حکمت میں یہ امر بھی مسلم اور منفصل ہو چکا ہے کہ جسقدر مزاج اعدل ہو گا اُسیقدر وحدت حقیقی بھی اقرب و امیل اور جو صورت و نقش اُسپر مترتب ہوگا ۔ وہ افضل و اکمل ہو گا یہی سبب ہے کہ یہ نسبت شریفہ جہاں کہیں پائی جاتی ہے موجب انجذاب و اہتزاز نفس ہوا کرتی ہے ۔ بنابریں حسن، اعضا کے ایک خاص تناسب کیوجہ سے پیدا ہوتا ہے ؛ بلاغت و فصاحت، الفاظ و کلام اور مقتضائے مقام کی ایک خاص مناسبت کا نام ہے الحاصل ایک ہی معنی ہے جو اگر اجزائے ممتزجہ عنصری میں ظاہر ہو تو اعتدال مزاج سے موسوم ہوتا ہے ؛ اگر اصوات میں ہو تو ابعاد لذیذہ کہلاتا ہے، اگر حرکات میں ہو تو غنج و دلال اور ناز و کرشمہ اُسکا نام ہے، اگر کلام میں ہو تو فصاحت و بلاغت، اگر اعضا میں ہو تو

حسن؛ اور اگر ملکات نفسانی میں ہو تو عدالت نفس ناطقہ ہر ایک جگہ اور ہر ایک مقام پر اُس معنی حقانی کا طالب عاشق ہوا کرتا ہے خواہ جس لباس اور جس صورت میں اور جہاں کہیں وہ جلوہ گر ہو۔

وانی احب الحسن حیث وجدتہ	
وللحسن فی وجہ الملاح مواقع	

بجشم یا بقبا ہر رنگ ہست بیروں آ	کہ من حریف تو انم بہر لباس شناخت

(۴) جس طرح اعضاء بدن انسانی اپنی بقامیں ایک دوسرے کے محتاج ہیں مثلاً جگر محتاج ہے دل کا۔ روح حیوانی اور قوت حیات میں۔ اور دل محتاج ہے جگر کا۔ روح طبعی اور تغذیہ میں۔ اور یہ دونوں محتاج ہیں دماغ کے۔ روح نفسانی اور قوت حس میں۔ اور دماغ محتاج ہے ان دونوں کا حیات اور تغذیہ میں؛ اسیطرح افراد انسانی بھی مدنی الطبع ہونے کیوجہ سے اپنی تعیش وزندگی میں ایکدوسرے کی مشارکت ومعاونت کے محتاج ہیں اور اس مشارکت میں باہم معاوضہ ومبادلہ کا ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ مثلاً خباز کسان کے لئے روٹی پکائیگا اور کسان اسکے واسطے زراعت کریگا۔ درزی جولاہے کیلئے کپڑے سیئے گا اور جولاہا اسکے لئے کپڑا بنیگا۔ علیٰ ہذا القیاس مختلف حوائج اور ضروریات معیشت کے لئے مختلف پیشہ ور ہونے چاہئیں تاکہ وہ اپنی اپنی مصنوعات کا تبادلہ ایک دوسرے سے کیا کریں اور اسطرح سے ہر ایک کے حوائج تمدنی پورے ہوں۔ غرض یہ کہ انسان اپنی بقائے شخصی ونوعی دونوں میں بنی نوع کی معاونت وخدمت کا محتاج ہے۔ کیونکہ اگر ہر ایک شخص بنفسہ ترتیب غذا وسکن ولباس میں مصروف ہوجائیگا تو سب سے پہلے اسکو ان کے اسباب کا فراہم کرنا ضروری ہوگا اور پھر خود ہی ان اشغال میں یعنی بونے، کاٹنے اپنے پکانے میں مشغول ہونا پڑیگا۔ تب کہیں جاکر غذا اور مسکن وغیرہ اشیاء جنکا وہ اپنی زندگی میں محتاج ہے، حاصل ہوسکیں گی۔ لیکن اس مدت تک کہ وہ ان اسباب کی فراہمی میں مشغول رہیگا بدون غذا اور مسکن ولباس کے بسر کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ اوسکی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی تمام عمر بھی ان صنائع میں تو صرف ایک صنعت پر بھی صرف کردے تب بھی وہ اسکو اچھی طرح حاصل نہیں کرسکتا۔ لیکن جب چند افراد مجتمع ہوکر ایکدوسرے کی معاونت کرینگے اور ہر ایک دوسرے کا کام انجام دیگا اور اس معاونت، ومعاوضہ میں جادۂ اعتدال

کو مرعی رکھیگا تو احوال معیشت منتظم اور بقاے نوع محفوظ رہیگی۔

چونکہ انسان کے امور معیشت کا انتظام، اُنکی باہمی معاونت پر موقوف رکھا گیا ہے اسلئے حکمت بالغۂ آلہی کا یہ مقتضیٰ ہوا کہ افراد انسانی اپنی ہمتوں، طبیعتوں، ارادوں اور خواہشوں میں مختلف ہوں تاکہ ہر ایک اپنی اپنی طبیعت وہمت کے مطابق ایک ایک صنعت کی طرف متوجہ ہو جاوے اور اسکی تکمیل میں کوشش کرے۔ کیونکہ اگر تمام افراد اپنی طبیعتوں اور ارادوں میں متحد ومتفق ہو جاتے تو سب کے سب ایک ہی صنعت کی طرف مائل ہوتے جس کی وجہ سے دوسری صنعتیں معطل رہجاتیں اور نظام انتظام بگڑ جاتا۔ اسی طرح اگر سب کے سب حالت فقر وغنا میں یکساں رہتے تو ایکدوسرے کی معاونت نکرتے کیونکہ اگر سب فقیر ہوتے تو کسی کو اپنی خدمت کے مقابلہ میں دوسرے سے نفع کی توقع نہ ہوتی اور اگر سب غنی ہو جاتے تو ایک دوسرے کی خدمت ہی نکرتے لیکن جب اختلاف ہمم وطبائع کی وجہ سے ہر ایک کو ایک صنعت پسند آئی اور عملی معلوم ہوئی اور بمقتضاے اختلاف احوال ہر ایک کو من وجہ دوسرے کی احتیاج ہوئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی معاونت وخدمت سے تمام کام انجام پاے اور سب کی معیشت منتظم ہوئی پس کمال ہر شخص کا ایک دوسرے کی معاونت پر موقوف اور اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ اسلئے ہر فرد کو اپنے بنی نوع کے ساتھ مخالطت بمعاونت ومعاشرت بمعاوضت کرنی واجب ولازم ہے ورنہ وہ قاعدہ عدالت سے متجاوز اور جادۂ اعتدال مدنیت سے منحرف سمجھا جائے گا اور جور وظلم سے متصف ہوگا۔

بیان مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ رہبانیت خلاف مقتضاے طبیعت انسانی ہے اور شریعت نے اسی لئے اسکو منع کیا ہے کہ خلاف مدنیت وانسانیت ہے۔ پس جو لوگ عزلت ووحشت اختیار کرتے ہیں اور معاونت بنی نوع سے دور اور نفور رہتے ہیں اور اپنی معیشت وزندگی کا بوجھ دوسروں کے سر ڈالتے ہیں اور اسکا نام فقر وزہد اور تفرید وتجرید رکھتے اور اسکو فضیلت جانتے ہیں۔ وہ شخص ظالم وجابر اور غاصب اموال ہیں۔ کیونکہ غذا ولباس اور دیگر مایحتاج معیشت اپنے بنی نوع سے لیتے ہیں اور اسکے عوض میں اُنکو کوئی نفع نہیں پہنچاتے اور اُنکی قیمت و اُجرت تک نہیں دیتے جو عفت وعدالت انسانی سے نہایت بعید ہے۔ یہ لوگ صرف اسی پر اکتفا نہ [illegible] کہ اُنکو بجاے نفع [illegible] کے ضرر [illegible] ہیں

اور قسم قسم کے فسانہ و افسوں ابلہ فریب سے افراد بنی نوع کو مدنیت سے دور اور ترقی و استحصال قابلیت سے باز و مہجور رکھتے ہیں اور بجائے اجتماع و اتفاق و اتحاد کے اُنہیں مخالفت و منافرت و مبغضت پھیلاتے ہیں۔

ہمارے اس بیان سے یہ اچھی طرح ظاہر ہو گیا کہ انسان خاص خاص اختلافات کے باوجود بنی نوع کے اجتماع کا محتاج ہے، اور اسی اجتماع کا نام تمدن ہے یعنی ایسا عام اجتماع جو مختلف الطبائع اور متبائن الآرا، افراد کے امور معیشت میں بوجہ لائق موجب انتظام ہوا ہے۔

افراد بنی نوع کی طبعی خواہشیں مختلف ہوا کرتی ہیں اور ہر ایک کا نفس اپنے نفع کے استحصال پر مجبول ہے۔ اگر اُن کو اپنی اپنی طبیعت پر چھوڑ دیجئے تو باہمی معاونت میں خلل پڑیگا اور انتظام باقی نہ رہیگا۔ کیونکہ ہر شخص اپنے نفع کیلئے دوسرے کا ضرر چاہیگا جس کی وجہ سے مخالفت و منازعت پیدا ہو جائے گی اور ہر ایک دوسرے کو فنا کرنے اور صفحہ ہستی سے میٹ دینے کی کوشش کرے گا۔ اسلئے کسی ایسی تدبیر کی ضرورت ہوئی جس سے ہر ایک اپنے حق پر قانع رہے اور دوسرے پر جور و تعدی نہ کرنے پائے اسی ضرورت سے حاکم و قانون کا ہونا لازمی ہے اور جو چیز اس ضرورت کو انجام دیتی اور پورا کرتی ہے اُسی کا نام سیاست عظمیٰ ہے۔

حکما کا اس امر پر اتفاق ہے کہ جس طرح معاونت و مساعدت، اور سرانجام حوائج و معاش باہمی کے لئے بنی نوع انسان کا اجتماع ایک ضروری اور فطری امر ہے، اسی طرح اس اجتماع کے اعتدال کو باقی رکھنے اور اسکی محافظت کرنے کیلئے ایک حاکم کا ہونا بھی بنی نوع انسان کے لئے لازمی اور طبعی امر ہے۔

چونکہ اجتماع تمدن انسانی خیر و شر کے مختلف حالات پر مبنی ہے اور طرز معیشت تمدن سلطنت اور افراد بنی نوع کے اوصاف خیر و شر کے لحاظ سے یہ علاقات مختلف ہوا کرتے ہیں اسلئے حکما نے حالات اجتماعی اور اغراض تمدنی کے اختلافات کی مناسبت سے مدینہ کے کئی [illegible] بغرض امتیاز اُنکے جُدا جُدا نام رکھے ہیں۔ مثلاً

مدینہ جاہلہ [illegible] فاسقہ، مدینہ ضالہ۔ مدینہ فاضلہ

اگر اجزاء مدینہ، قوت ناطقہ[1] سے بے بہرہ ہوں اور انکا اجتماع کسی اور قوت کی وجہ سے ہوا ہو تو اسکو "مدینہ جاہلہ" کہتے ہیں ، اگر افراد مدینہ، قوت ناطقہ کو استعمال کر سکتے ہوں مگر دوسری قوتیں بھی اسکے ساتھ شریک کر لی گئی ہوں اور انکا مجموعہ موجب تمدن ہوا ہو تو اسکو "مدینہ فاسقہ" کہتے ہیں ، اگر کوئی ایسا قانون - جو قوت فکر کے نقصان کا نتیجہ ہو - تجویز کر لیا گیا اور بجائے خود وہی فضیلت قرار دے لیا گیا اور اسی پر تمدن کا دار و مدار رکھا گیا ہو تو اسکو "مدینہ ضالہ" کہتے ہیں اگر بنی نوع انسان کا اجتماع قواعد کسب سعادت، و دفع شرور پر مبنی ہو تو اسکو مدینہ[2] فاضلہ کہتے ہیں اگرچہ عقائد و اعمال کے اعتبار سے مختلف اور شخصی حالات اور ذاتی خصوصیات کے لحاظ سے متباین ہی کیوں نہوں چونکہ سب کے سب اغراض حمائد بجائیں ایک دوسرے کے سہیم و شریک ہیں اور ان سب کی غرض ایک ہی ہے اسلئے یہ شخصی اور ذاتی اختلافات تمدن کے منافی و مضر نہیں ہو سکتے اور جسطرح ہر ایک کی صورت اور طبیعت کا اختلاف اس اجتماع کے مخالف نہیں ہے اسی طرح مختلف فرقوں کے صور اعتقادی و اعمالی کا اختلاف بھی اس اجتماع کا مانع نہیں، چونکہ سب کی غرض و غایت ایک ہی ہے اور ایک ہی امر اجمالی میں سب مشترک ہیں اور ایک ہی مدبر فاضل اور حاکم عادل کے تابع اور رعیت ہیں ، لہذا انمیں تعصب و تعاند نہ رہنا چاہیے اور جس کمال کے جو مستعد اور لائق ہے اس میں مصروف ہونا اور ایکدوسرے کے معاون و معاضد بنے رہنا نہایت ضروری ہے -

ہمارے مذکورۃ الصدر دلائل کا ماحصل و نتیجہ یہ نکلا کہ ہر کثرت کا قوام و نظام وحدت پر موقوف رکھا گیا ہے اسلئے مختلف فرق رعایا اور متفرق افسران ملک کا باہمی انتظام کیلئے فطرتاً انکا سیاسۃً متحد رہنا اور ایک حاکم، ایک سیاست اور ایک قانون کے تابع ہونا ضروری اور لابدی ہے - جسطرح سے جسم انسانی کا قیام مختلف الطبائع عناصر کے اختلاف اور کسر و انکسار سے ہوتا ہے اسی طرح جسم سلطنت کی ساخت اور ترکیب بھی ایسے فرقوں سے ہوتی ہے

[1] قوت ناطقہ - اس انسانی قوت کا نام ہے جو مبدا فکر و تمیز ہوا کرتی ہے یعنی جزئیات سے کلیات کیطرف منتقل ہونا اور احکام کلیہ نکالنا اور مقدمات سے نتائج پیدا کرنا اسکا کام ہے -

[2] ان چاروں کی ترکیب سے بہت اقسام پیدا ہوتے ہیں جنکو حکمائے در مزاہمت کے نام سے موسوم

جنکی عصبیات یا مذاہب یا عقائد و رسوم مختلف ہوا کرتے ہیں اور یہ اختلافات اتحاد سیاسی کو مانع اور سلطنت کی وحدت قہری میں مجتمع ہونے سے مزاحم نہیں ہوتے۔ بلکہ اسکے قیام کے لیے یہ اختلاف ایک لازمی اور طبعی امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسقدر زیادہ مختلف عصبیات کسی سلطنت کی وحدت قہری میں مجتمع اور متحد ہونگے اتنی ہی اُس حکومت کی عظمت و شوکت و قوت زیادہ ہوگی۔ کیونکہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ہر کثرت اُسی وقت اعلیٰ و اشرف ہوگی جب کہ وہ اپنی ضد سے متقارب ہو جائے اور اُسمیں وحدت کے آثار زیادہ ظاہر ہوں۔

(بقیہ صفحۂ گذشتہ)

کیا ہے لیکن بیان (؟) ہم کو مدینہ فاضلہ سے ... لہذا مزید وضاحت کی غرض سے ہم اسکے ارکان کو بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں ارکان مدینہ فاضلہ پانچ ہیں

اول وہ لوگ جن پر تدبیر مدینہ موقوف ہو یہ گروہ اپنے فضائل اور تکمیل قوت مدرکہ کی وجہ سے سب سے ممتاز ہوا کرتا ہے۔ جیسے حکماء کاملین طبع۔

دوسرے۔ وہ لوگ جو عوام کو کمال انسانی پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ اور مدینہ کے افراد مجتمعہ کو مواعظ و نصائح کے ذریعہ سے رذائل اور نفاق و شقاق سے باز رکھتے ہیں۔

تیسرے۔ وہ فرقہ جو عہدہ دار ہیں جو افراد بنی نوع میں قانون حکومت نافذ کرتے ہیں۔

چوتھے۔ وہ جو مدینہ کو تعرض و تغلب اعداء سے بچاتے ہیں۔ یعنی لشکری۔

پانچویں۔ وہ جو ان چاروں کے ماکولات ملبوسات اور مسکونات وغیرہ اشیاء کے متکفل ہوتے ہیں یعنی پیشہ ور اور اہل حرفہ۔

ان پانچوں کے سوا اسکے اور جتنے ہیں ارکان مدینہ فاضلہ سے خارج ہیں اور ان فرقوں کے ادوات و آلات کے مانند ہیں۔ اگر یہ قابل فضیلت ہوں تو جس کمال کے وہ لائق ہوں بترتیب فضلا اُس درجہ فضیلت و کمال پر پہنچائے جائیں ورنہ اُن اعمال میں جو سبب مصالح تمدن ہوں مشغول و مصروف رہیں۔ بعضے اُس گھاس پات کے مشابہ ہوتے ہیں جو اکثر باغوں اور کھیتوں میں اُگ آتا ہے اسلئے علمائے اخلاق نے اُنکا نام نوابت رکھا ہے اور اُنکی بھی پانچ قسمیں کی ہیں۔

(ا) مرائی وہ لوگ جو اپنے آپ کو افعال فضلا اور شعار علماء میں ظاہر کرتے ہیں اور بزرگوں کے لباس

جب یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ کمال افراد انسانی و استکمال ہیئت مدنی و سیاسی اجتماع باہمی سے منوط و مربوط ہے اسلئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہاں اُن صفات و اخلاق کو جن پر اجتماع بنی نوع انسان موقوف ہے اور جن سے ہیئت مدنیت قائم ہے بیان کریں۔ مدبرین ملک و مصلحین قوم کا فرض ہے کہ وہ سلطنت کی اس ہیئت اجتماعی کے قائم رکھنے میں کوشش کریں اور اُن اسباب کو جن پر انکا قیام موقوف ہے کام میں لائیں۔

میں جلوہ گر ہوکر بتلبیس و تلبیس دنیوی اغراض فاسدہ حاصل کرتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ گذشتہ)

(۲) محرف۔ جو خواہشات نفسانی کے تسلط اور میلان رزائل کے غلبہ کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ قواعد مدنیت کو بحیلہ و تاویل اپنی طبیعت و خواہش کے موافق کریں۔

(۳) باغی۔ جو احکام بادشاہ کی اطاعت نہیں کرتے جنکا دفع کرنا عقلاً و شرعاً تمام پر واجب ہے۔

(۴) [illegible]۔ جو اپنے قصور فہم و ادراک کے سبب سے [illegible] آگاہ نہیں [illegible] معانی پر اُن کو محمول کرکے جادہ استقامت سے منحرف ہو جاتے ہیں۔

(۵) مغالط۔ جو حقائق کو نہ سمجھ کر طلب جاہ و مال کے لیے دعاوی کاذبہ پر اقدام کرتے ہیں اور غلط سلط دہوکہ کی باتوں سے بے سروسامانہ خود فروشی کا بازار گرم کرنے لگتے ہیں اور عوام کی نظروں میں اپنے تئیں دانا اور عقلمند ثابت کرتے ہیں حالانکہ خود متحیر ہوتے ہیں اور کسی مسئلہ کا بھی اذعان و ایقان نہیں رکھتے۔

علم اخلاق میں یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ بمقابلہ فضائل بعض ایسے رزائل ہوا کرتے ہیں جو شبیہ بفضائل ہوتے ہیں اور جو لوگ علم اخلاق سے ممارست نہیں رکھتے اُنکے دہوکہ اور فریب کا موجب ہوتے ہیں۔ پس کسیقدر انکا بھی یہاں بیان کر دینا مناسب ہے تاکہ "مشابہت" کا انکشاف اچھی طرح ہو جاوے اور طالبان کمالات انسانی اور راغبان ملکات نفسانی مغالطہ میں نہ پڑیں اور ان دغابازوں اور فریبیوں کے دہوکہ میں آکر خرمہرہ کو بہ نرخ جواہر نہ خریدیں۔ مثلاً فضیلت حکمت میں بعض لوگ مسائل علوم حکمت کو حفظ اور انکے نکات و دلائل کو یاد کرکے اسطرح تقریر کرتے ہیں کہ وہ لوگ جنکو فراست و کیاست سے کچھ تعلق نہیں ہے عش عش اور تعجب کرنے لگتے ہیں اور اُنکے وفور دانش و بینش کی گواہی دیتے ہیں حالانکہ اُن کو کسی مسئلہ حکمیہ کا یقین اور اُسپر اطمینان نہیں ہوتا اور اُنکے نفس ناطقہ میں کوئی نقش راسخ و متمکن نہیں ہوا کرتا علماء و حکماء کی نسبت ہیں ان لوگوں کا حال مثل اُن جوانات کے ہے جو افعال و اقوال انسانی کی محاکات کرتے ہیں جیسے بندریا طوطی یا اُس لڑکے کے مانند جو بالغوں

منجملہ انکے ایک محبت ہی۔ یہ ایک ایسی فضیلت ہے جسکے ہوتے ہوئے نظام تمدن میں عدالت
کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ یہ اُس سے افضل ہے کیونکہ یہ ایک ایسی وحدت ہے جو شبیہ بالطبعی

بقیہ صفحہ گذشتہ

سے مشابہ ہوا کرتا ہے ؎

گیرم کہ مار چوبہ کند تن بشکل مار کو زہر بہر دشمن و کو مہرہ بہر دوست

اور ان میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں کہ کسی مطلب یا مسئلہ میں حق صریح کا اذعان نہیں رکھتے ہیں اور ہر مطلب
میں۔ اگرچہ صریح وصاف ہی کیوں نہو۔ باوجود عدم فطانت اتصرف کرنا چاہتے ہیں اور غلط سلط دہوکہ کی باتوں
سے مبتدیوں کو وہم وشک میں ڈالتے ہیں حالانکہ مسائل یقینیہ میں وہم وگمان کی گنجایش اور شک کا شائبہ ہی کہاں۔
یہ لوگ مطالب عالیہ میں بڑے بڑے دعوے کرتے اور باطل کو لباس حق پہناتے اور ظن وتخمین کو بصورت علم و
یقین ظاہر کرتے اور بزعم خود اسکا نام تحقیق وتدقیق رکھتے ہیں۔ چونکہ حکمت، کمالات انسانی کے اعلیٰ
مدارج سے ہے اسلئے اسکی حقیقت بتمام بجز حکیم کے حاصل نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ حکما میں اور اس گروہ
میں فرق وامتیاز نہیں کرسکتے۔

اسیطرح فضیلت عفت میں ایک گروہ لذات دنیاوی سے اعراض واحتراز کرتا ہے تاکہ اُسی جنس کی
اُس سے زیادہ تر لذت والی چیز حاصل کرے۔ جیسے کہ وہ زاہد جو تزویر عوام اور صید انام کے لئے زہد اختیار
کرتے ہیں تاکہ اسکے وسیلہ سے اپنے خواہشات کو پورا کریں۔ یا وہ لوگ جو کثرت استعمال لذات کی بنا پر
ملال وکلال حاصل ہونے سے۔ یا اصل فطرت یا کسی مرض کی وجہ سے نقصان شہوت آجانے سے۔ چیز ترکریں ؎

گر بعصیاں در نمی آویزم از نا طاقتی است ویں بعینہ چون عروس شہوت است و ضعف باہ

یا وہ لوگ جو بوجہ خوف آلام وامراض یا اس خوف سے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہوجائیگا تو موجب سرزنش وملامت
ہوگا۔ اس سے محترز رہتے ہیں یہ لوگ درحقیقت عفیف نہیں ہیں۔

اور اسیطرح فضیلت شجاعت کا حال ہے کہ کبھی غیر شجیع سے بھی شجاعت کا فعل صادر ہوتا ہے۔
مثلاً بعض لوگ مال وجاہ کے لئے یا حرص کی وجہ سے ضرب شدید وحبس مدید وقتل دشمنان وجنگ وجدال
کے متحمل ہوتے ہیں۔ جیسے عیار وقطاع الطریق۔ مگر یہ لوگ شجیع نہیں کہلاسکتے اسلئے کہ شجیع وہی شخص ہے
جو سوا اس ملکہ فاضلہ کے دوسری غرض مدنظر نہ رکھتا ہو۔ یہاں اسقدر رذائل شبیہ بفضائل کا بیان

ہے اور عدالت شبیہ بصناعی اور یہ امر مسلم ہے کہ ملکی معاملات پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ تعیث دو کو ایک اور عدالت و انصاف ایک کو دو کرنے والی صفت ہے کیونکہ انصاف کے معنی ہی نصف نصف

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

جو طرداً للباب وتبصرۃً لاولی الالباب کردیا گیا ہے کافی و وافی ہے زیادہ تطویل کی ضرورت نہیں

چونکہ اعتدال تمدنی موقوف بردرستی اخلاق انسانی اور بنی نوع انسانی ہے اور بدون اسکے مصالح دین و دنیا۔ خواہ شخصی ہوں یا نوعی پورے نہیں ہوسکتے اسلئے اس فن شریف کی ضرورت و حاجت کیطرف بھی کچھ اشارہ کردینا ضروری ہے کیونکہ اصلاح تمدن بدون اصلاح افراد کے [illegible] ہے اسلئے حکماء قدیم طالب فضیلت کو پہلے تہذیب اخلاق [illegible] بعد علم اخلاق ریاضی بعد منطق، بعد علم طبعی پڑھانے کو بہت [illegible] کیونکہ ریاضیات کی ممارست سے نفس یقینیات کی عادت [illegible] اسکا شوق ہوجاتا ہے اکثر لوگ جو بغیر ریاضی کے منطق پڑھتے ہیں ان صفات کے برعکس موصوف و متصف ہوتے ہیں انکے نزدیک کمال نفس ناطقہ شغب وجدال کا نام ہے اور ایراد مغالطہ یا شک پیدا کرنا نہایت تحقیق ہے اسلئے افلاطون نے اپنے گھر پر یہ نوٹس لگا دیا تھا کہ جو حساب و ہندسہ نہ جانتا ہو وہ نہ [illegible] جمیع علوم حکمیہ پر تہذیب اخلاق مقدم ہے۔ بقراط کا یہ مقولہ ہے کہ جب تک بدن اخلاط فاسدہ [illegible] ہو غذا سے بجز فساد کے کچھ فائدہ نہو گا اور مرض کی زیادتی کے سوا [illegible] یہی نکتہ و رمز اس میں بھی ہے کہ جب تک کہ نفس اخلاق ذمیمہ سے پاک نہو تعلیم علوم حکمیہ اسکے ازدیاد فساد کا سبب ہوتی ہے۔ کیونکہ اسکی وجہ سے مواد کبر و نخوت پید اور اسباب انواع رذائل مہیا ہوتے ہیں [illegible] چونکہ اکثر طلبہ و آتوا البیوت من ابوابہا پر عمل نہیں کرتے اور تہذیب اخلاق کیطرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں اسی لئے فسق و فجور اور ضلالت و گمراہی میں پڑجاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ علامت قید تقلید سے آزاد کرتی اور درجہ تحقیق پر پہنچاتی ہے اور نہیں سمجھتے کہ اسکے کیا معنی ہیں؟ [illegible] ہیں کہ حکمت موجب انحلال قیود شریعت اور سبب اطلاق قانون ملت ہے اور سبب [illegible] اور خواہشات نفس قید شریعت سے آزاد ہوجاتے ہیں جو زیبائے رہروان راہ طلب و سالکان [illegible]

خلاص ما ہمہ نزال زلف تابدار صیاد — [illegible] کند تو بستگار [illegible]

رہتے ہیں جو وحدت کثرت کی طرح پائی جاتی ہے اگر بغور دیکھا جاوے اور خیال کو ذرا وسعت دیجاوے تو معلوم ہوگا کہ تمام عالم اسی کشش انجذابی و تالیفی اور اسی حب ذاتی پر موقوف و منحصر ہی اگر یہ جاتی رہے تو ابھی تمام عالم درہم برہم ہو جاوے اور اذا النجوم انکدرت کا مفاد پورا ہو جاوے

سر حب ازلی در ہمہ اشیا ساری
ورنہ بر گل نہ زدے بلبل بیدل فریاد

جو محبت بادشاہ و رعیت اور حاکم و محکوم کے درمیان ہوتی ہے وہ بوجہ اختلاف اسباب طرفین کے بسبب شکایت کے [illegible] باقی رہتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے سے وہ چیز طلب

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

اور بہائم کے مانند [illegible] و بطون [illegible] اپنی [illegible] ہیں اور درندوں کی طرح [illegible] بعض اوقات [illegible] [illegible] طالبان [illegible] جو [illegible] واجب ہے [illegible] ان اعتقادی [illegible] سے ہی کئے گئے ہیں جو ایک قسم کی نجات کا موجب ہے۔

[illegible] کالذی استہوتہ الشیاطین فی الارض حیران [illegible] مذبذبین بین ذلک لا الی [illegible] [illegible] متعدد جگہ وارد ہوا ان [illegible] غرض ہمارے [illegible] آجکل کی تعلیم قدیم و جدید میں جو نقص پیدا ہو [illegible] نہیں ہو سکتا خواہ کسی ڈگری یافتہ یا مولوی [illegible] تعلیم یافتہ کیوں نہوں کالج کے پڑھے ہوئے ہوں یا یونیورسٹی کے [illegible] تعلیم قدیم و جدید کو اسکا خیال زیادہ تر ہونا چاہیے ورنہ بجز تخریب اخلاق کے تعلیم سے اور کوئی فائدہ مرتب نہوگا۔

چونکہ اس جگہ [illegible] محبت کا ذکر آگیا ہے اسلئے ہم یہاں [illegible] اقسام کو بیان کردینا ضروری خیال کرتے ہیں نوع انسانی میں دو قسم کی نسبت ہوا کرتی ہے ایک طبعی جیسے والدین اور اولاد کی محبت۔ دوسرا ارادی جیسے استاد و شاگرد اور مرید و مرشد کی محبت۔ محبت ارادی کی باعتبار اسکی غایت کے چار قسمیں کی گئی ہیں۔

اول۔ وہ جسکی غایت صرف لذت ہو یہ محبت جلد حاصل اور جلد زائل ہو جاتی ہے کیونکہ لذت [illegible] بالخصوص [illegible]

پیدا کرتا ہے جو اسکو اکثر اوقات میسر نہیں ہوتی اور فقدان مطلوب سبب ملامت و مادۂ شکایت ہوتا ہے
اسکا ارتفاع بغیر عدالت کے جو مستلزم رضا بقدر استحقاق ہے، نہایت مشکل ہے۔ سلاطین کو رعایا سے
تنعم و تفضل اور تربیت کیوجہ سے محبت ہوا کرتی ہے۔ لہذا بادشاہ کی محبت رعایا کے ساتھ پدرانہ
اور رعایا کی بادشاہ کے ساتھ پسرانہ ہونی چاہئے اور رعایا کو باہم برادران مشفق کی مانند رہنا
اور بقدر استحقاق اپنے حقوق طلب کرنا چاہئے نہ کہ زائد از استحقاق۔ چونکہ برادر حقوق میں
باہم شریک ہیں اور شرکت ایک قسم کی منازعت کی مقتضی ہے۔ لہذا انہیں جادۂ عدالت کو مرعی

دوسرے وہ جو لذت و نفع و خیر سے مرکب ہو یہ دیر سے حاصل ہوتی اور دیر تک رہتی ہے۔ کیونکہ اجتماع نفع و خیر دونوں حالتوں کو مقتضی ہے۔

تیسرے وہ جس کو صرف نفع مقصود ہو، یہ دیر سے پیدا ہوتی اور جلد زائل ہو جاتی ہے کیونکہ حصول نفع دیر میسر ہوتا ہے اور بعد حصول سبب محبت باقی نہیں رہتا، لہذا جلد زائل ہو جاتی ہے۔

چوتھی وہ جس سے صرف خیر و شر مقصود ہو یہ جلد حاصل ہوتی اور دیر سے زائل ہوتی ہے کیونکہ مناسبت روحانی اور انست جانی کی وجہ سے جلد میسر ہوتی ہے اور اتحاد حقیقی کے سبب سے دیر پا رہتی ہے۔

حکما نے کہا ہے کہ محبت صداقت سے اعم ہے کیونکہ محبت جماعت کثیر سے ہو سکتی ہے بخلاف صداقت کے اور عشق اس سے بھی اخص ہے کہ ایک دل میں دو کا عشق نہیں سما سکتا چونکہ محبت اہل خیر کی غایت خیر ہے اس لئے اس میں کبھی خلل واقع نہیں ہوتا، برخلاف دیگر محبتوں کے کہ وہ ادنیٰ عوارض سے ہی خلل پذیر اور زائل ہو جاتی ہیں جیسا کہ اس آیت میں ہے الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ

لیکن وہ محبت کہ صرف نفع اس کے لئے ہو جیسی سفر و دریا میں ہمسفروں و اجنبیوں اور اشرار و دلوں کے ہو سکتی ہے کبھی یہ محبت بوجہ غربت اور مصائب وغیرہ اور اجتماع ہو جانے کے بھی ہوا کرتی ہے۔ جیسے سفر دریا بعیدہ یا کسی شہر میں ایک جا ہو جانے کے سبب سے یا مصائب و حوادث وغیرہ کی وجہ سے۔ اس قسم کی محبت کا سبب یہ ہے کہ انسان بالطبع انس کی طرف مائل ہے اسلئے اسکو انسان کہتے ہیں۔ اور محبت کسی فرقہ یا قوم و عزیزہ میں ہو یا کم ہو تاہم وہ انسانیت سے بعید اور وحشت سے قریب سمجھا جائیگا۔ یہی ماہیت انسانی ہے اور مقتضائے تالف و تمدن ہے۔ شارع علیہ السلام نے بھی تالف و انس کا اہتمام اپنے تمام احکام میں مرعی رکھا ہے۔ جیسے کہ جمع و جماعت اور حج و زکوٰۃ وغیرہ احکام کے اسرار یہی ہیں اور ان تکالیف سے مقصود شارع یہی ہے کہ تحقق رابطۂ وحدت اور رفع فائدہ عموماً ہو۔ جیسے کہ اصل ایمان میں توحید تام ہے اسی طرح بروئے عمل بھی تاج توحید ہو اور جس طرح کہ انکا عقیدہ موحدانہ ہے عمل بھی موحدانہ ہے۔ جب سبب محبت ایک طرف سے لذت اور دوسری طرف سے منفعت ہو تو بوجہ اختلاف اسباب اکثر شکایات واقع ہوتی ہیں جیسے محبت مطرب و مستمع اور عاشق و معشوق کی کہ مستمع و عاشق کی محبت کا سبب لذت ہے اور مطرب و معشوق کی وجہ محبت منفعت۔ اس قسم کی محبت میں حدوث شکایات اسوجہ سے ہوتی ہے کہ طالب لذت استیفائے لذت میں عجلت کرتا ہے اور طالب منفعت اسکو حصول منفعت پر موقوف رکھتا ہے اسوجہ سے دونوں میں موافقت کمتر میسر ہوتی ہے اور اسیوجہ سے عشاق ہمیشہ شاکی اور متظلم رہتے ہیں حالانکہ درحقیقت خود ہی ظالم ہوتے ہیں کیونکہ استیفائے لذت میں تو جلدی کرتے ہیں اور اسکے بدلے ادائے منفعت میں تاخیر کرتے ہیں۔ اس قسم کی محبت کو لوامہ کہتے ہیں یعنی یہ محبت مقرون بملامت ہوا کرتی ہے۔

رکھنے اور اپنے حقوق سے بھی متجاوز ہو سکے کیونکہ بعض اوقات نزاع بھی ضروری ہو
چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بھائی بھائی میراث پر لڑا کرتے ہیں مگر یہ نزاع انکے رشتہ برادری کو منقطع
نہیں بلکہ قانون یا حاکم عادل اُن کو اپنے حقوق پر قائم اور راضی رکھ سکتا ہے اسی طرح اگر افراد رعایا
میں بعض خصوصیات اور اتصال منافع و حقوق پر لڑائی جھگڑے ہوں تو اُس سے ان کی محبت
والفت میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے بلکہ ابتدا ہی سے تک بھی دور رکھنا چاہیے۔

دوسری۔ صداقت ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ رشتہ اتحاد یہاں تک ہو کہ حکم اثنینیت کو مرتفع اور رابطہ
اتحاد کو اسطرح مستحکم کریں کہ جو بات اپنے لئے پسند نہ کریں اپنے دوست کے لئے بھی نہ پسند کریں اور جو
منافع اپنے لئے چاہیں اُسکے لئے بھی چاہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ:

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔	تم میں سے کوئی بھی کامل مومن اسوقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

تیسری۔ الفت ہے یعنی مختلف فرقے اور گروہ ایک دوسرے کی معاونت کریں اس فضیلت کو آنحضرت
صلعم نے اوصاف ایمان سے قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:-

المومن مألف لاخیر فیمن لا یألف ولا یؤلف۔	مومن الفت رکھتا ہے۔ اُس شخص میں کچھ بھی خیر نہیں جو نہ دوسروں کو مالوف کرتا ہے اور نہ خود مالوف ہوتا ہے۔

چوتھے۔ وفا ہے یعنی مواسات جسکے معنی مال و تن سے یاری و مدد کرنے کے ہیں یا مواجب
و حقوق کا ایفا کرنا حدیث میں آیا ہے۔

انصر اخاک ظالماً و مظلوماً	یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم

صحابہ نے عرض کیا یا رسول مظلوم کی نصرت تو خیر لیکن ظالم کی نصرت کیونکر ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ
ظالم کی نصرت یہی کہ وہ ظلم سے باز رکھا جائے۔ قرآن میں دوسری قسم کی بابت وارد ہے کہ:

اوفوا بالعہد ان العہد کان مسئولا۔	اور عہد کو پورا کرو کیونکہ وہ پوچھا جائیگا

پانچویں۔ شفقت یہ ایک قسم کے انفعالی اثر کا نام ہے جو بنی نوع پر کسی نا ملائم حادثہ کے واقع
ہونے سے طبیعت انسانی میں پیدا ہوتا ہے جس سے بالطبع انسان کو اُس حادثہ کے زائل اور دفع کرنے کی
تحریک ہوتی ہے کیونکہ بنی نوع انسان ایک ہی تن کی شاخیں ہیں اور ایک ہی جسم کے اعضا جب کہ

يايها الناس اتقوا ربكم الذي خلقكم من نفس واحدة | اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم تمام کو ایک نفس (آدم)
وخلق منها زوجها وبث منهما رجالا كثيرا ونساء | سے پیدا کیا۔ اور اس سے اسکا جوڑا بنایا اور ذکور و اناث کی ایک تعداد کثیر پیدا کی

آنحضرت نے فرمایا ہے۔

ترى المؤمنين في تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم | مومنین اپنے ترحم، دوستی اور مہربانی میں مثل ایک جسد کے
كمثل الجسد اذا اشتكى عضو تداعى له سائر الجسد | ہیں جبکہ ایک عضو میں اگر تکلیف ہو تو تمام جسم بیداری و بخار
بالسهر والحمى۔ | سے بےچین رہتا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگرند	۵	که در آفرینش ز یک جوہرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار		دگر عضوہا را نماند قرار
تو کز محنت دیگراں بے غمی		نشاید که نامت نہند آدمی

چھٹا۔ رفق یعنی خوش خوئی اور نرمی [illegible] رفق اور خوش خلقی کی [illegible] علامتیں ہیں۔

(۱) نیک کاموں [illegible] (۲) [illegible]

(۴) اگر کسی سے کوئی خطا ہو [illegible] تو اسکو قبول کرنا۔ (۵) [illegible] تکلیف میں ساتھ دینا (۹) [illegible] بر نظر اللہ۔ (۹) خلق [illegible] خوش کلامی سے پیش آنا۔ حدیث میں وارد ہوا ہے۔

ما كان الرفق في شيء الا زانه ولا نزع من شيء | [illegible] ہوا معلوم ہوتا ہے اور [illegible]
الا شانه۔ | [illegible]

خدا تعالی نے آنحضرت صلعم کے [illegible] پر احسان کیا اور فرمایا
فبما رحمة من الله لنت لهم | [illegible] تو انکے لئے نرم ہو گیا۔

الحاصل خوش خلقی سے [illegible]

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است		با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

درشت کلامی سبب [illegible] — [illegible]

[illegible]	●	[illegible]

ساتویں - حسن شرکت و معاشرت ہے۔ یعنی بمراعات قانون عدالت معاملات کو اسطرح

سے کرشرکا کے لئے موجب انحراف نہو۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ :-

خیر الاصحاب عند اللہ خیرھم لصاحبہ و خیر الجیران عند اللہ خیرھم لجارہ و خیرکم من یرجی خیرہ و یؤمن شرہ و خیر الناس من ینفع الناس	خدا کے نزدیک بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنے رفیق کے حق میں بہتر ہوں۔ اللہ کے نزدیک وہ ہمسایہ اچھا ہے جو ہمسایہ کے لئے اچھا ہو تم میں اچھا شخص وہ ہے جس سے خیر کی امید کیجائے اور اسکے شر سے امن میں رہا جاوے۔ اچھا انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچاوے

آٹھویں - تودد یعنی اکفاء و افاضل کی دوستی بطیب کلام و انعام و اکرام طلب کرنا اور اسی قسم کے اسباب جو موجب جلب محبت ہوسکیں۔

بہر حال ان صفات حسنہ اور اخلاق حمیدہ کے بغیر نہ عدالت کا تحقق ہو سکتا ہے نہ مختلف فرق آپس میں نسبت تالیفی پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ تمدن و مذہب کا مقتضا پورا ہو سکتا ہے۔ اسلئے جو لوگ ارکان مدینہ فاضلہ ہیں یعنی علماء و فضلاء و حکماء اور حکام عادل انکو پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ صفات افراد و اجزاے مدینہ میں پیدا ہوں اور جو لوگ اسکے برخلاف نفاق اور فتنہ اور تفرقہ و اختلاف پھیلاتے ہیں وہ درحقیقت مخرب دولت و ملت اور مفرق اجزاے مدینہ ہیں۔

ہم یہاں بمناسبت مقام بادشاہ و حاکم مدینہ کے ان فرائض کو بھی مختصراً بیان کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ جو اس اجتماع تمدنی کے قائم رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

بادشاہ کی مثال طبیب عالم کی مانند ہے۔ جس طرح طبیب کو اسباب مرض کا دریافت کرنا اور اسکے مناسب علاج کی فکر کرنا ضروری ہے۔ اسیطرح بادشاہ کو بھی مرض مملکت کا جاننا اور اسکے دفعیہ کی کوشش کرنا واجب ہے۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ تمدن مختلف فرق انام کے اجتماع عام کا نام ہے۔ جب تک ہر ایک گروہ اپنی اپنی حد پر رہیگا اور جو اشتغال کہ اسکے مناسب حال ہیں انہیں مصروف رہیگا اور جو عہدے اور مراتب اسکے لائق ہوں اسکو ملتے رہینگے تو اس صورت میں مزاج مدینہ حد اعتدال پر اور تمام کام منتظم رہتے ہیں۔ اگر اس قانون کی پابندی نہ کیجائیگی تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ افراد مدینہ کا رشتہ الفت منقطع اور تمام انتظام خراب و تبتر ہو جائیگا۔ کیونکہ ہر ایک دولت کا مبدا ایسی جماعت کی آراء کا اتفاق ہے جو باہمی معاونت میں اعضاء شخص واحد کے مانند ہوتے ہیں اور اس جماعت

کی تمام قوتوں کا جامع ایک شخص ہوجاتا ہے، اسی وجہ سے کوئی شخص تنہا اُسکا مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ ایسے بہت سے اشخاص بھی جو باہم مختلف الآرا ہوں اُسپر غالب آسکتے ہیں، لیکن ان لوگوں میں بھی اتفاق و ایتلاف ہوجاے اور سب کے سب ایک شخص کی مانند متحد ہوجائیں تب ان کا مقابلہ اور غلبہ ممکن ہے۔

ہمنے متعدد بار بیان کیا ہے کہ کوئی کثرت، وحدت تالیفی کے بغیر منتظم نہیں ہوسکتی اور وہ وحدت عدالت ہے۔ اسلئے جب تک بادشاہ قانون عدالت پر چلتا رہیگا، تمام طبقات رعایا کو اپنے اپنے حدود پر برقرار رکھیگا۔ اُن کو دوسروں پر جور و تعدی نکرنے دیگا، تو ضرور نظام مملکت باقی رہیگا۔ اگر اسکے برخلاف ہر ایک گروہ اور ہر ایک فرقہ اپنے نفس کی خواہش میں دوسروں کو ضرر پہنچانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا تو اس افراط و تفریط کی وجہ سے ضرور رابطہ انتظام درہم برہم ہوجائیگا تجربہ سے ثابت ہے کہ جس دولت کے مختلف فرق رعایا میں موافقت رہتی ہے اور قانون عدالت کی پابندی کیجاتی ہے وہ دولت ترقی کرتی رہتی ہے اور جہاں ظلم و عدوان کا غلبہ ہوا وہاں ہمیشہ سلطنت کو زوال ہوا۔ کیونکہ اہل زمانہ اپنے سلاطین کے طریقہ کو اختیار کرتے اور اُسی روش چلتے ہیں۔ الناس علی دین ملوکھم۔

چونکہ ہر ایک شخص کی طبیعت میں دوسروں پر ظلم و تعدی اور تسلط و غلبہ حاصل کرنیکا مادہ ہے اسلئے جب بادشاہ اور اُسکے اتباع ظلم کرتے ہوئے دیکھے جائینگے تو خواہ مخواہ قوی کو ضعیف پر متسلط ہونے اور اُسکے حقوق میں دست اندازی کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا۔ ہمنے اوپر بیان کیا ہے کہ وحدت سیاسی غلبہ و عدوان کے ساتھ مجتمع نہیں ہوا کرتی ہے کیونکہ اسکی وجہ سے ملک میں انتظام نہیں رہیگا اور فتنہ و فساد برپا ہوجائیگا اسی لئے کہا گیا ہے کہ:۔

الملك يبقى بالكفر ولا يبقى مع الظلم — ملک کفر کے ساتھ باقی رہ سکتا ہے لیکن ظلم کے ساتھ نہیں رہتا

والظلم مؤذن للخراب — ظلم اُجڑنے اور خراب ہونے کی خبر دیتا ہے۔

پس بادشاہ کو چاہئے کہ اصناف خلق کو باہدگر برابر رکھے تاکہ اسکی وجہ سے اعتدال تمدنی حاصل ہوسکے۔ جسطرح اعتدال مزاج عناصر اربعہ کے معتدل رہنے سے پیدا ہوتا ہے اسیطرح مزاج تمدنی کا اعتدال بھی ان چار گروہوں کے اعتدال سے ظہور میں آتا ہے۔

(۱) اہل قلم۔ جیسے علما، فقہا، قضاۃ، کتاب، حساب، مہندس، منجم، اطبا، شعرا وغیرہ وغیرہ جنکے قلم سے دین و دنیا کا قوام ہے۔ یہ لوگ بمنزلہ آب ہیں اور جیسا سبزہ علم و آب میں سے ہے وہ

روشن تر از آفتاب ہے۔

(۲) اہل شمشیر۔ یہ گروہ رعایا کے انتظام مصالح کے لئے ہے۔ اسکا یہ کام ہے کہ سلطنت کو دشمنوں اور باغیوں کے خطروں سے محفوظ رکھے۔ یہ بمنزلۂ آتش ہے اور ان دونوں کی وجہ تشبیہ ظاہر ہے۔

(۳) اہل معاملہ۔ جیسے تجار اور دیگر اہل حرفت جنکے ذریعہ سے مایحتاج زندگی اور اسباب معیشت فراہم ہوتے ہیں۔ یہ گروہ مثل ہوا کے ہے اور وجہ تشبیہ یہ ہے کہ جسطرح ہوا نباتات کے نشو و نما میں مدد و معاون ہے اور اپنے تموج و حرکت سے بطرح قسم قسم کے دلکشا اور مفرح اشیا سے حیوانات اور انسان کی روح کو تر و تازگی پہونچاتی ہے، اسیطرح اہل حرفہ اور تجار انسان کی ضروریات زندگی پورا کرتے اور دور دراز مقامات کی طرح طرح کے دلفریب امتعہ اور مرغوب و نفیس اشیاء سے مستفید و منتفع کرتے ہیں۔

(۴) اہل زراعت۔ یہ فرقہ مدبر نباتات ہے اور اہل مدینہ کے اشیاء خورد و نوش کو پیدا کرتا ہے بغیر اسکی کوششوں کے افراد انسان کا زندہ رہنا محال ہے، درحقیقت یہ گروہ معدوم شے کو موجود کرتا ہے، کیونکہ دوسرے جتنے فرقے ہیں وہ کسی شے کو عدم سے وجود میں نہیں لاتے بلکہ موجودہ شے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ یا ایک حالت سے دوسری حالت کیطرف منتقل کرتے ہیں۔ چونکہ اس گروہ کو خاک سے قرب و اتصال ہے اسوسطے بمنزلۂ خاک ہے[۱]۔

مرکبات عنصری میں جسطرح ایک عنصر کا غلبہ اور حد اعتدال سے متجاوز ہوجانا فساد کا موجب اور نظام جسمی کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے اسی طرح اجتماع مدنی میں ان اصناف اربعہ میں سے کسی ایک صنف کا غلبہ بھی انتظام میں خلل ڈالتا ہے۔

---

[۱] اہل مدینہ کی تقسیم ایک دوسری وجہ سے یعنی اُنکے خصائل طبعی و فطری کے لحاظ سے پانچ قسم پر ہوسکتی ہے۔

(۱) وہ جو بالطبع نیک ہوں اور اُنکا خیر متعدی بغیر ہو جیسے علماے شریعت مشائخ طریقت اور عرفائے حقیقت۔

(۲) وہ جو بالطبع نیک تو ہیں مگر ان کی نیکی دوسروں تک متعدی نہیں ہوتی یعنی (۲) میں کمل نہیں۔ بادشاہ کو چاہیئے کہ اس طبقہ کو بھی محترم رکھے اور اسکی معونت کرے۔ (۳) وہ جو بالطبع نہ نیک ہیں نہ بد بادشاہ کو اس گروہ کی حمایت و نگہبانی کرنا چاہئے تاکہ فساد استعداد سے محفوظ و مصون رہے اور بقدر امکان اکمال لائق تک ترقی کرے۔

چہارم۔ جو بالطبع شریر ہوں مگر اُنکا شر دوسروں تک سرایت نکرے بادشاہ کو چاہئے کہ اس جماعت کی تحقیر و اہانت کر

بادشاہ کو چاہیے کہ اہل تمدن کے مراتب کی تعین کے بعد اُنکو قسمت خیرات میں بھی حد اعتدال پر رکھے خیرات کی تین قسمیں ہیں۔ سلامتی نفوس، سلامتی اموال، اور تعدیل کرامات۔

تعدیل کرامات کے یہ معنی ہیں کہ ہر شخص کے رتبہ اور استحقاق کا لحاظ رکھا جائے اور بقدر اوسکی لیاقت و حیثیت کے رتبہ اور مراتبہ مقرر کیا جائے اسلئے کہ اگر اُسکے حقوق کا خیال نہیں کیا جائے گا تو اُس پر جور ہوگا اور اگر اُسکو استحقاق سے زیادہ رتبہ دیا جائیگا اور مستحقین و لائق لوگ محروم رکھے جائینگے تو گویا یہ اہل مدینہ پر ایک قسم کا ظلم ہوگا۔ کبھی کسی خاص شخص کی تنقیص بھی اہل مدینہ کے لئے جور و ظلم ہوا کرتی ہے اسلئے کہ کسی مستحق کو اُسکے رتبہ سے گھٹانا، اُسکے اور دوسرے مستحقین کی خاطر شکنی کا موجب اور انتظام مدینہ کے خلل کا باعث ہوتا ہے۔

پس جو لوگ لیاقت و استحقاق کے بغیر ملکی خدمات میں حصہ لینا چاہتے ہیں اور مستحقین کو محروم کرنا پسند کرتے ہیں وہ قواعد عدالت سے دور اور ضوابط و آئین ریاست سے قاصر و مہجور ہیں۔

اور موعظت و نصیحت سے اُنکو شرارت سے حتی الامکان باز رکھے۔ پنجم - وہ جو کہ بالطبع شریر اور اُنکا شر دوسروں تک سرایت کرے یہ طائفہ اخس و ارذل طوائف ہے۔ اس گروہ میں جنکی اصلاح کی امید ہو اُنکی تادیب کرنی چاہیے اور جنکی شرارت شمول عمومیت رکھتی ہو اُنکی نسبت صلاح وقت کا رہبند ہونا چاہئے اور جنکی شرارت عمومیت و شمولیت نہ رکھتی ہو اُنکو کاالسد احبس اور انکے دفع شر کا طریقہ حسب حال ہو۔

حبس یعنی اہل مدینہ سے ملنے نہ دینا۔

قید - یعنی بند کرنا اور بیڑیاں ڈالنا اور تصرفات پر فی سے باز رکھنا۔

نفی - یعنی خارج البلد کرنا اور دخول مدینہ سے باز رکھنا۔

اگر ان طریقوں سے بھی اُن کا شر منقطع نہ ہو تو اُن کو معدوم اور قتل کر دینا چاہیے جسطرح دوسرے اعضاء کے بقا اور حفاظت جسم کے لئے طبیب کو کسی فاسد و مضر عضو کا قطع کر دینا واجب ہے اسیطرح طبیب عالم یعنی بادشاہ کو بھی سلامتی نفوس اور مصلحت عامہ بنی نوع کے لئے جو اعضائے تمدن ہیں ایسے مضر شخص کا قتل کرنا ضروری اور لازمی ہے۔

شیخ محمد عبدالرزاق اینڈ سنس سوداگر کانپور چوک

چار روپیہ میں ریلوی گھڑی اور ... مفت

ناظرین کو خوب خیال ہوگا کہ ہم ریلوی فیشن کی بیسی گھڑی کس وقت میں روسے سوداگرات روپیہ کو ... جب ہمنے دساور سے چالان خود منگایا ... تب اور سوداگر ... گھڑی کا ... مفت دینا ... ہم ۴ ... ریلوی اور تار ... کے لئے موزوں ہے۔

... پائدار ... چاندی کی ... سال ... گھڑی سنہری پائدار ... کلاک ... والی ...

کانپور سے ہر قسم کے بوٹ جوتے

[illegible]

کانپور کے ہر قسم کے زین

[illegible]

کانپور کے ہر قسم کے ساز

... جوڑا کانپور ... نہایت ...

عمدہ قیمت ... نہایت عمدہ خوبصورت ...

... جوڑا کانپوری ...

... ہر قسم کی اشیاء دیسی و ولایتی روانہ ہوسکتی ہے

۱۵

ممبر کا سُرمہ

بعدہ توجہ جناب ... گنگا رام صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

... میڈیکل کالج ... یونیورسٹی کے سند یافتہ یورپین ڈاکٹر ... سرمہ ... امراض ... آنکھ ... خارش وغیرہ ... عینک کی حاجت نہیں رہتی ...

... قیمت فی تولہ ... اعلیٰ قسم فی تولہ ... سرمہ ... فی تولہ ...

المشتہر

... مقام بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب

اس سے بڑھکر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے

... استعمال ... دیکھا ...

... آنکھوں کی بیماری ... فائدہ بخش نہیں ... آنکھوں کی ذرا سی بھی کسی قسم کی شکایت ہے ... زور سے استعمال کرنیکی سفارش کرتا ہوں کہ ہر طرح سے مفید اور فائدہ بخش ثابت ہوگا پانی آنا - دھند خارش سرخی چشم کے واسطے ... زیادہ فائدہ بخش ثابت ہوگا - ... واسطے ... ایجاد کرکے ... احسان کیا ہے اسکا شکریہ الفاظ میں ہونا محال ہے ... تمام لوگ آپ کے سرمہ سے دستیاب ہو ... ہر طرح کی آنکھ کی بیماریوں سے نجات ...

... پنڈت گنگا رام صاحب ڈاکٹر

بہادر بھویا

رجسٹرڈ نمبر ۱۲۵۱

اردوی معلّٰی

نمبر ۶ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۰۶ء | جلد ۱

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی ۔ بی ۔ اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوی معلّٰی علیگڈھ

احسن المطابع واقع علی گڑھ میں طبع ہوا

قیمت { قسم اول (مع دواوین) للعہ سالانہ مع محصول
قسم دوم (معمولی سفید کاغذ) عا الضاً ۔ [illegible] سالانہ

بسم اللہ

طالب علیخاں عیشی

(سنہ ۱۱۹۷ھ تا سنہ ۱۲۲۵ھ غالباً)

سلسلۂ شاعری | طالب علیخاں نام عیشی تخلص اردو میں مصحفی کے شاگرد رشید تھے اور فارسی میں مرزا قتیل کو تلمذ تھا چنانچہ کلیات اردو کے علاوہ ان سے ایک کلیات نظم و نثر فارسی بھی یادگار ہے۔

تصانیف | اردو میں ایک دیوان اور ایک مثنوی سوز و ساز قابل دید ہے۔ نظم فارسی میں کلیات میں زیادہ تر قصائد حمد و نعت و منقبت اور کچھ قصیدے نواب سفیر الدولہ کی شان میں ہیں آخر میں رباعیات و قطعات اور دس کے قریب چھوٹی بڑی مثنویاں ہیں مثلاً شکارنامہ نواب سعادت علیخاں۔ مثنوی حقیقت و مجاز۔ مثنوی مذمت دنیا۔ مثنوی در مدح آغا تقی بہادر اور مثنوی وصل و ہجر جو سب سے بڑی ہے۔ نثر فارسی معروف بہ خزان و بہار میں اکثر حکایتیں اور رقعے ہیں۔

سرقہ و توارد | اسمیں ایک موقعہ پر سرقہ و توارد کے باب میں انہوں نے نہایت معقول رائے ظاہر کی ہے کہ جو شخص خود معنی یاب طبیعت رکھتا ہوگا وہ ایک بیت یا مصرعے کے لیے کبھی سرقہ نہ کریگا اگر بظاہر کہیں ایسا معلوم بھی ہو تو اسکو توارد سمجھنا چاہیئے۔ یا بار ہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ذہن شاعر میں کسی دوسرے شخص کا شعر یا مضمون شعر محفوظ ہوتا ہے اور بحالت نادانستگی وہ اس مضمون کو اپنی غزل میں ادا کر جاتا ہے۔ اسکو بھی سرقہ کہنا ظلم ہے۔ البتہ معلوم ہو جانے پر ایسے شعر کو اپنے کلام سے خارج کر دینا چاہیئے۔ عیشی کی عبارت یہ ہے :-

" در مثنوی وصل و ہجر بیتے در حمد الٰہی گفتم۔ بتحقیق رسید تمامش از ہاتفی ست۔ وا استماع گویاں از سلک نتائج نمایش بیروں کردم۔ و در غزلے مصرعے از نتائج طبع استادی و فخر المتاخرین مرزا محمد حسن قتیل توارد گردید۔ چوں آگاہ شدم گفتم انا للّٰہ و انا الیہ راجعون و خط نسخ بر وشیدہ و علی ہذا القیاس بر ذمہ ہمت خود لازم داشتہ ام کہ نقشے را کہ ثانیاً از قلم ہیچمدان صورت بندد بنقاش اولش واگذارم۔ اگر صورت تحقیق نپذیرد معذورم ..... و از نگاہ ذوی الابصار حقیقت نگر مخفی نیست کہ ایں معذرت بجانہ مختص بہ من نیست بلکہ ہر کرا فکر معنی یاب دادہ اند کے

برائے یک مصرعہ یا یک بیت دامن ہمت را بلوث سرقہ بیالاید"

عیشی کی شاعری | عیشی میاں مصحفی کے درمیانی عہد شاعری کے شاگردوں میں سے تھے یہی وجہ ہے کہ انکا کلام عہد آخر کے شاگردوں مثل اسیر و شعور وغیرہ کی شاعری کے خلاف بجائے خشک، کلامی و بے رنگی سے پاک ہے بلکہ جا بجا باعتبار سادگی و درد مثنوی میں کلام میر اور غزل میں کلام مصحفی کے ہم پہلو نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

خوے وزدی زبس اس طبع ہوسکار کی تھی	آنکھ پھرہون سدا روزن دیوار کی تھی
حشر تک لطمہ صرصر کے طمانچے کہائے	خاک یہ کس کے محبت کے گنہگار کی تھی
سر مژگاں پہ لگے لخت جگر دیکھ چکے	یہ بھی ہم نخل محبت کا ثمر دیکھ چکے
کبھی صیاد چھیڑے ہاتھ کا ہے باغباں ڈالے	چمن میں کیا سمجھکر کوئی طرح آشیاں ڈالے
کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہتا	اس برس ننگ جوانی تھا جو زنداں میں نہتا
نے کبھی روسے نہ ٹیکا سر کو گاہی سنگ پر	مفت اپنا خون ہوا جرم شکست رنگ پر
ہستی کا جو اپنے ہمیں مختار بناتے	سو بار مٹاتا میں جو سو بار بناتے

تنہا میں اس جہان کی محفل میں رہگیا	اور داغ ہمرہان سفر دلمیں رہگیا
اُٹھتے ہی تیری بزم سے اُٹھا یہ غلغلہ	بہتوں کا دل کشاکش محفل میں رہگیا
رویا میں یاد کرکے بہت ماجرائے دل	پروانہ جلکے رات جو محفل میں رہگیا
عیشی شباہت رخ جاناں سے تھی اُسی	پر داغ عارض مہ کامل میں رہگیا
چشم کس ترک کی شمشیر لئے پھرتی ہے	کہ قضا حسرت تکبیر لئے پھرتی ہے
کوئی اس فصل میں دیوانہ ہوا ہے شاید	کہ ہوا ہاتھ میں زنجیر لئے پھرتی ہے
قیس برگشتہ خدا جانے کہاں ہے کہ صبا	خبر لیلئے دلگیر لئے پھرتی ہے
ہیولی یوں ہوگئے برباد کہ اب تلک اُ	آرزوئے گل تصویر لئے پھرتی ہے
بادہ نوشان خرابات مغاں مژدہ کہ آج	مغفرت دفتر تقصیر لئے پھرتی ہے
گل نے کیا بے ادبی کی تہ [illegible] نسیم	تازیانہ سبب تقدیر لئے پھرتی ہے
ضعف ہر چند کہ زنجیر قدم ہے عیشی	گردش خانہ تقدیر لئے پھرتی ہے

بلجیم کے دلفریب نظارے

دوسرے دن جب میں اپنے کمرے سے نیچے اُتر کر آیا تو خوب دہوپ نکلی ہوئی تہی۔ یہانکے ہوٹلوں کا دستور ہے کہ ہر اک کے متعلق ایک ایک قہوہ خانہ ہوتا ہے جہاں لوگ کہانے پینے کے لئے جاتے ہیں۔ علی ہذا اس ہوٹل کے متعلق بہی ایک قہوہ خانہ تہا جہاں سب سے پہلے میری نظر اپنے پرانے دوست "گارسان" پر پڑی پیرس کے اثنائے قیام میں ان حضرات سے اسقدر رابطہ پڑا تہا کہ اتنی جلدی بہول جانا ناممکن تہا۔ پیچہے سے کٹا ہوا کوٹ اور سامنے کمر سے نیچے ایک سفید رومال بندہا ہوا ان لوگوں کی مخصوصیات لباس میں سے ہی۔

میں نے "ڈی ریُنے" یعنی ناشتے کے لئے حکم دیا اور ایک گز بہر کی لمبی کرکری روٹی۔ تیدر کی میز پر میرے سامنے لاکر رکہدی گئی۔ اور ایک قدح گرم دودہ اور ایک پیالہ قہوہ اور ایک ٹکیہ مکہن کی بہی روٹی کے پاس رکہدی گئی۔ بس اسیقدر یہانکے لوگوں کا ناشتہ ہوتا ہی جو کہا جاتا ہی کہ بالکل فرانسیسی فیشن کے مطابق ہے۔ ہم انگلستان کے ٹوسٹ۔ مکہن یا پچ اور انڈے یا مچہلی کہانے کے عادی تہے۔ اتنے ذرا سے ناشتہ میں کیا ہوتا تہا۔ مگر دو تین دن میں عادت پڑ گئی۔

ہوٹل کے سامنے ایک بڑا چوک تہا۔ جسکے شمال پر اسٹیشن کی خوبصورت عمارت واقع تہی۔ سامنے بہت سی شاہراہیں تہیں اور چوک کے بیچ میں ایک بہت وسیع چبوترا سا تہا جسپر اخبار بیچنے والوں کے اڈے تہے۔ جہاں ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت کا تانتا لگا ہوا تہا۔ ہر چہار طرف بگہیاں اور بسی ٹریم گاڑیاں منٹ منٹ پر چہوٹتی تہیں۔ بازار کے اس شور و شغب میں سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ چہوٹی چہوٹی لکڑی کی گاڑیاں تہیں جنکو کتے کہینچتے پہرتے تہے۔ مثلاً ایک دودہ والا جو ظاہرا غریب معلوم ہوتا ہے اور شاید ابہی دیہات سے آیا ہے۔ اپنے برتن ایک گاڑی میں رکہے اور اک بڑے قد کا تندرست ساز و یراق سے آراستہ کتا جسے گاڑی ہانکتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں ایک دہوبی کی گاڑی میں اسی طرح ایک کتا جتا ہوا ہے اور کہیں ایک چاقو پر سان رکہنے والا اسیطرح کتے کے ذریعہ سے اپنے اوزار اور ہتیار وغیرہ ایک گاڑی پر لادے کہینچتا جا رہا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ تمام بلجیم اور خصوصاً دیہاتوں میں

اکثر اسکا رواج ہے۔ جہاں لوگ عموماً غریب ہوتے ہیں وہاں کتوں کے ذریعہ سے بہت سے کام نکالتے ہیں۔

برسلس میں پہلے ہی دن کے چکر میں مجھے بہت سی ایسی نئی چیزیں معلوم ہوئیں جنکو پہلے پیرس میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ شہر جو بلجیم کا دارالسلطنت ہے خوبصورتی میں چھوٹا پیرس کہا جاتا ہے اسمیں شک نہیں کہ جو قدامت اور عالیشان پیرس میں پائی جاتی ہو یہاں اُسکا عشر عشیر بھی نہیں اور نہ پیرس کے مانند اسکی آرائش پر کروروں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا ہے نہ یہاں کوئی عالیشان پل مثل "پان اسکندر سوم" (   ) کی ہے اور نہ یہاں "گرانڈ پیلے" (   ) کی طرح کوئی خوبصورت عمارت ہے نہ یہاں دریائے سین ہے اور نہ اوسکی دلفریبیاں تاہم اپنی حیثیت کے لحاظ سے جو ایک جداگانہ شے ہے اُسے دیکھئے تو اُسمیں بہت سی خوبیاں نظر آئینگی۔ یہاں پیرس کی طرح آرام وراحت زندگی کے لئے کچھ کم سامان مہیا نہ نظر آئینگے۔ اسمیں ایک ایسی خوبی پائی جاتی ہے جو پیرس کو نصیب بھی نہیں۔ یہ خوبی یعنی سادگی ہی اسکا زیور ہے اور بناوٹ کی سی بنارٹ نام کو نہیں۔ یہاں اسقدر مکروہات بھی نہیں پائے جاتے جتنے کہ وہاں ہیں اور نہ یہاں ضروریات زندگی اسقدر گراں ہیں کہ رہنا دشوار ہوجائے۔ یہانکے لوگ بھی اسقدر سرکش نہیں کہ ہر وقت بغاوت کا خوف لگا رہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ زمانہ نے اسپر کیا کیا ستم توڑے ہیں اور تاریخ یورپ نے یہاں کیا کیا پلٹے کہائے ہیں اسپر بھی یہ ایک بے حیثیت شہر تہوڑے زمانہ میں ایک خوبصورت پایۂ تخت بن گیا ہے تو درحقیقت حیرت ہوتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا اور دریائے آئن پر آباد تھا۔ مگر اب اس دریا کا اندرون شہر کہیں پتہ نہیں لگتا۔ شہر میں جابجا اس دریا کی شاخیں اور نہریں پھیلی ہوئی ہیں مگر بالکل پٹی ہوئی ہیں۔ دہلی کی چاندنی چوک کیطرح اس شہر کی ایک شارع عام کے نیچے ایک خوب چوڑی نہر ہے اور اوپر دورویہ مکانات بنے ہیں جو دو تین منزل سے زیادہ اونچے نہیں۔ شاہراہوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ تہر سے پاٹی گئی ہیں۔ جنپر گاڑیوں کے چلنے سے سخت ناگوار آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہانکے مکانات زیادہ اونچے نہیں ہیں اور انکے رہنے والوں کی خوش طبعی کا اس سے خوب پتہ لگتا ہے کہ ہر کہڑکی کے سامنے باہر کی جانب کہلی ہوئی

[illegible]

تحفظ حقوق مسلمانان

جسوقت سے مسٹر مارلی نے اپنی گرانقدر اور بیش بہا تقریر میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی اور توجہ کا اظہار کیا ہے اور صاف الفاظ میں کہدیا ہے کہ نئے خیالات جو ملک میں پھیل رہے ہیں انمیں کوئی بات خلاف عقل اور نامناسب نہیں معلوم ہوتی اور نہ کانگریس کوئی خوف کی چیز ہے، اسیوقت سے اس گروہ میں جو گورنمنٹ کے کسی فعل پر رائے زنی کرنے اور اپنے حقوق طلب کرنے کو گناہ کبیرہ سمجھتا تھا، ایک سنناہٹ پیدا ہوگئی ہے اور دم بخود دیکھ رہا ہے کہ ع - چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی - اور حیران ہے کہ جب ہندوستان کے اصلی حکمران کے یہ خیالات ہیں تو معمولی عہدہ داران گورنمنٹ ہماری پولیٹکل "دلکشی" اور "جی حضوری" کا ہمیں کیا فائدہ پہنچا سکتے ہیں؟ (اگرچہ اسوقت تک بھی سوائے نقصان کے فائدہ نہیں ہوا ہے) - اس نے پس از خرابی بصرہ اب سمجھا ہے کہ بیسویں صدی کا اقتضا کیا ہے اور اس زمانے میں اگر کچھ نفع ہوسکتا ہے تو پولیٹکل جد وجہد میں غرق ہو کر نہ کہ اس سے علیحدہ ہو کر۔ وہی وسوسہ شیطانی جو لاحول پڑھکر دلوں سے نکالا جاتا تھا اب دلوں میں پیدا کیا جا رہا ہے - ہم مسلمانوں میں کہ ایک عرصہ سے باعتبار پالیٹکس اپنے کو مردہ بنا چکے تھے، ایک خفیف حرکت کا پیدا ہونا بھی بہت بڑی خوشی کا باعث ہے - اور یہ خوشی اسوقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ نواب محسن الملک بہادر کے سے بہی خواہ و برگزیدہ قوم اور تجربہ کار شخص نے اسکی ابتدا کی ہے۔ معلوم نہیں اب نواب صاحب بہادر ہم لوگوں کے [illegible] کیا فتوی دینگے - میں اس حیرانی میں ہوں کہ۔

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما
چیست یاران طریقت بعد ازین تدبیر ما

لیکن جہاں اس تحریک کے پیدا ہونے سے خوشی اور مسرت ہے وہاں ایک اندیشہ بھی دامنگیر ہے وہ یہ کہ نواب صاحب اس تحریک کی روح رواں ہیں اور وہی کالج کی بھی جان ہیں اگر کہیں یہ تحریک مثل مرحوم ڈیفنس ایسوسی ایشن کے کالج میں مدغم ہوگئی تو پھر اسکا ہونا نہ ہونا دونو[illegible]

برابر ہوجائیگا۔ ہمیں نواب صاحب بہادر کی دانشمندی سے پوری توقع ہے کہ وہ اس تحریک کو کالج سے بالکل علیحدہ اور ممتاز رکھینگے۔

یہ خفیف تموج جو مسلمانوں میں پیدا ہوا اسکی پہلی عملی شکل والسرائے کو اپنے حفظ حقوق کے متعلق ایڈریس دینا ہے چونکہ یہ ایڈریس عام مسلمانان ہند کی طرف سے دیا گیا ہے اسلئے میں بحیثیت ایک مسلمان کے اپنے کچھ خیالات اسکے متعلق ظاہر کروں تو امید ہے کہ اسکا مستحق سمجھا جاویگا۔

مسٹر مارلی نے اپنی بجٹ اسپیچ میں لیجسلیٹو کونسل کی توسیع اور اصلاح کا وعدہ کیا اور فوراً ایک کمیٹی بھی مقرر ہوگئی۔ مسلمانوں کی ایک گروہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور بعض دیگر اسباب نے جو اسوقت اتفاقاً جمع ہوگئے ہیں۔ انہیں کامیابی کا یقین دلایا۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے غلط سمجھا۔ جس نشان پر وہ چلے ہیں وہ رہبری نہیں بلکہ گمراہی کا نشان ہے

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

سول سروس ہندوستان کی ترقی میں ہمیشہ سد راہ رہی ہے اور رہیگی۔ انگلو انڈین (سوای بعض مستثنیات کے کہ الشاذ کالمعدوم ہیں) نہیں چاہتے کہ کسیطرح بھی ہندوستانیوں کو واقعی اختیارات انتظام ملک میں حاصل ہوں۔ چنانچہ مسٹر گوٹ (ماسٹر بلیل کالج) نے جو خطوط لارڈ لینسڈاون کو انکے زمانہ حکومت ہند میں لکھے ہیں۔ اسمیں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "ہند کے سربرآوردہ لوگوں سے اخلاق بلکہ ادب کا برتاؤ کرنا چاہیے مگر اسیوقت تک کہ انکی گلے میں رسی بندھی رہے" پس کیونکر یہ گمان بھی ہوسکتا ہے کہ ایسا گروہ ایک منٹ کے لئے دلمیں یہ خیال گزرنے دیگا کہ مسٹر مارلی کی خواہش پوری ہوسکے۔ تمام انگلو انڈین اخبارات نے جو کچھ ان سے ہوسکا ہی مسٹر مارلی کے خلاف لکھنے اور شائع کرنے میں دریغ نہیں کیا ہے اور [illegible] بناہی کرنیوالے بھی ممبران سول سروس ہیں۔ ان لوگوں کی خوش قسمتی سے ہندوستانیوں کی ہر ایک اصلاح اور رفاہ کے کام میں روڑا اٹکانے کیلئے انکے ہاتھ میں مختلف اقوام کا ایک ایسا آلہ آگیا ہے کہ موقع بے موقع وہ اسے استعمال کرنے سے باز نہیں رہتے۔ اور

ہماری بدقسمتی سے کچھ ہندوستانی بھی انہیں ایسے ملجاتے ہیں جو انکے اس خیال کی تائید کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔ معاملہ زیر بحث میں بھی ایسا ہی ہوا۔ تمام انیگلو انڈین اخبارات گویا خاص مسلمانوں کے آرگن بن گئے ہیں اور انیگلو انڈین اصحاب کا برتاؤ مسلمانوں سے ایسا گویا وہ ہندوستان میں صرف مسلمانونکے فلاح اور بہبود کے لئے آئے ہیں۔ یہ سب کیوں ؟ اسلئے کہ مسلمانوں کی طفل تسلی سے فائدہ اٹھا کر مسٹر مارلی کے نیک ارادوں میں خلل ڈالیں۔

ایسی طرح جاننا چاہیے کہ اقوام اور علی الخصوص مفتوح اقوام کے تاریخ میں ایسے اتفاقات بہت کم آتے ہیں کہ انہیں واقعی اور حقیقی ترقی کیطرف قدم بڑھانیکا موقع ملے۔ لبرل فریق ہندوستان کے حق میں کنسرویٹو سے نسبتاً بہتر ثابت ہوا ہے مگر ہمیشہ لبرل کی وزارت نہیں رہتی اور لبرل کی وزارت میں بھی ہمیشہ مسٹر مارلی سکرٹری ہند نہیں ہوتے۔ ہندوستان کی بیداربختی کہنی چاہیے کہ اس وقت اسکی زمام حکومت ایک نیک نفس، خیرخواہ بنی انسان، دور اندیش، معاملہ فہم اور مدبر وزیر کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں اس مغتنم وقت سے فائدہ اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا چاہیے۔ اور کفران نعمت کرکے آئندہ کے لئے رحمت الہی کا دروازہ نہ بند کرنا چاہیے۔ اگر ہم اپنی بدبختی کے سبب اس فرشتہ مبعوث انسان کے عہد سے متمتع نہوسکے تو پھر کیا امید کیجاسکتی ہے کہ کبھی ترقی کی شکل خواب میں بھی دیکھنی میسر ہوگی۔ ایسے وقت میں کہ کامیابی بہت قریب تھی مسلمانوں نے ابلہ فریبی میں آکر اگر اسے بالکل نیست کرنے کی نوبت نہیں پہنچادی ہے تو بہت کچھ کمی ضرور ہوجائیگی۔ مسلمانوں کے ایڈریس کا جو کچھ فائدہ انہیں پہنچے وہ تو ابھی موہوم ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ اسکی بنا پر مسٹر مارلی پر بہت بڑا دباؤ پڑیگا۔

ہماری قومی سیاہ بختی کا سب سے تاریک دن وہ تھا جب ہمنے پہلی بار کانگرس کے خلاف آواز بلند کی بیس برس ہم اس روش پر قائم رہے اور اسکا نتیجہ سوائے اسکے کچھ نہ پایا کہ پولیٹیکل میدان میں دوسری قوموں سے بدرجہا پیچھے رہگئے۔ اب کچھ احساس ہوا تو اپنی غفلت کی تلافی اسطرح کررہے ہیں کہ کوئیں سے نکلکر کھائی میں گریں یعنی ایک دوسری غلطی میں ایک ربع صدی اور ضائع کردیں اور پھر مرثیہ خوانی

شروع کریں۔ پہلے ہم سرے سے ریپریزنٹیشن کے خلاف رہے اور ہر طرح اسکے مٹانے کی
کوشش کی مگر جب یہ ظاہر ہوگیا کہ زمانے پر کسیکا زور نہیں چلسکتا تو بجاے اسکے کہ فراخ
دلی کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ترقی قوم میں ساعی ہوتے یہ کہنا شروع کیا
کہ ریپریزنٹیشن مفید ہے ہونا چاہیئے مگر مسلمانوں کا ایک حصہ خاص مقرر ہوجاے۔ یہ خیال
بوجوہ چند در چند قرین مصلحت نہیں معلوم ہوتا اور اسی پر اس آرٹکل میں بحث کرنا مقصود ہے
بزرگان قوم نے اپنے ایڈریس میں بہ نظر بہی خواہی مسلمانان دو امور کی درخواست کی ہے
اولاً۔ ملازمت سرکاری میں مسلمانوں کو نسبتاً جگہ دیجاے۔ دوم کونسل اور میونسپلٹی
میں ایک خاص تعداد مسلمانوں کی مقرر ہوجاے اور بصورت انتخاب مسلمان آبادی مسلمانوں کا
انتخاب کرے۔ برخلاف اسکے لیڈران کانگرس کی یہ خواہش ہے کہ (۱) تمام اعلی عہدہ
ہاے سرکاری پر امتحان مقابلہ کے ذریعہ تقرر ہو اور (۲) طریق انتخاب کو بلا لحاظ قوم
وملت ترقی دیجاے یہانتک کہ مثل برٹش پارلیمنٹ کے ایک کونسل ہندوستان میں قائم ہوجاے۔
انہیں دونوں صورتوں میں محاکمہ کرنا چاہیئے کہ کونسی ملک کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے
لیے بالخصوص مفید ہے۔

۱۔ مقابلہ

کانگرس کا یہ مقصد مسلمانوں میں بہت بری طرح سے شائع کیا گیا ہے اور یہ ذہن
نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سے غرض سواے اسکے اور کچھ نہیں ہے
کہ مسلمان ملازمت سرکاری سے بالکل خارج کردئے جائیں۔ شاید ہندوستان میں کسی مسئلہ
پر اتنی غلط فہمی نہ ہوئی ہوگی جتنی اس مسئلہ پر ہوئی ہے۔ کانگرس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے
جو مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے۔ کانگرس کا اس تجویز پر اصرار کرنا وجوہات ذیل پر مبنی ہے
(الف) جو شخص ذرا بھی غور کرے گا اسے معلوم ہوجاے گا کہ ہندوستانیوں کا بکثرت
ملازمت سرکاری کے اعلی عہدوں پر لیا جانا موجودہ ملازمین کی حسن کارگزاری پر بہت کچھ
منحصر ہے۔ اور سفارشی طریقہ تقرر کا اسکے منافی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نالائق لوگ

"حضور زمی" کے سبب مقرر ہو جاتے ہیں اور ان کی عدم قابلیت کے سبب تمام ہندوستانیوں کی بدنامی ہوتی ہے۔ اگر مقابلہ کا قاعدہ رائج ہو تو لائق اور قابل لوگ مقرر ہوا کریں اور اسطرح عام ہندوستانیوں کی عزت بڑھے۔

(ب) بڑا فائدہ اس مقابلہ سے یہ حاصل ہوگا کہ قوم کی ایک کثیر التعداد نوجوانوں کی زندگی تلف ہونے سے بچ جائیگی۔ بہت سے قابل تعلیم یافتہ جو ملک کے لئے مفید ثابت ہوسکتے ہیں نوکری کی امید میں برسوں دفتروں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ اور جب کامیابی نہیں ہوتی تو ناامید ہو کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور پھر وہ دنیا کے کسی کام کے نہیں رہتے۔ اسکی مثالیں ایک نہیں سدہا ملسکتی ہیں۔ تعداد ملازمین تو ہر حال میں ایک ہی رہیگی۔ مقابلہ ہو یا نامزدگی لیکن اول الذکر حالت میں جو امیدوار کامیاب ہوتے وہ مقرر ہو جاتے۔ دوسروں کو کچھ نہ پہنچتا۔ صورت آخر الذکر میں بھی کامیاب تو صرف اسیقدر ہوتے ہیں، مگر سیکڑوں برباد ہو جاتے۔ ہمیں ان ہمدردان قوم پر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ باوجود قوم کے بہی خواہ اور تعلیم کے پیشوا ہونے کے۔ اپنے ہم مذہب تعلیمیافتہ گروہ کی یہ پریشانی دیکھکر انہیں کچھ رحم نہیں آتا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ نوجوان تعلیم یافتہ اس امتحان کو بجائے زحمت کے اپنے لئے رحمت سمجھتے ہیں۔ میںنے متعدد گریجوئیٹوں کو اس صوبہ سے امتحان مقابلہ کے لوٹ جانے پر افسوس کرتے دیکھا ہے۔ ہاں جو لوگ ذاتی قابلیت سے معرا صرف آباواجداد کی اسناد کو وسیلہ بنانے یا کسی حاکم کا سہارا پکڑنے والے ہیں وہ ضرور خوش ہیں۔

(ج) اکثر انگریز صاحبان بھی طریق نامزدگی کے دلدادہ معلوم ہوتے اور لارڈ کرزن بھی اسکے مؤید تھے۔ اس سے ان کی غرض سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ملک میں نئی اسپرٹ ایک حد تک روکی جاسکے، اور انکو اس خیال میں بہت کچھ کامیابی ہوئی ہے جو جوش اور امنگ کہ طلباء کالج سے لیکر نکلتے ہیں انہیں نوکری کی امید انکے اظہار سے مانع ہوتی ہے، اور ایک زمانہ کی خوشامد اور حاضر باشی کے بعد جب وہ ناکام رہتے ہیں تو پھر پژمردگی اور دلشکستگی انہیں کسی کام کا نہیں رکھتی۔ اگرچہ ہم ہندوستانی بھی اس امر میں انگریزوں کے

مفید ہوں تو سوای بداندیش ملک کے اور کیا کہے جا سکتے ہیں

نفس الامر یہ ہے کہ امتحان مقابلہ سے **مسلمانوں کی مخالفت** وقتی مخالفت تھی - اور اب وہ وقت نہیں رہا ہے کہ ہم ہر حاکم کے پاس یہ درخواست لیکر پہنچیں کہ ہم نالائق ہیں اسلئے ہمیں نوکری ملنی چاہیے - صورت اول اول مسلمانوں نے امتحان مقابلہ کی مخالفت کی تھی اسوقت وہ کسیقدر حق بجانب بھی تھی کیونکہ تعلیم انمیں بہت ہی کم تھی لیکن اب بفضلہ تعالیٰ خدا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی کمی قریب قریب پوری کرلی ہے اور اب امتحان مقابلہ کو خوفناک سمجھنا سوای اسکے کہ ہماری پست ہمتی پر دلالت کرے اور کیا کہا جا سکتا ہے - زمانہ کی رفتار سے مسلمانوں میں اکثر نے تو امتحان مقابلہ کا سوتیلا پن ... لیکن اب وہ وقت قریب آ گیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ ایک بڑا وقت ہو ... سے زیادہ مہلک مسلمانوں کو نہیں ... قابلیت کے کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں صرف اتنا ہی کہ انہیں اپنی اس جدوجہد کے لئے ... ملا ہے اور اس قلیل زمانے ہی میں انہوں نے بہت کچھ کامیابی حاصل کر لی ہے - پس ہمیشہ کے لئے انہیں چہارم یا پنجم حصہ ملازمت سرکاری پر محدود کر دینا کسیطرح انکے حق میں مفید نہیں معلوم ہوتا - بہت ممکن ہے کہ تھوڑے زمانہ کے بعد وہ نسبتاً اس سے زیادہ کامیابی حاصل کریں - اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ تقرر تعداد نسبتی قابل عملدرآمد بھی یا نہیں - متعدد وجوہ اسکے خلاف ہیں -

(الف) انتظامی اور عدالتی صیغہ کے تمام بڑے عہدے صرف سویلین کو ملتے ہیں اور اسکے لئے امتحان مقابلہ شرط ہے - مدبران انگلستان نے بہت غور اور تامل کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے قاعدہ کیڈٹ کو توڑ کر یہ طریقہ جاری کیا ہے اور اسکا تعلق ہندوستانیوں کے بنسبت انگریزوں سے زیادہ ہے - انگریزوں کے مفاد کے مقابلے میں ہندو ہوں یا مسلمان کسی کی نہیں سنی جا سکتی - اور غالباً سول سروس کے متعلق ایسا خیال بھی نہیں ہے ہندوستانی اسبارہ میں جو کچھ کرسکتے ہیں وہ یہی کہ ملکی طلبا کی راہ میں جہانتک ہوسکے آسانیاں پیدا کریں جیسا کہ عمر کی قید

بڑھانے سے ہوا ہے) اسطرح کی جو سہولتیں حاصل ہونگی انسی ہندو مسلمان برابر کا فائدہ اُٹھائینگے۔

(ب) ملازمین گورنمنٹ کا ایک بڑا حصہ پروفیشنل لوگوں سے لیا جاتا ہے جیسے انجینیری ڈاکٹری کے محکمہ جنگلات۔ تار وغیرہ اس معاملہ میں گورنمنٹ کو یہ صلاح دینا کہ ایک زیادہ قابلیت کے شخص ہوتے ہوئے ایک کم قابل شخص (محض تعداد مقررہ پوری کرنیکے لئے) لیا جائے ملک کیساتھ سخت بدخواہی کرنی ہے۔ فرض کیجئے کہ گورنمنٹ ایک تعداد نسبتی منظور کرلے تو اُسوقت کیا کیا جائیگا جب ایک مسلمان یا ہندو کی جگہ خالی ہوگی۔ اور اس مذہب کا کوئی شخص نہیں ملیگا تو کیا گورنمنٹ اپنے کام بند کردیگی۔ ہرگز نہیں۔ پس اس لائن میں تعداد نسبتی کا تقرر کسیطور بھی ممکن نہیں۔ (ج) جو ڈیشنل لائن میں منصفی اور سب جج تک اگزیکٹو لائن میں ڈپٹی کلکٹری تک ایسی جگہیں ہیں جو زیادہ تر نامزدگی سے پوری کیجاتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ انہیں پر لوگوں کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ اسکا حال یہ ہے کہ جوڈیشنل لائن میں گورنمنٹ نے نہایت دانشمندانہ پالیسی اختیار کرکے قانون پیشہ لوگوں کا انتخاب شروع کردیا ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ اپنی تعداد بار میں بڑھائیں۔ اگزیکٹو لائن کی بابت گورنمنٹ نے قریب قریب فیصلہ کردیا ہے۔ [illegible] اور اب کچھ دنوں میں قانونگو سے لیکر ڈپٹی کلکٹری تک انہیں [illegible] ہے کہ ایسی حالت میں تعلیمی قابلیت کا لحاظ کیا جائے۔

(د) ان محکموں کو چھوڑکر [illegible] (مثلاً [illegible] وغیرہ) میں ہندو مسلمان یورپین اور یوریشین مقرر ہوتے [illegible] سوائے [illegible] ہوگئے ہیں۔ اسکے مرخص ہونیکا انتظار ہے کہ [illegible] ان عہدوں پر مقرر کیا جائے۔ وہاں ہندو مسلمانوں کا کوئی ذکرہی نہیں [illegible]

(ہ) ان جگہوں کو چھوڑکر [illegible] کا خیال مقابلے کا نہیں ہے۔

ایسی حالت میں [illegible] گورنمنٹ اسے اختیار کرلی جاتی ہے (خواہ [illegible] لیا جائے) ہماری ہادیان قوم کا اپنے طلبا کی ہمت پست کرنا اور مقابلہ سے انہیں [illegible] ہوسکتا۔ ہم مسلمانوں کو ایسی [illegible]

یاد رکھنا چاہئے کہ جوہر ذاتی سے چشم پوشی کرکے محض سعی و سفارش کے زور سے ملازمت میں چند افراد کا داخل ہو جانا قوم کے حق میں سخت مضر ہوگا۔ اسوقت تک جو نالائق لوگ ملازمت سرکاری داخل ہیں وہ ہندو مسلمان سب ہی ہیں اور جو ذلت ہے وہ سب کے لئے ہے لیکن جبتک کہ امتحان مقابلہ ہو اور نا کامیاب ہیں محض تعداد پوری کرنے کو لئے جائیں اسوقت یہ ساری ذلت مسلمانوں کی قوم کے ساتھ مخصوص ہو جائیگی۔ علاوہ قوم کی بدنامی کے جو بے انصافی اور کام کی ابتری ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوگی وہ ہندو اور مسلمان رعایا کو یکساں برداشت کرنی پڑیگی چند افراد کے ذاتی فائدے کے لئے انسانوں کی ایک بڑی گروہ کو مصیبت میں ڈالدینا کسی دانشمند کا کام نہیں۔ کوئی شخص اس امر کا خاطر خواہ جواب نہیں دیسکتا کہ ایک مسلمان ایم۔ ڈی کے ہوتے ہوئے ایک ہندو ایم۔ بی کیوں رکھا جائیگا۔ اور کیوں اول الذکر کی اعلیٰ قابلیت سے سیکڑوں کو مستفید ہونیکا موقع نہ دیا جاوے۔

رہبران قوم کو عامہ خلائق کا نفع سب سے مقدم رکھنا چاہیے۔ ان وجوہ سے میرا یہ خیال ہے کہ تعداد کی نسبتی مقرر کرنا خود مسلمانوں کے حق میں مضر ہوگا۔

۲ - ریپریزنٹیشن

دوسرا مسئلہ یعنی ریپریزنٹیشن بہت تفرقہ اور بے چینی کا سبب ہو رہا ہے جن مسلمانوں نے کسی نہ کسی غرض سے اسکی مخالفت کرنی مصلحت سمجھی ہے، انھوں نے صاف الفاظ میں اپنے ہم مذہبوں سے یہ کہا ہے کہ انمیں اور ہندوئیں ایک اور پانچ کی نسبت ہے، وہ الکشن میں ایک جگہ بھی نہیں حاصل کر سکتے اگر کسی طور سے اُنہوں نے کوئی جگہ حاصل بھی کرلی تو کونسل میں ان کی کوئی ہستی نہ ہوگی اور انکے مفاد کا کچھ خیال نہ کیا جائیگا اسلئے کہ ہندو نمبر بھی زیادہ ہونگے۔ میرا یہ مستحکم عقیدہ ہے کہ مذہب کی بنا پر کوئی پولیٹیکل پارٹی نہیں قائم ہو سکتی اوقت جو مذہب ہندو اور مسلمانوں میں مابہ الامتیاز ہے وہ صرف اسوجہ سے کہ انمیں کسیطرح کی پالیٹکس ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ پالیٹکس پیدا ہوتی ہے اختیار اور ذمہ داری سے اور یہی چیزیں ہم میں ابھی نہیں ہیں۔ لیکن جو مسلمان سچے دل سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ پولیٹکل حقوق حاصل ہونیکے بعد بھی ہندو مسلمانوں کا تفرقہ قائم رہیگا یا وہ اگر یہ کوشش کریں کہ جب تک مسلمانوں کی

حفاظت اغراض کی کوئی اطمینان بخش شکل نہ پیدا ہو جائے ریپریزنٹیشن سے علیحدہ رہنا چاہئے تو وہ بالکل بجا ہیں۔ الا میں بہت ادب سے ایسے بزرگان قوم سے گزارش کرونگا کہ جو علاج آپنے تجویز کیا ہے وہ نہ صرف بے اثر بلکہ مضرت۔ ترقی کی راہ میں سدباب ہونا۔ ملک کی حالت سے غفلت کرنا۔ قوم میں پولیٹیکل بے توجہی اور غیر ضروری سکوت پیدا کرنا۔ اس مرض کی دوا نہیں ہو سکتی۔ اب وقت نہیں ہے کہ ترقی کن جماعت کی شرکت اور عدم شرکت پر بحث کیجائے۔ کانگرس کی ابتدا کے وقت اسکے مخالفین نے عتاب گورنمنٹی کا جو خوف ظاہر کیا تھا وہ اب زیر غور نہیں ہے بلکہ شد و مد کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ گورنمنٹ نے رہی ایکشن کی کارروائیوں کا مہلک ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ لارڈ کرزن نے جتنے قوانین جاری کئے انمیں اُن لوگوں کے لئے جو پولیٹیکل معاملات سے بالکل مستثنیٰ ہیں کوئی استثنا نہیں قائم کی گئی۔ اب اگر ہم اس طریق کو چھوڑنا چاہیں تب بھی ہمیں کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ گورنمنٹ اپنی روش نہیں بدلیگی۔ مسلمانوں کو اختیار ہے کہ ہندوں کے ساتھ شریک ہو کر عام مقاصد اور اغراض کے حصول میں کوشش کریں یا ان سے اختلاف کرکے ملک کی تباہی و بربادی کو اور ترقی دیں۔ اگر ہمارے لیڈروں سے یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں کچھ مستقل فائدہ حاصل ہو تو انھیں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ترقی کن جماعت کی مخالفت کرکے اور گورنمنٹ کی ہاں میں ہاں ملا کر وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ بلکہ انھیں مردانہ وار میدان میں آنا چاہئے۔ اور جو موانع حصول اتحاد میں حائل ہیں انھیں صدق نیت کے ساتھ رفع کرنا چاہئے۔

ریپریزنٹیشن کے بارے میں مسلمانوں کی وہی روش رہی ہے جو امتحان مقابلہ کے بارے میں۔ پہلے تو انھوں نے یک قلم ریپریزنٹیشن سے انکار کیا اُسکے بعد اسکے فوائد کا اقرار کیا اور اپنے ایڈریس میں یہ الفاظ لکھے۔ کہ جن لوگوں کو اب تک گورنمنٹ نے مسلمانوں کا قائم مقام بنایا ہے وہ ہمیشہ مسلمانوں میں اس نظر سے نہیں دیکھے گئے ہیں اور آخر میں الکشن کی تائید کی ہے۔ بشرطیکہ ایک تعداد

خاص مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دی جائے۔ جب اس مسئلہ پر غور کیا جائیگا تو معلوم ہو جائیگا کہ

(۱) مسلمان بغیر اسکے کہ قانوناً ایک تعداد مقرر کرائیں اپنی تعداد پوری کر سکتے ہیں۔

(۲) اگر تعداد نسبتی قانوناً مقرر کی جائے تو اس سے (الف) مسلمانوں کے اور (ب) ملک کے اغراض کو سخت صدمہ پہنچیگا۔

(۳) یہ مشکل اور صورتوں سے بھی حل ہو سکتی ہے۔

ا۔ (الف) ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے اعتبار سے برٹش انڈیا میں ہندو بارہ کروڑ اسی لاکھ (۱۰۸ ملین) اور مسلمان پانچ کروڑ تیس لاکھ (۵۳ ملین) ہیں۔ اس تعداد کے دیکھنے سے ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان بھی منتخب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ خیال ایک بہت بڑی غلطی پر مبنی ہے۔ یعنی یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کے ہر گوشے میں ایک ہی نسبت سے آباد ہیں۔ واقعاً ایسا نہیں ہے۔ ملک کی آبادی ایسی ہے کہ اگر انتخاب کا ذریعہ صرف مذہب قرار دیا جائے تو مسلمان اپنی تعداد کی نسبت سے کم نہ منتخب ہونگے۔ فرض کیجئے کہ ایک ملین کی طرف سے ایک ممبر منتخب ہو۔ مقابلہ صرف ہندو و مسلمانوں میں ہوگا۔ کیونکہ دوسرے مذاہب کے لوگ (جنکی تعداد بیس ملین ہے) اسقدر متفرق ہیں وہ کہیں بھی (سوائے پنجاب اور برہما کے بعض مقامات کے) ہندوؤں اور مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ انتخاب کی بنا صرف مذہب ہوگا اسلئے صوبجات ذیل میں صرف مسلمان منتخب ہونگے۔

صوبہ سرحدی	۲
سندھ	۴
پنجاب	۱۲
مشرقی بنگال و آسام	۲۶
	۴۵

مسلمان اپنی پوری تعداد مذہب کے زور سے حاصل کر سکتے ہیں نسبتی حلقہ انتخاب

کی تقسیم اسطرح سے ہوسکتی ہی کہ مسلمان ہندوونکی مدد سے آزاد ہوجائیں - میں یہ نہیں کہتا کہ صورت اچھی ہے مگر مسلمانونکے اطمینان کے لئے ایک صورت یہ بھی ہے -

(ب) جسوقت ہندوستانیوں کو حقوق ملکی حاصل ہونگے ہر فریق کو دوسرے کا لحاظ مجبوراً کرنا پڑے گا - حقوق ملکی کا پہلا اثر لوکل گورنمنٹ میں ظاہر ہوگا - اور اسکا آخری نتیجہ ہندوستان میں فڈریشن کا قائم ہونا ہوگا (یہ صوبے اپنے اندرونی معاملات میں سنٹرل گورنمنٹ سے اسقدر آزاد ہوں جیسے کہ امریکہ کے صوبے ہیں یا اسقدر پابند جیسے کناڈا اسکیلوقت اسکا فیصلہ کرے گا) لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک طرح کی لوکل حب الوطنی پیدا ہوجائیگی - اور یہ حب الوطنی ہندو اور مسلمانوں کو اس امر پہ مجبور کرے گی کہ ایک دوسرے کے اغراض اور مقاصد کا پاس کریں ورنہ ایک سخت اضطرابی کیفیت پیدا ہوجائیگی - بعض صوبوں میں صرف ہندو حاوی ہوجاوینگے اور بعض میں مسلمان - مجبوراً ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کا پاس کرنا پڑیگا اور اس طرح ایک پائدار صورت اتحاد کی پیدا ہوجائیگی - اب بھی ان مقامات میں ایساہی ہی جہاں "خیالی اختلاف اغراض" کی زہریلی ہوا نے اثر نہیں کیا ہے - بمبئی کی کونسل میں ہندو مسلمان اور پارسی بلا خیال مذہب کے منتخب ہوتے ہیں - مدراس نے (جہاں مسلمان ۵ فیصدی بھی نہیں ہیں) دوبارہ نواب سید محمد کو کونسل وائسرے کا ممبر منتخب کیا ہے - یہی آسانیاں اور جگہ بھی ممکن ہیں اگر ہندو مسلمان ان اختلافات کو بھول جائیں جنکا وجود سوا اسکے ذہن کے اور کہیں نہیں پایا جاتا -

"تکثیر ووٹ"

تیسری صورت اس مسئلہ کی حل کرنے کی "تکثیر ووٹ" کا قاعدہ جاری کرنا ہے انگلستان میں اگرچہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ ایک شخص ایک ہی ووٹ کا مجاز ہے مگر ہالینڈ و ورٹمبرگ - بلجیم اسکی نظیر موجود ہے وہاں پر ۲۵ برس کے شخص کو حیثیت باشندہ

ملک کے ایک ووٹ کا اختیار ہے۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہے تو اسے ایک اور ووٹ کا اختیار ہے، اگر اسکی جائداد ایک خاص مقدار کی ہے تو وہ ایک تیسرے ووٹ کا مجاز ہے، غرضکہ وہاں ایک شخص پانچ ووٹ کا مالک ہو سکتا ہے۔ انگلستان میں بھی اسطریق کو رائج کرنے کی نسبت بہت بحث ہو رہی ہے۔ پس ہندوستان میں اگر یہاں کی ضروریات کے اعتبار سے تکثیر ووٹ کا طریقہ اختیار کیا جائے اور اس ذریعہ سے قلیل التعداد مذاہب کے ووٹ جہاں مقابلہ مذہبی بنا پر ہو بڑھا دیئے جائیں تو ہر ایک چھوٹے بڑے مذہب کی شکایت رفع ہو جائے اور انصاف میں بھی کسیطرح کا خلل نہ پڑے۔

(د) لیکن سب سے زیادہ قابل اطمینان طریقہ یہ ہوگا کہ بجائے اسکے کہ ایک حلقہ میں صرف ایک ممبر ہو ہر حلقہ کے لئے متعدد ممبر رکھے جائیں۔ انگلستان میں بہت سی اصلاحات کے بعد ایک حلقہ ایک ممبر کا قاعدہ جاری ہو گیا ہے مگر "انگلستان کا قابل احترام اوک جتنا ہندوستان کو منتقل نہیں کیا جا سکتا (مسٹر مارلی) ہندوستان میں انگلستان کے صرف وہی اصول اور قواعد رائج کئے جا سکتے ہیں جو یہاں کی حالات کے مناسب ہوں" مسلمہ اصول کی اس ترمیم سے ہندوستان کے مختلف مذاہب کو ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے، ایک دوسرے کی ضروریات کے سمجھنے اور آپس میں اتفاق پیدا کرنیکے عمدہ موقع ملینگے

۲۔ (الف) جو تجویزیں اسوقت بیان کی گئی ہیں۔ وہ صرف اس غرض سے ہیں کہ مسلمانوں کو ریپریزنٹیشن میں انکا حق دلا دیجا جائے لیکن اگر کسی طور سے انہوں نے اپنی تعداد کونسل میں پوری بھی کر لی تو اس سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے اگر دونوں قوموں کے معاملات صاف نہیں ہیں۔ مسلمان ہر حال میں تعداد میں کم ہونگے۔ تعداد نسبتی کے لئے مسلمانوں کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انکے اور ہندوؤں کے اغراض ایک نہیں ہیں اور وہ اپنے اغراض کو دوسروں کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑنا چاہتے۔ اسیوقت اس بحث نے کچھ کشیدگی پیدا کر دی ہے اور اگر مسلمانوں

نے اپنی اس رائے میں ترمیم نہ کی تو اس معاملہ میں انکی تمام کوشش بیکار جائیگی اور اُن کی حالت کچھ بھی بہتر نہو سکیگی۔ ہر معاملہ میں ہندو انسے مخالفت کریں گے کیونکہ وہ کونسل میں ہندوؤں کے ذریعہ تقابت بنکر داخل ہونگے۔ اور ہندوؤنکے ووٹ ایسے ہر حال میں زیادہ ہونگے جس کو شکست دینا دیرا ور دن کے سوا کچھ نہو گا۔ اور

مسلمان ہر طرح خسارہ میں رہینگے۔

(ب) جو بحث اوپر لکھی گئی ہے وہ اس بنا پر ہے کہ ہندوستانیوں کو کونسل میں واقعی کچھ اختیارات ہونگے (اور خدا نے چاہا تو وہ دن دور نہیں) مگر مسلمان اپنی حالت کی وجہ سے مجبور ہونگے کہ اس طرح کے اختیار ملنے سے مخالفت کریں وہ ہمیشہ اس امر کی کوشش کرینگے کہ کونسل صرف مشورت کے لئے ہو۔ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی کوششیں مگر انکی رائے کا کوئی اثر فیصلہ معاملات پر نہ پڑے مسلمانوں کو اسمیں کیا فائدہ ہو۔ بجز اسکے کہ موجودہ روشش جو انہوں نے اختیار کی ہے اس سے سوا اسکے اور کچھ قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ انگلو انڈین بہت خوشی سے مسلمانوں کی اس خواہش کی تائید کرینگے۔ اور ملک کی پولیٹکل ترقی کو روکنے کے لئے مسلمانوں کو ذریعہ بناوینگے جیسا کہ اب تک کیا ہے۔ ہندوستان کے لئے وہ بدبختی کا دن ہوگا جس روز ان حرکات سے ترقی کی رفتار رک جائیگی۔ اور چند مسلمانوں کے ذاتی فائدے کے لئے قوم اور ملک کے مفاد قربان کر دئے جائینگے اور ہمیشہ کا طوق غلامی ہماری قسمت میں لکھدیا جائیگا۔

۲۔ سب سے احسن صورت اس مشکل کو حل کرنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے تو ہندو اور مسلمان سب ملکر اس امر کی کوشش کریں کہ کونسل میں ہندوستانیونکا ایک جزو غالب شریک کیا جائے اور اختیارات واقعی اسے ملیں۔ اسکے بعد وضع قانون کے کام تین حصوں میں تقسیم کر لیں۔

(۱) وہ قوانین جو صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایسے قوانین صرف مسلمان ممبروں کے ہاتھ میں ہوں۔

(۲) وہ قوانین جو صرف ہندوں سے تعلق رکھتے ہیں - یہ صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوں
(۳) وہ قوانین جو مشترک ہیں - یہ کل ممبروں کے ہاتھ میں ہوں اور اسمیں بھی کسی فریق کی حق تلفی نہ ہونیکے لئے مصالحت کے ساتھ قرار واقعی انتظام کیا جائے - یہ کوئی جدت نہیں ہے - فرانس کی مجلس ناسیان مختلف حصص میں منقسم ہے اور ہر حصہ کے متعلق ایک صیغہ گورنمنٹ کا ہے اور اسکے فیصلے میں باستثنا کم تبدیلی کیجاتی ہے - انگلستان میں بھی اسی اصول پر گرینڈ کمیٹی قائم کرنیکا چرچا بعض اخبارات میں ہو رہا ہے - اسلئے ہندوستان میں یہ الوکھی بات نہ ہوگی اور اس سے ہر ایک فریق کی حفاظت بھی پوری پوری طرح ہو جائیگی - لیکن یہ سب باتیں اُسیوقت ہو سکتی ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے دل صاف ہوں اور دونوں نیک نیتی کے ساتھ متحدہ کوشش کرنا چاہیں ۔

جو صورتیں بیان کی گئی ہیں وہ قطعی نہیں ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ اگر یہی خواہان ملک چاہیں تو بغیر گورنمنٹ میں داد فریاد کئے ہوئے آپس کے مشورت سے کوئی صورت قرار دے سکتے ہیں اور غالبًا ہندوؤنکو اسمیں کسیطرح کا تامل نہ ہوگا کہ مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ انکے حقوق ہر طرح محفوظ رہینگے ۔

اب میں چند الفاظ مسلمانوں کی موجودہ کوشش پر بھی لکھنا چاہتا ہوں کہ اس خیال کی کہ مسلمانوں کے لئے ایک خاص تعداد کونسل میں مقرر کر دی جائے کہانتک تائید ہو سکتی ہے ۔

یہ امید نہیں کیجاتی کہ موجودہ نظام میں بہت زیادہ تغیر کیا جائیگا اور جب تک کونسلوں میں ہندوستانیوں کی تعداد غیر معمولی طور پر نہ بڑہا دی جائے - گورنمنٹ اس خواہش کو پورا کرنے سے مجبور رہیگی - مسلمانوں کا یہ دعوی ہے کہ انکی اغراض دوسری قوموں سے مختلف ہیں اسلئے وہ انکے ہاتھ میں نہ چھوڑنے چاہئیں - بالفاظ دیگر دوسرے بھی اپنے اغراض مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں چھوڑینگے - اب موجودہ کانسٹیٹیوشن کو دیکھیئے ہر جگہ ایوان تجارت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور انگریز ہی

انکی طرف سے ممبر ہوتا ہے۔ یونیورسیٹیونکا بھی یہی حال ہے۔ باقی رہگئے لوکل کونسلوں
میں میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے نامزد کردہ ممبر اور امپیریل کونسل میں دوسری
کونسلونکے غیر سرکاری ممبرونکی طرف سے ایک ایک ممبر۔ پس جبتک ہندوستانی ممبروں کی
تعداد اسقدر نہ بڑھادی جائے کہ ہر جگہ ہندو اور مسلمانونکو انتخاب کا موقع ملے یہ غرض
پوری نہیں ہوسکتی۔ اسکی زیادہ صراحت یوں ہوسکتی ہے کہ وائسرائے کی کونسل میں
ہر صوبہ کی غیر سرکاری ممبرونکی طرف سے ایک ایک ممبر نامزد ہوتا ہے اب فرض کیجیے
کہ پانچ ممبروں میں یہ قرار دیا جائے کہ دو مسلمان ہونگے تو جہاں سے مسلمان منتخب
ہونگے ایسے صوبوں کے ہندو کب اس امر پر راضی ہونگے کہ انکے اغراض کا کوئی
قائمقام نہو اور یہی حال بقیہ تین صوبے کے مسلمانونکا ہوگا۔
اس سے بھی بڑھکر دشواری اسوقت پیدا ہوگی جبکہ دوسرے اقوام بھی اسیطرح
کا مطالبہ کرینگے۔ اسوقت برٹش انڈیا میں ۹۵ لاکھ بدھ مذہب کے پیرو اور ۸۰ لاکھ انیمسٹک
اور ۳۰ لاکھ عیسائی ۲۱ لاکھ سکھ موجود ہیں۔
یہ بھی کوئی چھوٹے اعداد نہیں ہیں۔ امریکہ کے بعض اسٹیٹ کی آبادی اس سے
زیادہ نہوگی۔ پس جب ایکبار گورنمنٹ نے تعداد نسبتی کا اصول قرار دیدیا تو کوئی
وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اسکی تخصیص ہمیں تک کیوں ہو اور دوسرے بھی ایسی ہی
خواہش کیوں نہ کریں۔ چنانچہ جس اثر نے مسلمانوں کو حرکت دی ہے اس نے
عیسائیوں میں بھی اپنا کام شروع کردیا ہے۔ مسلمانوں نے اپنی گذشتہ حکومت
کی بنا پر جب اپنی اہمیت ثابت کی تو عیسائی حکمران قوم۔ ہم مذہبی پر کسقدر زور
نہ کرینگے اور پارسیوں کا غیر معمولی رسوخ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔
یہ وقت تھا کہ بجای تفرقہ اندازی کے تمام اقوام ہند متفق ہوکر مسٹر مارلی کی عنایات
سے مستفیض ہونیکی کوشش کرتے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے وقت بہت ملتے
رہینگے۔ آخر میں مجھے ہندو اور مسلمان بزرگان قوم سے اسقدر عرض کرنا ہے کہ کوئی
زمانہ ایسا نہیں آویگا کہ تمام اختلافات مٹ جائیں اور دونوں قومیں ایک ہوجائیں

بلکہ اختلافات روز نئے نئے پیدا ہوتے رہینگے۔ پس بجاے اسکے کہ آج ہم اور کل آپ ہر معاملے میں گورنمنٹ کا سہارا ڈھونڈیں آپس کی منافرت کو بڑھائیں اور انگریزونکو اپنے اوپر ہنسی کا موقع دیں، اپنے جھگڑے آپس میں چکا دیں اور اختلافی امور کو سربرآوردگان ملک کی ایک کانفرنس قرار دیکر اسمیں طے کریں اور اتفاق کی برکت سے ملک کی عظمت اور دولت بڑھائیں اور اسوقت ذلت سے نکالیں۔ خداوہ دن کرے۔ فقط

(تلمذ حسین)

بیاض حسرت موہانی

حضرت میرزا مظہر جانجاناں رحمتہ اللہ

"از بدو حیات الی یومنا ہذا کہ عمر شریفش بہ پیمانش خطوہ ستین است ..... از دولا ہمتی سر استغنا بپادشاہ و وزیر فرو نیاورد مسند فراغت در کنج نشین چار بالش عزت است،" (از تذکرہ فتح علی شاہ تالیف سنہ ۱۱۶۲ھ)

الٰہی مت کسو کے پیش دنج انتظار آوے	ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے
انہی زلف ت دو کھولیں فرصت دو صیاد ہم	تو اس باغ نئے سائیں ہم آزاد ہم
نہیں کچھ غم کہ ملتا کیوں نہیں بے پیمان گسل میرا	کہ یہاں رہتا ہوں اوکی بیکسی پر ہای دل میرا

میر شرف الدین مضمون شاگرد میرزا مظہر وخان آرزو

از شہ اہی قرار دادۂ ریختہ است ... ہرگاہ کہ دندانش از نزار ریختند خان آرزو از مزاح شاعر بے دانہ میگفت (از تذکرہ فتح علی شاہ)

چلا آگے سے کشتی میں جو وہ محبوب جاتا ہی	کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھو دل ڈوب جاتا ہی
مرا یہ اشک قاصد کی طرح اک دم نہیں تھمتا	کسی بیتاب کا گویا لئے مکتوب جاتا ہے

مرزا رضا قلی آشفتہ (ماخوذ از تذکرہ مصحفی)

لڑے تو اس سے رات میں غصے میں لڑلیا	پر جب وہ اٹھ چلا تو کلیجا پکڑ لیا
جدائی جیہ اندنوں غم پنہاں سے زرد ہے	ظاہر میں کچھ مرض نہیں پر دل میں درد ہے
وہ رشک مہر جو مطلع ہو بام پر سے	پھر اس سا چکت نہ گردوں پہ آفتاب پھر سے

مکتوبات امیر مینائی

مرتبہ حضرت ثاقب

قاضی عبدالجمیل صاحب مرحوم رئیس بریلی کے نام

(رامپور - ۲۵ ستمبر ۱۸۹۲ء)

کرم و محترم جناب قاضی صاحب زادت مکارمکم -

سلام مسنون اشتیاق و نیاز مشحون - مکرمت نامہ میرے نامہ ہائے نیاز کے جواب میں صادر ہوا مجھے انتظار رہتا کہ جن عزیزوں کے اُتارنے کا بریلی میں بندوبست کرنا ہے اُنکا تار تعین وقت کیا آجائے تو آپ کی خدمت میں اطلاع کردوں - اسوقت راہ سے تار آیا کہ منگل کا دن گزر کر شب کو ریل میں بریلی پہنچینگے - میں احتیاطاً میاں ناصر علی اپنے ایک معتمد کو کہ مثل میرے عزیزوں کے ہیں یہ نامہ نیاز دیکر آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں جس جس قسم کی ضرورت مرکبوں اور کہاروں اور مکان فرودگاہ کے در پیش ہو اُن سب کا تکفل آپکی توجہ سے ہونا چاہیے اور مستعدی سے اسٹیشن پر مع سواریوں کے حاضر باشی اور دو تین وقت تک ریل گاڑیوں کی نگرانی میاں ناصر علی کے ذمے ہے - مزید احتیاط کے واسطے ایک کارڈ ڈاک پر بھی آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں - آخر میں آپ کی مزاج پرسی اور آپکی عنایتوں کی شکرگزاری کرتا ہوں - صاحبزادہ بلند اقبال کو دعا میر بندہ زادگان عقیدت نشان تسلیم رساں ہیں فقط - امیر احمد عفی عنہ

حکیم برہم صاحب اڈیٹر ریاض الاخبار کے نام

(۲) پیاری برہم - سہ غصے میں ترے ہمنے عجب لطف اُٹھایا + اب تو عمداً اور بھی تقصیر کرینگے تمہاری تحریر آئی اسیوقت غزل دیکھی بہت اچھے اچھے شعر ہیں - دو ایک جگہ تصرف کیا - اس زمانے میں حبس بول کا دورہ پڑا تھا میں اور بھی ناتواں ہوں اور عسر بول کی تکلیف تو روز ہی رہتی ہے - اشعار قصیدے کے آئینگے تو بشرط امکان دیکھکر بھیجونگا - آپ کی باب میں تحریک باطنی اور ظاہری چلی جاتی ہے - خاطر جمع رکھئے - انشاءاللہ آپ بہت جلد کامیاب ہونگے

بشرطِ آنکہ با ما یار باشی		ز عمر خویش برخوردار باشی

حافظ غلام احمد صاحب فرغی مدرس مدرسہ فارسی جہانگیری بپول کے نام

دلنواز! وصال زیادت اخلاقکم۔ سلام مسنون اخلاص و نیاز مشحون۔ عنایت صحیفہ آیا اور اپنے ساتھ عمدہ ہدیہ
لایا۔ نعت کا نسخہ جو تحفۃً آپنے مرحمت کیا۔ میں نے خوش ہو کر اسکو قبول کیا۔ مینے دو چار ورق الٹکر
دیکھے۔ کتاب آپنے بہت اچھی اور مفید لکھی ہے۔ مرزا غالب مرحوم کا قادر نامہ بھی میری نظر سے گذرا
ہے۔ آپکے یہاں بہت سی باتیں بڑھی ہوئی ہیں۔ حسن انجام کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ الفاظ نادر والے
بہت ہی کم آئے ہیں انشاء اللہ یہ کتاب مقبول خاص و عام ہوگی۔ میری رنجوری و معذوری کی
وہی حالت ہے جو لکھ چکا ہوں۔ مجھے ذرا بھی صحت اور اطمینان ہوتا تو آپ کی فرمائش کی خوشی سے تعمیل کرتا
آپ کے اصرار اور اپنی حالت سے نہایت محجوب ہوں۔ اخلاق سامی سے امید ہے کہ میرا عذر
قبول کر کے میری خیالات مرتفع فرمائینگے۔ فرزندان و احباب فقیر با وجب گزارش ہیں۔ مسنتی پذیر
امیر فقیر

(۴۲) منشی ولایت علیخاں صاحب عزیز صفی پوری کے نام

گرامی گوہر سانی پر زور سلام اللہ الاکبر۔ سلام مسنون۔ اخلاص و دعا مشحون۔ مختصر سا کلام جو آپنے اپنے
دیوان سے نقل کر کے بلا انتخاب بھیجا۔ رمضان کی وجہ سے میں ابھی اسکو پورا تو نہیں دیکھ سکا مگر جہاں جہاں سے
دیکھا تو میری نظر میں سب منتخب قرار پایا۔ الحق آپ جوہر قابل ہیں اور ہر رنگ میں مذاق آپکا بہت اچھا ہے
خصوصاً ایسی مشکل زمینوں میں آپنے نعت کی غزلیں کہی ہیں کہ ان زمینوں میں شاعر سے عاشقانہ شعر بھی
مشکل سے نکل سکتے ہیں۔ بارک اللہ فی عمرکم۔ فہرست آپکی تالیفات کی بھی معلوم ہوئی۔ خداوند تعالیٰ
ایسا سامان کرے کہ یہ سب نتائج افکار باحسن عنوان نظر افروز بچشم مشتاقان ہوں۔ آپکے چھوٹے بھائی محمد یعقوب علیخاں
مرحوم کی جوانمرگی کا جو صدمہ میرے دل نے اٹھایا اسکے بیان کو الفاظ نہیں ملتے۔ آپ اپنا قلق جسقدر لکھئے بجا ہے
حق تعالیٰ اس مغفور کو غرق دریائے رحمت فرمائے اور آپکو صبر و جزائے صبر عطا کرے۔ ایسی حالت ضعف
قلب و ضعف بصر میں آپنے میرے واسطے اس کلام کی اپنے دست و قلم سے لکھنے میں تکلیف اٹھائی اس
تکلیف نے مجھے راحت تو پہنچائی مگر شرمندہ بھی کیا۔ بیوقت تصدیع دہی سے شرمسار ہوں اور اس
عنایت و محبت کا شکر گزار۔ کیفیت صومی زیادہ لکھنے نہیں دیتے۔ یہ چند سطریں بطور رسید لکھدی ہیں
تاکہ آپکو نگرانی نہ رہے۔ اطفال عقیدت خصال با وجب سلام ہیں۔ اشعار الاشعار دیکھنے کی نوبت ابھی نہیں

مکتوبات داغ دہلوی مرحوم

میرزا محمد شرفیار خانصاحب شرف منج ریاست جاورہ کے نام

جناب صاحبزادہ محمد شرفیار خانصاحب - الہی شکر - کہ برسوں کے بعد میں یاد آیا برس دن تک بیمار رہا کہ خبر مرگ اخبار میں چھپی - مرثیہ تاریخیں لوگوں نے کہیں - تمنے بات بھی نہ پوچھی - ہاں دیوان دیکھنے کی فرصت کہاں - جو میرے سلک سے خلاف ہو اوسکو خود نکال ڈالو البتہ ایک ... ہے کہ کوئی محاورہ خلاف نہ بندھا ہو -

... نظام کا قصد حضور خواجہ غریب نواز میں حاضر ہونے کا تہا بالفعل تو ملتوی ہوا اگر ... وہاں ... ہونگے - میں بھی بشرط زندگی ہمرکاب ہونگا - انشاء اللہ تعالی وہاں ملاقات ممکن ہے -

سب کچھ خدا نے دیا کسی پردیسی کی ایسی عزت اس دربار میں نہیں روٹی بھی بیاس کو کہلا کر کہا ... ہوں مگر ہائے ہندوستان تیرا ارمان -

چھ مہینے سے سفر میں ہوں - یہاں بھی خدمت احباب سے حتی الوسع دریغ نہیں کرتا - ... انشاء اللہ تعالی بلدہ میں جاکر بھیجونگا بشرطیکہ تم پہر یاد دلاؤ - ۱۲ ذی ... ... ہوں - فصیح الملک - داغ دہلوی -

... داغ ... تمہارے ... میں رمضان نہیں آتا - ... ... ہوں - اتنی ... کی ہی ... کہاں - بطور خود دیوان کو دیکھ لو ... ... یہاں اگر ... اور ... کر ... ... مہلت اگر ایک بار چھ مہینے میں غزل ... تو آپ کو وہ ... آپکے نزدیک میرا ہی قصور رہا - فصیح الملک داغ دہلوی -

شعراے عہد اکبری ۲

خواجہ مروی - شیخ رکن الدین بہاؤ الدولہ کی اولاد میں ... ... میں شیخ ابن حجر ثانی سے تلمذ تہا - انشا ... ... فصاحت بلاغت ... لطافت میں بے نظیر تہے - اشعار انکے متوسط درجے کے ہوتے تہے انکا دیوان ...

... ...

یہ اشعار کتاب ناتمام سنگھاسن بتیسی میں موجود ہیں جسکے لکھنے کا اکبر نے حکم دیا تھا۔ ؎

خوش الحان عندلیب باغ ابلاغ		مکحل نرگسش از کحل مازاغ
گرشید در زبور شیخ بے قیل		قلم بر نسخہ توریت و انجیل
نبوت را بدرگاهش حوالہ		امام الانبیا ختم الرسالہ

ہندوستان کی آب وہوا نے اسکو کچھ ایسا اپنا گرویدہ بنالیا تھا کہ اُسنے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ یہیں صرف کیا۔ سنہ ۹۸۹ھ میں بمقام کابل اسکا انتقال ہوا

تدوری ابجری

یہ مولانا نرگسی کے بھانجے ہیں بڑے ذہین تھے بیرام خاں کے زمانہ میں روم سے ہندوستان آئے اور بہادر خاں کی لڑائیوں میں اتکہ خاں نے انہیں قید کرلیا۔ رسالہ سن یوسفی اسنے یوسف محمد بن اتکہ کے نام پر لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے۔ ؎ بنام آنکہ روئے دشمن و دوست ٭ بہر جانب کہ باشد جانب اوست

سر بر آنکہ چوں نہم در ہجر آن پیمان گسل	ولہ	ندہد خاکستری گرد و تنم از سوز دل
سر داد بہر قلم چوں نہم تیغ جفائے او	ولہ	تعلیم را بہانہ سازم و افتم بپائے او
تیغ بطالب غائے برخود پسندیدم ندانستم		کہ چنداں اعتمادے نیست برمہر و وفائے او
بیگانگاں تو اند زبیخودی آمد بناز	ولہ	چوں بخود بازآمدم صد رخنہ در جاں داشتم

سنہ ۹۸۱ھ میں انکو چوروں نے قتل کرڈالا اور آگرہ میں دفن کئے گئے۔

جعفر بیگ

یہ آصف خاں قزوینی کے نام سے مشہور تھا بخشیوں کے زمرے میں داخل تھا طبیعت اسکی شعر سے نہایت مناسب تھی کسیقدر علم سے بھی ذوق رکھتا تھا۔ ؎

ہم امروز بہ بیداد گرے افتادہ است		کہ بہر جا کہ نہد پائے سرے افتادہ است
ایں چہ سحر ابود ایں صیاد صید افگن کبود	ولہ	ہیچ نخچیرے نشد پیدا کز و تیرے نداشت
نامہ درد ے سوے دلدار می باید نوشت	ولہ	درد دل بسیار شد با یار می باید نوشت
بیا در خاطرش ای زخم رنجم را مکن ضایع	ولہ	کہ خونہا مے خورم تا بر سر بیدادے آید
[illegible]	ولہ	[illegible]